فتاوی ابن تیمیه

شیخ الاسلام تقی الدین احمد ابن تیمیہ

جلد-۲

توحیدِ ربوبیت

(ابن عربی کی کتاب فصوص الحکم اور نظریہِ وحدت الوجود کا رد)

مترجم

پروفیسر ڈاکٹر عبدالکبیر محسن

پرنٹ لائن

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَأَشْھَدُ أَنْ لاَ إِلٰہَ إِلاَّ اللّٰہُ وَحْدَہٗ لا شَرِیْکَ لَہٗ وَأَشْھَدُ أَنَّ مُحَمَّداً عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً

قاعدہ اولیہ

علمِ الٰہی کی اصل اوراہلِ ایمان کی نظر میں اس کی اولین دلیل اللہ اوراس کے رسول پرایمان ہے جبکہ نبی اکرم کے ہاں وہ آپ کی طرف اللہ کی وحی ہے جیسا کہ آپ کا فرمان ہے:(أُمِرْتُ اَنْ أُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰی یَشْھَدُوْا اَنْ لاَ إِلٰہَ إِلاَّ اللّٰہُ وَاَنَّ مُحَمَّداً رَسُوْلُ اللّٰہُ فَاِنْ فَعَلُوْا ذٰلِکَ عَصَمُوْا مِنِّیْ دِمَائَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ اِلاَّ بِحَقِّھِمَا) (میں مامور ہوں کہ [عرب کے] لوگوں سے قتال کروں حتیٰ کہ اللہ کی توحیداور میری رسالت کی گواہی دیں،اگر ایسا کرلیں تو مجھ سے اپنی جان و مال کو بچالیں گے مگر ان کا حق ادا کرکے)(بقولِ مرتب یہاں اس کے حاشیہ میں مؤلف نے اپنے قلم سے لکھا: اس کا تکملہ جو میں نے مسئلہِ تقدیر میں متکلمین اورفلاسفہ کے اثباتِ صانع اورانبیاء کی شریعت کی بحث بارے ذکر کیا اور جوکئی دیگر مقامات میں لکھا کہ واجبات میں سے اولین ایمان ہے نہ کہ نظر (یعنی منطقی بحثیں)اورنہ اس کا مطلق علم ،اسی پر اہلِ سنت کے عقیدہ کی بناء ہے ،اسی قاعدہ پر ایک اورحاشیہ میں لکھا کہ ابومحمد عبداللہ بن احمد خلیدی نے اپنی کتاب شرح اعتقاد اہل السنۃ ۔اصل کتاب ابوعلی حسین بن احمد طبری کی ہے اور یہ شائد امام احمد وغیرہ کے معاصرین میں سے ہیں۔میں اللہ تعالی کی معرفت بارے لکھتے ہیں:

یہ اولین فرض ہے جس سے ہر مسلمان کو واقف ہونا چاہئے اگر اسے معرفت وتقویٰ حاصل نہیں تو چاہے کتنا ہی مطیع اور عبادت گزار ہو اسے کچھ نفع نہیں !مسلمان جب اللہ تعالی کی مخلوقات میں نظر کرتا ہے اور جواس نے عجائب تخلیق کئے مثلاً گردشِ لیل و نہار اور چاند وسورج اورخود اپنے وجود اوراپنے مبدا ومنتہا میں میں تفکر کرے تو اس کے پاس اللہ کی معرفت بڑھے گی ،اللہ نے فرمایا:
(**وَفِیْ أَنْفُسِکُمْ أَفَلاَ تُبْصِرُوْنَ**) [الذاریات :۲۱] (اورخودتمہارے نفوس میں تو کیا تم دیکھتے نہیں؟) نبی اکرم کا فرمان ہے: (مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ عَرَفَ رَبَّہٗ) (جس نے اپنی معرفت پالی اس نے اپنے رب کی معرفت پالی) ہم نہیں کہتے کہ اللہ تعالی کی پہچان مخلوقات کے ساتھ ہے لیکن تمام مخلوقات کی پہچان اللہ کے ساتھ ہے البتہ مخلوقات پرنظر وتفکر سے اس کی پہچان بڑھتی ہے،عبدالرحمٰن بن ابوحاتم سے قائل کے اس قول کی بابت پوچھا گیا کہ میں نے اللہ کوعقل اورالہام کے ساتھ پہچانا تو کہا جس نے یہ کہا وہ بدعتی ہے،ہم نے ہر چیز کو اللہ کے ساتھ پہچانا ہے،ذوالنون مصری سے پوچھا گیا آپ نے اپنے رب کو کیسے پہچانا؟ کہا: (عَرَفْتُ رَبِّیْ بِرَبِّیْ) (میں نے اپنے رب کو اپنے رب کے ذریعہ پہچانا)اگر میرا رب نہ ہوتا تو میں اپنے رب کو پہچان نہ سکتا،حضرت عبداللہ بن رواحہ کا ایک شعر ہے:

وَ اللّٰہِ لَوْ لاَ اللّٰہُ مَا اھْتَدَیْنَا وَلاَ تَصَدَّقْنَا ولاَ صَلَّیْنَا الخ

(واللہ اگر اللہ نہ ہوتا تو نہ ہم ہدایت پاتے اور نہ صدقہ ونماز ادا کرتے)اور یہ نبی اکرم کی موجودگی میں پڑھے اورآپ نے انکار نہ

فرمایا تو یہ ہمارے علماء کے قول: کہ اللہ کی معرفت خود اللہ کے ساتھ ہوتی ہے اور تمام اشیاء کی معرفت اللہ کے ساتھ ہے، کی صحت کی دلیل ہوئی، یہ خلیدی کی آخرِ کلام ہے اور یہ ہماری اس بحث سے متعلق ہے، شیخ الاسلام انصاری نے اہلِ سنت کا اولین اعتقاد اور جس پر امت کے اہلِ حق کا اجماع واقع ہوا ہے، یہ قرار دیا کہ بندے پر اللہ کی معرفت واجب ہے کیونکہ حضرت معاذ سے نبی اکرم نے انہیں یمن روانہ کرتے وقت فرمایا تم اہل کتاب کی ایک قوم کے پاس جارہے ہو تو سب سے پہلے انہیں اللہ کی عبادت کی دعوت دینا پس جب وہ اللہ کی معرفت حاصل کر لیں تو انہیں بتلانا کہ اللہ نے ان پر یہ یہ چیزیں فرض کی ہیں، مسلم نے یہ الفاظ روایت کئے، بخاری کی روایت میں ہے کہ کہا: (فَاعْلَمْ اَنَّ مَعْرِفَةَ اللّٰهِ وَعِبَادَتَهُ وَالإِيْمَانَ بِهِ اِنَّمَا يَجِبُ) (پس جان لو کہ اللہ کی معرفت، اس کی عبادت اور اس پر ایمان لانا واجب ہے) ابن عباس بارے منقول ہے کہ ان سے پوچھا گیا آپ نے اپنے رب کو کیسے پہچانا؟ کہا جس نے دین کی طلب قیاس کے ذریعہ کی وہ ہمیشہ التباس اور کجروی کا شکار رہے گا اور میں اللہ کو اسی کے ساتھ پہچانتا ہوں جس کے ساتھ اس نے اپنی پہچان کرائی اور وہی اس کا وصف کرتا ہوں جو خود اس نے کہا (حاشیہ ختم ہوا) قرآن میں ہے:

﴿ قُلْ اِنْ ضَلَلْتُ فَاِنَّمَآ اَضِلُّ عَلٰی نَفْسِیْ وَاِنِ اهْتَدَیْتُ فَبِمَا یُوْحِیْٓ اِلَیَّ رَبِّیْ﴾ [سبأ : **۵۰**] (کہہ دو کہ اگر میں گمراہ ہوں تو میری گمراہی کا ضرر مجھ ہی کو ہے اور اگر ہدایت پر ہوں تو یہ اس کا طفیل ہے جو میرا رب میری طرف وحی بھیجتا ہے بے شک وہ سننے والا نزدیک ہے)

﴿وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰی﴾ [والضحیٰ : **۷**] (اور راستے سے ناواقف پایا تو سیدھا راستہ دکھایا)

﴿ نَحْنُ نَقُصُّ عَلَیْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَآ اَوْحَیْنَآ اِلَیْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِیْنَ﴾

[یوسف : ۳] (ہم اس قرآن کے ذریعے سے جو ہم نے تمہاری طرف بھیجا ہے تمہیں ایک نہایت عمدہ قصہ سناتے ہیں اور تم اس سے پہلے بے خبر تھے) تو خبر دی کہ قبل ازیں اللہ کی پہچان رکھنے والوں میں سے نہ تھے اور کہا:

﴿ وَكَذٰلِكَ اَوْحَیْنَآ اِلَیْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا مَا كُنْتَ تَدْرِیْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِیْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِیْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا﴾ [الشوریٰ : **۵۲**] (اور اسی طرح ہم نے اپنے حکم سے تمہاری طرف روح القدس کے ذریعے سے بھیجا ہے تم نہ تو کتاب کو جانتے تھے اور نہ ایمان کو لیکن ہم نے اس کو نُور بنایا ہے کہ اس سے ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں ہدایت کرتے ہیں) صحیح بخاری میں نبی اکرم کی وفات کے بعد حضرت عمر کی تقریر کا ایک یہ جملہ (بالمعنی) مروی ہے: بے شک اللہ نے تمہارے نبی کو اس قرآن کے ذریعہ ہدایت دی تو اسے مضبوطی سے تھامے رکھو، قرآن میں رسل کے ساتھ تقریرِ حجت کثیر ہے جیسے یہ آیت:

﴿لِئَلَّا یَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَی اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ﴾ [النساء : ۱۶۵] (تاکہ پیغمبروں کے آنے کے بعد لوگوں کیلئے اللہ پر کوئی حجت باقی نہ رہے)

﴿ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا﴾[الإسراء : **۱۵**] (اور جب تک ہم پیغمبر نہ بھیج لیں عذاب نہیں دیا کرتے)

﴿وَ لَوْ لَآ اَنْ تُصِيْبَهُمْ مُّصِيْبَةٌ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ فَيَقُوْلُوْا رَبَّنَا لَوْ لَآ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ﴾(وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى حَتّٰى يَبْعَثَ فِيْٓ اُمِّهَا رَسُوْلًا﴾ تک[القصص : ۴۷ تا ۵۹] (اور ایسا نہ ہو کہ اگر ان کے سبب جو ان کے ہاتھ آگے بھیج چکے ہیں اُن پر کوئی مصیبت واقع ہو تو یہ کہنے لگیں کہ اے اللہ تو نے ہماری طرف کوئی پیغمبر کیوں نہ بھیجا کہ ہم تیری آیتوں کی پیروی کرنے اور ایمان لانے والوں میں ہوتے) (اور تمہارا رب بستیوں کو ہلاک نہیں کیا کرتا جب تک اُن کے بڑے شہر میں پیغمبر نہ بھیج لے)

﴿ وَسِيْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى جَهَنَّمَ زُمَرًا حَتّٰىٓ اِذَا جَآءُوْهَا فُتِحَتْ اَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَآ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ﴾[الزمر : ۷۱] (اور کافروں کو گروہ گروہ بنا کر جہنم کی طرف لے جائیں گے یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس پہنچ جائیں گے تو اس کے دروازے کھول دیئے جائیں گے تو اس کے داروغہ ان سے کہیں گے کہ کیا تمہارے پاس تم ہی میں سے پیغمبر نہیں آئے تھے)

﴿يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ﴾[الأنعام :۱۳۰] (اے جنوں اور انسانوں کی جماعت! کیا تمہارے پاس تمہیں میں سے پیغمبر نہیں آتے رہے) اسی لئے کتب حدیث کے **بعض مصنفین نے جنہوں نے ابواب پر سنن کی ترتیب کی** جب علم کی اصناف جمع کیں تو آغاز اصلِ علم وایمان کے ساتھ کیا جیسے امام بخاری نے اپنی صحیح کی ابتدا بدء الوحی اور اس کے نزول سے کی تو اولاً نبی کریم پر علم وایمان کے نزول کی صفت بارے خبر دی پھر اس کے بعد کتاب الایمان لائے جو آپ کی لائی باتوں کا اقرار ہے پھر کتاب العلم لکھی جو احکامِ شریعت کی معرفت ہے تو یہی (ہمارے دین کی) حقیقی ترتیب ہے، امام ابومحمد دارمی نے اپنی مسند کا آغاز دلائلِ نبوت سے کیا اور اس ضمن میں قابلِ قدر مواد لائے، یہ دونوں حضرات **مسلم اور ترمذی جیسوں سے کثیر وجہ افضل ہیں** اسی لئے امام احمد ان دونوں اور ان جیسوں کی بہت تعظیم کرتے تھے کیونکہ یہ اصولاً وفروعاً فقہائے محدثین ہیں، جب علم وہدایت کی اصل رسالت پر ایمان ہے جو کتاب وحکمت (یعنی سنت) کو متضمن ہے تو اس کا ذکر ہدایت بالرسالت کا طریق ہے جو کہ قرآن ہے اور جو رسول اکرم لائے، قرآن میں اس کی کثیر مثالیں ہیں جیسے کہا:

﴿ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ﴾[البقرة : **۲**] (اس میں کچھ شک نہیں اس میں متقین کیلئے ہدایت ہے) اور:

﴿ هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّ مَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ﴾[آل عمران : ۱۳۸] (یہ لوگوں کیلئے بیانِ صریح اور اہلِ تقویٰ کیلئے ہدایت اور نصیحت ہے)

﴿ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ﴾[إبراهيم : **۱**] (ایک کتاب، اس کو ہم

نے تم پر اس لئے نازل کیا ہے کہ لوگوں کو اندھیرے سے نکال کر روشنی کی طرف لے جاؤ، ان کے رب کے حکم سے)

﴿ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴾[البقرة : ۳۸] (جب تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت پہنچے تو جنہوں نے میری ہدایت کی پیروی کی ان کو نہ کچھ خوف وحزن نہ ہوگا)

﴿ وَ كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ وَ اَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيٰتُ اللّٰهِ وَ فِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ﴾[آل عمران : ۱۰۱] (اورتم کیونکر کفر کرو گے جب کہ تمہیں اللہ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سنائی جاتی ہیں اورتم میں اُس کے پیغمبر موجود ہیں اور جس نے اللہ کی مضبوط پکڑ لیا تو وہ سیدھی راہ لگ گیا) تو معلوم ہوا کہ اللہ ورسول کی آیات کفر کا مانع ہیں، اسی طرح علم و ہدیٰ کا ذکر بطورِ ہدایت کے حصول کا ذریعہ ہونا اوراس کا صرف اہل ایمان کیلئے فلاح کا باعث ہونا قرآن میں بھرا پڑا ہے جیسے: (﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ﴾) آگے کفاراور منافقین کی مذمت بیان کی، اسی طرح اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان:

﴿ وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِىْ خُسْرٍ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾[والعصر : ۱-۳] (عصر کی قسم انسان نقصان میں ہے۔مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے)اور:

﴿ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ [والتين : **۵-۶**](پھر اس کو پست سے پست کر دیا۔مگر جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے) تو تمام نوعِ بشر پر خسارہ اور آخری درجہ کی پستی کا حکم لگایا سوائے ان اہل ایمان کے جو صالح (بھی) ہیں اسی طرح اہلِ جنت اہلِ ایمان اوراہلِ جہنم اہلِ کفر ہیں اور یہ بات اتنی کثرت سے قرآن نے بیان کی کہ ہر کس و ناکس کو اس کا علم ہے اور سبھی بخوبی اس سے واقف ہیں، سعادت کا اصلاحِ عمل کے ساتھ ربط کیا جیسے:

﴿ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً﴾ [النحل : **۹۷**] (جو شخص نیک عمل کرے گا، مرد ہو یا عورت اور وہ مومن بھی ہوگا تو ہم اُس کو پاک زندگی سے زندہ رکھیں گے)اور:

﴿ وَ مَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَ سَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا﴾ [الإسراء : **۱۹**] (اور جو شخص آخرت کا طلبگار ہواوراس میں اتنی کوشش کرے جتنی اُسے لائق ہے اور وہ مومن بھی ہو، ایسے لوگوں کی کوشش مقبول ہوتی ہے) اوراس کا زوال اورفقدان اعمالِ صالحہ کا حبوط اور ضیاع ہے جیسے کہا:

﴿ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ بِقِيْعَةٍ﴾ [النور : **۳۹**] (جن لوگوں نے کفر کیا ان کے اعمال کی مثال ایسی ہے جیسے صحرا کی ریت) اور**:**

﴿ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادٍ﴾ [إبراهيم : **۱۸**] (جن لوگوں نے اپنے رب سے کفر کیا اُن کے اعمال کی مثال راکھ کی سی ہے) اور:

مَثَلُ مَا يُنْفِقُوْنَ فِىْ هٰذِهِ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَثَلِ رِيْحٍ فِيْهَا صِرٌّ اَصَابَتْ حَرْثَ قَوْمٍ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَاَهْلَكَتْهُ﴾ [آل عمران : ۱۱۷] (یہ جو مال دنیا کی زندگی میں خرچ کرتے ہیں اُس کی مثال ہوا کی سی ہے جس میں سخت سردی ہواور وہ ایسے لوگوں کی کھیتی پر جو اپنے آپ پر ظلم کرتے تھے چلے اور اُسے تباہ کر دے) اور:

﴿وَ قَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا﴾ [الفرقان : ۲۳] (اور جوانہوں نے عمل کئے ہوں گے ہم ان کی طرف متوجہ ہوں گے تو ان کو اڑتی خاک کر دیں گے) اوراس کا نحو کثیر ہے! ذکر کیا کہ تمام ہدایت یافتہ اقوام انہی صفات کی حامل تھیں چنانچہ کہا:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ الَّذِيْنَ هَادُوْا وَ النَّصٰرٰى وَ الصّٰبِـِٔيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ عَمِلَ صَالِحًا﴾ الخ [البقرۃ:۶۲] (جولوگ مسلمان ہیں یا یہودی یا عیسائی یا ستارہ پرست [یعنی کوئی شخص کسی قوم و مذہب کا ہومگر جب وہ] اللہ اور روزِ قیامت پر ایمان لائے گا اور نیک عمل کرے گا تو ایسے لوگوں کوان کا صلہ اللہ تعالی کے ہاں ملے گا) اس بارے اہلِ عقل کو تدبر کرنے اوراہلِ سمع کو سمع کا حکم دیا اور قرآن میں جا بجا تامل، تدبر، تفکر، تذکّر اور سوچنے سمجھنے کی دعوت دی، اسی طرح استماع، ابصار اور اصغاء کی اور یہ کہ اللہ کی آیات پر کان لگاؤ اور اس سے تمہارے دل لرزنے چاہئیں اور آنکھوں سے آنسو جاری ہوں، انسان کی فطرت اللہ کے اقرار اور اس کی طرف انابت کو متضمن ہے اور یہی سب کی سرشت ہے اور یہی لا الہ الا اللہ کا معنی ہے، الٰہ وہ ہو سکتا ہے جس کی معرفت ہو اور جس کی عبادت ہو، اس نکتہ پر ایک جگہ مفصل بحث کی ہے، دعوت سے مقصود بندوں کا اس مقصد تک وصول ہے جس کیلئے ان کی تخلیق ہوئی یعنی اپنے رب وحدہ کی عبادت اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا، **عبادت کی اصل** یہ کہ دل محوِ عبادت ہو اور دیگر اعضائے جسم اس کے ہمراہ ہوں کیونکہ دل (گویا) بادشاہ اور اعضاء اس کے لشکری ہیں اور یہ (بقول نبی اکرم) وہ ٹکڑا ہے جو اگر صحیح اور درست ہو تو سارا جسم صحیح ہے اور اگر یہ خراب اور فاسد ہو تو سارا جسم خراب و فاسد ہوگا اور یہ اسی صورت ہوگا جب اسے اللہ کے بارہ میں معرفت اور محبت حاصل ہو، یہی قرآن میں اصل دعوت ہے چنانچہ فرمایا:

﴿ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ﴾ [الذاریات : ۵۶] (اور میں نے جنوں اورانسانوں کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ میری عبادت کریں) سورۃ البقرہ کے شروع میں خلق کی تین اصناف: مومن، کافر اور منافق کے ذکر کے بعد فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ وَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ [۲۱] (اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تمہیں اور تم سے پہلے لوگوں کو پیدا کیا تا کہ تم بچو) اوران آلاء کا ذکر کیا جو اس کے فضل اور قدرت کو متضمن ہیں پھر اس کے بعد نبوت کی حقیقت بارے بات کی اور کہا:

﴿وَ اِنْ كُنْتُمْ فِىْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ﴾ [البقرۃ: ۲۳] (اور اگر تم کو اس میں جو ہم نے

اپنے بندے پر نازل کیا، میں کچھ شک ہوتو اسی طرح کی ایک سورت ہی تم بھی بنالاؤ) متکلم (یعنی علمِ کلام کا ماہر) اسی طرزِ تالیف کو مستحسن اور منتظم سمجھتا ہے اس طور کہ اولاً ربوبیت کی تقریر کی گئی پھر رسالت کی، وہ اپنے نقطہ نظر سے اسے عقلی مباحث میں اپنے کلامی طریقہ کے موافق خیال کرتا ہے کہ اولاً ربوبیت پھر نبوت کا اثبات کیا اور اسکے بعد نبوت کی سمعیات (یعنی احکامِ شریعت) کی بات کی جیسا کہ معتزلہ، کرامیہ، کلابیہ، اشعریہ اوران سب کا یہ مشہور کلامی طریقہ و اسلوب ہے جو اولاً صانع کا حدوثِ عالم پر بناء کرتے ہوئے اثبات کرتے ہیں پھر نفیاً اور اثباتاً اس کی صفات کا عقلی قیاس کے ساتھ اثبات کرتے ہیں، اس ضمن میں ان کے ما بین کئی اتفاقات اور متعدد اختلافات ہیں یا تو مسائل میں یا پھر دلائل میں پھر وہ بعد ازاں سمعیات مثلا معاد، ثواب، عقاب، خلافت، تفضیل اور ایمان بارے اجمالی طور سے بحث کرتے ہیں، **ان کے نزدیک کلام (اور طرزِ استدلال) کا عمدہ و اساس وہ مسائل اور مباحث ہیں جنہیں وہ عقلیات کا نام دیتے ہیں** اور یہ ان کے ہاں دین کے اصول ہیں اور ان کی بناء ان مقابیس پر رکھی ہے جو کثیر احادیث کے رد کو مستلزم ہے توان مقابیس کے ضعف کی جہت سے انہیں ذم لاحق ہے جن پر انہوں نے اعتماد کیا نیز کثیر روایات کو ان کے رد کرنے کی جہت سے

ان کی **دو قسمیں** ہیں: ایک وہ حضرات جنہوں نے ان عقلی قیاسات پر علمی ۔نہ کہ عملی ۔اصول کی بناء رکھی جیسے اشعریہ ہیں اور دوم وہ حضرات جنہوں نے علمی و عملی دونوں طرح کے اصول کی ان پر بناء رکھی جیسے معتزلہ ہیں حتی کہ یہ لوگ اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان قدرِ مشترک کا اخذ کرتے ہیں تو جس فعل کا صدور اللہ سے خوب ہے اس کا (ان کی نظر میں) بندوں سے صدور بھی خوب ہے اور جو قبیح ہے وہ بندوں کی جانب سے بھی ایسا ہے، اسی لئے علماء نے انہیں مشبہہ کا نام دیا، بلا شبہ سلف کی نظر میں یہ مذموم متکلمین ہیں اس وجہ سے کہ بکثرت دین کی بناء فاسد کلامی قیاس پر رکھی اور کتاب وسنت میں وارد کثیر کو رد کیا، دوسرا گروہ جب اس کے بعض میں ان کا مشارک بنا تو وہ بھی قابلِ مذمت وعیب ٹھہرے بقدر اسکے جو ان کی موافقت کی جو ان کے کثیر دلائل میں ہے، جن کی بابت ان کا زعم ہے کہ ان کے ساتھ وہ دین وایمان کے اصولوں کی تقویت وتائید کرتے ہیں اور ان کے کچھ مسائل میں بھی ان کی موافقت کی جن کے ساتھ وہ سنن اور آثار کی مخالفت کرتے ہیں اور اسکی جس پر اہلِ عقل و دین ہیں

یہاں مقصود ان کے احوال کی تفصیل بیان کرنا نہیں ہم نے ایک جگہ ان کے بارہ میں کئی اشیاء لکھی ہیں، یہاں غرض یہ بیان کرنا ہے کہ قرآن نے دین کے اصول اور اس کے فروع کے دلائل ومسائل کے ذکر میں اکمل اسلوب اختیار کیا ہے جبکہ علمِ کلام کا ماہر سمجھتا ہے کہ وہ اپنے منفرد طریقہ کے ساتھ قرآنی انداز و اسلوب کی موافقت کررہا ہے کبھی اثباتِ ربوبیت، کبھی اثباتِ وحدانیت، کبھی نبوت اور کبھی معاد کے اثبات میں حالانکہ وہ کثیر یا اکثر مواضع میں خطا کار ہے جیسا کہ یہاں تو **متکلم کا یہ زعم کئی وجوہ کے مدِ نظر درست نہیں کہ قرآن کا طریقہ اس کے طریقہ کے موافق ہے**:

(ا) کہ قرآن میں صانع کا اثبات اس کی آیات کے ساتھ ہے جن کا علم خود اسکے وجود کے علم کو مستلزم ہے جیسے شعاع کی موجودگی بغیر کسی کلی قیاس کے سورج کے وجود پر دال ہے اور ہر محدَث کے لئے محدِث کا ہونا ضروری ہے اسی طرح ہر جو ممکن ہے اس کی نسبت مرجح اور ہر حرکت کیلئے علتِ غائیہ یا فاعلیہ کا ہونا ضروری ہے اور اس ضمن میں یہ کہنا ضروری نہیں کہ آیا صانع کی ضرورت فقط حدوث ہے جیسا کہ معتزلہ کہتے ہیں یا امکان؟ جیسا کہ جمہور کہتے ہیں حتی کہ اس پر یہ امر مرتب کرتے ہیں کہ ثانی ایک باقی رہنے والی حالت ہے جو صانع کی محتاج ہے قول ثانی صحیح پر نہ کہ اول پر، اس نکتہ پر ایک جگہ مفصل بحث کی اور حق کی تبیین کی ہے کہ ذوات کی نفسِ مخلوقہ ایک صانع کی محتاج ہے اور اس کی یہ احتیاج ان موجوداتِ مخلوقہ کیلئے وصفِ ذاتی ہے جیسے ربِ خالق کی نسبت استغناء وصفِ ذاتی ہے اور اس احتیاج کی بجز نفسِ ماہیت اور عینِ الإنّیت کے کوئی علت نہیں جیسے ربِ خالق کے استغناء کیلئے بجز اس کی نفسِ ذات کے کوئی علت نہیں، تم کہہ سکتے ہو کہ ان کی احتیاج اور اس کے استغناء کی کوئی علت نہیں کیونکہ ہر امر کی علت نہیں ہوتی تو جس طرح اسکے وجود اور اسکی استغناء کیلئے کوئی علت نہیں اسی طرح اسکے عدم کیلئے بھی علت نہیں کیونکہ اسکا ہونا اس کی مشیت نہیں اور نہ موجودات کے اسکی طرف فقر و احتیاج کی اگر ان کا ہونا اس کی مشیت ہو، اگر چاہو تو کہو اس فقر اور اس استغناء کی علت نفسِ ذات اور عینِ حقیقت ہے اور اس کی دلیل یہ کہ انسان اپنے فقرِ ذات اور خالق کی طرف اس کے محتاج ہونے سے واقف ہے بغیر اس کے کہ اسکے دل میں خیال آئے کہ یہ ممکن ہے اور ممکن وہ ہوتا ہے جو وجود اور عدم دونوں کو قبول کرے یا یہ کہ یہ محدَث ہے اور محدَث اِحداث سے قبل معدوم ہوتا ہے بلکہ وہ اس (یعنی اپنے نفس) کے قدیم ہونے میں شک کرے گا یا اس قدامت کا اعتقاد رکھے گا جبکہ اس کے فقر اور صانع کی طرف اسکی حاجت سے واقف ہے تو اگر صانع کی طرف احتیاج کی علت نہ ہوتی مگر امکان یا حدوث تو اس کے اس کی طرف افتقار کے علم ہونے کا جواز نہ ہوتا مگر جب اس علت کو جانے کیونکہ ان کے نزدیک موثر کی طرف احتیاج کی دلیل بجز اس کے کوئی نہیں ہے

تب محتاج ذوات اور بے بس انّیات کا علم ان کے صانع کی طرف محتاج ہونے کے علم کا موجب ہے اسی لئے اللہ نے انہیں (یعنی انفس و ذوات کو) آیات قرار دیا ہے جیسے کہا: **﴿وَفِي أَنفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ﴾**[الذاریات : **۲۱**] (اور خود تمہارے نفوس میں تو کیا تم دیکھتے نہیں؟) تو یہاں دو مقام ہیں ایک کہ یہ (ذوات) ایک موجب مؤثر یا (بالفاظِ دیگر) محدِث کے محتاج ہیں ان دو علتوں کے پیشِ نظر! دوم کہ ہر وہ جو موثر، موجب یا محدِث کی طرف محتاج ہو وہ اس کیلئے ضروری ہے، یہ کلام فی نفسہ صحیح تو ہے لیکن یہ لازمی طریق نہیں بلکہ اس میں ایسا طول اور گھاٹیاں ہیں جو مقصود کو دور کر دیں گی، جہاں تک مقامِ اول تو ان کے محتاج ہونے کا علم اس کے امکان یا حدوث کسی دلیل کا محتاج نہیں اور جو مقامِ ثانی ہے تو ان کے اس کی طرف مفتقر ہونے سے لازم نہیں آتا کہ اس پر کسی کلی قیاس کے ساتھ استدلال کیا جائے اس طور کہ ہر ممکن کیلئے موجب کا ہونا ضروری ہے اسی طرح ہر محدَث کے لئے محدِث کا وجود لازمی

ہے اس لئے کہ یہ اس کیلئے نشانی (اور اسکے وجود کی دلیل) ہے تو ممتنع ہے کہ اس سے کمتر ہو یا اس کیلئے نشانی نہ ہو اور دل اپنی فطرت کے باوصف اسے جانتا ہے اگر چہ دل میں امکان وحدوث کی بابت سوچ نہ آئے

نکتہ یہ ہے کہ امکان وحدوث کے وصف کی بابت ضروری نہیں کہ دل اسے مانتا ہو، نہ ذوات کے فقر میں اور نہ اس امر میں کہ یہ باری تعالی کے وجود کی آیات ہیں اگر چہ یہ دونوں امور ثابت حقیقت اور صحیح دلیل ہیں لیکن ممکنات کے اعیان اپنے خالق کے عین کیلئے نشانی ہیں وہ ذات کہ جس کی مثل کوئی شئ نہیں اس طور کہ کسی کیلئے اس میں شراکت ہو! جہاں تک ہمارا کہنا کہ ہر ممکن کیلئے مرجح اور ہر محدَث کیلئے محدِث ہے تو یہ محدِث اور مرجح کے وجود پر دال ہے اور یہ ایک کلی وصف ہے جو قابلِ شرکت ہے اسی لئے عقلی قیاس تعیین پر دال نہیں بلکہ مطلقِ کلی پر دال ہے لہذا تب تعیین لازم ہے تو قیاسِ کلی ومطلق وصف پر دلیل ہے نیز اگر صانع کے وجود پر موجودات کے امکان یا حدوث یا دونوں کے ساتھ استدلال کیا جائے تو یہ کلی قیاس کا مفتقر نہ ہوگا بایں طور کہ کہا جائے کہ ہر محدَث کیلئے محدِث اور ہر ممکن کیلئے مرجح ضروری ہے تو اس کے لئے ان کے دو منطقی مقدموں کی ضرورت نہیں بلکہ دل اس ممکن اور اس محدث کے افتقار کو جانتا ہے لہذا حکمِ معینات کا علم اس کلی علم سے مستفاد نہیں جو موجودات کو شامل ہو بلکہ کبھی کسی معین کے حکم کا علم عام حکمِ کلی کے علم سے قبل بھی دل میں ہوتا ہے، جیسے اس بات کا علم کہ پانچ دس کا نصف ہے اور یہ اس امر کے جاننے پر موقوف نہیں کہ ہر عدد کیلئے نصفیت ہوتی ہے اور (اس ۔یعنی ہر عدد ۔کی تعریف یہ ہے کہ) وہ اپنے سے قبل اور اپنے سے بعد والے عدد کے مجموع کا نصف ہوتا ہے تو اب اس تناظر میں اس فرمانِ خداوندی کو دیکھو:

(**أَمْ خُلِقُوا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ أَمْ هُمُ الْخَالِقُونَ**) [والطور : **۳۵**] (کیا یہ کسی کے پیدا کئے بغیر ہی پیدا ہو گئے ہیں یا یہ اپنے آپ کے خود خالق ہیں) جبیر بن مطعم کہتے ہیں جب میں نے اس آیت کو سنا تو محسوس کیا کہ میرا دل پھٹ رہا ہے، یہ استفہامِ انکاری ہے، مطلب یہ کہ آیا یہ بغیر مبدِع کے عالَمِ وجود میں آ گئے ہیں؟ تو وہ جانتے ہیں کہ مُکَوِّن کے بغیر یہ نہ تھے اور جانتے ہیں کہ ان کے نفوس (ایک وقت تھا کہ) نہ تھے اور اپنی بابت ان کا یہ علم فطرت کے لحاظ سے ہے اور یہ کسی دلیل کا محتاج نہیں کہ ہر کائن محدَث ہے، یا ہر ممکن بذاتِ خود ہی موجود نہیں ہوجاتا اور بغیر موجد کے وجود میں نہیں آتا اگر چہ یہ عمومی نوعی قضیہ سچ ہے لیکن اس خاص معینہ کا جاننا اگر اس سے سابق نہیں تو اس سے متاخر بھی نہیں اور نہ واضح وبین ہونے میں اس سے کمتر ہے، اس نکتہ پر ایک جگہ تفصیل سے بحث کی ہے اور ذکر کیا کہ انبیاء کرام کی لوگوں کو (توحید کی) دعوت فطری طریق کے ساتھ تھی جیسے ان کا کہنا (جیسے قرآن نے بیان کیا):

(**أَفِي اللَّهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ**) [إبراهيم: ۱۰] (کیا اللہ میں شک ہے جو آسمانوں اور زمین کا بنانے والا ہے؟) حضرت موسیٰ نے کہا تھا: (**رَبُّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ**) [الشعراء : **۲۴**] (آسمانوں اور زمین کا رب) ایک جگہ کہا:

(**يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ**

فِرَاشًا﴾ [البقرۃ: ۲۱۔ ۲۲] (اے لوگو اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تمہیں اور تم سے پہلے لوگوں کو پیدا کیا تا کہ تم متقی بنو۔ جس نے تمہارے لئے زمین کو بچھونا بنایا) تو واضح کیا کہ ان ذوات (یعنی موجودات) کا نفس اللہ کے وجود کی نشانی ہے بغیر ان سابق الذکر دونوں مقامات کے علم کے تو یہاں بطورِ توبیخ ان کے نفوس کی خالق کی طرف حاجت کو آشکار کیا بغیر اسکے کہ کسی کلی مقدمہ کی ضرورت ہو! قرآن کے کلامی طریقہ کی مفارقت کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی عبدیت کا حکم دیا ہے جو کہ نفوس کا کمال، ان کی صلاح، غایت اور نہایت ہے مجرد اس کے اقرار پر اقتصار نہیں کیا جیسا کہ کلامی طریقہ کی غایت ہے تو انہوں نے نہ وسائل میں موافقت کی اور نہ مقاصد میں، قرآنی وسیلہ جیسا کہ ہم نے ذکر کیا فطری طریقہ ہے جو عینِ مقصود تک پہنچا دیتا ہے جبکہ کلامی طریقہ قیاسی اور (فہم سے) بعید ہے جو نہ نوعِ مقصود تک پہنچا تا ہے اور نہ اس کے عین تک

جہاں تک **مقاصدِ قرآن** علم و عمل سے زیادہ آگاہ ہے، اس نے انسان کی علمی و عملی دونوں قوتوں کو جمع کیا حسی، ارادی ادراکی اور اس کے تحرک کو روبعمل لایا جب کہا: (**اُعْبُـدُوْا رَبَّـكُـمْ**) تو عبادت کیلئے معرفت لازم ہے اور اس کی طرف انابت اور اسکی محتاجگی اور یہ مقصود ہے جبکہ کلامی طریقہ صرف اقرار اور اسکے وجود کے اعتراف کا افادہ دیتا ہے اور یہ جب بغیر عبادت اور انابت کے حاصل ہو تو اپنے صاحب کیلئے وبال اور بدبختی بن جائے گا جیسے ایک حدیث میں ہے کہ روزِ قیامت شدید تر عذاب والا شخص وہ عالم ہوگا جیسے اللہ نے اسکے علم سے کوئی نفع نہ دیا جیسے ابلیس لعین ہے تو وہ اپنے رب کا معترف اور اسکے وجود کا مقر تھا لیکن اسکی بندگی نہ کی تو بدبختوں کا سرخیل بنا اور ہر اس کی اتباع کرنے والا بدبخت ہے جیسے کہا:

﴿لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكَ وَمِمَّنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ اَجْمَعِيْنَ﴾ [ص: ۸۵] (کہ میں تجھ سے اور جو ان میں سے تیری پیروی کریں گے سب سے جہنم کو بھر دوں گا) حالانکہ شیطان اللہ کا اعتراف اور اس کے وجود کا اقرار کرتا ہے مگر طاعت و عبادت سے انکار و تکبر کیا، علمی کے ساتھ عملی قوت بمنزلہ فاعل و غایت کے ہے اسی لئے کہا گیا کہ علم عمل کے بغیر بے پھل درخت کی مانند ہے اور یہاں عمل سے مراد دل کا عمل ہے جو اللہ کی طرف انابت اور اس کی خشیت کا اس میں وجود ہے حتی کہ وہ اللہ کا عابد بنے، رسل اور آسمانی کتابوں نے اسی کا حکم دیا اور اسے واجب کیا بلکہ یہ دعوت کی بنیاد، اصل اور مقصود ہے! سماعی طریقہ عملی، صوتی اور منحرف طریقہ ہے جو عملی مقصود پر موافق ہے لیکن علم کے ساتھ نہیں بلکہ مجرد صوت یا مہیج (یعنی جذبات بھڑکانے والا) شعر یا مجمل حب کے وصف کے ساتھ تو جیسے کلامی طریقہ میں ناقص علم بلا عمل ہے اسی طرح اس طریقہ میں عملِ ناقص بلا علم ہے اور نبوی طریقہ اہل سنن والجماعت کا طریقہ ہے جس میں علم و عمل دونوں ہیں تو رسل کی دعوت کا آغاز عبادت کا حکم دینا ہے، قرآن نے کہا: (**يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ**) (ابھی گزری) نبی اکرم نے فرمایا مجھے حکم دیا گیا ہے کہ لوگوں سے قتال کروں حتی کہ گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد اس کے بندے اور رسول ہیں اور یہ اس کا اقرار کرنے اور ا کیلئے اسی کی

عبادت کرنے کو متضمن ے کیونکہ الہ وہی جو معبود ہو، یہاں (الہ کی جگہ) رب کا لفظ استعمال نہیں کیونکہ اسمِ اللہ اس کی عبادت کے مقصود پر ادل ہے جس کیلئے اس نے مخلوقات کو پیدا کیا اور اسکے وہ مامور ہیں اسی طرح حضرت معاذ کو یمن روانہ کرتے وقت آپ کا کہنا کہ تم اہل کتاب کی ایک قوم کے پاس جا رہے ہو، تمہاری انہیں اولین دعوت اس امر کی گواہی ہو کہ اللہ کے سوا کوئی الہ نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں، حضرت نوحؑ نے کہا تھا:

(اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ وَاَطِيْعُوْنِ) [نوح: ۳] (کہ تم اللہ کی عبادت کرو اور اس سے ڈرو اور میری طاعت کرو) اسی طرح دیگر سب رسل نے جیسا کہ سورہ الشعراء اور اعراف وغیرہ میں ذکر ہوا، فرمایا:

(**وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ**) [النحل: **۳۶**] (اور ہم نے ہر جماعت میں پیغمبر بھیجا کہ اللہ ہی کی عبادت کرو اور بتوں سے اجتناب کرو) سب رسل سے کہا:

(**يٰاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا اِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ وَاِنَّ هٰذِهٖ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ) [المؤمنون: ۵۱۔ ۵۲]** (اے رسولو پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور نیک عمل کرو جو عمل تم کرتے ہو میں ان سے واقف ہوں۔ اور یہ تمہاری جماعت ایک ہی جماعت ہے اور میں تمہارا رب ہوں تو مجھ سے ڈرو) اور فرمایا:

(قُلْ يٰاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ) [الكافرون: ۱۔۳] (کہہ دو اے کافرو ۔ جن کو تم پوجتے ہو ان کو میں نہیں پوجتا۔ اور جس کی میں عبادت کرتا ہوں اس کی تم عبادت نہیں کرتے) سورہ فاتحہ میں کہا:

(اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ) [۴] (اے اللہ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں) اور:

(فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ) [هود: ۱۲۳] (تو اسی کی عبادت کرو اور اسی پر بھروسا رکھو) اور:

(فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا) [مريم: ۶۵] (کیا تم کوئی اس کا ہمنام جانتے ہو) اور:

(وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَآءَ) [البينة: ۵] (اور ان کو حکم تو یہی ہوا تھا کہ اخلاص کے ساتھ اللہ کی عبادت کریں، یکسو ہو کر اور نماز پڑھیں اور زکوۃ دیں اور یہی سچا دین ہے)۔

فصل في تمهيد الأوائل وتقرير الدلائل

یہ علم وایمان کی تحریر و بیان میں جیسا کہ قبل ازیں علمِ الٰہی کی اصل بارے لکھا، یہاں نبوی، ایمانی، علمی اور صلاحی منہج اور صابیٔ فلسفی اور اس سے جو کلامی اور عبادی منہج ناشیٔ ہے جو انبیاء کے سبیل وسنت کا مخالف ہے، کے مابین فرق واضح کرنا مقصود ہے انبیاء کرام نے لوگوں کو اولاً اللہ کی عبادت کی دعوت دی، دل اور زبان کے ساتھ اور اس کی عبادت اس کی معرفت اور ذکر کو متضمن ہے تو ان کے علم وعمل کی اصل اللہ کا علم اور اسکے لئے عمل ہے اور یہی فطری طریقہ ہے جیسا کہ کئی جگہ اس کی بحث کی اور بیان کیا کہ

علمِ الٰہی کی اصل فطری اور ضروری ہے اور نفوس میں علم ریاضی کی مبادیات سے بھی زیادہ راسخ ہے جیسے ہمارا یہ کہنا کہ ایک دو کا نصف ہے اور علم طبیعی (یعنی فزکس) کے مبدا سے بھی جیسے ہمارا یہ کہنا کہ ایک جسم دو جگہ نہیں موجود ہو سکتا

اس لئے کہ یہ معارف اسماء ہیں فطرت کے اکثر مظاہر اس سے معرض ہیں لیکن علمِ الٰہی کی نسبت متصور نہیں کہ فطرت اس سے اعراض اور اغماض کرے، اس کی تفصیل ایک جگہ بیان کی ہے! یہاں غرض یہ بیان کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ جب اولین وہ ذات ہے جس نے کائنات کی تخلیق کی اور آخرین وہ ذات ہے جس کی طرف کل حوادث کا مصیر ہے تو وہی جامع اصل ہے تو **اس کا علم ہر علم کی اصل** اور جامع ہے اور اس کا ذکر ہر کلام کی اصل و جامع ہے اور اس کے لئے عمل ہر عمل کی اصل و جامع ہے اور خلق کی صلاح اسی میں ہے کہ وہ اپنے رب کی معرفت و عبادت کرے، یہ اگر انہیں حاصل ہو گیا تو اسکا ماسوا یا تو نافع زائد ہے یا پھر غیر نافع زائد اور یا مضر امر، پھر اللہ کی بابت علم سے علوم کی مختلف اور متنوع انواع ظہور پذیر ہوئیں اور اس کی عبادت وقصد سے نیک مقاصد کی وجوہ نمودار ہوئیں، جب کوئی دل اس کی عبادت اور اس سے استعانت میں لگا ہوتا ہے تو گویا اس نے ایک طاقتور ذات کی پناہ لی اور ایک ہادی و رہنما کا دامن پکڑا اور مضبوط برہان کے ساتھ تمسک کیا تو اب روز بروز یا تو اس کے علم وایمان اور یقین میں اضافہ ہوتا رہے گا یا جہالت و کفر سے اس کی سلامتی یقینی رہے گی، الوہی نصوص اس امر کے ساتھ وارد ہیں کہ اللہ تعالیٰ ایمان کے ساتھ لوگوں کو ظلمات سے نور کی طرف نکالتا ہے، اللہ نے مومن کی۔ اور مومن وہ جو علماً وعملاً اپنے رب کا مقر ہے۔ حی، بصیر، سمیع، نور اور ظل کے ساتھ مثال دی ہے جبکہ کافر کی میت، اندھے، گونگے، ظلمت اور (یعنی بے سایہ جگہ) کے ساتھ، وسواس خناس بارے کہا۔ یہ وہ جو جب اللہ کا ذکر ہو تو بھاگ جائے اور جب اس سے غافل ہو تو وسواس ڈالے تو اس سے واضح ہوا کہ اللہ کا ذکر دفعِ وسواس کیلئے ہے جو ہر کفر و جہل اور فسق و ظلم کا مبدا ہے، ارشاد ہوا:

﴿اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْھِمْ سُلْطٰنٌ﴾[الحجر: ۴۲] (بے شک میرے بندوں پر تجھے کچھ قدرت نہیں)

﴿اِنَّہٗ لَیْسَ لَہٗ سُلْطٰنٌ عَلَی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَلٰی رَبِّھِمْ یَتَوَکَّلُوْنَ اِنَّمَا سُلْطٰنُہٗ عَلَی الَّذِیْنَ یَتَوَلَّوْنَ﴾[النحل: ۹۹۔ ۱۰۰] (جو مومن ہیں اور اپنے رب پر بھروسا رکھتے ہیں اُن پر اُس کا کچھ زور نہیں چلتا۔ اس کا زور اُنہی لوگوں پر چلتا ہے جو اس کی دوستی کا دم بھریں)

﴿وَ مَنْ یَّعْتَصِمْ بِاللّٰہِ فَقَدْ ھُدِیَ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ﴾[آل عمران: ۱۰۱] (اور جس نے اللہ کی مضبوط پکڑ لیا تو وہ سیدھی راہ لگ گیا) اور اس طرح کی آیات، امام احمد نے اپنے بعض اصحاب کو ایک دعا سکھلائی جس میں ہے: (یَا دَلِیْلَ الْحَیَارٰی دُلَّنِیْ عَلٰی طَرِیْقِ الصَّادِقِیْنَ وَاجْعَلْنِیْ مِنْ عِبَادِكَ الصَّالِحِیْنَ) (اے حیرت میں ڈوبے لوگوں کے رہنما مجھے سچوں کے طریق کی رہنمائی فرما اور مجھے اپنے نیک بندوں میں شامل فرما) اسی لئے ہمارے اصحاب و دیگر میں سے عام اہل سنت اس بات کے قائل ہیں کہ اللہ کو دلیل (یعنی گائیڈ اور رہنما) کہا جا سکتا ہے، ابن عقیل اور اشعری کے کثیر اصحاب نے اس سے

منع کیا کیونکہ ان کا اعتقاد ہے کہ دلیل وہ ہوتا ہے جس کے ساتھ استدلال کیا جائے اوراللہ تعالیٰ تو دال ہے (نہ کہ مستدَل بہ) ان کا یہ کہنا ان کے ہاں مستعمل عرف کے حساب سے ہے کہ وہ دال اور دلیل کے درمیان فرق کرتے ہیں، اس کا جواب دو وجوہ سے ہے، ایک: کہ دلیل دال سے معدول ہے اور یہ جس میں صفتِ دلالت مؤکد ہو تو ہر دلیل دال ہے مگر ہر دال دلیل نہیں اور یہ ان اسمائے آلات میں سے نہیں جن کے ساتھ کوئی فعل انجام پائے کیونکہ فعیل آلات کے اوزان میں سے نہیں جیسے مِفعل اور مِفعال ہیں

مستدل بہ اقوال، افعال اور اجسام کو ادلہ اس اعتبار سے کہا گیا کہ وہ ان کے ساتھ مستدِل کی رہنمائی کرتے ہیں جیسے ان کی بابت خبر دی جاتی ہے کہ یہ ہدایت، ارشاد، معرفت وعلم اور جواب وفتوی دیتے ہیں اگر چہ اس ضمن میں ان کیلئے قصد وارادہ نہیں ہوتا اور نہ حس و ادراک جیسا کہ عربی کلام وغیرہ میں مشہور ہے تو انہوں نے جو فرق وتخصیص کا ذکر کیا کلام عرب میں اس کی کوئی اصل نہیں! دوم: کہ اگر دلیل ان اسمائے آلات میں ہوتی جن کے ساتھ کوئی فعل انجام پاتا ہے تو ایک حدیثِ قدسی میں اللہ نے اپنے محبوب بندے کی بابت کہا کہ وہ: (فَبِیْ یَسْمَعُ وَبِیْ یُبْصِرُ وَبِیْ یَعْقِلُ وَبِیْ یَنْطِقُ وَبِیْ یَبْطِشُ وَبِیْ یَسْعیٰ) (یعنی میرے ساتھ ہی وہ سنتا، دیکھتا، سمجھتا اور پکڑتا اور چلتا ہے) مسلمان کہتا ہے: (اِسْتَعَنْتُ بِاللّٰهِ وَاعْتَصَمْتُ بِہٖ) (میں نے اللہ کے ساتھ استعانت کی اور اس کی حفاظت چاہی) اور جب اللہ کے ماسوا موجودات اعیان وصفات ہیں جن کے ساتھ رہنمائی لی جاتی ہے چاہے وہ زندہ ہوں یا نہیں بلکہ کئی دفعہ تو معدوم کے ساتھ بھی ایسا ہوتا ہے تو ایک حی وقیوم ذات کے ساتھ رہنمائی حاصل کرنا تو اَولی اور احریٰ ہے پھر امام احمد سے منقول سابق الذکر دعائے ماثور (یا دلیل الحیاری الخ) مقتضی ہے کہ اللہ کو دلیل کا نام دینا اس اعتبار سے ہے کہ وہ اپنے بندوں کو رہنمائی دیتا ہے نہ کہ مجرد اس وجہ سے کہ وہ مستدَل بہ ہے جیسا کہ بسا اوقات اعیان، اقوال اور افعال میں سے کسی ایسے کو مستدل بہ کیا جاتا ہے کہ جو رہنمائی وہدایت کا قاصد نہیں ہوتا

اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنی میں سے ہادی اور برہان بھی وارد ہے اسی لئے بعض کا یہ قول منقول ہے کہ (عَرَفْتُ الأشْيَاءَ بِرَبِّيْ ولَمْ اَعْرِفْ رَبِّيْ بِالأشْيَاءِ) (یعنی میں نے اشیاء کو اپنے رب کے ساتھ پہچانا ہے نہ کہ رب کو اشیاء کے ساتھ) بعض نے کہا وہ ہر شیَ پر میرا دلیل ہے اگر چہ ہر شیَ ۔ تا کہ وہ مجھے عذاب نہ دے۔ اس پر دلیل ہے، ابن عباس سے پوچھا گیا آپ نے اپنے رب کو کیسے پہچانا؟ وہ بولے جس نے اپنے **دین کی طلب قیاس کے ساتھ کی وہ ہمیشہ منہاج سے خارج، کجروی کا شکار اور التباس میں رہے گا،** میں نے اسے اسی کے ساتھ پہچانا جس کے ساتھ اس نے اپنی شناخت کرائی اور وہی اس کا وصف کیا جو اس نے اپنا خود کیا تو خبر دی کہ دل کو اللہ کی تعریف (یعنی پہچان کرانے) کے ساتھ معرفت حاصل ہوتی ہے اور یہ نورِ ایمان ہے اور وصفِ لسان کلام اللہ کے ساتھ حاصل ہے اور یہ نورِ قرآن ہے، کسی نے ایک شیخ سے کہا:

قَالُوا ائْتِنَا بِبَرَاهِيْنَ فَقُلْتُ لَهُمْ ۔۔۔ اَنّٰى يَقُوْمُ عَلَى الْبُرْهَانِ بُرْهَانُ

(لوگوں نے کہا ہمیں براہین پیش کرو میں نے ان سے کہا [وہ تو خود برہان ہے اور] برہان پر برہان کیسے قائم ہو؟)

ایک عارف باللہ شیخ نے ایک علم الکلام کے ماہر سے کہا ہمارے نزدیک یقین قلبی واردات ہیں نفوس ان کے رد کرنے سے عاجز ہیں تو اس نے جواب دیا یہ ضروری ہے، اسماعیل کورانی نے ایک متکلم شیخ سے کہا تم کہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ دلیل کے ساتھ پہچانا جاتا ہے جبکہ ہم کہتے ہیں اللہ نے ہمیں اپنا تعارف کرایا تو ہم نے اسے پہچان لیا، ان دونوں مشائخ کی کلام میں طریقہ عبادیہ کی طرف اشارہ ہے! میں نے ایک جگہ اس پر گفتگو کی ہے، تو اگر حق باری تعالی حی و قیوم اور ہر شئ کا رب اور اس کا ملیک ہے اور ہر اصل کا موصل اور ہر سبب وعلت کا مسبب ہے اور وہ دلیل، برہان اور اول واصل ہے جس سے بندہ رہنمائی پکڑتا اور پناہ کا طالب بنتا ہے اور علم کے بارے میں تمام اواخر کو اسی کی طرف لوٹاتا ہے تو یہ ہدایت کا راستہ اور طریق ہے جیسا کہ جب اعمال و حرکات کا مصدر اللہ ہے اور وہی ان کا مرجع ہے تو اپنے تمام اعمال میں اس پر توکل کرنے والا اور اس بات کا مقر کہ (لَاحَوْلَ وَلاَ قُوَّةَ اِلاَّ بِاللّٰہِ) (نہیں کوئی طاقت اور قوت مگر اللہ کے ساتھ) مؤید منصور ہوگا

تو خلاصہ بحث یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ ہادی ونصیر ہے اور وہ ہادی ونصیر کے بطور کافی ہے، ہر علم کیلئے ہدایت ضروری ہے اسی طرح ہر عمل کیلئے قوت، تو واجب ہے کہ وہ ہر ہدایت وعلم اور ہر نصرت وقوت کی اصل ہو، بندہ اسی سے رہنمائی کا طالب اور اسی سے نصرت کا خواہاں ہو بندہ جب مخلوق، مربوب، مفطور اور مصنوع ہے تو وہ اپنے علم وعمل میں اپنے خالق، فاطر، رب اور صانع کا محتاج ہے تو اس طور حق کے مطابق ترتیب اور حقیقت کے مطابق تشکیل ہوگی کیونکہ فرع کی اصل پر بناء اور اصل کی فرع پر تقدیم ہی حق امر ہے تو یہی صحیح طریق ہے جو اللہ کی فطرت وخلقت اور اس کی کتاب وسنت کے موافق ہے! مسلم میں حضرت عامر راوی ہیں کہ رسول اکرم جب قیامِ شب کیلئے اٹھتے تو کہتے: (اَللّٰھُمَّ رَبَّ جِبْرَائِیْلَ وَ مِیْکَائِیْلَ وَاِسْرَافِیْلَ فَاطِرَ السَّمٰوَاتِ وَالأَرْضِ عَالِمَ الْغَیْبِ وَالشَّھَادَةِ اَنْتَ تَحْکُمُ بَیْنَ عِبَادِكَ فِیْمَا کَانُوْا فِیْهِ یَخْتَلِفُوْنَ اِھْدِنِیْ لِمَا اخْتُلِفَ فِیْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِكَ اِنَّكَ تَھْدِیْ مَنْ تَشَاءُ إلیٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِیْمٍ) (اے اللہ، جبریل، میکائیل اور اسرافیل کے رب ارض و سماوات کے صانع، غیب وحاضر کے عالم تو ہی اپنے بندوں کے درمیان ان کے اختلافات کا فیصلہ کرے گا، اختلافات میں مجھے حق کی ہدایت دے بے شک تو جسے چاہے سیدھے راستہ کی ہدایت عطا فرماتا ہے)

اور جو **فلسفی وکلامی طریقہ ہے تو انہوں نے اپنے نفوس سے ابتدا کی تو اسے اصل باور کیا** جس سے دیگر امور مفرع کئے اور اساس جس پر (دیگر کی) بناء قائم کی، انہوں نے علم کیلئے اپنے ادراک بارے کلام کی کہ کبھی وہ حس اور کبھی عقل کے ساتھ ہوگا اور کبھی ان دونوں کے ساتھ، انہوں نے حسی اور بدیہی ونحوہا علوم کو اصل قرار دیا کہ جن کے بغیر علم حاصل نہیں ہوتا پھر زعم کیا کہ وہ اس کے ساتھ اپنے سے قریب امور کا ادراک کرتے ہیں طبیعی، حسابی اور اخلاقی امور میں سے تو یوں ان تین کو اصل بنایا جن پر وہ

عام علوم کی بناء کرتے ہیں اوراسی لئے وہ علمِ کلام کے اصول میں تمثیل بیان کرتے ہیں کہ ایک دو کا نصف ہے اورایک جسم دوجگہ موجودنہیں ہوسکتا اورضدین۔ جیسے سیاہی وسفیدی۔ باہم مجتمع نہیں ہوسکتیں تو یہ متفق علیہ دوفنون ہیں جہاں تک اخلاق مثلاًعلم، عدل، عفت اورشجاعت کو بنظرِ استحسان دیکھنا تو جمہور فلاسفہ اورمتکلمین انہیں اصول میں سے کرتے ہیں لیکن اصولِ عامہ میں سے اوران کے بعض انہیں اصول نہیں بلکہ فروع سے قرار دیتے ہیں جو دلیل کے محتاج ہوتے ہیں، یہی اکثر ان متکلمین کا قول ہے جو تاویلِ قدر میں سنت کیلئے منتصر ہیں تو جسے انہوں نے اصل اورمعارف میں سے قرار دیا جن پر باہم اتفاق کیا وہ ایک قلیل الفائدہ امر ہے اور یہ فلسفی امور ہیں، پھر جب ان مقدمات اور دلائل سے علوی امور کی طرف آگے بڑھے تو ان کیلئے دوطریقے ہیں ایک نبوات کے پیروکار متکلمین کا تو عموما ان کا مقصد عالَم کے صانع کا اثبات کرنا ہے اوران صفات کا جن کے ساتھ ان کے طریقہ کے مطابق نبوت ثابت ہو پھر جب نبوت کا اثبات کیا تو اس سے سمعیات کا اخذ کیا اور یہ کتاب،سنت، اجماع اوراس کی فروع ہیں

اور جو **فلاسفہ ہیں تو وہ عموماً طبیعی امور اوران کے لوازم بارے توسع اختیار کرتے ہیں** پھر وہ افلاک اوران کے احوال کی طرف بڑھتے ہیں پھران میں سے الٰہیات کی بخشیں کرنے والے واجب الوجود اورعقول ونفوس کی طرف پیش قدمی کرتے ہیں، ان کے بعض ابتداءً واجب الوجود کا اثبات کرتے ہیں اس جہت سے کہ وجود میں واجب کا ہونا ضروری ہے، ان طرق میں وسائل اورمقاصد کی جہت سے کثیر فساد ہے! جہاں تک مقاصد تو کثیر تعب ومشقت کے بعد ان کا حاصل خیرِ قلیل ہے تو یہ لاغر اونٹ کی مانند ہے جو ایک دشوار گزار پہاڑ کی چوٹی پر ہوتو نہ تو وہاں تک رسائی آسان ہے کہ اس کا حصول ہو اورنہ وہ فربہ ہے کہ اس کی اشتہاء ہو پھر اس وجہ سے کئی ضروری اورمحمود مقاصد کا فوات اور ضیاع ہے جن کی تفصیل میں یہاں جانا مناسب نہیں اورجو وسائل ہیں تو یہ طرق کثیر مقدمات (یعنی تمہیدات) والے ہیں اوراکثر اس راہ پر چلنے والے منزل تک پہنچنے سے قبل ہی ان کے پیچ وخم میں الجھ جاتے ہیں اورعموماً ان کے مقدمات یا تو مشتبہ ہیں جن میں نزاع واقع ہے اوریا مخفی جن کا ادراک صرف اذکیاء ہی کرسکتے ہیں اس لئے ان میں سے دو ماہرین بھی کسی دلیل کے مقدمات پر شاذ و نادر ہی متفق ہوں گے تو فلاسفہ ومتکلمین کے ماہرین میں سے ہر ماہر کا اپنا ہی طریقِ استدلال ہے جو دوسرے کے طریق سے مختلف ہے اس طور کہ ہر دو کے اتباع اورتلامذہ ایک دوسرے کے طریقہ پر قدح اورتنقید کرتے ہیں اور ہر ایک سمجھتا ہے کہ اللہ کی معرفت صرف اسی کے طریقہ سے ہوگی اگرچہ جمہور اہلِ ملت بلکہ عام سلف اس میں اس کی مخالفت کرتے ہوں

اس کی مثال یہ کہ اکثر متکلمین کا اعتقاد ہے کہ اللہ کی معرفت نہ ہوگی مگر جب حدوثِ عالم کا اثبات کریں پھر اس کے ساتھ اس کے محدَث پر استدلال کریں پھر اسکا حدوث ثابت کرنے کے ضمن میں ان کے کئی طریقے ہیں تو ان کے اکثر حدوثِ اَعراض کے ساتھ استدلال کرتے ہیں اور یہ اجسام کی صفات ہیں پھر معتزلہ کے قدریہ ہیں جو معتقد ہیں کہ صانع اورنبوت کا اثبات ممکن نہیں مگر یہ اعتقاد رکھنے کے بعد کہ بندے اپنے افعال کے خود ہی محدِث ہیں وگرنہ دلیل منتقض ہو جائے گی اور دیگر اس طرح کے اصول جن میں

جمہور مسلمانوں کی مخالفت کی، حدوثِ اجسام پر حدوثِ حرکات کے ساتھ استدلال کرنے والے ان متکلمین کے جمہور اسے ظاہر سمعیات کے مدلول علیہ کی نفی کی دلیل قرار دیتے ہیں جن میں وارد ہے کہ: اللہ آتا ہے، نازل ہوتا ہے اور اس کے نحو (جو الفاظ احادیث میں آئے) جبکہ معتزلہ وغیرہم اسے اس امر کی دلیل ٹھہراتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کیلئے کوئی صفت نہیں نہ علم، نہ قدرت، عزت، رحمت اور نہ اس سے دیگر کیونکہ یہ ان کے حسبِ زعم اَعراض ہیں جو حدوثِ موصوف پر دال ہوتے ہیں فلسفہ کے اکثر مصنفین مثلاً ابن سینا منطق سے آغاز کرتے ہیں پھر طبعی پھر ریاضی (کا سہارا لیتے ہیں) یا اسکا ذکر نہیں کرتے پھر اپنے پاس موجود الٰہیات کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں، تم علم الکلام کے اکثر مصنفین کو پاؤ گے کہ اس کے مقدمات کے ساتھ نظر وعلم اور دلیل میں بحث کا آغاز کرتے ہیں اور یہ منطق کی جنس سے ہے پھر حدوثِ عالم اور اس کے محدِث کے اثبات کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں اور بعض معلومات کی موجود اور معدوم کی طرف تقسیم کی طرف اور وہ وجود اور اس کی اقسام کو مدِنظر رکھتے ہیں جیسے فلسفی علمِ الٰہی کے آغاز میں کرتے ہیں! جہاں تک انبیاء تو ان کی اولین دعوت اس امر کی گواہی ہے کہ بجز اللہ کے کوئی الٰہ نہیں اور محمد (یا ہر عصر کا نبی) اللہ کے رسول ہیں، غزالی نے اعتراف کیا ہے کہ صوفیاء کا طریق ہی غایت ہے کیونکہ وہ دلوں کی اللہ کے ماسوا سے تطہیر کرتے ہیں اور انہیں اللہ کے ذکر سے بھر دیتے ہیں اور یہی رسول کی دعوت کا مبدا ہے لیکن وہ صوفی جس کے پاس مفصل اَثارۃ نبویۃ (یعنی نبیوں کے بیان کردہ علوم) نہ ہو وہ مجمل ایمان کے لحاظ سے ہی اس سے مستفید ہوگا بخلاف صاحبِ اثارہ نبویہ کے کہ اس کے پاس مفصل معرفت ہے، تو علم وعمل کے طرق میں تدبر کرو تا کہ تمہارے لئے اہلِ سنت وایمان کا طریقہ اہلِ بدعت ونفاق کے طریقہ سے متمیز ہو اور علم وعرفان کے طریق کا جہل ونکران کے طریق سے تفرقہ ہو۔

فصل

متکلمین، فلاسفہ اور متصوفہ کے ایک گروہ نے ممکنات اور محدثات کے واجب قدیم کے ساتھ قیام بارے بحث کی ہے اور یہ حق معنی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر شئ کا رب اور ملیک ہے لیکن اس پر وہ اس فرمانِ الٰہی سے استشہاد کرتے ہیں:

(كُلُّ شَىْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ)[القصص: ۸۸] (اُس کی ذات کے سوا ہر چیز فنا ہونے والی ہے) اور قائل ہیں کہ معنائے آیت یہ ہے کہ ہر جو ممکن ہے وہ اپنی ذات کے اعتبار سے ہالک (یعنی قابلِ زوال) ہے یا وہ عدمِ محض اور نفیِ صرف ہے! فقط اس کے رب کی جہت سے اسکا وجود ہے تو وہ اپنی ذات کے اعتبار سے ہالک لیکن اپنے رب کی وجہ سے یعنی اس کی جہت سے موجود ہے، ان کے بعض حضرات اس سے جہمیہ، اتحادیہ اور حلولیہ کے مذہب کی طرف نکل جاتے اور کہتے ہیں یہ وجہ وجودِ کائنات ہے اور (وجہ اللہ) سے مراد اس کا وجود ہے تو اسکا وجود کائنات کا وجود ہے (وحدت الوجود کا نظریہ) وہ واجب وجود اور ممکن وجود کے مابین تفرقہ نہیں کرتے جیسا کہ ابن عربی اور ابن سبعین وغیرہما کا قول ہے اور یہ لازم ہے اسی کیلئے جو اس کے وجود کو مطلق ٹھہراتا ہے وہ ایسی حقیقت کے ساتھ متمیز نہیں جو اس کے ساتھ خاص ہو، برابر ہے کہ اسے مطلق وجود بشرطِ اطلاق بنایا ہو جیسے ابن سینا اور ان جیسے

فلاسفہ کا زعم ہے یا بنا کسی شرط کے مطلق وجود قرار دیا ہو جیسے اتحادیہ کہتے ہیں اور وہ عقلی قواعد سے سالم ہیں ان میں سے جواز روئے ضرورتِ عقل معلوم ہیں جو موجب ہیں کہ وہ بشرطِ اطلاق موجود ہو اس کا وجود اذہان میں ہے نہ کہ اعیان میں جیسے حیوانِ مطلق بشرطِ اطلاق اور انسانِ مطلق بشرطِ اطلاق وغیرہ اور مطلق بنا شرط کیلئے کوئی حقیقت نہیں ماسوائے عینی اور ذہنی وجود کے، اعیانِ موجودہ میں وجودِ مطلق نہیں سوائے ان کے اعیان کے جیسا کہ اس انسان میں نہیں اور وہ انسان اس انسان کے ماوراء انسانِ مطلق ہے تو رب کا وجود اول پر ذہنی وجود ہے جبکہ ثانی پر وہی وجودِ کائنات ہے

متقدمین اور متاخرین جہمیہ کا قول ان دونوں اقوال سے خارج نہیں اور یہ درحقیقت تعطیل ہے لیکن وہ اس کا بھی اثبات کرتے ہیں تو یوں نفی و اثبات کے مابین جمع کرتے ہیں اور اس طرح بحرِ حیرت میں غوطہ زن رہتے ہیں اور اسی لئے یہ حضرات **حیرت کو منتہائے معرفت** قرار دیتے ہیں اور نبی کریم کی طرف ایک من گھڑت روایت منسوب کرتے ہیں کہ فرمایا: (اَعْلَمُكُمْ بِاللّٰهِ اَشَدُّكُمْ حَيْرَةً) (تم میں سے اللہ بارے اعلم وہ ہے جو حیرت میں سب سے زیادہ ہے) اور کہ آپ نے دعا کی اے اللہ: (زِدْنِیْ فِیْكَ تَحَیُّراً) اور اسکا التزام کرتے ہوئے نقیضین کا جمع کرتے ہیں اور یہ باطنیہ قرامطہ اور اتحادیہ کا قول ہے اور یہ فلاسفہ اور معتزلہ کے قول کیلئے لازم ہے اگرچہ ان حضرات نے اس کے التزام کی تصریح نہیں کی بخلاف باطنیہ اور اتحادیہ صوفیاء کے کہ وہ اس کے التزام کی تصریح کرتے ہیں اور اسے حلاج سے نقل کرتے ہیں، یہاں یہ مقصود ہے کہ کہا جائے: جہاں تک خالق کے وجود کی وجودِ مخلوق ہونے کی بات تو یہ باتفاقِ اہلِ ایمان صریح کفر اور نہایت باطل امور سے ہے، ہر انسان کی عقل بالبداہت اس کا انکار کرتی ہے اگرچہ اس کے قائلین زعم کریں کہ یہ غایت درجہ کی تحقیق وعرفان ہے، اس نکتہ پر ایک جگہ تفصیلی بحث کی ہے اور جہاں تک یہ کہنا کہ مخلوق کیلئے (اپنا) کوئی وجود نہیں مگر خالق سے تو یہ حق ہے پھر وہ تمام کائنات کا خالق، رب اور ملیک ہے، کوئی شئ نہیں ہوسکتی مگر اس کی قدرت، مشیت اور خلق سے، وہ ہر شئ کا خالق ہے لیکن یہاں کلام آیت کی اسکے ساتھ تفسیر میں ہے، تو معانی، حق اور باطل میں منقسم ہیں اور باطل کے ساتھ اللہ کی کلام کو مفسر نہیں کیا جاسکتا، رہا حق تو اگر یہ وہ ہے جس پر قرآن دال ہے تو اس کے ساتھ اس کی تفسیر ہوگی وگرنہ ہر صحیح معنی اس قابل نہیں ہوتا کہ لفظ کی مجرد کسی مناسبت کی وجہ سے اس کے ساتھ تفسیر ہو جیسے وہ مناسبت جو خواب اور تعبیر کے مابین ہوتی ہے اگرچہ یہ لفظ کی دلالت کی وجوہ سے خارج ہو جیسے قرامطہ اور باطنیہ کہتے ہیں کہ لفظ کی معنی پر دلالت سمعی ہے لہذا لازم ہے کہ لفظ اسی (سمعی) معنی میں مستعمل ہو اس طور کہ اس کے ساتھ وہ معنی پر دال ہو، اس ضمن میں لفظ کا اس معنی کے لئے وضعی لحاظ سے موزوں ہونا کافی نہیں کیونکہ ایسے الفاظ بے شمار ہیں، صرف اللہ ہی ان کا شمار کرسکتا ہے جو وضعاً کسی معنی کیلئے درست ہوں مگر ان معانی کے لئے وہ موضوع (اور مستعمل) نہیں (یعنی ہوسکتا اور بات ہے اور ہونا اور بات)

اور یہ ان حضرات کے نزدیک جو لفظ و معنی کے مابین مناسبت کا اعتبار کرتے ہیں جیسے اہلِ کلام و بیان کی ایک جماعت کا

قول ہے لیکن وہ جو مناسبت کا اعتبار نہیں کرتے تو ان کے نزدیک ہر لفظ جس کی وضع ہر معنی کیلئے درست ہے بالخصوص اگر معلوم ہو کہ جس معنی کیلئے وہ موضوع ہے اسی میں اس کا استعمال ہے تو مجرد کسی مناسبت کی وجہ سے دیگر کسی معنی پر محمول کرنا اللہ پر کذب ہے پھر اگر یہ معنی معلوم شریعت کے مخالف ہو تو یہی قرامطہ کا وطیرہ رہا ہے اور اگر مخالف نہیں تو یہ کثیر جہال واعظین اور متصوفہ کا حال رہا ہے جو ایسے اشاراتی (بلکہ جناتی) معانی استعمال کرتے ہیں کہ الفاظ کی ان پر دلالت نہیں ہوتی نہ نصاً اور نہ قیاساً

جہاں تک وہ اربابِ اشارات جو لفظ کے مدلول علیہ کا اثبات کرتے اور مشار الیہ معنی کو قیاس واعتبار کی جہت سے قابلِ فہم بناتے ہیں تو ان کا حال قیاس واعتبار کے عالم فقہاء کے حال کی طرح ہے اور یہ حق ہے، اگر قیاس صحیح ہو، نہ کہ فاسد اور اعتبار مستقیم نہ کہ منحرف، جب یہاں مقصود آیت کی تفسیر میں کلام ہے تو ہم کہیں گے اس کی تفسیر میں بعض سلف سے منقول ہے کہ معنی یہ ہے کہ ہر شیٔ روبہ زوال ہے مگر وہ جس کے ساتھ اس کے وجہ (یعنی رضا) کا قصد کیا گیا، یہ اس محدَث تفسیر سے احسن ہے بلکہ اس محدث کے ساتھ تو آیت کی تفسیر کرنا جائز ہی نہیں اور یہ کئی وجوہ کے ساتھ مبین ہے، بعض راجح اور بعض بطلان پر اشارت کناں ہیں

پہلی وجہ: کہ یہ نہیں کہا کہ ہر شیٔ ہالک ہے (إلا مِـنْ وَجْهِهِ) بلکہ کہا: (إلا وَجْهَهُ) تو اگر (وجهه) سے مراد اس کا وجود ہے تو یہ مقتضی ہے کہ اس کے وجود کا ہر ماسوا ہالک ہے تو اس کا مقتضا ہے کہ تمام مخلوقات ہالک ہوں جبکہ معاملہ ایسا نہیں اور یہ بھی اتحادیہ کے قول پر ہے، ان کے نزدیک کائنات میں صرف ایک وجود ہے لہذا پھر یہ کہنا کیونکر صحیح ہو کہ اس کے وجود کے سوا ہر شیٔ ہالک ہے کیونکہ ان کے مطابق کائنات میں اس کے وجود کے سوا کچھ بھی نہیں کہ ان کا اصل مذہب فی نفس الامر اللہ کے ماسوا کی نفی ہے اور یہ وجہِ ثانی کے ساتھ تام ہے

دوسری وجہ: اور وہ یہ کہ اگر کہا جائے ہالک سے مراد وہ ممکنات ہیں جن کیلئے اس کی جہت سے وجود نہیں تو معنی یہ بنے گا کہ ہر وہ شیٔ جس کا وجود اس کے نفس سے نہیں ماسوا اس کے! کہا گیا کہ موجود ومخلوق شیٔ میں ہالک کے لفظ کا استعمال اس وجہ سے ہے کہ اس کا وجود اس کے رب سے ہے نہ کہ اس کے نفس سے، یہ لغت میں معروف نہیں نہ حقیقۃً اور نہ مجازاً، قرآن نے ایک اور دوسری شیٔ کے درمیان ہلاکت کے ضمن میں تفرقہ کیا ہے چنانچہ فرمایا:

(إِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ لَيْسَ لَهُ وَلَدٌ)[النساء: ۱۷۶] (اگر کوئی ایسا مرد مر جائے جس کے اولاد نہ ہو) اور کہا:

(وَ لَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ)[البقرة: ۱۹۵] (اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو) اور کہا:

(وَهُمْ يَنْهَوْنَ عَنْهُ وَيَنْئَوْنَ عَنْهُ وَاِنْ يُّهْلِكُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ)[الأنعام: ۲۶] (وہ اس سے روکتے ہیں اور خود بھی پرے رہتے ہیں مگر اپنے آپ ہی کو ہلاک کرتے ہیں اور بے خبر ہیں) اور:

(وَقَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ)[الجاثية: ۲۴] (اور کہا کہ ہماری زندگی تو

صرف دنیا ہی کی ہے کہ مرتے اور جیتے ہیں اور ہمیں تو زمانہ مار دیتا ہے) اور:

(وَكَمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا فَجَآءَهَا بَأْسُنَا بَيَاتًا اَوْهُمْ قَآئِلُوْنَ)[الأعراف:۴] (اور کتنی ہی بستیاں ہیں کہ ہم نے تباہ کر ڈالیں جن پر ہمارا عذاب آتا تھا جب کہ وہ سو رہے تھے یا جب وہ دوپہر کو آرام کر رہے تھے) اور:

(وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قُرُوْنٍ)[طه:۱۲۸] (اور ہم ان سے کتنی ہی قوموں کو ہلاک کر چکے ہیں) اور:

(وَاِنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اِلَّا نَحْنُ مُهْلِكُوْهَا قَبْلَ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ اَوْ مُعَذِّبُوْهَا عَذَابًا شَدِيْدًا) [بنی إسرائیل: ۵۸] (اور کوئی بستی نہیں مگر قیامت کے دن سب سے پہلے ہم اُسے ہلاک کر دیں گے یا سخت عذاب سے معذب کریں گے) اور:

(وَكَانَ فِى الْمَدِيْنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُّفْسِدُوْنَ فِى الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ قَالُوْا تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ لَنُبَيِّتَنَّهٗ وَاَهْلَهٗ ثُمَّ لَنَقُوْلَنَّ لِوَلِيِّهٖ مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ اَهْلِهٖ) [النمل : **۴۸۔ ۴۹]** (اور شہر میں نو شخص تھے جو زمین میں فساد کیا کرتے تھے اور اصلاح سے کام نہیں لیتے تھے۔ کہنے لگے اللہ کی قسم کھاؤ کہ ہم رات کو اس پر اور اس کے گھر والوں پر شبخون ماریں گے پھر اس کے وارث سے کہہ دیں گے کہ ہم صالح کے گھر والوں کے موقع ہلاکت پر گئے ہی نہیں اور ہم سچ کہتے ہیں) اور:

(وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ بَعْدِ نُوْحٍ) [بنی إسرائیل: ۱۷] (اور ہم نے نوح کے بعد بہت سی اُمتوں کو ہلاک کر ڈالا) فرشتوں کا قول ذکر کیا: **(اِنَّا مُهْلِكُوْا اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ) [هود: ۳۱]** (کہ ہم اس بستی کے لوگوں کو ہلاک کر دینے والے ہیں) اور:

(اَلَمْ نُهْلِكِ الْاَوَّلِيْنَ ثُمَّ نُتْبِعُهُمُ الْاٰخِرِيْنَ) [المرسلت: ۱۶] (کیا ہم نے پہلے لوگوں کو ہلاک نہیں کر ڈالا) تو یہ آیات مقتضی ہیں کہ ہلاکت (کا مطلب) موجود شئ میں استحالت اور فساد ہے، آگے اس کی وضاحت آئے گی، یہ نہیں مراد کہ اس کا وجود اسکے نفس سے نہ ہو کہ اس میں تو تمام مخلوقات مشترک ہیں

تیسری وجہ: یہ کہ اس تقدیر پر کہا جائے: معنی یہ ہے کہ اس کا ہر ماسوا ممکن اور عدم کے قابل ہے، اس کا وجود اس کے نفس سے نہیں، لیکن یہ معنی وہ نہیں جس کا وہ قصد کرتے ہیں، ان کا مقصود دراصل یہ ہے کہ اسکے ہر ماسوا کا وجود اسی سے ہے اور دونوں معانی کے درمیان فرق واضح ہے تو کسی چیز کی بابت خبر دینا کہ وہ ممکن قابلِ عدم ہے اسکا وجود اس کے نفس سے نہیں اس خبر سے دیگر ہے کہ وہ موجود ہے اور اسکا وجود اللہ سے ہے

چوتھی وجہ: کہ کہا جائے اگر مراد یہ ہے کہ اسکا ہر ماسوا ممکن ہے اور ضمیر واجب الوجود کی طرف عائد ہے یعنی اللہ کی طرف جو خالقِ کائنات ہے تو یہ ایضاح الواضح کے باب سے ہوگا کہ یہ (پہلے ہی سے) معلوم اور بین ہے کہ ہر ماسوا جو واجب الوجود ہے وہ ممکن ہے اور ہر جو اسکی مخلوق ہے۔ اور سبھی اس کی مخلوق ہیں۔ وہ ممکن ہے

پانچویں وجہ: کہ کہا جائے کتاب وسنت میں وجہ (کے لفظ کا استعمال) اس کیلئے عبادت اور خاص اس کیلئے عمل کرنے میں مذکور ہے اور اسی کی طرف توجہ ہونے میں تو یہ اس کی الوہیت کی تقریر (یعنی اثبات) اور اسکی عبادت وطاعت کے تناظر میں ہے نہ کہ اس کی وحدانیت کے اثبات میں کہ وہ خالق اور رب ہے اور یہ معنی علتِ غائیہ اور یہی علتِ فاعلیہ ہے اور علتِ غائیہ ہی مقصود ہے جو کہ اعلی واشرف ہے، بلکہ یہ علتِ فاعلیہ کیلئے فاعلی علت ہے اسی لئے ذیل کی آیات میں یہ مقدم کی گئی:

(اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ) (فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ) (دونوں کچھ قبل گزریں)

(وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰۤى اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى وَ لَسَوْفَ يَرْضٰى)[والليل: ۱۹-۲۱] (اور نہیں اس پر کسی کا احسان جس کا وہ بدلہ اتارتا ہے۔ بلکہ اپنے رب الاعلیٰ کی رضا اصل کرنے کے لئے۔ اور وہ عنقریب خوش ہو جائے گا)

(وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّ يَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا) [الدهر: ۸-۹] (اور باوجود یکہ ان کو خود طعام کی خواہش ہے فقیروں اور یتیموں اور قیدیوں کو کھلاتے ہیں۔ کہ ہم تم کو خالص اللہ کے لئے کھلاتے ہیں نہ تم سے عوض چاہتے ہیں اور نہ شکر گزار ہونا)

(وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ)[الكهف: ۵۲] (اور جو لوگ صبح وشام اپنے رب سے دعا کرتے ہیں اُس کی ذات کے طالب ہیں اُن کو دور مت کرو) جب معاملہ یہ ہے تو اس آیت میں (وجہ) کو اسی مدلول علیہ پر محمول کرنا اولی ہے جس پر دیگر سب آیات میں محمول ہے بجائے اس معنی پر محمول کرنے کے کہ کتاب وسنت کی کسی جگہ میں ایسا نہیں ہوا بلکہ یہی واجب ہے نہ کہ وہ کیونکہ وہ اس لفظ کا ایسا استعمال ہے جو کتاب وسنت میں کہیں وارد نہیں اور جو وارد ہے وہ اس معنی کا غیر ہے

چھٹی وجہ: کہ ہلاکت سے مراد فساد (یعنی خرابی) ہے اور اس چیز سے خروج جو مقصد ومراد ہو اور یہ اس شیٔ کے مناسبِ حال ہے جو اللہ کیلئے نہ ہو تو وہ فاسد اور حقیت میں قابلِ انتفاع نہیں بلکہ وہ مقصد ومراد سے خارج ہے، ارشادِ ربانی ہے:

(وَهُمْ يَنْهَوْنَ عَنْهُ وَيَنْئَوْنَ عَنْهُ وَاِنْ يُّهْلِكُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ) (کچھ قبل گزری) تو خبر دی کہ وہ اپنے آپ کو رسول سے روک کر اور اعراض کر کے معرضِ ہلاکت میں ڈال رہے ہیں اور معلوم امر ہے کہ جس نے رسول کی اتباع سے اعراض کیا اور دوسروں کو بھی اس سے روکا۔ اور وہ کافر ہے۔ تو اس کے کفر کے سبب اس کی ہلاکت (سے مراد) اس کیلئے ناگوار عذاب کا حصول ہے اور نعیمِ مقصود سے اس کی محرومی تو فرمایا: (إِنِ امْرُؤٌ هَلَكَ الخ) (کچھ قبل گزری)۔

فصل

پھر کہا جائے گا یہ اس امر کو بھی مقتضی ہے کہ ان دونوں میں سے ہر ایک بنفسہ واجب اور مستغنی وقیوم نہیں بلکہ اپنی ذات و صفات میں اپنے غیر کا محتاج ہے جیسا کہ اپنے معمولات میں بھی ہے تو اگر ہر دو اس صفت کے حامل ہیں کہ ایک دوسرے کے اپنے

معمولات میں محتاج اوران کے ساتھ منفرد ہونے سے عاجز ہیں کہ۔جیسا کہ گزرا۔اشتراک اس کیلئے لازم ہے تو یا تو استقلال پر قدرت کے وہ قابل ہوں گے اس طور کہ وہ اس میں ممکن ہو یا ایسا ممکن نہ ہوگا اور دوسرا ممتنع ہے اس لئے کہ اگر یہ بات ممتنع ہے کہ کوئی شئ کسی ایک کیلئے مقدور وممکن ہو تو اس کا دو کے لئے مقدور وممکن ہونا ممتنع ہوگا،کسی شئ کا مقدور وممکن ہونے میں اس کا حال اس پر قادر کے تعدد اور توحد کے ساتھ مختلف نہ ہوجائے گا،تو اگر ممتنع ہے کہ وہ دو کیلئے معمول ومقدور ہو اور یہ ممکن ہے تو جائز ہے کہ وہ ایک کیلئے بھی ہو اور یہ جب امکان اور امتناع ممکن۔معمول مقدور علیہ۔میں کسی معنی کیلئے ہو کیونکہ اسکی صفاتِ ذات فی الحال مختلف نہ ہوں گی اور اسی طرح جب قادر میں معنی کیلئے ہو تو دو کے ساتھ قائم قدرت ممتنع نہیں کہ وہ ایک کے ساتھ قائم ہو بلکہ اس کا امکان بداہتِ عقل کے ساتھ معلوم ہے اور یہ بھی کہ تمام صفات چاہے قدرت ہو یا دیگر جب ان کا محل متحد ومجتمع ہوگا تو یہ ان کیلئے اکمل ہوگا بجائے اسکے کہ وہ متعدد اور متفرق ہو اسی لئے خلق میں اجتماع واشتراک بایں طور کہ ان کیلئے قوت وقدرت میں سے اس چیز کا موجب ہوگا جو تفرق وانفراد کی صورت میں انہیں حاصل نہ ہوگا اگر چہ ان میں سے ایک باقی ہو بلکہ اشخاص اور اعضاء وغیرہ متفرق اجسام میں سے ہر ایک کے ساتھ کوئی قدرت قائم ہوگی تو جب ان کا اتحاد واجتماع فرض کیا جائے تو یہ قدرت اکمل واقوی ہوگی کیونکہ اب ان کیلئے بحسبِ امکان اتحاد واجتماع حاصل ہوا جو افتراق وتعدد کے وقت نہیں تھا

اس سے واضح ہوا کہ دو کے ساتھ قائم قدرت۔اگر فرض کریں کہ وہ دو ایک شئ تھے۔اکمل ہوگی تو دو محل کے ساتھ قائم قدرت کے وہ مساوی کیونکر نہ ہوگی ؟ اور جب معلوم ہے کہ دو متباین محل جن کے ساتھ دو قدرتیں قائم ہیں اگر فرض کیا جائے کہ وہ دونوں ایک محل ہیں تو ان کے ساتھ قائم قدرت اس سے ناقص نہیں بلکہ اس میں اور اضافہ ہوگا تو اس سے معلوم ہوا کہ دو الگ الگ ذی قدرت کیلئے معمول،ممکن اور مقدور علیہ جب فرض کیا جائے کہ دونوں بعینہما ایک قادر ہیں تو وہی قدرت جو قبل ازیں انہیں حاصل تھی وہ اب بھی ہوگی،کم نہ ہوگی تو اسکا نتیجہ یہ نکلا کہ ان دونوں میں سے ہر ایک مستقل طور پر اس قدرت کا اہل ہوگا اور یہ اس میں ممکن ہے تو واضح ہوا کہ ایک مفعول پر دو مشترک بارے ممکن ہے کہ دونوں میں سے ہر ایک جداگانہ حیثیت میں بھی اس پر قادر ہو بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ دونوں اس پر قادر ایک شئ ہوجائیں،اس سے واضح ہوا کہ دونوں میں سے ہر ایک پہلے کی نسبت اکمل ہوسکتا ہے اور کہ یہ بصفتِ دیگر ہو جب دونوں بارے ممکن ہو کہ اس کی ذات وصفات متغیر ہوجائیں اور معلوم امر ہے کہ یہ ناممکن ہے کہ کوئی اکیلا اپنے آپ کا اِکمال کرے اور اپنے نفس کی تغییر کرے کہ تقدیر یہ ہے کہ وہ اپنے سے جدا مفعول کے ساتھ منفرد ہونے سے عاجز ہے تو اس کا اپنے نفس کی تکمیل وتغییر سے عاجز ہونا اولی ہے اور جب یہ ممکن ہے کہ متغیر وکامل ہو اور یہ بنفسہ اس کے لئے ممکن نہیں تو وہ بذاتِ خود واجب الوجود نہیں ہوسکتا بلکہ وہ ممکن اور غیر کی طرف محتاج ہوگا اور تقدیر یہ ہے کہ بنفسہ واجب الوجود اس سے دیگر ہے جو بنفسہ واجب الوجود نہیں تو وہ واجب وممکن ہوگا اور یہ تناقض ہے ! کیونکہ جو بنفسہ واجب الوجود ہو اس کا نفس اپنی ذات اور صفات کی حقیقت میں

کافی ہوگا، وہ اپنی ذات وصفات سے متعلق کسی شئ میں اپنے غیر کامحتاج نہ ہوگا کہ یہ سب اس کی ذات کے مسمیٰ میں داخل ہے بلکہ واجب ہے کہ وہ اپنے افعال ومعمولات میں سے کسی چیز میں اپنے غیر کامحتاج نہ ہو کیونکہ اس کے افعال جو اسی کے ساتھ قائم ہیں اس کی ذات کے مسمی میں داخل ہیں اور بعض معمولات میں اپنے غیر کامحتاج ہونا اپنے فعل اور اپنے ساتھ قائم صفت میں اس کے محتاج ہونے کو موجب ہوگا کیونکہ اس کا مفعول اس سے صادر ہوا، تو اگر اس کی ذات کامل مستغنی ہے تب وہ اپنے فعل میں غیر کی محتاج نہ ہوگی تو کسی بھی طور غیر کامحتاج ہونا اس کے عدم استغناء اور غیر کی طرف محتاج ہونے کی دلیل ہے اور ایسا ہونا اس کے بنفسہ واجب الوجود ہونے کے پیشِ نظر مناقض امکان ہے

اور اس لئے جب **وجوب الوجود رب العالمین کے خصائص میں سے ہے** اسی طرح استغناء بھی تو استقلال بالفعل بھی رب العالمین کے خصائص سے ہوا، اسی طرح فعل اور مفعول میں کسی شریک سے منزہ ہونا بھی ! تو مخلوقات میں سے کوئی ایسا نہیں جو مفعولات میں سے کسی شئ کے ساتھ مستقل ہو اور نہ ان میں کوئی ایسا ہے جو تن تنہا علتِ قائمہ ہو اور نہ ایسا جو مفعولات میں سے کسی شئ میں شریک سے مستغنی ہو بلکہ اس عالمِ وجود کے اسباب میں کوئی شئ ایسی نہیں جو کسی اور سبب کی مشارکت کے بغیر ہو، تو ہر ایک مقتضیہ سببیہ علت ہے اگر چہ علت کے نام کا اطلاق ہوا اور دونوں میں سے ہر ایک دوسرے کیلئے شرط ہوگا جیسا کہ عالم میں کوئی سبب نہیں مگر اس کے لئے کوئی فعل مانع ہوتا ہے تو مخلوق میں سے ہر جو علت یا سبب کہلاتا ہے یا قادر، فاعل یا مدبر تو اس کیلئے ایسا شریک ہے جو اس کے لئے شرط کی مانند ہے اور معارض ہے جو اس کیلئے مانع اور نقیض ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

(وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ)[الذاریات: ۴۹] (اور ہر چیز کی ہم نے دو قسمیں بنائیں) زوج سے مراد نظیر و مماثل اور ضدِ مخالف اور وہ ندّ ہے تو ہر ایک مخلوق کیلئے شریک اور ند ہے اکیلا اللہ تعالیٰ وہ ذات ہے جس کیلئے نہ کوئی شریک ہے اور نہ ند بلکہ جو وہ چاہتا ہے وہ ہوتا ہے اور جو نہیں چاہتا وہ نہیں ہوتا لہذا اسکا کوئی غیر مستحق نہیں کہ خالق یا مطلق رب کہلائے کیونکہ یہ استقلال اور مفعول مصنوع کے ساتھ انفراد کو مقتضی ہے اور یہ صرف اللہ ہی کا خاصہ ہے اسی لئے اگر چہ بعض حضرات نے علت کے ذاتِ اوصاف ہونے بارے منازعت کی اور ادعاء کیا کہ علت نہیں ہوتی مگر ایک وصف والی تو اکثر لوگوں نے اس میں مخالفت کی اور کہا علت کا ذاتِ اوصاف ہونا جائز ہے ! مخلوق میں وصفِ واحد والی کوئی علت نہیں ہوتی یا (بالفاظِ دیگر) مخلوق میں کوئی ایسا نہیں جو تنِ تنہا علت ہو اور نہ مخلوق میں کوئی علت ہوگی مگر وہ جو دو یا دو سے زائد امور سے مرکب ہو تو مخلوق میں کوئی واحد ایسا نہیں جس سے کوئی شئ صادر ہو سکے چہ جائے کہ کہا جائے واحد سے صرف واحد ہی صادر ہوگا، بلکہ مخلوق سے کوئی شئ صادر نہ ہوگی مگر کم از کم دو سے اور یہ صرف اللہ واحد ہے جس سے تنِ تنہا (بغیر کسی اور کی شراکت کے) فعل صادر ہوتا ہے تو جس طرح وحدانیت اس کیلئے واجب اور اسکا لازمہ ہے اسی طرح مخلوق کیلئے مشارکت واجب ہے اور یہ اس کا لازمہ ہے، وحدانیت کمال کو اور وہ وحدانیت کو مستلزم ہے اور اشتراک نقص کو اور وہ اشتراک کو مستلزم ہے،

اسی طرح وحدانیت غیر سے مستغنی ہونے اور بذاتہ قیام اور بنفسہ وجوب کو مستلزم ہے اور یہ امور یعنی استغناء، وجوب بالنفس اور قیام بالنفس وحدانیت کو مستلزم ہیں اور مشارکت غیر کا محتاج ہونے، امکان بالنفس اور عدم قیام بالنفس کو مستلزم ہے، اسی طرح فقر، امکان اور عدم قیام بالنفس اشتراک کو مستلزم ہے اور یہ اور اس کے امثال توحیدِ ربوبیت کے دلائل اور اس کے اَعلام میں سے ہیں اور یہ مخلوقات مشہودات کے امکان اور ان کے فقیر و محتاج ہونے کے دلائل بھی ہیں اور کہ یہ ابتداء سے ہی ہیں تو یہ اثباتِ صانع کے دلائل ہیں کیونکہ ان میں جو افتراق، تعدُّد اور اشتراک ہے وہ ان کے محتاج اور ممکن ہونے کو موجب ہے اور ممکن و محتاج کیلئے کسی واجب اور بنفسہ غنی کا ہونا ضروری ہے وگرنہ وہ موجود نہ ہوگا، اگر محتاج ممکنات کا تسلسل فرض کیا جائے تو یہ مجموعی لحاظ سے ممکنہ ہوں گے اور ممکن کی بابت لازمی طور سے معلوم ہے کہ وہ ممکن اور محتاج ہے، اس کے بارہ میں یہ بھی معلوم ہے کہ اس کا وجود اپنے غیر کا محتاج ہے لہذا کسی ایسی ذات کا ہونا لازم ہے جو بنفسہ غنی اور واجب الوجود ہو، وگرنہ کوئی ایسا موجود ہونا ممکن نہ ہوسکتا جو ممکن و محتاج ہو

یہ معانی توحیدِ ربوبیت اور توحیدِ الوہیت پر دال ہیں اور یہ واجب و کامل توحید ہے جس کے ساتھ قرآن وارد ہوا، کئی وجوہ کے اعتبار سے جن میں سے بعض کا ہم نے ایک جگہ ذکر کیا ہے مثلاً یہ کہ متحرکات کیلئے ارادی حرکت کا ہونا ضروری ہے اور ارادہ کیلئے لنفسہ مراد کا ہونا لازم امر ہے اور یہی اللہ ہے، مخلوق کی نسبت ممتنع ہے کہ وہ لنفسہٖ مراد ہو جیسے یہ بھی کہ وہ لنفسہ فاعل ہو! جب ممتنع ہے کہ وہ فاعل لنفسہ ہوں تو یہ بھی ممتنع ہے کہ وہ مراد بنفسہ ہوں! نیز الٰہ وہی ہوگا جو لنفسہ مراد ہو، اگر وہ رب نہیں تو ممتنع ہے کہ وہ لنفسہ معبود ہو اور جو رب خالق نہیں ہوتا وہ مدعو اور مطلوب منہ اور لغیرہٖ مراد بھی نہیں ہوسکتا تو جو معبود نہ ہو اس کا مراد لنفسہ نہ ہونا بابِ اَولی سے ہوا تو الوہیت کا اثبات ربوبیت کے اثبات اور نفیِ ربوبیت نفیِ الوہیت کو موجب ہے کہ الوہیت ہی غایت ہے اور یہ بدایت کو مستلزم ہے جیسے علتِ غائیہ فاعلیت کو مستلزم ہوتی ہے، ربوبیت اور الوہیت کی وحدانیت اگرچہ فطری اور بدیہی طور سے معلوم ہے اسی طرح وہ نبوی اور الوہی شریعت کے طریق سے بھی معلوم ہے مگر یہ ضروری امثال ۔ جو کہ عقلی مقاییس ہیں ۔ کے ذریعہ بھی معلوم ہے لیکن متکلمین توحیدِ ربوبیت پر صرف عقلی مقاییس قائم کرتے ہیں اور اس میں تو بنی آدم میں سے کوئی ایک بھی اس کی اصل میں اختلاف نہیں کرسکتا البتہ اسکی بعض تفاصیل میں منازعت ضروری ہے جیسے مجوسیوں، ثنویت کے پیروکاروں، نیچریوں، قدریوں اور ان جیسے گمراہ فلاسفروں اور معتزلہ وغیرہم کا نزاع، جہاں تک توحیدِ الوہیت تو اس میں شرک عام و غالب ہے، اس کے مرتکب ایسے بھی ہیں جو مقر ہیں کہ اللہ کے سوا نہ کوئی خالق ہے اور نہ اس کا غیر رب ہے جیسے قرآن نے کہا:

﴿وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللَّهِ إِلَّا وَهُمْ مُشْرِكُونَ﴾ [یوسف: ۱۰۶] (اور ان کے اکثر اللہ پر ایمان نہیں رکھتے مگر شرک کرتے ہیں) اس کی مفصل بحث ایک جگہ کی ہے۔

فصل

فائدہ: اس سے متعلق کچھ بحث سابقہ سطور میں بھی کی ہے، اثبات ونفی اور حب وبغض کی اصل وضابطہ نفس کا وجود وعدم اور ملائمت ومناظرت کا شعور واحساس ہے، اگر تمہیں کسی شیٔ کی ذات یا اسکی صفات کے ثبوت کا شعور ہوتو اسکے (وجود کے) ثبوت کا بھی اعتقاد رکھو گے اور اسکی تصدیق کرو گے پھر اگر یہ صفاتِ کمال ہیں تو نفس اس کے اجلال واکرام کا اعتقاد رکھے گا اور اس کی تصدیق کرے گا اور اس کی تعریف وتوصیف میں رطب اللسان ہوگا لیکن اگر اس کے انتفاء کا شعور رکھو یا اس سے صفاتِ کمال کے انتفاء کا تو یہ اس کی ذات کے انتفاء کے مترادف ہے اور اگر کسی طرح کا اسے شعور نہیں، نہ ثبوت اور نہ انتفاء کا تو ان میں سے کسی کا بھی وہ اعتقاد نہ رکھے گا تو نہ تصدیق کرے گا اور نہ تکذیب البتہ بسا اوقات ممکن ہے کہ وہ انتفاء کا معتقد بنے، جب وہ ثبوت کا شعور نہ رکھے اور اگر چہ عدم کا شعور بھی نہ رکھے، عدم کے شعور اور وجود کے شعور کے درمیان واضح فرق ہے اور یہ جہل کی منزلت ہے جس کا وہ اکثر لوگ شکار ہوتے ہیں جو ہر اس کی تکذیب کر دیتے ہیں جس کی بابت ان کے پاس معلومات نہیں ہوتیں (جیسے محاورہ ہے) (مَنْ جَهِلَ شَيْئاً عَادَاهُ) (جو کسی شیٔ سے ناواقف ہوتو اس سے وہ مانوس نہ ہوگا)

پھر جب نفس انتفاء کا اعتقاد رکھے تو ثبوت کی تکذیب کرے گا اور اس کی ذم وطعن کا مرتکب بنے گا، یہ تب جب وہ اس کے وجود یا عدم کو محمود خیال کرے لیکن اگر مذموم سمجھے تو معاملہ اسکے برعکس ہوگا اسی طرح اگر ملائم (یعنی مناسبِ حال اور سازگار) کا شعور پایا تو وہ اس سے محبت کرے گا اور اس کا ارادہ کرنے والا ہوگا اور اگر منافی کا شعور جاگزین ہوا تو اس سے بغض وکراہت کرے گا اور اگر ان میں سے کوئی شعور نہیں یا ایسے امر کا شعور ہے جو نہ ملائم ہے اور نہ منافی تو اب اسے نہ محبت ہوگی اور نہ بغض، کئی دفعہ نفس کسی اس شیٔ سے بغض کرتا ہے جو منافی تو نہیں مگر ملائم بھی نہیں، اسی طرح منافی کا شعور ہونے اور ملائم کا عدم شعور ہونے کے مابین واضح فرق ہے لیکن یہ محمود ہے! تو جو انسان کیلئے ملائم نہیں اس میں اس کیلئے فائدہ بھی نہیں اور جس میں فائدہ نہیں اس کی طرف میلان عبث، مضرت اور باعثِ ضررفعل ہے اس سے اعراض ہی مناسب ہے، کسی شخص یا فعل کیلئے محبت کا جذبہ اس کی ثناء وتوصیف کا اور بغض ہونا طعن وملامت کا باعث بنتا ہے اور جو نہ محبوب ہو اور نہ مبغوض تو اس کی نسبت نہ تعریف ودعا ہوتی ہے اور نہ طعن وملامت، جب نفس الامر میں محبوب کا وجود ماٗ لوہ (یعنی معبود) تو اصلِ سعادت اس کے ساتھ ایمان ہے اور ایمان کی اصل دل کا قول ہے جو کہ تصدیق ہے اور دل کا عمل جو کہ صفتِ خضوع کے ساتھ محبت ہے کہ بندوں کی ارواح کیلئے کوئی ملائمت نہیں، اتم ہے اس کے الہ کی ملائمت سے وہ جس کے سوا کوئی الہ نہیں اور جب ایمان ان دونوں معانی کا جامع ہے اور جس نے اسے مجرد تصدیق قرار دیا وہ ناقص وقاصر ہے تو امت اس بابت تین فرقوں میں تقسیم ہوئی، تو جامعین نے اس کے ان دونوں معانی کو محقق کیا: تصدیقِ قول اور ارادی عمل، جبکہ دیگر دونوں فریق نے دو میں سے ایک کا فقدان کیا تو متکلمین کی غالب نظر وبحث ثبوت، انتفاء، وجود، عدم اور تصدیقی امور وقضایا کے بارہ میں ہے تو ان کی غایت مجرد تصدیق اور علم وخبر ہے جبکہ صوفیاء کی غالب طلب وجستجو اور عمل محبت، بغض، ارادہ، کراہت اور عملی حرکات میں مجتسد ہے تو ان کی

غایت محبت، انقیاد، عمل اورارادہ ہے ! جہاں تک اہلِ علم وایمان تو وہ دونوں امور کے مابین جامع ہیں : ایک علمی تصدیق اور دوم جبی عمل پھران کی تصدیق علم پر مبنی ہے اسی طرح ان کا عمل اور حب بھی تو وہ منحرف متکلمین اور منحرف صوفیاء دونوں کی آفت سے سالم رہے اور جو نقص اُنہیں لاحق ہوا یہ اس سے محفوظ رہے توان دونوں منحرفین کو دو مفسدتیں حاصل ہوئیں: متکلمین کو قول (یعنی خواہ مخواہ کی طولانی بحثیں) بلا عمل اور دوسرے گروہ کو عمل بلا علم اور اس کا نتیجہ کتاب وسنت کی مخالف کلامی اور عملی بدعات کی شکل میں ظاہر ہوا

دوسری مفسدت یہ کہ متکلم سے عمل اور صوفی سے قول وکلام فائت ہوا جبکہ اہلِ سنتِ باطنہ اور ظاہرہ کی کلام وعمل ظاہری اور باطنی علم کے ساتھ ہے اوران کا ہر قول وعمل ایک دوسرے کے ساتھ مقرون ہے اور یہی حقاً مسلمان اور اس صراطِ مستقیم پر گامزن ہیں جس کا ذکر سورہ فاتحہ میں ہوا، منحرف اہل کلام میں یہودیوں سے اور منحرف صوفیوں میں نصاریٰ سے مشابہت ہے اسی لئے پہلوں پر حروف اور جس پر علم واعتقاد کی دلالت ہے، غالب ہوئے اور دوسروں پر اصوات کی جانب غالب ہوئی اور وجد وحرکت کا پہلوان میں نمایاں ہوا

اس بحث کا تکملہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو حکم دیا کہ وہ اپنے رب کے راستہ کی طرف حکمت اور موعظۂ حسنہ کے ساتھ دعوت دیں اور احسن انداز واسلوب کے ساتھ ان سے بحث ومجادلہ کریں، یہ تینوں طرق عمل وعلم کے لحاظ سے نافع اور اس سے مشابہ ہیں جو اہلِ منطق دلیل، خطابت اور جدل کا ذکر کرتے ہیں باقی رہا شعر اور سَفسَطہ (یعنی فلسفیانہ موشگافیاں) اور یہ مُموَّہ (آراستہ کیا گیا) کذب تو اللہ نے ان آیات میں اس کی نفی کی ہے :

﴿هَلْ أُنَبِّئُكُمْ عَلَى مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيَاطِينُ تَنَزَّلُ عَلَى كُلِّ أَفَّاكٍ أَثِيمٍ يُلْقُونَ السَّمْعَ وَأَكْثَرُهُمْ كَاذِبُونَ﴾ **[الشعراء : ۲۲۱-۲۲۳]** (کیا میں تمہیں بتاؤں کہ شیطان کس پر اترتے ہیں۔ ہر جھوٹے گنہگار پر اترتے ہیں۔ جو سنی سنائی باتوں کو نشر کرتے ہیں اوران کے اکثر جھوٹے ہیں) آخرِ سورۃ تک، تو افاکین وہ جو مفسطین ہیں (یعنی اہلِ سفسطہ) اور شعراء کا ذکر کیا، حضرت عمر نے حضرت ابوبکر سے کہا اے خلیفۂ رسول آپ لوگوں کی تالیفِ قلبی کریں تو انہوں نے ان کی داڑھی پکڑ لی اور کہا: اے ابن خطاب کیا جاہلیت میں تم جبار (یعنی زبردست، زورآور) تھے اور اب اسلام میں خوار (کاہل اور سُست) بن گئے؟ میں کس چیز پر ان سے نرم پڑوں؟ کیا من گھڑت بات پر یا جذبات انگیز شعر پر، افک قوتِ خبریہ اور شعر عملی اور طلبی قوت میں ہوتا ہے تو وہ گمراہی اور یہ غوایت ہے لہذا اکثر اوقات دونوں سابقہ اہلِ ملت رہبان اور فاسد فقراء وغیرہم میں باہم مقترن ہوتے ہیں ! پھر جب شعر شعور سے مستفاد ہے تو یہ نفس میں تحریک پیدا کرتا ہے اگرچہ صدق نہ ہو بلکہ محبت، نفرت یا رغبت ورہبت کے جذبات ابھارتا ہے کیونکہ اس میں تخیل ہوتا ہے اور یہ شعر کا خاصہ ہے اسی لئے آیت میں شعراء کا یہ وصف کیا کہ : **﴿يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُونَ﴾[الشعراء : ۲۲۴]** (اور شاعروں کی پیروی نفس پرست کیا کرتے ہیں) غیّ شہوات کی اتباع کا نام ہے تو شعر لوگوں کی شہوات اور میلانات میں تحریک پیدا کرتا ہے اسی طرح نفرت، خوشی اور حزن بلا علم کے جذبات کا باعث ہے اور یہی غی ہے بخلاف افک کے کہ اس میں

علم میں اِضلال ہے اس طور کہ حقیقت کے بر خلاف کسی شئ بارے اعتقاد کا موجب ہوتا ہے اور جب نفس میں کبھی تصدیق و ایمان سے اور کبھی شعر سے تحریک ہوتی ہے تو شعری تحریک مذموم ہے ماسوائے اسکے جس کا اللہ نے استثناء کیا جب کہا:

﴿ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَذَكَرُوا اللَّهَ﴾ الخ [الشعراء : ۲۲۷] (مگر جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کئے اور اللہ کو بہت یاد کرتے رہے)

﴿وَمَا عَلَّمْنَاهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنبَغِي لَهُ إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ وَقُرْآنٌ مُّبِينٌ﴾ [یس : ۶۹] (اور ہم نے ان کو شعر گوئی نہیں سکھائی اور نہ وہ ان کے شایان ہے یہ تو محض نصیحت اور صاف صاف قرآن ہے) تو ذکر شعر کے بر خلاف ہے، ذکر حق و علم ہے جس سے دل نمو پاتا ہے جبکہ شعر صرف نفس میں تحریک پیدا کرتا ہے اسی لئے **منحرف صوفیاء پر قصائد و اشعار کا سننا** (جنہیں وہ عارفانہ کلام کا نام دیتے ہیں) بجائے قرآن و ذکر کے سماع اور فعل کے غالب ہوا کیونکہ وہ انہیں مجرد حب یا اس کے غیر کی حرکت عطا کرتے ہیں بغیر اس امر کے کہ یہ علم و تصدیق کے تابع ہو اسی لئے ان کے کئی اسے قرآن کے سماع پر ترجیح دیتے اور علت یہ بیان کرتے ہیں کہ قرآن حق ہے اور حق سے اسکا نزول ہوا جبکہ نفوس کی سرشت میں باطل کی حب ہے اور یہ اس لئے کہ قول صدق و حق ہے جو دل میں علم و عقیدہ راسخ کرتا ہے اور نفوسِ مبطلہ حق کو پسند نہیں کرتے اسی لئے اس کا اثر باطل ہے نفس سچھٹ جاتا ہے تو وہ فرع ہے جس کی کوئی اصل نہیں لیکن تحریک، ازعاج اور تاثیر کی جہت سے نفس میں اس کی تاثیر ہے، نہ کہ تصدیق و علم اور معرفت کی جہت سے اسی لئے وہ قول کو حدی خواں کا نام دیتے ہیں کیونکہ وہ انہیں تحریک دیتا اور ہانکتا ہے جیسے حدی خواں قافلہ کے اونٹوں کو، جہاں تک حکمت اور موعظتِ حسنہ اور جدلِ احسن تو یہ تصدیق و عمل عطا کرتے ہیں جو ایک عظیم منفعت ہے! میں نے جو یہ کہا کہ یہ تین خصال بعض وجوہ سے ان تین مقاییس سے مشابہ ہیں : برہانی، خطابی اور جدلی، بس یہی نہیں بلکہ یہ کثیر وجوہ سے ان سے افضل ہیں

پہلی وجہ: مثلاً اس وجہ سے کہ قرآن میں جو ہے وہ علم و عمل اور خبر و طلب کی دونوں انواع کا جامع ہے بخلاف ان منطقی مقاییس کے، اس کی تفصیل یہ کہ عقلی اور منطقی قیاس کا فائدہ صرف خبری قضایا میں مجرد تصدیق ہے چاہے عمل ان کے تابع ہو یا نہ ہو تو اگر قیاس کا مادہ یقینی ہے تو وہ برہان ہے چاہے مشہور ہو یا مسلّمات میں سے ہو یا ایسی نہ ہو اور وہ یقین کا فائدہ دے گی، اگر مشہور یا مقبول ہے تو اسے خطابت کہتے ہیں چاہے وہ یقینی ہو یا نہیں جبکہ یہ اعتقاد اور تصدیق کا فائدہ دے گی جو یقین اور ظن کے درمیان کا مرحلہ ہے، یہ نہیں کہ یقین کی بجائے ظن کا فائدہ دے کیونکہ اس کا مشہور ہونا اس امر کا مانع نہیں کہ وہ یقینی ہو اور یقین کیلئے مفید ہو، اس کے مابین فرق ہے جس کا مفیدِ یقین ہونا ضروری نہیں اور اس کے جو افادہِ یقین کے مانع ہے تو مشہور اس حیثیت سے کہ وہ مشہور ہے تصدیق، اِقناع اور اعتقاد کا فائدہ دے گا پھر اگر اس کا یقینی ہونا معروف ہو تو وہ یقین کا بھی فائدہ دے گا اور اگر غیر یقینی ہونا معروف ہو تو بجز ظن کے اس کا کوئی فائدہ نہیں اور اگر نفس ان دونوں میں سے کسی کا شعور نہیں رکھتا تو باقی مجرد اعتقاد رہے گا جس کیلئے یقین ثابت نہ ہو اور نہ وہ اس

سے اس کی نفی کرے گا، جہاں تک قرآن میں حکمت تو اس سے مراد حق کی معرفت، حق کہنا اور حق پر عمل کرنا ہے اس ضمن میں ایک جگہ بحث کی ہے اور موعظتِ حسنہ خبر کی تصدیق اور امر کی طاعت کی جامع ہے اسی لئے قرآن میں وعظ سے مراد ترغیب و ترہیب کے ساتھ امر و نہی ہے جیسے ارشادِ خداوندی ہے:

﴿ وَلَوْ أَنَّهُمْ فَعَلُوْا مَا يُوْعَظُوْنَ بِهٖ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَشَدَّ تَثْبِيْتًا﴾ [النساء :۶۶] (اور اگر یہ اُس نصیحت پر کار بند ہوتے جو ان کو کی جاتی ہے تو ان کے حق میں بہتر اور زیادہ ثابت قدمی کا موجب ہوتا) اور:

﴿ يَعِظُكُمُ اللّٰهُ اَنْ تَعُوْدُوْا لِمِثْلِهٖ﴾[النور:۱۷] (اللہ تمہیں نصیحت کرتا ہے کہ اگر مومن ہو تو پھر کبھی ایسا نہ کرنا) اور:

﴿ فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَ مَوْعِظَةً﴾ [البقرة: ۶۶] (تو اسے اس وقت کے لوگوں کے لئے اور جو اُن کے بعد آنے والے تھے عبرت اور پرہیز گاروں کے لئے نصیحت بنا دیا) اسی طرح جدلِ احسن ہے جو جدل برائے تصدیق اور طاعت کا جامع ہے

دوسری وجہ: اور اسے ایک اور وجہ میں بھی تقسیم کیا جا سکتا ہے کہ کہا جائے لوگوں کی تین اقسام ہیں: ایک، جو حق کا اعتراف اور اس کی اتباع کرتے ہیں، تو یہ صاحبِ حکمت ہیں، دوم، جو اعتراف تو کرتے ہیں مگر اس کے مطابق عمل نہیں کرتے، تو انہیں وعظ کیا جائے گا تا کہ عمل بھی کرنے لگیں، سوم، جو حق کا اعتراف بھی نہیں کرتے، تو ان کے ساتھ احسن طریق سے مجادلت کی جائے گی کیونکہ بحث و جدل سے لوگ غصہ اور ضد میں بھی آجاتے ہیں لہذا (بِالَّتِيْ هِيَ أَحْسَنُ) کی قرآنی قید ضروری ہے اس سے بقدرِ امکان مطلوبہ منفعت حاصل ہوگی

تیسری وجہ: کہ کلام اللہ اول تا آخر حق و یقین پر ہی مشتمل ہے، اس چیز پر نہیں جو خطابت اور جدلِ برہان سے ممیّز ہے کہ مقدمہ مشہور یا مسلّم ہو یا یقینی ہو بلکہ اللہ تعالی جب کسی مشہور یا مسلم مقدمہ پر مشتمل کوئی مثال بیان فرماتا ہے تو اس کی نسبت بھی لازم ہے کہ وہ یقینی ہو! جہاں تک مجرد متنازع تسلیم کرنے پر اکتفاء بغیر اس کے کہ مقدمہ سچا ہو یا مجرد اس کے مشہور ہونے کی وجہ سے اگر چہ سچا نہ ہو تو اس طرح کے مقدمات پر اللہ کی کلام مشتمل نہیں، وہ تو سب کلی طور پر حق و صدق ہے، وہ اصدق الکلام اور احسن الحدیث ہے تو صاحبِ حکمت سچے مقدمات کا مدعی ہوتا ہے چاہے وہ مشہور ہوں یا مسلمات، یا ایسے نہ ہوں اس وجہ سے کہ ان میں ادراکِ دِق (یعنی دقیق نکتے) اور اتباعِ حق ہے اور صاحبِ موعظت صادق مقدمات میں سے صرف مشہور کے ساتھ اپنا دعوی پیش کرتا ہے کیونکہ کبھی وہ مخفی حق کا سمجھنے والا نہیں ہوتا اور نہ مشہور بارے منازعت کرنے والا جبکہ صاحبِ جدل صادق مقدمات میں سے صرف مسلمات کے ساتھ بات کرتا ہے، چاہے وہ مشہور ہوں یا نہ ہوں کیونکہ وہ غیر مسلّم کا مُنقاد (ماننے والا) نہیں ہوتا، چاہے وہ جلی ہو یا خفی بلکہ وہ صرف مسلمات کا منقاد ہوتا ہے چاہے جلی ہوں یا خفی تو یہاں یہی ہے، معاملہ وہ نہیں جو جہال اور کفار گمراہ فلاسفر اور بعض متکلمین سمجھے کہ قرآن خطابی طریقہ سے آیا ہے اور یہ برہانیت سے تہی دامن ہے یا تہی دامن تو نہیں البتہ یہ اس میں قلیل ہے بلکہ قرآن سب کا سب

برہانی طریقہ پر مشتمل ہے اور کبھی خطابی اور کبھی جدلی اسلوب بھی اختیار کرلیتا ہے لیکن اس کی کوئی بھی بات برہانیت سے خالی نہیں!
وہ عقلی قیاسات جن پر قرآن مشتمل ہے خلق کو اللہ کی طرف بلانے میں غایت ہیں جیسے کہا:

﴿ وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ﴾ [الإسراء : ۸۹] (ہم نے اس قرآن میں لوگوں کے لئے ہر طرح کی مثال دی ہے) یہ بات سورہ سبحان کے شروع اور آخر اور سورہ کہف میں بھی کہی اور مثل (سے مراد) قیاس ہے لہٰذا قرآن صحیح طرق کے خلاصہ پر مشتمل ہے وہ سب جن کے ساتھ عقلائے متکلمین اور فلاسفروں وغیرہ کی کلام متصف ہوتی ہے جبکہ ان کی کلام میں موجود فاسد طرق سے قرآن منزہ ہے اور اس میں ایسے صحیح طرق ہیں اور اس قدر کہ کسی بشر کی کلام میں ان کا موجود ہونا محال ہے

چوتھی وجہ: یہاں ایک نکتہ ہے جسے سمجھنا ضروری ہے کیونکہ نافع ہے وہ یہ کہ قیاس میں مذکور مقدمہ اس کیلئے وصفِ ذاتی اور وصفِ اضافی ہے، وصفِ ذاتی یہ کہ (امرِ واقع کے) مطابق ہو تب وہ سچا ہے اور اگر مطابق نہ ہو تو کذب ہے، قرآن میں مذکور تمام مقدمات الحمد للہ سچے ہیں اور جو وصفِ اضافی ہے تو (مثلا) زید کو اس کا معلوم یا مظنون ہونا یا مسلمہ یا غیر مسلمہ ہونا تو یہ ایسا امر ہے جو منضبط نہیں، کئی دفعہ کسی شخص کے پاس مقدمہ یقینی ہوتا ہے جو اسے جانتا ہے مگر وہ مجہول ہوتا ہے چہ جائے کہ وہ نہ جاننے والے کے ہاں ظنی ہو تو مقدمہ کا مشہور یا غیر مشہور ہونا، یقینی یا غیر یقینی ہونا، مسلمہ ہونا یا ایسا نہ ہونا یہ سب اس کی نسبت نسبی اور اضافی امور ہیں جو انسان کے اس کی بابت شعور کے بحسب عارض ہیں اسی لئے کسی شخص کے حق میں ظنی بلکہ مجہول مقدمہ یقینی اور معلوم بن جاتا ہے اور ممنوع مسلَّم بلکہ کئی دفعہ تو مسلم ممنوع ہو جاتا ہے اور قرآن اللہ کی کلام ہے جس کے ساتھ تمام خلق کا اِنذار کیا، کسی ایک کو اس کی مخاطبت کے ساتھ خاص نہیں کیا کہ اس کے پاس یقینی یا مشہور یا مسلمہ مقدمات کے ساتھ اسے مخاطب کرے

تو اثقال کے مقدمات کے سلسلہ میں ان کی صفتِ ذاتیہ کا اعتبار کیا ہے اور یہ ان کا سچا (یعنی امرِ واقع کے مطابق) اور حق ہونا، جہاں تک تصدیق کی جہت سے تو وہ متعدد اور متنوع ہو سکتے ہیں کیونکہ کبھی زید کے لئے کوئی تصدیق کا طریق ایسا ہو سکتا ہے جو عمرو کیلئے نہ ہو مثلا کہ وہ اسے احساس اور مشاہدہ کے ساتھ جانتا ہے جبکہ یہ سماع اور تواتر کے ساتھ جیسے انبیاء کے معجزات اور مثلا اہلِ فیل کا قصہ وغیرہ تو جو اپنی جہتِ تصدیق سے لوگوں کیلئے عام ہے اس کا اس کے تصدیق کرنے کی جہت سے ذکر ممکن ہے جیسے ربوبیت کی علامات اور نشانیاں جو ہمیشہ حسی طور سے معلوم ہیں اور جو جہتِ تصدیق سے متنوع ہو تو ہر قوم کے سامنے اسی انداز و طریق سے پیش کیا جائے گا جس کے ساتھ ان کیلئے تصدیق کرنا ممکن ہو، کبھی اس کے مثل میں کہا جائے گا:

﴿ اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ﴾ [النحل : ۱۲۵] (لوگوں کو دانش اور نیک نصیحت سے اپنے رب کے راستے کی طرف بلاؤ اور بہت ہی اچھے طریق سے ان سے بحث کرو) تو معین کی مخاطبت سے کبھی وہ واقف ہوتا ہے، جس کے پاس یقینی یا مشہور یا مسلم مقدمہ ہو، اس سے واضح ہوا کہ منطقیوں کا قیاس کے مقدمات کو مستیقن، مشہور

اور مسلم میں تقسیم کرنا کسی قضیہ کیلئے وصفِ لازم نہیں بلکہ یہ تصدیق کرنے والوں کے لحاظ سے ہے اور کئی دفعہ معاملہ اس کی نسبت بدل جاتا ہے، اس سے ظاہر ہوا کہ ان کا کسی مقدمہ کی بابت قرار دینا کہ یہ یقینی یا مشہور یا مسلم نہیں، درست نہیں البتہ اس طرح کا حکم کسی معین قوم کے حق میں تو درست ہوسکتا ہے، سب کے حق میں نہیں، اسی طرح یہ قرار دینا کہ وہ یقینی یا مشہور یا مسلم ہے تو یہ بھی اس کے حق میں ہے جس کیلئے یہ وصف ثابت ہو! نیز قیاس ثابت، غیر متبدل اور حق ہے جبکہ ان کے اقوال متغیر و متبدل ہوتے رہتے ہیں، انہیں استمرار حاصل نہیں مگر ان امور میں جن کی نسبت اللہ کی سنت کا فیصلہ ہے کہ لوگ ان میں مشترک ہیں حسابیات (یعنی ریاضی کے کلیے قاعدے) اور طبیعیات میں سے اور یہ دونوں فنون دعوتِ نبوی کا مقصود نہیں اور نہ ان کی معرفت ہونا سعادت میں شرط ہے اور نہ یہ اسکے محاصل ہیں، اصل مقصود فنِ الٰہی ہے اور اس بارے قیاسی مقدمات قسمِ اول میں سے ہیں جس میں نسب و اضافت سے مقدمات کے احکام مختلف ہو جاتے ہیں تو اس بارے تدبر کرو یہ خالص، نافع اور عظیم القدر ہے، اس بحث سے وضاحت ہوگی کہ اللہ نے قرآن کی۔ اگرچہ وہ کلام اللہ ہے۔ رسول کی طرف اضافت کی اور کئی مقامات میں فرشتہ کی طرف اضافت کی جیسے کہا:

(إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ ذِي قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِينٍ) [کورت : ۱۹ـ۲۰] (بے شک یہ فرشتہ عالی مقام کی زبان کا پیغام ہے۔ جو صاحبِ قوت مالک عرش کے ہاں اونچے درجے والا) تو یہ حضرت جبریل ہیں اور یہ ان کی صفات ہیں نہ کہ محمد صلعم کی پھر کہا:

(وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُونٍ)[کورت : ۲۲] (اور تمہارا صاحب دیوانہ نہیں) یہاں ہماری طرف آپ کو مضاف کیا اور ہم پر احسان کرتے ہوئے آپ کو ہمارا صاحب قرار دیا، ایک اور جگہ بھی یہی کہا:

(وَ النَّجْمِ إِذَا هَوَىٰ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوَىٰ)[والنجم : ۱ـ۲] (تارے کی قسم جب غائب ہونے لگے۔ کہ تمہارا ساتھی نہ راستہ بھولا نہ بھٹکا ہے) اس آیت **(وَ لَقَدْ رَآهُ بِالْأُفُقِ الْمُبِينِ وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِينٍ) [کورت : ۲۳ـ ۲۴]** (بے شک انہوں نے اسے مشرقی کنارے پر دیکھا ہے۔ اور وہ غیب پر بخیل نہیں) میں نبی اکرم مراد ہیں، بعض فلسفیوں نے یہاں بھی حضرت جبریل کو مراد قرار دیا مگر یہ کلم کی ان کے مواضع سے تحریف ہے، حضرت جبرائیل کی صفات تو پہلے ذکر ہوچکی ہیں بلکہ یہ آنجناب کا وصف ہے، پھر کہا: (وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطَانٍ رَجِيمٍ) جب اسے فرشتے کا قول ثابت کیا تو اب نفی کی کہ یہ شیطان کا قول ہو جیسے سورۃ الشعراء میں کہا:

(نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ عَلَىٰ قَلْبِكَ)[۱۹۳ـ۱۹۴] (اس کو امانت دار فرشتہ لے کر اترا ہے۔ تمہارے دل پر) درجِ ذیل آیات میں اس کی اضافت بشری رسول (یعنی حضرت محمد) کی طرف کی:

(فَلَا أُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُونَ وَمَا لَا تُبْصِرُونَ إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ قَلِيلًا مَا تُؤْمِنُونَ وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ قَلِيلًا مَا تَذَكَّرُونَ تَنْزِيلٌ مِنْ رَبِّ الْعَالَمِينَ)[الحاقۃ : ۳۸ـ ۴۳] (تو ہم کو ان چیزوں کی قسم جو تم کو

نظر آتی ہیں۔ اور جو تمہیں نظر نہیں آتیں۔ کہ یہ ایک معزز رسول کا قول ہے۔اور یہ کسی شاعر کا کلام نہیں لیکن تم لوگ بہت ہی کم ایمان لاتے ہو۔ اور نہ کسی کاہن کا قول ہے لیکن تم لوگ بہت کم فکر کرتے ہو۔ پروردگار عالم کا اتارا ہوا ہے) تونفی کی کہ یہ کاہن یا شاعر کی کلام ہو اور یہ دونوں بنی نوعِ بشر سے ہیں جیسے سورہ الشعراء کے آخر میں کہا کہ شیاطین ہر افاک واثیم پر نازل ہوتے ہیں جیسے کاہن لوگ جن کی طرف وہ سمعی باتوں کا القاء کرتے ہیں اور شعراء جن کے گرد ہوس پرستوں کا جھمگٹا لگا رہتا ہے تو یہ دونوں قسم کے لوگ وہ ہیں جو بشری رسول سے مشابہ ہوسکتے ہیں اسی لئے آنجناب کی بابت کاہن یا شاعر ہونے کی نفی کی، اس سے معلوم ہوا کہ رسول کریم ہی جنسِ بشر سے مصطفیٰ ہیں، اللہ تعالیٰ فرشتوں میں سے اور بنی نوعِ بشر میں سے اپنے رسل چن لیتا ہے جیسے سورۃ التکویر میں کہا: (اَللّٰهُ يَصۡطَفِیۡ الخ) تو جب شیطان فرشتہ سے مشابہ ہوسکتا ہے تو اس بات کی نفی کی کہ یہ قرآن شیطانِ رجیم کے قول سے ہو، اس سے معلوم ہوا کہ اس آیت میں (رسول کریم) کی ترکیب فرشتوں میں سے مصطفیٰ (یعنی حضرت جبرئیل) کے لئے استعمال کی ہے

اس کی کبھی اِس اور کبھی اُس رسول کی طرف اضافت کرنے میں اس امر کی دلالت ہے کہ یہ اضافتِ اِبلاغ واداء ہے، نہ کہ کسی شیٔ کے اضافتِ اِحداث و اِنشاء جیسے بعض **بدعتی اشعریوں نے کہا کہ اس کے حروف حضرت جبرائیل یا آنجناب کی ابتداء ہیں** اور یہ ان کی جانب سے اپنے نصف قول میں مشرکینِ عرب سے مضاہات ہے جو قائل تھے کہ یہ بشر کا قول ہے اور محمد (ﷺ) نے خود اپنی مہارت اور قوتِ نفس سے قرآن کا اِنشاء کیا ہے، اسی طرح ان تفلسُف پسندوں کی مضاہات بھی جو زعم کرتے ہیں کہ معانی اور حروف آپ کی تالیف ہیں جو آپ پر فائض ہوئے (یعنی ان کا فیضان ہوا) جیسے علماء پر علم فائض ہوتا ہے تو کاہن شیاطین سے اپنا کلامی مادہ اخذ کرتا ہے اور شعراء غاوین سے اور دونوں کے الفاظ موزون ہوتے ہیں، کاہن کی کلام مسجع اور شاعر کی کلام منظوم ہے اور دونوں طرز ہائے اسلوب کیلئے معانی شیاطین کی وحی والقاء سے ظہور پذیر ہوتے ہیں، نبی اکرم کی ایک دعا کے الفاظ تھے: (اَعُوۡذُ بِاللّٰهِ السَّمِيۡعِ الۡعَلِيۡمِ مِنَ الشَّيۡطَانِ الرَّجِيۡمِ مِنۡ هَمۡزِهٖ وَنَفَثِهٖ وَنَفۡخِهٖ) اور فرمایا: (هَمۡزُهُ المؤتة وَنَفَثُهُ الشِّعۡرُ وَنَفۡخُهُ الۡكِبۡرُ) (یعنی ہمز سے مراد اس کی طرف سے لاحق پریشانی، نفث شعر اور نفخ کبر) اور فرمانِ خداوندی: (وَمَا هُوَ بِقَوۡلِ شَاعِرٍ) ان دونوں امر کی نفی کرتا ہے جیسے سورۃ الشعراء میں کہا: **وَ مَا تَنَزَّلَتۡ بِهِ الشَّيٰطِيۡنُ [الشعراء : ۲۱۰]** (اور جو شیاطین القاء کرتے ہیں) پھر ان لوگوں کی علامت بتلائی جن پر شیاطین نازل ہوتے ہیں کہ وہ افاک اور اثیم ہوتے ہیں تو ظاہرِ قرآن سے ثابت یہ ہوا کہ شاعروں میں سے ایسا شاعر جس پر شیاطین متنزل ہوتے ہیں وہی ہوگا جو افاک اور اثیم ہو (یعنی سب شعراء ایسے نہیں، خود آیت میں آگے استثناء کیا) کذاب اپنے قول وخبر میں اور اثیم فعل وامر میں

اور یہ۔ واللہ اعلم۔ اس وجہ سے کہ شعر کبھی شیطان سے ہوتا ہے اور کبھی (شاعر کے) نفس سے جیسے اگر شعر حق (بات پر مشتمل) ہو تو وہ روح القدس سے ہوگا جیسے نبی اکرم نے حضرت حسان کی بابت کہا تھا: (اَللّٰهُمَّ اَيِّدۡهُ بِرُوۡحِ الۡقُدُسِ) (اے اللہ اس کی روح القدس کے ساتھ تائید فرما) اور انہیں حکم دیا تھا کہ شعرائے مشرکین کی ہجو کا جواب دیں اور جبریل تمہارے ساتھ ہیں تو جب

شیطان کے حصہ کی نفی کی تو نفس کے حصہ کی بھی کی، اسی لئے کہا (يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُوْنَ) [الشعراء : ۲۲۴] غیّ شہوات کی اتباع ہے جو کہ ہوائے نفس ہے اسی لئے ابوحیان نے کہا جو تیرے نفس میں (کوئی صفت) ہے تو اس سے تیرے نفس نے تیرے نفس کی وجہ سے محبت کی ہے تو وہ تجھی سے ہے اس سے اسے منع کر دو (یعنی اگر وہ خلافِ شریعت ہے) اور جو تیرے نفس سے ہو اور اسے تیرا نفس برا سمجھے تو وہ شیطان سے ہے تو اس سے اللہ کی پناہ کے طالب بنو تو یہی۔ واللہ اعلم۔ اس کا سبب ہے! جہاں تک معنی کی جہت سے کاہن اور شاعر کی طرف اس کی تقسیم تو یہ۔ اللہ اعلم۔ اس لئے کہ کلام کی دو انواع ہیں: خبر اور انشاء تو کاہن غیب کی باتوں کی اس ضمن میں سچ کے ساتھ جھوٹ کو خلط کرتے ہوئے خبر دیتا ہے، وہ خالص حق اور سچ پیش نہیں کرتے اور جب شیطان کسی کے دل میں کوئی ایسی ویسی چیز القاء کرے تو اس کا اس سے نسخ نہیں کرتا بلکہ ان کے اکثر کاذب ہیں جیسے اللہ نے فرمایا اور جیسے کاہنوں بارے فرمایا کہ وہ ایک سچ کے ساتھ سو جھوٹ ملا دیتے ہیں بخلاف رسول، نبی اور محدَّث کے جیسے ابن عباس وغیرہ کی قراءت میں ہے: (فَـإِنَّ الـلّٰـهِ يَـنْسَـخُ مَـا يُـلْـقِي الشَّـيْـطَانُ) مشہور قراءت میں محدث کا لفظ موجود نہیں تو اس کی بابت ممکن ہے کہ اس پر القاء کی گئی کلام (یعنی الہامات) میں شیطان کی جانب سے کوئی ملاوٹ ہو جائے اور وہ برقرار رہے بخلاف رسول اور نبی کے تو ان پر وحی اور القاء کی گئی باتوں میں شیطان کی جانب سے گڑ بڑ ممکن تو ہے لیکن اللہ تعالیٰ اسے برقرار نہ رکھتا تھا اور اپنی کلام کو ممیّز فرما دیتا اور نکھار دیتا تھا کیونکہ وہ حق ہے اور محدَّث مامور تھا کہ اپنے پر القاء کی گئی اخبار کی رسول کی بتلائی تعلیمات کی روشنی میں پرکھ کرے (تاکہ حق و سچ اور شیطان کی گڑ بڑ کے مابین تمییز ہو) اسی لئے حضرت عمر جو (فرمانِ نبوی کے بحسب اس امت کے) محدَّث تھے کیلئے قصہ حدیبیہ میں شیطان نے القاء کیا تھا اسی طرح آنجناب کی وفات کے موقع پر (یعنی ان کے دل میں وسواس ڈالا تھا کہ آپ کی وفات واقع نہیں ہوئی) اسی طرح ان کے حکیم بن حزام کے ساتھ سورۃ الفرقان کی قراءت کے قصہ میں تو نورِ نبوت نے اس کا ازالہ کر دیا تھا، جہاں تک شاعر تو اس کا کام تحریکِ نفوس ہے (یعنی جذبات بھڑکانا) تو یہ مرغب باب خاص میں سے ہے اسی لئے وارد ہوا: (يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُوْنَ) تو ان کا ضرر اعمال میں ہے نہ کہ اعتقادات میں جبکہ کاہنوں کا ضرر اعتقادات میں بھی ہے اسی لئے انہیں (أَفَّـاكٌ أَثِيْـمٌ) [الشعراء : ۲۲۲] قرار دیا تو کہانت اور شعر کی اس خصوصیات کا عکس کثیر فلاسفروں، صوفیا، متکلمین، بزعم خود نام نہاد فقہاء، عوام الناس اور ان درویشوں کی کلام میں موجود ہے جو ملت سے خارج اور کاہنوں کی بولی بولتے اور جذبات میں آگ لگاتے ہیں، یہ جھوٹے مدعیانِ نبوت کے پیروکاروں میں سے ہیں جن کے پاس شیطانی مادہ ہوتا ہے۔

فصل

پھر ملحدہ سے مشابہ منحرفین یا تو مجردہ ہیں اور یا یہودیت یا نصرانیت کی طرف منحرف و مائل اہلِ منطق اور قیاس میں سے جو علم وکلام کے طالب ہونے کے مدعی ہیں اور اہلِ عمل و وجد میں سے جو طالبینِ معرفت وحال ہیں نیز اہلِ حروف اور اہلِ اصوات، یہ علمِ الٰہی کے ضمن میں دو طرق پر چلے ہیں، ان میں سے ہر فریق ایک طریق کا سالک بنا، کبھی یہ بھی ہوا کہ ایک مدت اس طریق پر چلے پھر اسے

چھوڑ کر دوسرے طریق کے سالک ہوئے اور کئی دفعہ دونوں کے مابین جمع کیا اوران کے اکثر نہیں جانتے کہ اللہ کی طرف لے جانے والا طریق ان دو میں سے ایک ہی ہوسکتا ہے جیسے ابن خطیب اوران کے اتباع بلکہ ابوحامد (غزالی) نے بھی ذکر کیا جب کلام اور فلسفہ کے طرق کا حصر کیا جو کہ نظر اور قیاس ہیں یا تصوف اور عبادت کے طرق کا اور یہ عمل اور وجد ہیں، دیگر نے یہ تین اصناف ذکر نہیں کیں بلکہ ابوحامد نے جب (اپنی کتاب) (المُنقِذُ مِنَ الضَّلَال والمُفصِحُ بالأحوال) میں علم کے طرق کے بیان میں اپنے اور عالم کے احوال ذکر کئے تو بیان کیا کہ ان کے راستہ کی پہلی رکاوٹ اپنے معروف شبہات کے ساتھ سفسطہ تھی، لکھتے ہیں اس داء (مرض) نے تقریبا دو ماہ انہیں بے بس اور لاچار رکھا وہ اس دوران بحکم الحال سفسطہ کے مذہب پر تھے نہ کہ بحکم المنطق والمقال حتی کہ اللہ نے اس سے چھٹکارا دیا اور صحت و اعتدال کی واپسی ہوئی اور عقلی قابلِ اعتماد ضروریات پر بھروسہ بحال ہوا اور یہ کسی دلیل کے نظم یا ترتیبِ کلام کے ساتھ نہ تھا بلکہ نور کے ساتھ جو اللہ نے ان کے دل میں ڈالا اور یہ نور اکبر معارف کی کنجی ہے، کہتے ہیں جس نے گمان کیا کہ کشف مجرد دلائل پر موقوف ہے اس نے اللہ کی وسیع رحمت کو تنگ کیا، کہتے ہیں **میرے نزدیک طالبین کے طرق چار فرقوں میں منحصر ہیں:**

(۱) متکلمین، یہ مدعی ہیں کہ وہ اہلِ رائے ونظر ہیں

(۲) باطنیہ، یہ اپنے آپ کو اصحابِ تعلم اور امامِ معصوم سے اقتباس کے ساتھ مخصص قرار دیتے ہیں

(۳) فلاسفہ، یہ مدعی ہیں کہ وہ اصحابِ منطق و برہان ہیں

(۴) صوفیہ، یہ دعوی کرتے ہیں کہ وہ خواص الحضرت، اہلِ کشف اور صاحبِ مشاہدہ ہیں، میں نے سوچا حق ان چار اصناف کے غیر میں نہیں ہوگا تو یہ حق کی راہ کے سبل کے سالکین ہیں پس اگر ان سے حق مسدود ہوا تو اس کے درک کی کوئی طمع نہ ہوگی، پھر ذکر کیا کہ کلام کا مقصود اور اسکا فائدہ جدل ومناظرہ کے ساتھ سنت کا دفاع کرنا ہے نہ کہ حقائق کی تحقیق، باطنیہ کے (تمام) نظریات باطل ہیں، فلسفہ کا بعض حق اور بعض کفر ہے اور اس میں سے جو حق ہے وہ مقصود پر پورا نہیں اترتا، پھر لکھا کہ وہ اپنی ہمت کے ساتھ صوفیہ کے طریق پر متوجہ ہوئے اور جانا کہ اس کا حصول علم وعمل کے ساتھ ہوسکتا ہے تو ان کی کتب مثلا ابوطالب مکی کی قوت القلوب، حارث محاسبی کی کتب اور جنید، شبلی اور ابویزید سے منقول متفرقات کے مطالعہ کے ساتھ ان کے علم کی تحصیل سے ابتدا کی حتی کہ آخر کار ان کے علمی مقاصد کی حقیقت پر مطلع ہوا پھر یقینی طور سے جان لیا کہ یہ حضرات اصحابِ احوال ہیں نہ کہ اصحابِ اقوال اور علم کے طریق سے جس قدر تحصیل ممکن تھی وہ کر لی ہے اور باقی وہی رہا ہے جس کے حصول کی راہ تعلم اور سماع بلکہ ذوق وسلوک ہے، کہتے ہیں جن علوم کے حصول کا بیڑا اٹھایا اور شعری وعقلی دونوں صیغوں کے بارے میں تحقیق کی اور جن راہوں پر میں چلا اس سے مجھے اللہ پر یقین اور نبوت اور روزِ آخرت پر ایمان حاصل ہوا اور ایمان کے یہ تینوں اصول اللہ کے ساتھ میرے دل میں راسخ ہوئے نہ کہ کسی معین مجرد دلیل کے ساتھ بلکہ اسباب، قرائن اور تجارب کے ساتھ جن کی تفاصیل کا حصر ممکن نہیں اور مجھے یقینِ کامل ہوا کہ تقوی کے بغیر آخرت کی سعادت کے

حصول کی کوئی گنجائش نہیں، لکھتے ہیں میں نے دس برس خلوت میں گزارے اور اس عرصہ میں میرے لئے کئی امور منکشف ہوئے جن کا شمار اور بیان ممکن نہیں، استفادہ کیلئے کچھ باتیں بیان کرتا ہوں! میں نے یقینی طور پر جان لیا ہے کہ صرف صوفیہ ہی اللہ کے راہ کے سالک ہیں اور ان کی سیرت احسن سیرت، ان کا طریق صحیح ترین راستہ اور ان کے اخلاق پسندیدہ ترین اخلاق ہیں بلکہ اگر عقلاء کی عقل، حکماء کی حکمت اور شریعت کے اسرار سے واقف علماء کا علم جمع کیا جائے تا کہ اس سے ان کے سیرت و کردار کو بدلا جا سکے اور انہیں اس سے بہتر کے ساتھ آراستہ کیا جا سکے تو اس کی کوئی گنجائش نہیں تو ان کی تمام ظاہری و باطنی حرکات وسکنات نورِ نبوت کے روزن سے مقتبس ہیں اور روئے زمین پر نورِ نبوت سے بڑھ کر روشنی دینے والا کوئی نور نہیں ہے

بالجملہ نفوس کی طہارت کے طریق بارے کہنے والے کیا کہیں گے؟ اور ان کی اولین شرط دل کی ماسوا اللہ سے کلی تطہیر ہے اور اس کی کلید دل کو اللہ کے ذکر میں مستغرق رکھنا ہے، بقول ابن تیمیہ ان کی کلام سے مستفاد ہے کہ طریق کی اساس کلمہ طیبہ ہے جیسا کہ کئی دفعہ اس کی تقریر کی ہے اور یہ اسلام کا آغاز ہے اور اسی کو انہوں نے انتہاء بتلایا ہے اور انبیاء کے طریق اور فلاسفہ و متکلمین کے طریق کے درمیان فرق واضح کیا مگر انہیں عارف اہلِ سنت وحدیث کے طریقہ کی معرفت نہ ہوسکی اسی لئے اسکا ذکر نہ کیا اور یہ خالص محمدی طریقت ہے جو سب طرق کی شاہد ہے! سہروردی حلبی مقتول نظر اور تألہ (یعنی الٰہیات) کے مرکب طریق پر چلے لیکن یہ خالص صابئ فلسفی نبوت سے وہی کچھ اخذ کرتے ہیں جو ان کے فلسفہ کے موافق ہو بخلاف ان (یعنی غزالی وسہروردی) کے اور ان جیسوں کے پھر ان میں سے کچھ ایسے ہیں جو بنیادی طور پر صرف ریاضت، تجرّد اور تصوف کا طریقہ ہی پہچانتے ہیں ان کثیر صوفیاء اور درویشوں کی طرح جو نظریہ اتحاد اور مطلق تألّہ میں واقع ہوئے جیسے عبداللہ فارسی اور عفیف تلمسانی وغیرہما، بعض نے جمع کیا جیسے صدر قونوی اور ان کے نحو، اور ان پر توہم کا علم غالب ہے تو کبھی اس چیز کا توہم کرتے ہیں جس کے لئے حقیقت ہے اور کبھی بے حقیقت چیز کا توہم کرتے ہیں جیسے بشر کی الوہیت کا توہم اور نصاریٰ کا توہم اور منتظر (یعنی امامِ منتظَر) کا توہم اور مکہ میں مقیم کسی غوث کا توہم اور یہ اعتقاد کہ اس کے واسطہ سے ارض وسماء کی تدبیرِ امر ہے اسی لئے تلمسانی نے کہا ہمارے ہاں کشف کے طریق سے وہ کچھ ثابت ہوا ہے جو صریح عقل کے منافی ہے لہذا **صاحب الخلوت تین توہمات کا شکار ہوتا ہے**:

(۱) کہ اپنے نفس میں اعتقاد کرے کہ وہ کامل ترین استعداد والا ہے

(۲) کہ اپنے شیخ بارے اعتقاد رکھے کہ وہ روئے زمین کا اکمل ترین شخص ہے

(۳) کہ توہم کرے کہ وہ بغیر کسی سبب کے اپنے مطلوب تک پہنچ سکتا ہے، اس کا غالب اعتماد وہمی قوت پر ہوگا، کبھی اوہام کئی طرح کے اعمال بجالاتے ہیں لیکن وہ باطل ہیں جیسے وہ مشائخ جو شرعی اور نبوی طرق کے سالک نہیں بنے، نہ نظری طور پر اور نہ عملی طور پر بلکہ صابئیت کے وہ سالک ہوئے، یہ حضرات کئی وجوہ سے اکثر احمدیہ، یونسیہ، حریریہ اور کثیر عدویہ جو اوحد کرمانی کے اصحاب ہیں اور ارضِ مشرق کے کثیر صوفیاء اور درویشوں سے مشابہ ہوئے، اسی لئے ان پر اباحیت غالب ہوئی تو یہ شریعت کے واجبات اور محرمات پر ایمان

نہیں رکھتے اور یہ جب مطلق الٰہیات کی بحثوں میں پڑیں (یعنی بحث برائے بحث) تو دلی معرفت نہیں رکھتے کہ کون ان کا الہ ہے اور اگران کے زندیق عارفین اس کا تحقق کرلیں تو اسے وجودِ مطلق مان لیتے ہیں، ان میں سے بعض کسی مردِ صالح کی بندگی میں لگ جاتے ہیں اوراس کی قبر کی اوراس کے نحو، تو اس ضمن میں کبھی مشرکین سے ان کی مشابہت ہوتی ہے اور کبھی نصاریٰ اور کبھی صابئین، کبھی معطلہ فرعونی اور کبھی دہریہ سے، یہ بھی صابئین میں سے ہیں لیکن فی الاصل یہ کفار ہیں، ان میں سے کئی خالص اللہ وحدہ کی عبادت کرتے ہیں لیکن اکثر یہ عبادت بغیر محمدی وقرآنی شریعت کے ہے تو یہ منحرفین ہیں یا تو کلمہ کے جزوِاول اور یا جزوِثانی سے، نظر وتجرید کے دونوں طرق عظیم نفع والے اور مفید ہیں بلکہ دونوں میں سے ہرایک واجب اور لازمی ہے، سعادت ان کے بغیر تام نہ ہوگی، قرآن سب کا سب نظر، عبرت پکڑنے اور تفکر کرنے کی دعوت دیتا ہے نیز تزکیہِ نفس، تزہد اور عبادت کا داعی ہے! قرآن نے نظری وعملی قوت اور عمل وارادہ کی صلاح کا کئی جگہ ذکر کیا ہے جیسے یہ آیت:

﴿هُوَ الَّذِیٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ﴾ [الصف : ۹] (وہی تو ہے جس نے اپنے پیغمبر کو ہدایت اور دینِ حق دے کر بھیجا تا کہ اسے اور سب دینوں پر غالب کرے خواہ مشرکوں کو بُرا ہی لگے) تو ہدایت کمالِ علم اور دینِ حق کمالِ عمل ہے جیسے کہا:

﴿اُولِی الْاَیْدِیْ وَ الْاَبْصَارِ﴾ [ص :۴۵] (جو ہاتھوں والے اور آنکھوں والے تھے) اور: **﴿آمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ [العصر:۳]** (ایمان لائے اور نیک عمل کیے) **﴿اِلَیْهِ یَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّیِّبُ وَ الْعَمَلُ الصَّالِحُ﴾[الفاطر: ۱۰]** (اسی کی طرف پاکیزہ کلمات چڑھتے ہیں اور نیک عمل) نبی اکرم اپنے خطبوں میں یہ الفاظ کہا کرتے تھے: (إِنَّ خَيْرَ الْكَلَامِ كَلَامُ اللّٰهِ وخَيْرَ الْهَدْيِ هَدْيُ مُحَمَّدٍ) لیکن نافع نظر وفکر وہ جو دلیل میں ہو، غیر دلیل میں نظر مدلول علیہ کے علم کا افادہ نہیں دیتی اور دلیل ہی مطلوب تک پہنچاتی ہے اور مقصود تک رہنمائی کرتی ہے، تام دلیل رسالت اور صنائع ہیں

اسی طرح عباداتِ تامہ مامور بہ پر بندے کا عمل کرنا اور جو رسل لائے اس پر، دونوں طرق میں خطا کا وقوع ہوا ہے اس طور کہ ہر ایک نے یا دونوں نے مجموعی لحاظ سے ابتدا میں اللہ اور اس کے رسول پر ایمان سے تجرد کا اخذ کیا ہے بلکہ اس ضمن میں مجرد اسی پر اقتصار کیا جس کا قلبی نظر نے حصول کیا اور کبھی اس پر جو ذوقِ رسل کی تعلیمات کے موافق ہوا اور بعض کے جو وہ مخالف ہوا مجرد عقلی نظر اور مجرد عقلی عبادات یا اس سے بڑھ کر ملی نظر اور ملی عبادات میں، اور نظر وعمل ہر دو میں واجب یہ ہے کہ اس میں عقلی، ملی اور شرعی تینوں قسم کی نظر موجود ہو لیکن جب تقصیر کی تو ہر دو فریق یا تو گمراہی میں یا کفرِ مرکب میں واقع ہوئے اور اس پر مستزاد جہلِ مظلم، اس کی وجہ یہ ہے کہ اہلِ نظر وقیاس کے طریقہ کا مدار اس مقدمہ پر ہے جو انسانوں کے معمول بہ ہر قیاس میں لازمی ہے اور یہ کلی اور جامع مقدمہ ہے جو مطلوب اور اس کے غیر دونوں کو متناول ہے اس معنی میں کہ اس کے غیر کو اس میں داخل ہونے سے مانع نہیں اگر چہ خارج میں اس کا وجود نہ ہو تو یہ بطورِ خاص مطلوب کو متناول نہیں ہوتا بلکہ اسکے اور اس کے غیر کے مابین قدرِ مشترک کی وجہ سے اور اس کا مطلوب اللہ تعالیٰ کی ذات ہے ہے تو یہ حضرات اس تک نہ پہنچ سکے

مگراس کے اوراس کے غیر کے مابین ایجابی اورسلبی قضایا میں سے ایک مشترک جامع کے ساتھ جبکہ یہ مشترک اصلاً بخصوصہ معروف نہیں ہوتا توانہوں نے اللہ کی معرفت حاصل نہ کی بلکہ جب اس میں قدرِمشترک کا عقیدہ رکھا تو مشرک ہوئے، انہوں نے کچھ سلبی یا ایجابی مشترکہ احکام لگائے تو یہ فی الجملہ صحیح ہیں اس لئے کہ جو عام ومشترک معنی سے منتفی ہوا وہ خاص وممیّز سے بھی ہوا مگر اس کا عکس درست نہیں تو جس کی تم کسی ذی حیات یا نبی سے نفی کرو وہ انسان اور رسول سے بھی منتفی ہوگا لیکن جس کی انسان یا رسول سے نفی کرو وہ حیوان اور نبی سے (خود بخود) منتفی نہ ہوگا لہذا آنجناب کا فرمان:(لَا نَبِـیَّ بَعْدِیْ) (میرے بعد کوئی نبی نہیں) آپ کے بعد رسول آنے کی بھی نفی کرتا ہے (البتہ اگر آپ کہتے: لا رسول بعدی تو یہ آپ کے بعد نبی آنے کی نفی نہ ہوتا) اسی طرح جو عمومی صفت کے ساتھ کسی مشترک معانی کیلئے ثابت ہو وہ خاص کیلئے ثابت ہوگا اور جو صفتِ اطلاق بھی ثابت ہوا تو اس کیلئے ضروری نہیں کہ وہ خاص کیلئے بھی ثابت ہو تو جب یہ مذکورہ حکم ہر نبی کیلئے ثابت ہوا تو اس میں رسول بھی داخل ہوا (کیونکہ ہر رسول نبی ہے مگر ہر نبی رسول نہیں) لیکن جو کوئی حکم مطلقاً نبی کیلئے ثابت ہو واجب نہیں کہ وہ رسول کیلئے بھی ثابت ہو

سلبی اور ایجابی امور کے مجموع سے کئی ایسے امور متشکل ہوتے ہیں جو صرف اسی پر صادق آتے ہیں اور اس کے غیر کو ان کے ساتھ متصف کرنا صحیح نہ ہوگا جیسے کوئی کئی مجموعی صفات کے ساتھ متصف کیا جائے تو یہ اس کے غیر میں موجود نہ ہوں گی لیکن یہ قدر اس کے غیر کے انتفاء کا اثبات کرے گی کہ وہ یہ ہو، جہاں تک اس کا عین تو یہ ان کلی قضایا کے مجموع کے ساتھ معروف نہ ہوگا تو رب تعالی کے بارہ میں عقل کیلئے قیاس کے ساتھ حاصل نہ ہوگا مگر سلب وعدم کا علم، اگر قیاس صحیح ہو اسی لئے قرآن میں جو امثال بیان کی گی ہیں۔ اور یہ عقلی مقاییس ہیں۔ وہ نفی پر دال ہیں جیسے اس آیت میں:

(ضَرَبَ لَكُمْ مَّثَلًا مِّنْ اَنْفُسِكُمْ هَلْ لَّكُمْ مِّنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ شُرَكَاءَ فِيْ مَا رَزَقْنٰكُمْ) [الروم: ۲۸] (وہ تمہارے لئے تمہارے ہی حال کی ایک مثال بیان فرماتا ہے کہ بھلا جن کے تم مالک ہو وہ اس میں جو ہم نے تمہیں عطا فرمایا) اور:

(وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ)[النحل: ۷۶] (اور اللہ ایک اور مثال بیان فرماتا ہے کہ دو آدمی ہیں) اور:

(قُلْ لَّوْ كَانَ مَعَهٗۤ اٰلِهَةٌ كَمَا يَقُوْلُوْنَ) [الإسراء: ۴۲] (کہہ دو کہ اگر اللہ کے ساتھ اور معبود ہوتے جیسا کہ یہ کہتے ہیں تو وہ ضرور مالک عرش کی طرف راستہ نکالتے)اور:

(مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ وَّمَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍۭ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ) [المؤمنون: ۹۱] (اللہ نے نہ تو کسی کو بیٹا بنایا ہے اور نہ اس کے ساتھ کوئی اور معبود ہے ایسا ہوتا تو ہر معبود اپنی اپنی مخلوقات کو لے کر چل دیتا اور ایک دوسرے پر غالب آ جاتا) اوران جیسی دیگر امثالِ قرآنی اور یہ قیاسات ہیں جن کا مضمون ملزوم کی نفی ہے اس کے لازم کے انتفاء کے سبب یا اس کا نحو، اسی لئے اہلِ فلسفہ وکلام کے اہلِ قیاس پر ربوبیت کے ضمن میں سلبی معارف غالب ہیں پھر انہوں نے اسی مقدار پر اقتصار نہیں کیا جو عقل وقیاس سے جانے بلکہ اس سے آگے بڑھے اور قیاسِ فاسد سے مشابہ اشیاء کی نفی کی مثلا نبوی

خبری صفات کی نفی بلکہ فلاسفہ اور معتزلہ نے ان صفات کی نفی کردی جن کا اہلِ اثبات کے متکلمین نے اثبات کیا تھا اور انہیں وہ عقلی صفات کا نام دیتے ہیں کیونکہ ان کا اثبات عقلی قیاس کے ساتھ کیا اور معلوم امر ہے کہ عقل از روئے قیاس نفی نہیں کرتی مگر اس قدرِ مشترک کی جو قضیہ کلیہ کا مدلول ہے، قیاس میں جو ایک لازمہ ہے مثلاً ارادہ یا رحمت یا اس علم کی نفی جو اس اسم کے مسمیات کے درمیان مشترک ہے اور مخلوقین کے درمیان قدرِ مشترک کی نفی، جسے ایسی صفات لاحق ہوں جو اللہ تعالیٰ کیلئے ثابت نہیں تو وہ مشترک معنی کی نفی کرتے ہیں جن کا صفاتِ حق اور صفاتِ خلق (دونوں) پر اطلاق ہے اور یہ تتبع کرتے ہوئے اس انتفاء کی جس کے ساتھ خلق مختص ہے تو یوں وہ معطلہ بنے (یعنی اللہ تعالیٰ کی صفات کو معطل کرنے والے) جیسے (ان کے مقابلہ میں) اہلِ تمثیل انہی صفات کا ہی اثبات کرتے ہیں جن کے ساتھ خلق مختص ہے اور یہ قدرِ مشترک کو ملحوظ رکھتے ہوئے اور یہ دونوں نقطہ نظر قیاسِ خطا ہیں تو ان **صفات بلکہ ذوات میں بھی تین اعتبارات ملحوظ ہیں**:

(۱) جن کے ساتھ رب تعالیٰ کی ذات مختص ہے اور اس کی صفات

(۲) جن کے ساتھ مخلوق مختص ہے اور اس کی صفات

(۳) مطلق اور جامع معنی، تو اول کی نفی کرنے میں جامع قیاس کا استعمال خطا ہے اسی طرح ثانی کے اثبات میں بھی اسکا استعمال غلط ہے، جہاں تک سوم کے اثبات میں اسکا استعمال تو یہ عقل کے جامع اور کلی معنی کے ادراک کا محتاج ہے اور یہی قیاس اور دلیل کی اصل ہے تو اگر عقل بذاتِ خود یا کسی اور قیاس کے واسطہ سے اس کا ثبوت نہ جانے تو قیاس مستقیم نہ ہوگا

اسی طرح وہ اپنے ثبوتی معارف میں صرف مجمل اور مطلق معانی ہی پیش کرتے ہیں مثلاً ثبوت الوجود اور وجوب الوجود یا اس کا رب یا صانع یا اول یا مبدا یا قدیم ہونا اور اس طرح کلی معانی جب ان کے ساتھ خصوصیت سے رب تعالیٰ کی معرفت حاصل نہیں ہوتی کیونکہ قیاس خصوص پر دال نہیں ہوتا تو اگر استدلال کیا جائے کہ ہر ممکن کیلئے موجب کا اور ہر محدَث کیلئے محدِث کا ہونا لازم ہے تو اس قیاس کا مدلول ایک عام معاملہ ہوگا، اس کی ایک جگہ تفصیلی بحث کی ہے، اسی طرح اہلِ ریاضت وتجرد ہیں تو ان کے ارباب جو مثلِ لا الہ الا اللہ ذکرِ بسیط کے ساتھ مشتغل ہوتے ہیں اگر وہ غلو کریں تو مجرد (اللہ اللہ) (بلکہ اب تو صرف اَن اَن کی سمجھ آتی ہے) پر اقتصار کرتے ہیں اور اعتقاد رکھتے ہیں کہ یہ افضل واکمل ہے، ان کے کثیر کا یہی فعل ہے، کئی دفعہ ان کے بعض (هُوْ هُوْ) یا (إلَّا هُو إلَّا هُو) پر اقتصار کرتے ہیں اس لئے کہ یہ مبتدَع ذکر جس کا بنفسہ کوئی فائدہ نہیں سوائے اس کے کہ یہ مطلق ہے اس میں اللہ کا ذکر ذاکر کے قصد سے ہی پایا جائے گا (ورنہ ظاہرا تو یہ ھوھو [یعنی: وہ وہ] کا تکرار ہے) کبھی اسکے ساتھ ذاکر کا یہ اعتقاد بھی منضم ہوگا کہ مراد یہ ہے کہ نہیں کوئی موجود مگر وہی جیسے ان کے بعض تصریح کرتے اور کہتے ہیں: (لَا هُوَ إلَّا هُو) یا (لَا مَوْجُوْدَ إلَّا هُو) اور یہ اتحادیہ کے نزدیک (لَا إلٰهَ إلَّا اللّٰـهُ) کہنے سے اجود ہے کیونکہ یہ ان کے قرمطی فرعونی مذہب کی حقیقت کی تصریح کرتا ہے حتی کہ ان کے بعض کا قول ہے کہ (لَا إلٰـهَ إلَّا اللّٰهُ) عابدین کا اور (اللّٰهُ اللّٰهُ) عارفین کا اور (هُو) محققین کا ذکر ہے اور خود اس نے اپنا ذکر یہ کیا: (يَا مَنْ لَا هُوَ إلَّا هُوَ)

اور جب کہا:(اَللّٰـہ اَللّٰہ) تو یہ مجرد اللہ کے ثبوت کا افادہ دیتا ہے کبھی اس کے ساتھ اسکے غیر کی الوہیت کی نفی،تو یہ ذکر کرنے والا وحدت الوجود میں واقع ہوتا ہے اور کئی دفعہ قلب کا سوا کیلئے شہود منتفی ہوگا، جب وہ مقامِ فنا میں ہوگا تو یہ قریب ہے! جہاں تک یہ اعتقاد کہ وجودِ کائنات ہی وہ ہے (یعنی لَا ھُـوَ إلاَّ ھُـوَ کا یہ معنی مرادلیا جائے) تو یہ گمراہی ہے وہ اس کے ساتھ تصفیہ کی ایک نوع شامل کرتے ہیں مثلا اکل وشرب اور دنیوی منزلت وغیرہ بدنی شہوات اور لذتوں کا ترک اور اس طرح کی زہدِ مطلق اور عبادتِ مطلقہ کی انواع تو یوں وہ مطلق تأ لہ اور رب کے ثبوت و وجود وغیرہ کی مطلق معرفت تک پہنچ جاتے ہیں عین اسی طرح جس طرح اربابِ قیاس پہنچے پھر بسا اوقات یہ معرفتِ علم وعمل کئی طبعی امور مثلا طعام اور لوگوں سے میل جول کی ملابست کے ساتھ پسِ منظر میں ہوجاتی ہے تو اسکا سبب وہی تجرد ہے تو اس کے زائل ہونے سے یہ بھی زائل ہوجاتی ہے اسی لئے ایک مقولہ ہے کہ ہر وہ حالت جو بھوک کی دین ہو وہ سیر ہونے سے ختم ہوجائے گی جیسے کئی دفعہ پہلی مطلق معرفت بھی نظری مقاییس سے دل کی غفلت کے باعث پسِ منظر میں چلی جاتی ہے اور بلا شبہ قیاس اپنے حسبِ مقتضا معرفت کے حصول کا سبب بنتا ہے اور ریاضت اور تأ لہ بھی اپنے حسبِ مقتضا لیکن کسی سبب کے ساتھ مطلق معرفت کبھی ثابت اور کبھی زائل ہوگی اور کثیر اوقات اتحاد،حلول اور اباحیت جیسے فاسد نظریات کا اور بگاڑ کا باعث بنے گی

اور یہ اس وجہ سے کہ وہ تأ لہ کو بندۂ صالح کی نسبت لازمی امور سے متجرد کردیتے ہیں تو جب وہ ان چیزوں کے محتاج ہوتے ہیں تو یہ تأ لہ سے اعراض کر جاتے ہیں تو یہ یا تو ان کے نفوس کے نزدیک آلہہ ہیں اور یا پھر یہ زندیق یا فساق ہیں،اس ذریعہ سے حاصل معرفت وہ معرفت ہے جو بندے کے حال کی اصلاح کرتی ہے اور یہ اس کیلئے واجب ہے لیکن کبھی صدقِ دل کے ساتھ قیاس یا وجد کے واسطہ سے رسالت تک رسائی ہوتی ہے تب رسالت سے وہ کچھ اسے مل جاتا ہے جس سے اسکی اصلاحِ حال ہو اور جس سے اسے معرفتِ تامہ اور علمِ نافع نصیب ہوا اور یہ شرعی ونبوی طریق ہے جس کا قبل ازیں ذکر کیا،اور کبھی اس کا حصول نہیں ہوتا تو ان کے کثیر لوگ نبوت سے استغناء میں واقع ہو جاتے ہیں اعتقاداً بھی اور حالاً بھی اس کی تعلیمات سے اعراض کرتے ہوئے،تو یوں ایمان،علم اور رسول کی لائی معرفت سے اسے محرومی ہوتی ہے جو آخر کار دنیا میں ہدایت سے اس کی دوری پر منتج ہوتی ہے اور یہ اس کی بڑی بدبختی ہوگی جیسے یہود ونصاری اور صابئین میں سے رسول کے کافروں کا حال ہوا اگرچہ رب کے وجود پر ان کا ایمان تھا،مسلمانوں میں بھی ایسے ہیں (اور تھے) جو رسول کی بابت نفاق میں مبتلا تھے جیسے ان مذکورین نے ظاہر باہر کفر کیا اور یہ نفاق قدیم وجدید میں کثیر ہے

کبھی اس کے دل میں فاسد مقاییس اور خیالات پیدا ہوں گے جن کے اقتضا سے وہ ربوبیت بارے فاسد احکام لاگو کرے گا ان فلاسفہ،متکلمین اور صوفیا کی مثل جو یہودیت یا عیسائیت یا صابئیت کی طرف منحرف ہوئے جو یا تو صفاتِ باری تعالی کی تعطیل اور ان کی تکذیب کی طرف منحرف ہوئے یا ان کی تمثیل اور تشبیہہ کی طرف یا پھر اس اعتقاد کی طرف کہ رب وجودِ مطلق ہے جو جدا نہیں اور عینِ وجود (یعنی وجودِ کائنات)ہی عینِ خالق ہے اور زمین وسماوات کے ماوراء کوئی اور شئ نہیں ہے اور یہ سب اشیاء صفات کے

مراتب ہیں اور ربوبیت والوہیت ذہنی شکوک کی مراتب ہیں ! جہاں تک فی الحقیقت تو سوائے اس کی عینِ ذات کے کچھ اور نہیں تو مجوب ایسے مراتب اور مکاشف دیکھتے ہیں جنہیں حق کی آنکھ ہی دیکھ سکتی ہے اور یہ خیال کرتے ہیں ۔ اور ان کی وجہ سے کثیر لوگ بھی ۔ کہ یہ توحید صدیقین کی توحید ہے جنہوں نے اللہ کی معرفت کی اور کہا: (اَلاَ کُلُّ شَیْءٍ مَا خَلاَ اللّٰہَ بَاطِلٌ) جیسے گمراہ متکلمین زعم کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی توحید ۔ جو کہ نفیِ صفات ہے ۔ انبیاء اور صدیقین کی توحید ہے جنہیں اللہ کی معرفت ملی، اسی لئے ان حضرات میں اکثر شرک واقع ہوا حتی کہ ایک دوسرے کو سجدہ کرتے تھے اور ان کے بعض میں حلال عقود اور مباح عبادات کی تحریم واقع ہوئی، تو اس ضمن میں دو فریق ہیں: ایک جس کے شرک کرنے اور حلال کو حرام کرنے کے باعث اللہ نے مذمت کی اور ان میں کثیر نصاری سے مشابہ پائے جاتے ہیں اور دوسرے فریق میں آصار واغلال یعنی شدت پسندی، حق کا جحود اور دلوں کی قسوت ہے کہ ان میں بکثرت یہود سے مشابہ موجود ہیں، یہ وہ جو ان میں سے غالی نہیں اور جہاں تک ان دونوں فرقوں کے غالی لوگ تو ان کے نزدیک انہیں جو معرفتِ حق ملی ہے وہ انبیاء کو ملی معرفت اور ان کے حال سے فائق تر ہے جیسے تلمسانی نے کہا قرآن تو جنت تک پہنچاتا ہے مگر ہماری کلام اللہ تک پہنچاتی ہے اور فارابی کا دعوی ہے کہ فلسفی نبی سے اکمل ہوتا ہے، نبی کا خاصہ صرف حقائق کیلئے جودتِ تخیل ہے اور دیگر اس طرح کی زندیقیت اور کفر کی انواع جن کے سبب وہ اسماعیلیوں، نصیریوں، قرامطہ اور باطنی فرقہ سے ملتحق ہوئے اور فرعون اور نمرود جیسے نبوت یا نبوت اور ربوبیت دونوں کے منکرین کی اتباع کی، اس قسم کے غالی دونوں فرقوں میں موجود ہیں اور اسکا سبب ان کے دلوں میں اصل کا معدوم ہونا ہے جو اللہ اور رسول پر ایمان ہے یہ اصل اگر ناظر، مرید اور طالب کے ہر مقام پر سنگ نہ ہو تو وہ سخت گھاٹے میں ہے انہیں اسی طرح اس کی ضرورت ہے جیسے بدن کو غذا یا حیات کو روح کی ہے تو انسان غذا اور حیات کے بغیر کبھی متقوم نہیں ہو سکتا اور نہ جان سکتا ہے اور نہ اسے جانا جا سکتا ہے

اسی طرح جو اللہ اور رسول کے ساتھ صاحبِ ایمان نہیں اس کیلئے اللہ کی معرفت کا اور اس کی طرف سے ہدایت حصول ممکن نہیں اور ہدائت کے بغیر ہر کوئی بدبخت اور معذ ّب ہے تو یہی اللہ و رسول کے کافروں کا حال ہے، اگر ایمان کا حامل ہو کر نظر و فکر کی اور استدلال کیا تو یہ دلیل و برہان کے ساتھ ہوگا اور یہ ربوبیت اور نبوت کا ثبوت ہے، ایمان کی روشنی اور اس کے ذائقہ کے ساتھ ہی انسان لذت آشنائی کا حصول ممکن بنا سکتا ہے پھر یہ نظر و ذوق ایسے شخص کو ربانی معالم کی انواع کے ماورا اور الوہی مواجید (یعنی وجدانی احساسات) پر مطلع کرے گا اور علم و وجد باہم متلازم ہیں کیونکہ انبیاء اور رسل نے بذریعہ وحی اللہ کی معرفت پائی ہے اور اس کی اس طرح سے عبادت کی جو اسکا حق تھا ان تعلیمات کے بحسب جو اللہ نے انہیں عطا کیں اور ان کے اس ضمن میں درجات اور مراتب ہیں لیکن خصوصی ربوبیت سے ایسی معرفت حاصل کی جو مجرد نظری قیاس سے نہیں مل سکتی تھی اور نہ مجرد ارادی ذوق اسے پا سکتا تھا پھر اس کی انہوں نے خبر دی اور وصف و اِخبار میں ضروری ہے کہ مسمی و موصوف کو ان اسماء اور ان کے موافق اوصاف کے ساتھ ذکر کیا جائے جن میں اشتراک ہے اور جن میں مخلوقات سے تمییز ہے ایسے جو قاطعِ شراکت ہیں کیونکہ اخبار و وصف کا مقصد مخاطبین کو تعارف دینا ہے اور وہ ان خصوصیات سے واقف نہیں جو اللہ کی ذات و

صفات کے ساتھ مختص ہیں تو اگر انہوں نے مجرد انہی کی خبر دی ہوتی تو انہیں کچھ معرفت حاصل نہ ہوسکتی بلکہ ممکن تھا انکار کر بیٹھتے تو مشترک معانی کے ساتھ وہ مخاطب کئے گئے اور اشتراک کی مفسدت بھی زائل کردی گئی اس امر کے ساتھ جو تماثل کا قاطع ہے جیسے کہا:

﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ﴾[الشوریٰ : ۱۱] (اس کی مثل کوئی چیز نہیں) اور: **﴿وَلَمْ يَكُنْ لَّهُ كُفُوًا اَحَدٌ﴾[الإخلاص : ۵]** (کوئی اس کا ہمسر نہیں) اور اس کے نحو آیات! تو مخاطبین اب دو میں سے ایک شخص کی مثل ہوئے یا تو مردِ مومن جو مطلقا کلی طور پر ان صفات کے معانی کے ساتھ ایمان لایا اور اللہ کے لئے اس وجہ پر جو اس کے لائق ہے اور اس کے ساتھ مختص ہے مخلوق اس کے ساتھ اس میں شریک نہیں، اثبات کیا تو ان حضرات کے حال میں یہ غایت ممکن ہے اور یا ایسا شخص جس کے دل کو اللہ نے اپنا نور اور خاص ہدایت ودیعت کی جس کی رو سے ان خصوصیات میں سے کچھ کا مشاہدہ کرادیا جو کہ ان اسماء وصفات کی اعیان ہیں تو اسے اس کا علم نہ تو مجرد قیاس کے ساتھ ہوا اور نہ مجرد وجد کے ساتھ بلکہ علمی شہود کے ساتھ جو رسل کے اخبار کے مطابق ہے اور اس کے صحتِ شہود پر اس کے مشاہدہ کی رسل کی باتوں سے موافقت دال ہے اور اس کیلئے ایک حصہ نبوت حاصل ہوا ہے

تو نبوت اپنے کمال کے ساتھ تو اب (یعنی نبی اکرم کے بعد) منقطع ہوچکی البتہ اس کے بعض اجزاء کا وجود منقطع نہیں ہوا اور لازم ہے کہ ایسا شخص بعض امور سے محجوب ہو، ان امور میں سے جن کے نبی شاہد ہوئے تو ان کی اسے تصدیق کرنا ہوگی کیونکہ ان میں سے بعض امور کا اسے مشاہدہ کرادیا جانا بقیہ اخبارِ مرسل کی حقانیت کی دلیل ہے اور یہی انبیاء کے ساتھ صدیقین کا حال ہے، اس کی مثال جیسے کسی کیلئے کسی شہر کی ثقافت اور تہذیب وتمدن کا کئی انواعِ صفات کے ساتھ وصف کیا گیا تو وہ آیا حتی کہ ان احوال میں سے بعض کا مشاہدہ کیا تو یہ امر باقی جن کا مشاہدہ نہیں کیا کی بابت مخبر کے صدق کی دلیل ہونا چاہئے، میں مجرد اس مشاہدہ کو صدق قرار نہیں دے رہا کیونکہ ممکن ہے مخبر کی بتلائی بعض باتیں غلط ہوں لیکن مخبر مخبر میں فرق ہوتا ہے تو رسول اللہ جیسا مخبر کون ہوا اور آپ کے احوال کے مطالعہ ومشاہدہ آپ سے امتناعِ کذب کا عقیدہ رکھنے کو واجب ٹھہراتا ہے

اگر کہو اس کیلئے **اللہ اور اس کے رسول پر ایمان کی صحت کی ابتداء کیونکر اور کہاں سے ہو** حتی کہ یہ وہ اصل ہو جائے جس پر وہ بناء کرے اور اس کے ساتھ اس کے مابعد کی طرف منتقل ہو؟ تو اہلِ قیاس ووجد نے اس اصل کی بحث وتقریر میں بہت مغز کھپائی کی ہے اور ان بحثوں کو متکلمین نے عقلیات ونظریات اور دیگر نے ذوقیات اور وجدیات کا نام دیا اور خیال ظاہر کیا ہے کہ جس کے بغیر اللہ اور اس کے رسول کی معرفت تام نہ ہوسکے تو اس کی معرفت اس پر مقدم ہے وگرنہ تسلسل لازم آئے گا، تو انہیں عقلیات کا نام دیا اور انہیں عقلی اور منطقی قیاس کے ذریعہ ہی پایا جاسکتا ہے

میں کہتا ہوں اس کا جواب کئی وجوہ سے ہے، ایک: معارضہ بالمثل سے، تو قیاسی نظر یا ذوقی ارادہ کی راہ کے سالک کیلئے کہاں سے ابتدا ہوئی (یعنی اسے پتہ چلا) کہ اس طریق پر چلنا اس کیلئے علم ومعرفت کے حصول کا موجب ہوگا؟ اس کے پاس ابتداءً مجرد مخبر کا

اِخبار ہے کہ وہ اس طریق کا سالک ہے جو وصال عطا کر دے یا خیال ہے جو اس کے دل میں جاگزین ہوا کہ اس راہ کا سالک بنے یا تو وصال کے لئے مجوز یا اس کی تلاش وطلب کرتا ہوا یا کچھ اور، یا ابتداء بلا انتہاء سلوک تھا اور یہ علم الٰہی کے ساتھ مختص نہیں بلکہ تمام علوم کی نسبت، سالک کیلئے لازم ہے کہ ایسے مصادرات سے اس کی ابتدا ہو جنہیں وہ مابعد حقائق مبرھن کرنے کیلئے سیڑھیاں بنائے، اگر یوں ہو کہ ہر علم کا طالب جب اس کی طلب کرے تو اسے حاصل بھی کرے (یعنی اسی دم) تب تو وہ اس کا طالب نہ ہوا، کسی راہ کا سالک بننے کا یہی مطلب ہے کہ وہ اسے مقصود تک پہنچا دے گا لیکن بات ہو رہی ہے اول الاوائل، دلیل الدلائل اور اصل الاصول بارے، جب ناظر کسی دلیل میں نظر کرے اور ممکن نہیں کہ فوراً ہی جان لے کہ یہ منزل تک پہنچانے والی دلیل ہے حتیٰ کہ مدلول کے ساتھ اس کا ربط اسے معلوم نہ ہو کیونکہ اگر دلیل مدلول کو مستلزم نہیں تو وہ دلیل نہ ہوگی، استلزام کا علم لازم اور ملزوم کو جان لینے پر موقوف ہے تو یہ بات معلوم نہ ہو سکے گی کہ یہ معین مدلول کی دلیل ہے حتیٰ کہ اس معین مدلول کا ثبوت معلوم ہو اور یہ بھی کہ وہ اس کیلئے ملزوم ہے اور جب یہ معلوم ہو جائے تو اس کے ساتھ اس کے ثبوت پر استدلال سے مستغنی ہوا جائے گا اور اس کا فائدہ فقط اس کی تذکیر ہوگا نہ کہ ابتدائے علم، اور یہاں اسی لئے اشتباہ واقع ہوتا ہے کیونکہ کثیر اوقات انسان کسی شئ کا ثبوت خیال کرتا ہے پھر اس کی صفات کی معرفت اور اس کی ذات کے مشاہدہ کے طریق کی طلب کرتا ہے یا حس کے ساتھ اور یا قلب کے ساتھ، تو اس طریق کا سالک بنتا ہے جسے اس مطلوب تک رسائی کا ذریعہ سمجھتا ہے کیونکہ اس نے جان لیا ہے کہ یہ طریق اس مطلوب کیلئے مستلزم ہے جس کا ثبوت وہ قبل ازیں جان چکا ہے جیسے کوئی کعبہ کے حج کی طلب کرے اور ظاہر ہے اس کے وجود کا اسے علم ہے تو اس راستہ پر چلے گا جس کی بابت جانتا ہے کہ وہ اسے کعبہ تک پہنچا دے گا اس وجہ سے کہ لوگوں نے اسے اس کے بارہ میں یہی بتلایا ہے یا کسی ایسے شخص سے رہنمائی لے گا جس کی بابت اسے علم ہو کہ وہ راستہ سے واقف ہے تو اس راہ کے ذریعہ منزل تک پہنچ جانے والوں کی اخبار کے ذریعہ یہ جان لینے کے بعد کہ وہ مقصود کا راستہ ہے اس پر بنفسہ اس کا چلنا یا ماہر دلیل کی رہنمائی میں جو ہر مقام پر اس کی رہنمائی کرے، نہیں ہوگا مگر مطلوب کے وجود کا ثبوت اور یہ بات جان لینے کے بعد کہ یہ طریق اور اس کی یہ دلیل ہے

یہی اللہ کی معرفت کے طالبین، اس کے مریدین اور اس راہ کے سالکین کا کا حال ہے انہوں نے اولاً اس کے وجود کی معرفت حاصل کی اور اس کی صفات کی معرفت کے طالب بنے یا دنیا میں ان کے دلوں کو اسکا مشاہدہ ہوا تو اب ایمان وقرآن کے ساتھ اس تک پہنچا دینے والی راہ کے سالک بنے تو ایمان آدمی کے اس طریق پر چلنے کی نظیر ہے جس کا سالکین نے اس کے لئے وصف کیا اور قرآن رسل کی تصدیق ہے ان معلومات وتعلیمات میں جن کی انہوں نے خبر دی اور یہ منزل بمنزل سنگ ہائے میل کے اتباع کی مثل ہے، اللہ تک پہنچانے والے راستہ میں ان دونوں کا وجود لازمی ہے

جہاں تک وہ شئ کہ عقل جس کا ثبوت اولاً نہیں جانتی ہاں جب اس راستہ پر چلا تو اسکا علم ہوا تو ابتداء میں تقلید اور مصادرت کی روش سے ہی چلنا ہوگا تمام مبادی علوم کی طرح تو قیاسی اور عملی طریقہ پر چلنے کے ضمن میں شروع میں تقلید ضروری ہے جب یہ علم نہ ہو

کہ یہ طریق ہے اور کہ یہ مطلوب تک پہنچا سکتا ہے یا کہ مطلوب موجود ہے تو ایمانی طریقہ اگر فرض کیا جائے کہ اسی طرح ہے تو یہ قابلِ عیب نہیں بلکہ کثیر وجوہ سے ایسا کرنا زیادہ ضروری ہے، ان میں سے بعض وجوہ کا ہم ذکر کریں گے بلکہ بجز اس کے کوئی طریق نہیں

پہلی وجہ: یا جو اس تک پہنچائے یا جو اس کے ساتھ مقترن ہو تو مطلوب پانے میں یہ قطعی شرط ہے اور جو اسکے ماسوا ہے وہ شرط نہیں بلکہ اس کے بغیر ہی حصولِ مطلوب ہوسکتا ہے اور کبھی حصولِ مطلوب کیلئے ضار ہوگا تو وہ حاصل نہ ہو سکے گا یا اس کا نقیض حاصل ہوگا اور دونوں صورتوں میں یہ بڑی بدبختی ہے تو یہ قطعی طور پر موصّل طریق ہے اور اس میں کوئی خرابی نہیں جبکہ اس کے ماسوا طرق میں کثیر خرابیاں لاحق ہوسکتی ہیں اور یہ اکیلا موصل نہ ہوگا بلکہ ایمانی طریقہ اختیار کرنا لازم امر ہے

دوسری وجہ: یہ کہ اگر کوئی قیاسی اور ریاضی طریقہ پر چلے اور وہ اسے معرفت تک پہنچا دے۔ اگر ایسا ہو۔ تو اسے علم ہوگا کہ وہ صحیح راستہ کا سالک بنا تھا اور اس کا مطلوب حاصل ہو چکا لیکن اس سے قبل اسے یہ امر معلوم نہ ہو سکے گا جبکہ ایمانی طریقہ کے سالک بننے کا فائدہ یہ ہوگا کہ وہ خرابی سے سالم رہے گا، اس کے موجب میں نظر اور اسکے مقتضا پر عمل کرے گا اور اسکی ادنی کوشش سے ہی مطلوب اللہ کی معرفت اسے حاصل ہو جائے گی اور وہ جان لے گا کہ وہ صحیح راستہ کا سالک ہے تو رسول کی اللہ کی طرف سے بتلائی ہوئی باتوں کی تصدیق اور ان کی طاعت اسے یقینی علم کا وارث کرے گی اور باور کرائے گی کہ وہ صحیح راہ پر گامزن ہے لہذا یہ روش سابق الذکر روش سے بدر جہا افضل ہے

تیسری وجہ: یہ کہ اقرار باللہ کی دو قسمیں ہیں: ایک فطری اور دوسری ایمانی، تو فطری اور یہ صانع کے وجود کا اعتراف جو فطرت میں ثابت ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں کئی مقامات پر اسکی تقریر کی اور میں نے ایک جگہ اس پر تفصیلی بحث کی ہے تو یہ محتاجِ دلیل نہیں بلکہ یہ تو ارسخ المعارف، اثبت العلوم اور اصل الاصول ہے! جہاں تک رسول کا اقرار تو ان کی لائی ہوئی تعلیمات یا ان کے حال یا ان کے معجزات وغیرہ میں ادنی تامل کے ساتھ نبوت کی بابت علم حاصل ہوسکتا ہے اور یہ ان قیاسی الوہی امور اور وجدی مطالب کے حصول سے بدر جہا قوی ہے، پھر جب وہ آپ کے احوال میں غور کرے گا تو اسے ضروری یقین حاصل ہوگا جس کا جھٹلانا اور جسے نظر انداز کرنا ممکن نہ ہوگا، اس کی ایک جگہ تفصیلی بحث کی ہے! یہاں مقصود یہ بیان کرنا ہے کہ ابتداء میں ایمان کے بغیر قیاس یا ریاضت کے طریق پر چلنا ایک مہلک لغزش ہے، جہاں تک طریقہِ ایمان کی بحث تو یہ مہتم بالشان ہے، یہ سطور اسکا حق ادا نہیں کرسکتیں

چوتھی وجہ: یہ کہ ہمارے مخاطَب ایمان سے متصف مسلمان ہیں جن کی غرض اللہ کی خاص معرفت ہے جس کے ساتھ عوام الناس سے علماء اور عارفین ممتاز ہیں تو ان کے بعض مبتدع اہلِ قیاس، فلاسفہ اور متکلمین کے طریقہ کے سالک بنتے ہیں اور بعض متفلسفہ اور متصوفہ کے اہلِ ریاضت و ارادت کے طریقہ کے، ان امور کی تفاصیل بارے رسول کی تعلیمات سے اعراض کرتے ہوئے تو یہ حضرات اکثر رسول کے صدق سے واقف ہوتے ہیں جو اپنے رب کی طرف سے احکام پہنچاتا ہے اور اسکی طرف ہدایت و دعوت دیتا ہے وہ جن کیلئے دین کا اکمال کیا اور ان پر وہ کتاب نازل کی جس میں ہر چیز کا بیان اور تبیان ہے تو اسے چھوڑ کر ان طریقوں کو کیونکر اختیار کرتے ہیں

پانچویں وجہ: کہ اکثر جو ان دونوں منحرف طریقوں کے سالک ہوئے، کے خیال میں کوئی اور طریقہ نہ تھا جیسا کہ بزعم خود ان نظریات کے فضلاء دعوی کرتے ہیں، تو وہ ایک صابی وفلسفی مادہ سے ارادی نصرانی مادہ کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں اور حسبِ ضرورت اس سے یہودی کلامی مادہ کی طرف، یہ حضرات ایک دن اصحابِ ارادت والوں کے ساتھ اور دوسرے دن اربابِ کلام کے ساتھ ہو جاتے اور ان کی بولی بولنے لگتے ہیں، انہی بھول بھلیوں میں یہ گم رہتے ہیں

ایمانی نبوی محمدی طریقہ ہی دینی، سنی اور اثری ہے مگر وہ اس تک نہیں پہنچ سکتے اور نہ ان کے نصیب میں اس کی معرفت ہے اور نہ وہ اسے مطلوب تک پہنچنے کا وسیلہ خیال کرتے ہیں کیونکہ ان کے گمان کے مطابق اس کے سالکین کا کوئی وجود نہیں یا پھر ظلماً (ضد اور عناد کی وجہ سے) اپنے نفوس کو اس سے محروم رکھا تو اس سے اپنی ضلال، غوایت اور جہل یا اپنے آپ پر ظلم کماتے ہوئے اس سے اعراض کئے ہوئے ہیں، اگر کہو خود قرآن ارض وسماء کی آیات میں نظر وتدبر کی دعوت دیتا ہے؟ میں کہوں گا فی الجملہ اس نظر وتدبر کی صحت میں کوئی ریب نہیں اور یہ جب ایسی دلیل میں ہو جو مدلول کے علم تک موصل ہو اور اگر یہ اللہ کی آیات میں ہو تو اس کے ساتھ ایمان لانے کا موجب بنے گا جو راس العبادت ہے جیسا کہ عبادت اور ارادت کی صحت میں بھی فی الجملہ شک نہیں بشرطے کہ وہ انبیاء کے منہاج پر ہو تو اللہ کی رضوان کے حصول کا ذریعہ بنے گی لیکن تمہیں چاہئے کہ آیات اور قیاس کے مابین فرق کرو جیسا کہ ایک جگہ اس کی تبیین کی ہے تو آیت نشانی ہے اور یہ بذات خود اس امر کو مستلزم ہے جس پر یہ نشانی ہے، بغیر کسی درمیانی واسطہ کے جس کے ساتھ کلی مقدمہ پر مشتمل قیاس منتظم ہو جیسے شعاع سورج کی نشانی ہے اسی طرح صحرا میں اُگے ہوئے پودے بارش کی اور دھواں آگ کی، اگرچہ یہاں فی النفس قیاس منعقد نہ ہو بلکہ عقل ان کے تلازُم سے واقف ہے تو ثبوتِ آیت سے اس کے لازم کا ثبوت معلوم ہوتا ہے اور تلازم کا علم کبھی قدرتی اور فطرتی ہوتا ہے اور کبھی نہیں

چھٹی وجہ: کہ مذکورہ دونوں طریقے صرف باطل ہی نہیں بلکہ ہر ایک کسی نوع کے حق کی طرف موصل ہیں لیکن یہ واجب حق نہیں اور اکثر اس کے ساتھ باطل کی آمیزش ہو جاتی ہے تو مجرد دونوں میں سے ہر ایک کے ساتھ ادائیگیِ واجب نہیں ہوتی اور نہ محرم کا اجتناب اور نہ یہ دونوں اس مقصود کی تحصیل کا سبب بنتے ہیں جس میں انسان کی سعادت ہے اور اس پر رسول کی بعثت کے بعد اس کی نجات ونعیم کا مدار ہے

جہاں تک **قیاسی نظری طریقہ** تو اس میں واجب کے ساتھ ممکن، محدَث کے ساتھ محدِث اور حرکت کے ساتھ محرِک پر استدلال ضروری ہے اور یہ من حیث الجملہ ایک عظیم فاعل کا معطی ہے، اسی طرح ریاضی وذوقی طریقہ صانعِ مطلق کی طرف دل کو انقیاد اور خضوع عطا کرتا ہے اور ان دونوں میں سے ہر ایک میں ایک اضطراری علم ضروری ہے جس کی طرف دل مضطر ہے کیونکہ ابتداء میں دل کو اضطراری جنس سے ہی علم حاصل ہوتا ہے ضروری کے توسط کے ساتھ! چونکہ نظر ان مقدمات پر مبنی ہوتی ہے جو اس تک منتہی ہوتے ہیں جو ضروری کی جنس سے ہوتے ہیں یا تو حس کے توسط سے یا اس سے مجرد ہو کر تو قیاسی طریقہ ضروری مقدمات کے توسط سے علم کا افادہ دیتا ہے مثلاً کہ کہا جائے معلوم وجود یا تو ممکن ہے اور یا واجب، اور ممکن کا وجود واجب کے بغیر نہیں ہوتا تو یوں دونوں تقدیروں پر واجب کا

وجود ثابت ہوا اور مثلاً یہ قول کہ یہ عالم یا اس کا کثیر حصہ محدَث ہے، ثانی ضروری ہے اور اول پر استدلال کیا جائے گا پھر کہا جائے گا ہر جو محدَث ہے اس کیلئے محدِث کا ہونا ضروری ہے یا کہا جائے بلا شبہ یہاں وجود ہے جو یا تو قدیم ہے اور یا محدَث اور محدَث کے لئے کسی قدیم کا ہونا ضروری ہے تو یوں ان دونوں تقدیروں پر قدیم کا وجود ثابت ہوا جیسے بالفاظِ دیگر کہا جائے کہ ادھر وجود ہے جو یا تو واجب اور یا پھر ممکن ہے اور ممکن کیلئے کسی واجب کا ہونا ضروری ہے تو دونوں تقدیروں پر واجب کا وجود ثابت ہوا، یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ بلاشبہ ادھر وجود ہے اور وہ یا تو مصنوع ہے یا غیر مصنوع، اور مخلوق ہے یا غیر مخلوق اور مفطور ہے یا غیر مفطور اور مصنوع، مخلوق اور مفطور کیلئے صانع، خالق اور فاطر کا ہونا لازم امر ہے تو دونوں تقدیروں پر ایک ایسے وجود کا ثبوت ملا جو نہ مصنوع، نہ مفطور اور نہ مخلوق ہے

تو یہ اور ان جیسی وجوہات ایک ایسے وجود کا سراغ دیتی ہیں جو واجب اور قدیم ہے اور جو مصنوع نہیں لیکن اس کی تعیین کے ضمن میں بحث وجدل کا معرکہ برپا ہوا، عام دہری کہتے ہیں کہ مشارالیہ وجود یہ عالم ہے یا کوئی ایسی شئ جو اسکے ساتھ قائم ہے پھر ممکن کی واجب، محدث کی قدیم اور مصنوع کی صانع کی طرف احتیاج مقدمہِ ضرور یہ ہے اگر چہ نظار (یعنی اہلِ نظر و بحث) کا ایک گروہ اس مقدمہ پر استدلال کرتے ہیں (یعنی اسے دلائل سے ثابت کرتے ہیں) اور اس امر پر کہ ممکن کی دو اطراف میں سے ایک کی دوسری پر ترجیح کسی مرجح کے ساتھ ہی ہوگی جبکہ جمہور اس ضمن میں ضرورت پر اکتفاء کرتے ہیں (کہ ایسا ہونا ضروری امر ہے) عبادی طریقہ ریاضت اور صفائے نفس توسط کے ساتھ علم کا افادہ دیتا ہے تب دل کیلئے ضروری علم حاصل ہوگا جیسا کہ الشیخ اسماعیل کورانی نے عز الدین بن عبد السلام سے کہا تھا جب وہ معرفتِ علم کی طلب میں ان کے پاس آئے تھے اور اس ضمن میں وہ کلامی طریقہ کے سالک تھے: تم لوگ کہتے ہو کہ اللہ کی معرفت دلیل کے ساتھ حاصل ہوتی ہے جبکہ ہم کہتے ہیں اللہ نے خود اپنی ذات کی پہچان کرائی ہے تو ہم نے اسے پہچان لیا اور جیسے نجم الدین کبری نے ابن خطیب اور ان کے ایک معتزلی ساتھی سے کہا تھا جب انہوں نے ان سے علمِ یقین کی بابت سوال کیا اور کہا تھا: یہ قلبی واردات ہیں، دل انہیں نہ آنے دینے سے عاجز ہیں تو دونوں کو یہ کہتے ہوئے جواب دیا: کہ ہمارے نزدیک علمِ یقین موجود بالضرورت ہے نہ کہ بالنظر، یہ عمدہ جواب ہے

تو علمِ ضروری جو عبد کے نفس کو لازم ہے ایسا لزوم کہ اس سے جدائی اسکے لئے ممکن نہیں تو قیاس کرنے والے کیلئے اگر ابتداءً ہی علمِ ضروری حاصل نہیں تو ضروری ہے کہ وہ اپنی نظر اور قیاس کی بناء ضروری مقدمات پر کرے تب یہ علم اسے حاصل ہوگا، اسی لئے ان میں سے ایک گروہ نے کہا جن میں ابوالمعالی جوینی بھی ہیں: تمام علوم ہی اپنے اعتبارات کے ساتھ ضروری ہیں، دلیل میں نظرِ صحیح کے بعد جو علم کو ایک ضرورت بنا کر پیش کرتے ہیں لیکن بعض ان میں سے ایسے ہیں جو قضیہ کے دونوں طرف کے تصور کے وقت ضروری ہوتے ہیں اور بعض ایسے جو تامل و نظر کے بعد ضروری ہیں اور کچھ ایسے جو دو یا دو سے زائد مقدمات والی دلیل میں نظر کے بعد ضروری ہوتے ہیں، تو شیخِ عارف نے کہا ہم علم کو وجدِ ضروری پاتے ہیں تزکیہِ نفس اور اصلاحِ قلب جو علم کی حامل و داعی ہے کے طریقہ کا سالک

بنتے ہوئے تو یہ دونوں چیزیں دل میں اللہ کا علم نقش کرتی ہیں البتہ ایک اس علم کی تحصیل کے ساتھ جو مطلوب علم کی مقارن ہے جو کہ مقدمات ہیں اور دوسری علم کے طالب کی اصلاح کے ساتھ جو چاہتا ہے کہ عالم بنے۔ اور وہ دل ہے۔ تو اسکی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے کسی خاتون کو پیغامِ نکاح دیا تو وہ کبھی اپنا آپ مزین اور خوبصورت کر کے اسے دکھلاتا ہے تا کہ اسے اس میں کشش محسوس ہوئی تو اسکا پیغام قبول کر لیا اور کبھی کسی ایسے کو اس کے پاس بھیجتا ہے جس سے وہ مانوس ہے اور اس کی بات مانتی ہے تو اس نے اس کے حق میں اسے ہموار کیا تو اس نے پیغام قبول کر لیا تو اول کی سعی وکوشش اپنے نفس کی اصلاح میں اور اس کے سامنے پیش کرنے میں ہوئی تا کہ اسے قبول کر لے اور ثانی کی کوششوں کا محور کسی ایسے واسطہ کی تلاش بنی جس کی وہ خاتون بات مانے اور یوں اس کا مقصد پورا ہو

لیکن مجرد نظر و بحث اور عمل چاہے اکٹھے ہوں یا الگ الگ، ایک امرِ مجمل کی تحصیل ہی کریں گے جیسا کہ امرِ واقع ہے اور یہ صحیح ہے تو مجمل امر کا ثبوت حق ہے اگر اس کے ساتھ نورِ رسالت کے ساتھ معلوم امرِ مفصل بھی ضم ہو جائے تو ایمانِ نافع کا حصول ہوگا اور دونوں طریقوں سے متوقع خرابیوں کا سدِ باب ہوگا اور یہ حال ہے اس شخص کا جو اہلِ نظر کلامی اور عملِ عبادی سے رسول کی اتباع اور آپ پر ایمان لانے کی طرف تحیز کرے اور ان سے اخذ وقبول کرے، اگر رسول کی لائی ہوئی تعلیمات ان کے ساتھ منظّم نہ کی جائیں تو یا تو ان کی ضد شاملِ حال ہوں گی یا کوئی شئ بھی نہیں تو پہلی صورت میں وہ تکذیب میں واقع ہوا اور یہ کفر مرکب ہے جبکہ دوسری صورت میں وہ کفرِ بسیط میں باقی رہے گا چاہے شک وریب میں ہو یا اعراض اور غفلت میں تو کافر کا حال اس امر سے خالی نہیں کہ یا تو اس کے ذہن میں رسالت کا تصور موجود ہے یا پھر نہیں؟ اگر نہیں، تو یا وہ اس سے غفلت اور عدم ایمان کی حالت میں ہے جیسے قرآن نے کہا:

وَ لَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَ اتَّبَعَ هَوٰىهُ وَ كَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا) [الكهف: ۲۸] (اور جس شخص کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے اور وہ اپنی خواہش کی پیروی کرتا ہے اور اس کا کام حد سے بڑھ گیا ہے اس کا کہنا نہ ماننا) اور:

(فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ فِی الْیَمِّ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا وَ كَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِیْنَ) [الأعراف: ۱۳۶] (تو ہم نے اُن سے بدلہ لے کر ہی چھوڑا کہ اُن کو دریا میں ڈبو دیا اس لئے کہ وہ ہماری آیتوں کو جھٹلاتے اور اُن سے بے پروائی کرتے تھے) لیکن غفلتِ محضہ اسی کی ہوگی جس کے پاس رسالت پہنچ ہی نہ سکی اور کفر باعثِ عذاب تبھی ہوگا اگر رسالت کا علم پہنچ جانے کے بعد اس کا انکار کیا اسی لئے تکذیب کو غفلت کے ساتھ جوڑا ہے، اگر رسول کی لائی ہوئی تعلیمات کا تصور تو موجود ہے لیکن انصراف کیا تو یہ معرض ہے جیسے کہا:

(فَاِمَّا یَاْتِیَنَّكُمْ مِّنِّیْ هُدًى فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَایَ فَلَا یَضِلُّ وَلَا یَشْقٰى ۝ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِیْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِیْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اَعْمٰى)[طٰه: ۱۲۳ـ ۱۲۴] (پھر اگر میری طرف سے تمہارے پاس ہدایت آئے تو جو شخص میری ہدایت کی پیروی کرے گا وہ نہ گمراہ ہوگا اور نہ تکلیف میں پڑے گا۔ اور جو میری نصیحت سے منہ پھیرے گا اس کی زندگی تنگ ہو جائے گی اور قیامت کو ہم اسے اندھا کر کے اٹھائیں گے) اور جیسے کہا:

﴿رَاَیْتَ الْمُنٰفِقِیْنَ یَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا ﴾ [النساء : ۶۱] (تم منافقوں کو دیکھتے ہو کہ تم سے اعراض کرتے اور رُک جاتے ہیں) اور:

﴿ وَاِذَا قِیْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَیْنَا عَلَیْهِ اٰبَآءَ نَا﴾ [البقرۃ:۱۷۰] (اور جب ان لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ جو اللہ نے نازل فرمائی ہے اُس کی پیروی کرو تو کہتے ہیں کہ بلکہ ہم تو اُسی چیز کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا) اگر اس کے باوجود اسے ملحوظ کیا مگر نہ تصدیق کی اور نہ تکذیب اور نہ وہ محبّ بنا اور نہ مبغض تو یہ شخص شک اور ریب کی حالت میں ہے جیسا کہ کثیر کفار اور منافقین کی حالت کے بارہ میں یہی خبر دی ہے جیسے کہا:

﴿ اِنَّمَا یَسْتَاْذِنُكَ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ ارْتَابَتْ قُلُوْبُهُمْ فَهُمْ فِیْ رَیْبِهِمْ یَتَرَدَّدُوْنَ﴾ [التوبۃ :۴۵] (اجازت وہی لوگ مانگتے ہیں جو اللہ پر اور پچھلے دن پر ایمان نہیں رکھتے اور ان کی دل شک میں پڑے ہوئے ہیں سو وہ اپنے شک میں ڈانواڈول ہورہے ہیں) اور جیسے حضرت موسیٰ کا قول نقل کیا:

﴿اَلَمْ یَاْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّ عَادٍ وَّ ثَمُوْدَ وَ الَّذِیْنَ مِنْ بَعْدِهِمْ لَا یَعْلَمُهُمْ اِلَّا اللّٰهُ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ فَرَدُّوْٓا اَیْدِیَهُمْ فِیْٓ اَفْوَاهِهِمْ وَقَالُوْٓا اِنَّا كَفَرْنَا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ وَاِنَّا لَفِیْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَنَآ اِلَیْهِ مُرِیْبٍ قَالَتْ رُسُلُهُمْ اَفِی اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ یَدْعُوْكُمْ لِیَغْفِرَلَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَ یُؤَخِّرَكُمْ اِلٰٓی اَجَلٍ مُّسَمًّی قَالُوْٓا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا تُرِیْدُوْنَ اَنْ تَصُدُّوْنَا عَمَّا كَانَ یَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا فَاْتُوْنَا بِسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ یَمُنُّ عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَ مَا كَانَ لَنَآ اَنْ نَّاْتِیَكُمْ بِسُلْطٰنٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ وَ عَلَی اللّٰهِ فَلْیَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ﴾ [ابراھیم : ۹۔۱۱] (بھلا تمہیں اُن لوگوں کی خبر نہیں پہنچی جو تم سے پہلے تھے، نوح اور عاد اور ثمود کی قوم اور جو اُن کے بعد تھے جن کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں، اُن کے پاس پیغمبر نشانیاں لے کر آئے تو اُنہوں نے اپنے ہاتھ اُن کے مونہوں پر رکھ دیئے اور کہنے لگے کہ ہم تو تمہاری رسالت کو تسلیم نہیں کرتے اور جس چیز کی طرف تم ہمیں بلاتے ہو ہم اسکے قوی شک میں ہیں۔ ان کے پیغمبروں نے کہا کہ کیا اللہ میں شک ہے جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے؟ وہ تمہیں اس لئے بلاتا ہے کہ تمہارے گناہ بخشے اور فائدہ پہنچانے کیلئے ایک مدت مقرر تک تمہیں مہلت دے۔ وہ بولے تم تو ہمارے ہی جیسے آدمی ہو تمہارا یہ منشاء ہے کہ جن چیزوں کو ہمارے بڑے پوجتے رہے ہیں ان سے ہمیں روک دو تو کوئی کھلی دلیل لاؤ۔ پیغمبروں نے اُن سے کہا کہ ہاں ہم تمہارے ہی جیسے آدمی ہیں لیکن اللہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے احسان کرتا ہے اور ہمارے اختیار کی بات نہیں کہ ہم اللہ کے حکم کے بغیر تمہیں معجزہ دکھائیں اور اللہ ہی پر مومنوں کو بھروسا رکھنا چاہیئے)

تو اللہ تعالیٰ نے اولاً کفار کے ربوبیت بارے رسل سے مناظرہ کا ذکر کیا کہ وہ اس بابت شک میں ہیں جس کی طرف اللہ انہیں بلاتا ہے اور ثانیاً نبوت بارے، جب کہا: (اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا) اور یہی فلاسفہ میں سے کفار کی بعینہ بحث ہے، اور اگر مکذب ہے تو یہ تکذیب ہے جو کفر سے اخص ہے تو ہر جو رسل کی لائی تعلیمات کی تکذیب کرے وہ کافر ہے لیکن ہر کافر مکذِب نہیں ہوتا بلکہ کئی دفعہ وہ مرتاب (یعنی شک میں) ہے اگر اس میں ناظر ہے یا اس سے اعراض کرنے والا ہے بعد اس کے کہ ناظر نہ تھا اور کبھی وہ اس سے غافل ہوگا اس طور کہ رسالت بارے نہیں سوچا تو اس کی عقوبت اس امر پر متوقف ہے کہ آیا اس کے پاس رسالت کا علم پہنچا (یعنی آیا دین کے بارہ میں اسے آگہی دی گئی) اور دونوں میں سے ہر امر اس بات میں کہ مجمل معرفت کی طرف ضم کیا جائے یا تکذیب اور یا کفر بلا تکذیب اور یہ ان دونوں طریقوں : قیاسِ مجرد میں نظر کرنا اور مجرد عبادت کو روبعمل لانا، کے سالکین میں بکثرت واقع ہے ! اس کی مثال یہ کہ کثیر نظار نے واجب الوجود یا صانعِ عالم کا اثبات کیا ہے اور اس کی تعیین اور صفات میں ایسے مذاہب اختیار کئے جن کی تفصیل یہاں بیان نہیں ہوسکتی، یہ ہمارے اہلِ ملت اور دیگر کی تصنیفات میں معروف ہیں، متاخر زمانوں کے کئی عُباد نے مجملاً بھی اس کا اثبات کیا اور اس ضمن میں کئی لوگ کفری توہمات کا شکار بنے جن کا ان کے عارفین نے وصف کیا ہے تو ان میں سے بعض نے اسے وجودِ مطلق متوھم کیا جو موجودات کے مابین مشترک ہے جیسے انسانِ مطلق اپنے اعیان وافراد کے ساتھ ! تو جب وجود کا تعین ہوگا تو وہ یہ نہ ہوگا کیونکہ مطلق تو معین نہیں ہوتا جیسا کہ صدر قونوی نے کہا

ان کے بعض نے توھم کیا کہ ممکنات کا وجود ہی عین اس کا وجود ہے جو کائنات پر فائض ہے، اسے صاحب الفصوص (یعنی ابن عربی) نے ذکر کیا، بعض نے اسے جملۃ الوجود متوھم کیا اور کہ ہر معین اس کا جزو ہے جیسے سمندر اپنی موجوں اور انسان کے اعضاء انسان کے ساتھ، تو یہ وہ نہیں جو ہر معین کے ساتھ مختص ہوتا ہے لیکن یہ مجموعِ کائنات ہے جیسے عفیف تلمسانی اور عبداللہ فارسی بلیانی نے کہا، جو کہتے ہیں کہ ہر موجود مراتبِ وجود سے مرتب ہے یا اس کے مظاہر میں سے ایک مظہر ہے جیسے امواج کا سمندر اور اعضاء کا انسان سے تعلق اور رتبہ ہے یا جیسے اسی انسان اور اس حیوان کا حیوانِ مطلق اور انسانِ مطلق سے ناطہ اور تعلق ہے، ان کا شاعر ابن اسرائیل کہتا ہے:

وَمَا اَنْتَ غَيْرُ الْكَوْنِ بَلْ اَنْتَ عَيْنُهٗ ‏ ‏ ‏ وَ يَفْهَمُ هذَا السِّرَّ مَنْ هُوَ ذَائِقٗ

(تم کون کا غیر نہیں ہو بلکہ تم اس کا عین ہو، اس راز کو صاحبِ ذوق ہی سمجھتا ہے) اور کہا:

وَتَلْتَذُّ اِنْ مَرَّتْ عَلىٰ جَسَدِىْ يَدِىْ ‏ ‏ ‏ لِأَنِّىْ فِى التَّحْقِيْقِ لَسْتُ سِوَاكُمْ

(میرا ہاتھ خود میرے جسم کے مس سے حظ اور لذت کشید کرتا ہے کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ میں تمہارا ماسوا نہیں ہوں)

لہذا ان کی نظر میں انسان کیلئے اس کے نفس کے ماوراء کوئی غایت نہیں، اس کی غایت بس یہ ہے کہ اس کے نفس سے پردہ منکشف ہو جائے تو وہ دیکھے گا کہ اس کا نفس ہی (الحق) ہے اور وہ قبل ازیں اس سے محجوب تھا جب حقیقت کا مشاہدہ کیا تو دیکھا

کہ وہ وہی ہے جیسے ابن اسرائیل کہتا ہے:

مَا بَالُ عِيسِكَ لَا يَقِرُّ قَرَارُهَا — اِلَّا فِيْ ضَلَالِكَ لَا تَنِيْ مُنْتَقِلا

فَلَسَوْفَ تَعْلَمُ اَنَّ سَيْرَكَ لَمْ يَكُنْ — اِلَّا اِلَيْكَ اِذَا بَلَغْتَ مَنْزِلا

(تمہارے عیسی کو کیا ہوا کہ اسے کسی جگہ قرار نہیں مگر تمہاری گمراہی میں، تم مسلسل تنقل میں ہو۔ جب تم منزل پر پہنچو گے تو تمہیں پتہ چلے گا کہ تمہارا یہ سفر تو خود تمہاری اپنی طرف ہی تھا)

اور جیسے ایک اور نے کہا:

وَفِيْ كُلِّ شَيْءٍ لَهُ اٰيَةٌ — تَدُلُّ عَلٰى اَنَّهٗ عَيْنُهٗ

(ہر چیز میں اس کی نشانی ہے جو دال ہے کہ وہ اس کا عین ہے) جبکہ اللہ کہتا ہے: **﴿اِنَّ اِلٰى رَبِّكَ الرُّجْعٰى﴾[العلق: ۸]** (کچھ شک نہیں کہ تمہارے رب ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے) اور: **﴿يٰۤاَيُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا﴾ [الانشقاق: ۶]** (اے انسان! تو اپنے رب کی طرف خوب کوشش کرتا ہے سو اس سے جا ملے گا) اور: **﴿وَرُدُّوْۤا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ﴾[یونس: ۳۰]** (پھر لوگ اپنے مالکِ برحق اللہ تعالیٰ کے پاس واپس بلائے جائیں گے) اور: **﴿اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّاۤ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ﴾ [البقرۃ ۱۵۶]** (ان لوگوں پر جب کوئی مصیبت واقع ہوتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم اللہ ہی کے لئے ہیں اور اُسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں) اور اس کے نحو آیات، تلمسانی۔ اور یہ اس زندیقیت میں راسخ القدم تھا جسے ان حضرات نے توحید وحقیقت کا نام دیا۔ کہتا ہے:

تَوَهَّمْتُ قِدَماً اَنَّ لَيْلٰى تَبَرْقَعَتْ — وَاَنَّ حِجَاباً دُوْنَهَا يَمْنَعُ اللثَمَا

فَلَاحَتْ فَلَا وَاللّٰهِ مَا كَانَ حِجَابُهَا — سِوٰى اَنَّ طَرَفِيْ كَانَ عَنْ حُبِّهَا اَعْمٰى

(مجھے قدیم زمانہ میں توہم تھا کہ لیلی نے برقع پہن لیا ہے اور اب اس کا یہ حجاب لثم (بوسہ دینے) سے مانع ہے مگر وہ تو ایسی ظاہر اور عیاں ہوئی ہے کہ بخدا کوئی حجاب نہیں، بات یہ ہے کہ میری آنکھ ہی اس کی محبت سے اندھی تھی) اس موضوع پر اس کے کثیر اشعار ہیں مثلاً یہ:

هِيَ الْجَوْهَرُ الصِّرْفُ الْقَدِيْمُ وَاِنْ بَدَا — لَهَا خَبَثٌ اُتِيْتُ بِهٖ وَهُوَ حَادِثٌ

حَلَفْتُ لَهُمْ مَا كَانَ مِنْهَا غَيْرُ ذَاتِهَا — فَقَالُوْا اتَّئِدْ فِيْهَا فَاِنَّكَ حَانِثٌ

(یہ۔ نفس۔ قدیمی خالص جوہر ہے اگر چہ اس میں میل کا ظہور ہو چکا ہے تو یہ اس کی موجودہ شکل حادث۔ یعنی زمانۂ مابعد کی پیداوار۔ ہے! میں نے قسم کھائی کہ اس سے سوائے اس کی ذات کے کچھ نہیں تو وہ بولیتو قف کرو کہ تم حانث ہو [یعنی قسم ٹوٹ گئی ہے]) اور:

وَقُلْ لِحَبِیْبِکَ مُتْ وَجْدا وَذُبْ طَرَباً　　فِیْهَا وَقُلْ لِزَوَالِ الْعَقْلِ لَا تَزَلِ

وَاصْمُتْ إِلیٰ اَنْ تَرَاهَا فِیْکَ نَاطِقَةً　　فَإِنْ وَجَدْتَ لِسَاناً قَائِلاً فَقُلِ

(اپنے حبیب سے کہو کہ حالتِ وجد میں مر جاؤ اور شدتِ طرب سے پگھل جاؤ اور زوالِ عقل سے کہو مت ساتھ چھوڑ و اور چپ رہو حتیٰ کہ اسے اپنے میں ناطق دیکھو اگر بولنے والی زبان پاؤ تو بولو) اسی لئے وہ اپنے حسبِ زعم ایسے مقام پر فائز ہو جاتے ہیں جس میں واجبات کے ایجاب اور محرمات کی تحریم کا اعتقاد ان کی نظر میں بے معنی ہو جاتا ہے، اسے وہ صرف مجوبین کیلئے سمجھتے ہیں جنہیں ابھی تک یہ مشاہدہ نہیں ہوا کہ وہ حقیقت کون ہے تو عابد و معبود اور آمر و مامور سب ان کے نزدیک ایک ہے جیسا کہ مصنف فتوحات (یعنی ابن عربی) نے اس کے شروع میں یہ اشعار درج کئے:

اَلرَّبُّ حَقٌّ وَالْعَبْدُ حَقٌّ　　یَا لَیْتَ شِعْرِیْ مَنِ الْمُکَلَّفُ؟

اِنْ قُلْتَ عَبْدٌ فَذَاکَ مَیِّتٌ　　اَوْ قُلْتَ رَبٌّ اَنّٰی یُکَلَّفُ؟

(رب بھی حق ہے اور بندہ بھی حق ہے، کاش جان پاؤں پھر مکلف کون ہے؟ اگر کہو بندہ تو یہ تو میت ہے اور اگر کہو رب تو رب کیوں کر مکلّف ہو؟) ان کے نزدیک تکلیف (یعنی شرع کی پابندی) اسماء وصفات کے مراتب میں سے ایک مرتبہ ہے اور وہ ممتحن کے مرتبہ میں ہے، ان کے بعض نے کہا:

مَا الْأَمْرُ إِلَّا نَسَقٌ وَاحِدٌ　　مَا فِیْهِ مِنْ مَدْحٍ وَلَا ذَمّ

وَإِنَّمَا الْعَادَةُ قَدْ خَصَّصَتْ　　وَالطَّبْعُ وَ الشَّارِعُ بِالْحُکْمِ

(امرِ کائنات ایک ہی طرز پر ہے، نہ اس میں مدح ہے اور نہ ذم، رفتارِ زمانہ نے کچھ امور طے کر دئے ہیں اور فطرت اور شرع نے قضاء وقدر کے ساتھ) یہ دونوں طریقے صابئیت کی پیداوار ہیں اور تامل سے یہ بات بخوبی واضح ہوتی ہے، صابئین اللہ وحدہ لاشریک لہ کی توحید سے نکلے ہوئے لوگ ہیں، دیگر سب مشرکین کی طرح اور وہ وجودِ مطلق کے معترف ہیں اسی لئے فلسفی علوم میں سے افضل علم مابعد الطبیعات کا علم ہے، میری مراد وہ مشائین فلاسفہ ہیں جو ارسطو کی پیروی کرتے ہیں جو ان کی نظر میں معلمِ اول ہے جس نے منطق کی جزئیات کی کئی انواع میں تصنیف کیا، اسی طرح علمِ طبیعی مثلا حیوان اور مکان، آسمان، عالم، علوی آثار اور مابعد الطبیعت بارے، وہ ان کے ہاں حکمت کی غایت اور ان کے فلسفہ کی انتہاء ہے اور یہ وہ علم جسے متاخرین فلاسفہ مثلا ابنِ سینا علمِ الٰہی کا نام دیتے ہیں

اس کے اصحاب کے ہاں اس علم کا موضوع وجودِ مطلق اور اس کے لواحق (یعنی لوازم) ہیں مثلا موجود اور معدوم بارے کلام پھر موجود کو واجب اور ممکن کی طرف تقسیم کرنا اور قدیم، محدث، علت، معلول اور جوہر وعرض وغیرہ بارے کلام و بحث کرنا پھر ان اقسام کی انواع اور ان کے احکام بارے کلام، مثلا علل کی چار انواع میں تقسیم اور یہ ہیں: فاعل اور غایت اور یہ دو کسی بھی شئ کے وجود کا سبب ہیں اور مادہ اور صورت اور یہ دونوں حقیقتِ

مرکب کا سبب ہیں اور اعراض کی نو مقالی اجناس میں تقسیم جو یہ ہیں: کیف، کم، وضع، این، متی، اضافت، مِلک، وَأنْ یَفْعَلَ وأنْ یَنْفَعِلَ یا پانچ اس اختلاف کی بناء پر جو ان کے مابین ہے، اور علم مابعد الطبیعیات کے آخر میں حرفِ لام ہے گویا وہ علتِ غائیہ ہے جس کی طرف حرکت ہے جیسا کہ ان کے معلمِ اول نے اسکا وجود استدلال بالحرکت کے طریق سے ثابت کیا جس میں اس نے واجب الوجود لذاتہ پر مختصر کلام کی جس میں اس کے کچھ احکام ذکر کیے وہ جس کی بابت ابن سینا نے لکھا کہ یہ وہ ہے جو معلمِ اول کے پاس اللہ کی معرفت میں سے تھا

جہاں تک نبوت و رسالت تو ان کے لئے اس بابت کوئی معروف کلام نہیں، نہ نفی اور نہ اثبات میں البتہ ان کے متاخرین نے جب توحیدِ ملتِ ابراہیمی کا ظہور ہوا کبھی حضرت عیسی کی نبوت کے ذریعہ جب نصاری شام، مصر اور روم وغیرہ میں صابئین کی مملکت پر غالب آئے اور پھر خاتم المرسلین کی نبوت کے ذریعہ جب اللہ نے نورِ نبوت کا وہ سورج طلوع کیا جس کے سامنے سب کواکب کی روشنی ماند پڑ گئی تو **دورِ عباسی میں روم، فارس اور ہند کے بعض عجمی فلاسفہ کی کتب کا عربی میں ترجمہ کیا گیا پھر مامون کے دور میں روم سے کتب منگوا کر انہیں معرّب کیا گیا جنہیں لوگوں نے پڑھا اور اس کے سبب بعض نئے نظریات ظاہر ہوئے** اسی طرح ان کے بعض ریاضی علوم مثلاً حساب اور ہیئت اور طبیعی علوم مثلاً علمِ طب اور منطقی علوم عربوں میں عام ہوئے! جہاں تک الوہی علوم تو ان میں ان کی کلام قلیل ہے پھر اس کا اکثر حصہ ان کے ہاں ٹھوس بنیادوں پر استوار نہیں جبکہ اس کے مقابلہ میں مسلمانوں نے الوہی درسیات کو خاتم المرسلین سے اخذ کیا اور دنیا کو ان کے نورِ ہدایت سے بھر دیا، ان کے متکلمین ان کی الوہیات میں سے جس مقدار کو اپنے مستخرج مقاییس سے بدعات کی طرف منسوب کرتے ہیں وہ اس مقدار سے بہت زیادہ ہے جو حُذاق فلاسفہ کے ہاں ہے پھر بعد ازاں جب ان کے طریقہ کے علم مابعد الطبیعیات کے ماہرین ہوئے جیسے فارابی اور ابن سینا وغیرہ تو مثلاً ابن سینا نے اپنی کتب میں اصولِ مشترکہ کے مقتضا کی رو سے ایسے امور تحریر کیے جن کا ذکر متقدمین کے ہاں نہیں ملتا، اسے علم الٰہی کا نام دیا اور نبوات، کرامات اور عارفین کے مقامات کے موضوعات پر متقدمین کی تحریرات کی نسبت رفیع المرتبت اور پرشوکت کلام کی اگرچہ اس بارے ان کی **کلام میں قصور و تقصیر و نفاق و جہل اور ایسا ضلال و کفر ہے جو اس شخص پر بھی مخفی نہیں جسے علم و ایمان کی ادنی سی بھی بصیرت ہے** مگر یہ فلسفیانہ طریقہ ان کے ہاں رائج ہو گیا کیونکہ اس نے اللہ کی معرفت، نبوات، معجزات اور ولایت کو فلسفیانہ صابی اصول کے بحسب ان کے قریب کیا نہ کہ فی نفسہ نورِ رسالت اور برہانِ نبوت سے مقتبس حق کے بحسب

جیسے نسطور نصرانی نے کیا جو مامون عباسی کے عہد میں تھا اور اس کی طرف تثلیث اور اتحاد میں نسطوریہ منسوب کی جاتی ہے لیکن چونکہ اسلامی علوم سے اس کا ذہن روشن تھا تو نصرانیت کے عقیدہ کی کثیر خرابیوں کا ازالہ کیا لیکن اس کے باوجود کثیر غلط نظریات قائم رہے اسی طرح یحی بن عدی نصرانی ہے، اس نے جب تفلسف اختیار کیا تو نصاری کے عقیدۂ تثلیث کو فلاسفہ کے عقل، عاقل اور معقول بارے اصول سے قریب کر دیا اسی لئے وہ فلاسفہ جو مشائین (یعنی ارسطو کے پیروکاروں) کے نظریات پر قائم رہے، خیال کرتے ہیں کہ ابن سینا نے دونوں اہلِ ملت سے مدارات کی ہے جب تقریب کے ضمن میں اس کی تحریرات کو ملحوظ کیا مگر یہ ان کا جہل و

کذب ہے، ابن سینا نے کسی سے مدارات نہیں کی لیکن (اپنے تئیں) حق کے بموجب اورفلاسفہ کے عقلی اصولوں کی رو سے یہ باتیں لکھیں جنہیں وہ تقریب سمجھتا تھا جیسے الٰہی مشائی فلاسفہ وغیرہم واجب الوجود کے اقرار اورموت کے بعد روح کے بقاء اورموت کے بعد اعمالِ صالحہ کے نافع ہونے پرمتفق ہیں،طبیعی وغیرہم کے فلاسفہ نے اس میں ان کی مخالفت کی بلکہ الٰہی فلاسفہ کے لئے بھی اس ضمن کی کچھ مخالفت ہےحتیٰ کہ فارابی نے بھی جوان کےنزدیک معلمِ ثانی ہے، کہا جاتا ہےاس کی کلام اس میں مختلف ہےتو کبھی اس نے تمام النفس کے بقاء کی بات کہی اورکبھی یہ کہ صرف عالم نفوس باقی رہیں گے، جاہل نہیں جیسا کہ اس نے یہ بات مدینہ فاضلہ کی آراء میں کہی ہےاورکبھی وہ ان دونوں باتوں کی تکذیب کرتا ہےاور یہ گمراہ اورکافر دعوی کرتا ہے کہ نبوت کا خاصہ روحانی حقائق کی جودتِ تخیل ہے،اس باب میں ان کی مضطرب کلام کثیر ہے یہاں اسکا ذکرمقصودنہیں،مقصد یہ بیان کرنا ہے کہ ان کےنزدیک علمِ اعلی اورفلسفہِ اولی مابعد الطبیعیات کاعلم ہےاوروہ وجودِ مطلق اوراس کے لواحق ہیں حتیٰ کہ مسلمان متکلمین میں سے جن کے ہاں فلسفی مادہ ہے جیسے ابن خطیب وغیرہ وہ اصولِ فقہ میں بحثیں کرتے ہیں جوایک خالص اسلامی فن وعلم ہےتواسے وہ ان فلسفی اصول کی روشنی میں پرکھتے اوران پراس کی بناء رکھتے ہیں جیسے ابن خطیب وغیرہ کا ابن سینا اوراس سےقبل کےفلاسفہ کی موافقت کرتے ہوئے اصولِ فقہ کےاول بارے یہ کہنا کہ فرعی علوم کے مبادی متقرر نہیں تاکہ تسلسل لازم نہ آئے توعلم کا مبدا اس کے اصول ہیں اوران کی معرفت کے بعد ہی اس علم کی معرفت ہوگی تواگراسکے اصول کی اس کے اصول پرمتوقف مسائل کی روشنی میں تعریف کی جائے گی توتسلسل لازم آئے گا بلکہ اس کے اصول مسلم ہیں اوراس علم میں وہ فرض کئے جارہے ہیں جواس سے اعلی ہےحتیٰ کہ معاملہ علمِ اعلی تک پہنچے جو وجوداوراسکے لواحق میں ناظر ہے، یہ بات انہوں نے مثلا طب اورحساب بارے بھی کہی کہ طبیب دراصل وہ ہے جوحیوان کے بدن میں نظرکرے اوراس کے اخلاط اوراعضاء میں تاکہ حفظانِ صحت ہواگروہ موجود ہےاوراگرمفقود ہےتوجسم کی طرف اس کی واپسی ہواورحیوان کا بدن زمین کےمولّدات (یعنی جنہیں زمین نے اگایا) کا جزو ہے نیزاس کے اخلاط بھی تواس سے اعم عناصرِ اربعہ: پانی، ہوا، آگ اورزمین (مٹی) کےمولدات میں نظرکرنا ہےاوراس سے بھی اعم مستحیل جسم میں پھرمطلق جسم میں،توجوکوئی علم بعض عینی یاعلمی موجودات کےموضوع سےمتعلق ہوتو اس سےاعم بھی ہے یہ جس میں وہ اوراس کا غیرمشترک ہو! جہاں تک اللہ بارے علم جوان کےنزدیک اعلی اوراشرف العلوم ہےکواس میں داخل کرنا اوراسےعلمِ اعلی کا جزو باورکرلینا جو وجوداوراس کے لواحق میں ناظر ہےاسی طرح اس علم باللہ کے ذیلی اجزاء وعلوم مثلا فرشتوں، کتب، رسل اوریومِ آخرت کی بحثیں تویہ دراصل قیاسی کجروی کا شاخسانہ ہے،اس کی وضاحت درج ذیل وجوہ سے ہوتی ہے:

(ا) کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلی واکبرہےاسی لئے اکمل الادیان کانمازوں، اذانوں اوراعیاد میں شعار (اللہ اکبر) ہے جیسے نبی اکرم نے حضرت عدی بن حاتم سے کیا تھا اے عدی تمہیں کیا نقصان ہے؟ کیا یہ کہ کہا جائے اللہ کے سوا کوئی الہ نہیں؟ اے عدی کیا تم اللہ کے سوا کوئی الہ جانتے ہو؟ تو کیا اللہ سے بڑی کسی طاقت سے واقف ہو؟ اس سےان فقہاء کےقول کا صائب ہونا متبین ہوا جوقائل ہیں کہ

اس کی بجائے (اللّٰہُ کَبِیْر) (یا اس طرح کا کوئی اور کلمہ) کہنا صحیح نہیں، اس بارے ایک جگہ بحث ہوگی جب یہ آیت نازل ہوئی: (**سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى**)[الأعلى: ۱] (اپنے ربِ جلیل الشان کے نام کی تسبیح کرو) تو آپ نے فرمایا اسے تم اپنے سجدوں میں کرلو کہ اللہ ہی اعلی اور اکبر ہے اور علم معلوم کے مطابق ہوتا ہے لہذا واجب ہے کہ اس کی معرفت و علم اکبر اور اعلی العلوم ہو

(۲) کہ اللہ تعالی ہی حق ہے جو بذاتہ موجود ہے، اس کا سب ماسوا اس کی مخلوق، مربوب اور اس کی قدرت کے تحت مقہور ہے وہ اشیاء کا خالق اور ان کے اسباب کا مسبب ہے تو ان کا علم ہر ماسواء کے علم کی اصل اور سبب ہے جیسے اس کی ذات ہے اور سبب کا علم مسبب کے علم کا افادہ دیتا ہے

(۳) یہ معرفت کہ وجودِ مطلق اس کے اور اس کے ماسوا کے مابین قدرِ مشترک کی معرفت ہے اور یہ اسے اس کی خلق پر قیاس کرنے میں حدِ اوسط ہے اور معلوم ہے کہ اس میں اس کی حقیقت کا علم نہیں اور نہ اس کے ماسوا کی حقیقت کا، یہ دراصل دونوں کے درمیان مشترک وصف کا علم ہے تو وصفِ مشترک کا علم دونوں میں سے ہر ایک کی حقیقت کے علم سے اعلی کیونکر ہوسکتا ہے؟ اسی طرح ان تمام انواع واعیان کے علم سے جو اسکا اختصاص کرتے ہیں اسی طرح ذاتِ مطلقہ کی معرفت ہے، ہر وہ جو امورِ مشترکہ میں سے ہے وہ اسی باب سے ہے

(۴) کہ وجودِ مطلق، ذاتِ مطلقہ اور ان کے نحو یا تو اس سے مراد اطلاقِ خاص ہے اور یہ وہ جس میں مقید داخل نہیں جیسا کہ مطلق پانی کہا جائے تو عقل و ذہن سے خارج میں اس کا کوئی وجود نہیں جس طرح وجودِ کلی عام اور ذاتِ کلیہ عامہ کا بھی خارج میں کوئی وجود نہیں، حقائق کیلئے یہ عموم ہی عارض ہوتا ہے اور یہ اطلاق کہ یہ اذہان کیلئے قابلِ فہم ہے نہ کہ اس طور کہ اعیان میں یہ ثابت ہے تو وہ کیونکر اعلیٰ اور اشرف العلوم ہوسکتا ہے جس کا معلوم ذہنی مثل ہیں نہ کہ وجودی حقائق، مثل دراصل حقائق کی تابع ہوا کرتی ہیں وگرنہ وہ جہل ہوں نہ کہ علم، یا پھر اس سے مراد اطلاقِ عام ہے اور یہ جو کسی شئ کے اس میں دخول سے مانع نہ ہو اور وہ ہر قید سے مطلق ہو حتی کہ قیدِ اطلاق سے بھی تو اس اعتبار سے مطلق کیلئے صحیح قول کے مطابق خارجی وجود ہوگا لیکن جو مطلقاً موجود نہیں وہ معیناً بھی موجود نہیں تو یا تو موجودِ مطلق بشرطِ اطلاق ہوگا تو اس کیلئے وجود نہیں اور وہ خاص مطلق ہے تو وہ عام مطلق جس میں مقید کا دخول ہوسکتا ہو اس کا خارج میں وجود ہونا صحیح ہے تو جب وجودِ مطلق اور اس کے لواحق خارج میں مطلقاً موجود نہیں اور نہ خارج میں سوائے معین کے کچھ موجود ہے تو ممتنع ہے کہ یہ اعلی العلوم ہو، اس کے معلوم کا وجود دراصل اذہان میں ہے نہ کہ اعیان میں، اگر مُثلِ ذہنیہ کی وجہ سے کسی علم کی خارجی حقائق پر ترجیح جائز ہوتی تو مثل کی حقائق پر ترجیح بھی جائز ہوتی اور رب، فرشتوں اور انبیاء بارے علم ذاتِ رب، ذاتِ ملائکہ اور ذاتِ انبیاء سے افضل ہوتا اور یہ بات کوئی عاقل نہیں کہہ سکتا

(۵) کہ ان حضرات نے اس جہت سے بحث کی ہے کہ انہوں نے تمام علوم بارے اپنے نظریہ کی بناء قیاس پر رکھی ہے اور قیاس میں قضیہِ کلیہ اور ایک اوسط حد کا ہونا ضروری ہے جو اس موصوف سے اعم ہو جس پر ابتداءً موضوع کا حکم لگایا جائے اور کوئی حد و قضیہ نہیں

مگر یہاں اس سے اعم بھی ہے مثلا انسان، تو اس سے حیوان اعم ہے اور حیوان سے اعم جسمِ نامی ہے (یعنی بڑھنے کی صلاحیت والا) اور اس سے اعم جسمِ سفلی اور اس سے جسم اور اس سے جوہر اور اس سے موجود چاہے وہ جنسِ ذاتی ہو جیسا کہ ان کے بعض کہتے ہیں یا وصفِ عرض جیسے ماہرین نے کہا، تو اگر کہا جائے قیاسی علوم میں سے اعلی ترین موجودات اور ان کے لواحق کا علم ہے کیونکہ اسکا معلوم اعم الموضوعات ہے تو یہ کہنے کا جواز ہوتا اور شائد یہی ان کی مراد ہے لیکن قیاسی علم بنفسہ موجودات میں کسی شئ کی حقیقت کی معرفت کا افادہ نہیں دیتا الا یہ کہ اس کیلئے کوئی مماثل نظیر ہو تب دونوں مثل میں سے ایک کی بنفسہ معرفت ہوسکتی ہے اور دوسری کی اس کی نظیر پر قیاس کر کے اور یہ قدر اللہ تعالی بارے علم میں منتفی ہے کیونکہ اس کا مثیل ونظیر موجود نہیں، پھر بھی متکلمین نے ان فلاسفہ کا اس چیز کے ساتھ معارضہ کیا ہے جو وجود سے اعلی ہے اور وہ معلوم و مذکور تو کہا: اعلی ترین معلوم اور اعم ترین اسماء وحدود معلوم و مذکور ہے کیونکہ اس میں موجود و معدوم دونوں داخل ہیں، وجود کی دونوں انواع واجب اور ممکن سمیت، اسی طرح معدوم کی دونوں انواع ممکن اور ممتنع سمیت! تو یہ کہا جانا واجب تھا کہ علمِ اعلی وہ ہے جو معلوم اور اسکے لواحق میں نظر و بحث کرے اور یہ اعم واوسع ہے، کسی شئ کا معلوم ہونا اس کیلئے ایک امرِ عارض ہے نہ کہ صفتِ ذاتیہ، اسی طرح اس کا موجود ہونا کیونکہ درحقیقت وہ اس طور ہے کہ واجد اسے پاتا ہے، یہ مقتضائے اسم ہے اگرچہ ان کے بعض نے اس سے مراد اس کا فی نفسہ حق ہونا لیا ہے تو یہ اس کی اصل حقیقت نہیں جیسا کہ ایک دیگر مقام پر اسکی بحث کی گئی ہے

جن فلاسفہ اور متکلمین نے کہا حقیقتِ رب اس کا وجود یا اس کا واجب الوجود ہونا ہے یا یہ کہ انہوں نے اس کی حقیقت جان لی ہے تو یہ ان کی قبیح خطا ہے اور یہ اس شخص کے بمنزلہ ہے جس نے کہا ساری کائنات کی حقیقت اس کا ممکن ہونا ہے، یہ اللہ سے دور اور اس کی معرفت سے محجوب ہیں، انہیں اس کی صفات میں سے صفتِ کلیہ کی ہی معرفت نصیب ہوئی تو گمان کر لیا کہ اس کی حقیقت سے آشنا ہو چکے ہیں، اس سے واضح ہوا کہ جس نے کہا علمِ اعلی مابعد الطبیعیات کا علم ہے اور یہ وہ جو وجود اور اس کے لواحق میں نظر کرتا ہے تو اس قول کی حقیقت بس اتنی ہے کہ اللہ کی اس کی خلق پر قیاس کر کے معرفت طالب کے ذہن میں اعلیٰ ہے نہ کہ یہ فی ذاتہٖ اعلی ہے اور نہ یہ کہ اسکا معلوم اعلی ہے اور نہ اس کے ہاں یہ اعلی ہے جسے موجودات کے حقائق کی معرفت ہوئی اور نہ اس کے ہاں اعلی جس نے اللہ کو فطرت کے ساتھ پہچان لیا چہ جائے کہ اس کے ہاں جس نے شریعت کے ساتھ اللہ کی معرفت کی اور چہ جائے کہ اس کے ہاں جس نے از روئے ولایت اللہ کی معرفت حاصل کی تو جب صابی فلاسفہ کا منتہا اور ان کا اعلی علم وجودِ مطلق ہے اور یہ تجہم کی اصل تھا اور اللہ تعالی کی صفات کی تعطیل صابئہ سے ماخوذ ہے اور یہ اتحادیہ اصل میں جہمیہ ہیں اور اس وجہ سے جو ان میں نصرانیت کے اثرات موجود تھے جو صابئہ کے مشارک ہیں اور ان کے اور صابئہ کے درمیان ایک نوع کا تعلق ہے تو ان کا معبود اور الہ یہی وجودِ مطلق ہوا اور انہوں نے زعم کیا کہ یہی اللہ تعالیٰ ہے اور اس رائے میں انہوں نے قدیم فلاسفہ کی مضاہات (یعنی ہمنوائی اور مشابہت) کی کہ ان کے ہاں بھی تعطیلِ صانع اور وجودِ مطلق کا اثبات تھا حتی کہ ان کی نظر میں فرعون کا یہ قول صحیح تھا: ﴿**وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ**﴾ **[الشعراء: ۲۳]** (یہ رب العالمین کیا ہے؟) اگرچہ مسلمان فلاسفہ اس پر اتفاق

نہیں کرتے بلکہ وہ رب کے مقر ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اسی سے اس عالم کا صدور ہے لیکن وہ بھی وجودِ مطلق کی تعظیم کرنے کے سبب ان کے ساتھ متفق ہوئے اوران کے متقارب بنے، جس نے صابی فلسفی نصیرطوسی اوراتحادی نصرانی فلسفی صدرقونوی اوراسماعیلیہ کی البلاغ الاکبراورالناموس الاعظم کی کلام میں تامل کیا ہے جس میں وہ کہتا ہے کہ لوگوں میں سے ہمارے قریب فلاسفہ ہیں، ہمارے اوران کے درمیان اختلاف صرف واجب الوجود میں ہے تووہ اس کے مقر جبکہ ہم منکر ہیں،توان کے مابین مناسبت اورمشابہت کی بخوبی سمجھ آتی ہے اسی طرح ان مکتوبات سے جن کا صدر اورنصیر کے درمیان تبادلہ ہواتھا

نصیر کے مسئلہ میں واجب الوجود کیلئے اثبات صابی فلاسفہ کے طریقہ پر ہے جبکہ صدر نے اسے وجودِ مطلق قرار دیا نہ کہ معین اور یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ ہے تواس سے میری کہی بات کی حقیقت اورضلال وکفر پران کے اتفاق کی وجہ معلوم ہوئی اور یہ کہ نصیر رب اورخلق سے متمیز اورجدا صانع کے اپنے اعتراف کے لحاظ سے اقرب ہے لیکن نبوت، شرائع اورعبادات کے ساتھ اپنے کفر کی وجہ سے ابعد ہے اس کے مقابلہ میں صدرقونوی عبادات، نبوات اورتألہ کیلئے نصاری کے طریقہ پراپنی تعظیم کی جہت سے اقرب ہے لیکن اس لحاظ سے اس کا کفر بڑا ہے کہ اسکانظریہ ہے کہ اس کے معبود کیلئے کوئی حقیقت نہیں، وہ اس وجودِ مطلق کواپنا معبود مانتا ہے جس کی خارج میں کوئی حقیقت نہیں لہذا صدرقولاً اَکفر ہے اورعملاً نصیر کی نسبت کم کافر ہے جبکہ نصیر عملاً اَکفراورقولاً اس سے کم کافر ہے اسی لئے عامۃ المسلمین کے عقلاء کیلئے ظاہر ہے کہ صدر کی کلام افک، زُوراورغروراوررسول کی تعلیمات کے مخالف ہے جیسا کہ نصیر کے افعال سے ان کیلئے ظاہر یہ ہے کہ وہ رسول کی تعلیمات سے خروج اوراعراض میں ہے لہذا نصیر علماء سے اقرب تھا کیونکہ اس کی کلام میں وہ باتیں تھیں جوحق اورسچ ہیں جبکہ صدر عُباد سے اقرب تھا کیونکہ اس کے افعال میں وہ کچھ تھا جوعبادت کے زمرہ میں آتا ہے۔

فصل

اس مقام میں جوکہ عباد کے مطالب کی غایت ہے، لوگ اختلافِ آراء کا شکار ہوئے توفلاسفہ ونحوہم کا ایک گروہ سمجھتا ہے کہ کمالِ نفس مجردعلم میں ہے وہ اس علم کوجس کے ساتھ ان کی معرفت کی تکمیل ہوتی ہے مابعد الطبیعیات کی قبیل سے قرار دیتے ہیں اورعبادات کواخلاقِ نفس کیلئے ریاضت سمجھتے ہیں حتی کہ علم کیلئے وہ تیار ہوتونفس عالم ہو جائے، عالَمِ موجود کیلئے موازی اوراس سے معتزل، یہ گمراہ بلکہ کئی وجوہ سے کافر ہیں

اول: کہ انہوں نے مجردعلم سے کمال کا اعتقاد رکھا جیسے جہم، صالحی اوراشعری، ان دو کے دومیں سے مشہورقول کی رو سے اوران کے اکثر اتباع کا اعتقاد تھا کہ ایمان مجردعلم ہے لیکن فلاسفہ کا حال جہمیہ سے برا ہے کہ جہمیہ ایمان کوعلم باللہ قرار دیتے ہیں جبکہ یہ نفس کا کمال اس امر میں قرار دیتے ہیں کہ وہ وجودِ مطلق کواس حیثیت سے جان لے کہ وہ وجود ہے اورمطلق بشرطِ اطلاق کا وجودصرف اذہان میں ہوتا ہے نہ کہ اعیان میں اورمطلق بغیرکسی شرط کے خارج میں موجودنہیں مگر معیناً ہی اگرچہ وہ واجب اورممکن میں منقسم وجودِکلی سے

واقف ہیں لیکن ان کے علم کے معلوم کے لیے کوئی خارجی وجود نہیں اسی طرح وہ حضرات جوان کے طریقہ پر متصوف اور متأ لہ ہوئے مثلا ابن عربی اور ابن سبعین وغیرہما، نیز جہمیہ رسل اور ان کی تعلیمات کے مقر ہیں اسی طرح وہ فی الجملہ مقر ہیں کہ اللہ تعالی آسمانوں اور زمین کا خالق ہے اور دیگر رسل کی تعلیمات کے بھی بخلاف فلاسفہ کے، بالجملہ نفس کا کمال مجرد علم میں نہیں بلکہ علم باللہ کے ساتھ ساتھ اللہ کی محبت، عبادت اور اس کی طرف انابت بھی ضروری ہے تو یہ نفس کا عمل اور اس کا ارادہ ہے اور نفس کے علم و معرفت پر دال ہے

دوم: کہ انہوں نے ظن کیا کہ وہ علم جس کے ساتھ کمالِ نفس حاصل ہوتا ہے وہ ان کا علم ہے حالانکہ ان کی کثیر باتیں اور نظریات جہل ہیں نہ کہ علم

سوم: وہ اس علمِ الٰہی سے واقف نہیں جو رسل لے کر آئے اور یہ علمِ اعلی ہے جس کے ساتھ نفس کو کمال ملتا ہے اس کے ساتھ ساتھ اسکے موجب کے مطابق عمل بھی

چہارم: وہ خیال کرتے ہیں کہ جب ان کیلئے یہ علم حاصل ہو تو شرع کے واجبات اور فرائض ان سے ساقط الاداء اور محرمات مباح ہو جائیں گے، یہ باطنیہ کی سوچ اور طریقہ ہے، اسماعیلیہ وغیرہم کے مثلا ابو یعقوب سجستانی مصنف (الأقـاليـد الـملكوتية) اور اس کے اتباع اور ان ملحد صوفیاء کا طریقہ جنہوں نے ان کی موافقت کی جو اس فرمانِ خداوندی: (وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْن) [الحجر : **۹۸**] (اور اپنے رب کی عبادت کئے جاؤ یہاں تک کہ یقین۔ یعنی موت۔ آجائے) کا معنی یہ کرتے ہیں کہ تب تک شریعت کے مطابق عمل و عبادت کرتے رہو جب تک تمہیں علم حاصل نہ ہو جائے اور جب ہو جائے تو یہ سب ساقط الاداء ہو جائے گا، جنید (بغدادی) سے کہا گیا کچھ لوگ کہتے ہیں کہ وہ از راہِ نیکی کچھ مدت تک نماز روزہ کریں گے حتی کہ ان سے فرائض ساقط اور محارم مباح ہو جائیں گے یا اس طرح کی کلام، تو کہا اس سے بہتر ہے کہ وہ زنا، چوری اور شراب نوشی کرنے لگ جائیں، ان میں سے کچھ ایسے ہیں جن کی علم سے مکاشفہ ونحوہا کیلئے طلب اللہ کے فرائض اور واجبات کے علم کی طلب سے بڑھ کر ہوتی ہے، یہ اپنی دعاؤں میں کہتے ہیں: اے اللہ میں تجھ سے حرکات، سکنات، خطوات، ارادات اور کلمات میں شکوک، ظنون، ارادہ، دلوں کیلئے غیوب کے مطالعہ سے ساتر اوہام سے بچاؤ کا سوال کرتا ہوں

ایک اور گروہ ایسا ہے جن کا نظریہ ہے کہ قدرت، سلطان اور تصرف فی الوجود میں کمال امر و نہی کا نفاذ ہے یا تو بادشاہی اور ولایتِ ظاہرہ یا پھر باطنی ولایت کے ساتھ، ان کی سب عبادت اور مجاہدے اسی غرض کیلئے ہوتے ہیں ان میں سے کثیر شرک اور جادو میں ملوث ہیں تو یہ کواکب و اصنام کی عبادت کرتے ہیں تا کہ انہیں ان کے مقاصد میں شیاطین کی معاونت حاصل ہو! یہ سابق الذکر گروہ سے بھی اضل اور اجہل ہیں، ان میں سے جو اللہ کی عبادت کرتا ہے اس کی غایت وغرض یہ ہوتی ہے کہ اس کے ہاتھوں خارقِ عادت (یعنی غیر معمولی) امور ظاہر ہوں (اور ایسا شیطانوں کی مدد سے ہو بھی جاتا ہے چنانچہ) ان کے کئی ہوا میں اڑتے اور سمندر میں چلتے نظر آتے ہیں اور ان میں جہال اور ضلال ہیں

ایک گروہ ایسا بھی جو کمالِ نفس دونوں امور کے مجموع میں سمجھتا ہے تو وہ اپنے اقوال اور اعمال میں شرک اور جادو کو داخل

کرتے ہیں تا کہ اپنے مقاصد و مطالب مثلاً غیبی خبریں دینے اور عالم میں کسی نوع کا تصرف کر لینے میں شیاطین سے مدد کی طلب کریں، حقِ مبین یہ کہ انسان کا کمال یہ ہے کہ وہ اللہ کی علماً اور عملاً عبادت کرے جیسے اس کے رب نے اسے حکم دیا اور یہ اللہ کے عبادت گزار، مومن و مسلم اور اللہ کے متقی اولیاء ہیں اور یہی فلاح یافتہ حزب اللہ اور اللہ جندِ غالب ہیں اور یہی علمِ نافع اور عملِ صالح کے اہل ہیں، انہی نے اپنے نفوس کا تزکیہ کیا اور تکمیل حاصل کی، نظری اور علمی اور ارادی عملی قوت کا کامل کیا جیسا کہ ارشادِ خداوندی ہے:

﴿ وَاذْكُرْ عِبٰدَنَآ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ اُولِي الْاَيْدِيْ وَالْاَبْصَارِ﴾[ص : ۴۵] (اور ہمارے بندوں ابراہیم اور اسحٰق اور یعقوب کو یاد کرو جو ہاتھوں والے اور آنکھوں والے تھے) اور:

﴿ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ﴾ [الفاتحہ : ۵۔۷](ہمیں سیدھے راستے پر چلا۔ ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام کیا۔ نہ کہ جن پر غضب ہوا اور نہ ان کا جو گمراہ بنے) اور کہا:

﴿فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى﴾[طٰہٰ : ۱۲۳] (فرمایا کہ تم دونوں یہاں سے نیچے اتر جاؤ تم میں بعض بعض کے دشمن پھر اگر میری طرف سے تمہارے پاس ہدایت آئے تو جو شخص میری ہدایت کی پیروی کرے گا وہ نہ گمراہ ہوگا اور نہ تکلیف میں پڑے گا) اور فرمایا:

﴿ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ [البقرۃ: ۵] (یہی لوگ اپنے رب سے ہدایت پر ہیں اور یہی نجات پانے والے ہیں) اور ارشاد کیا:

﴿ اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ﴾ [الفاطر:۱۰] (جو شخص عزت کا طلب گار ہے تو عزت تو سب اللہ ہی کے لئے ہے اسی کی طرف پاکیزہ کلمات چڑھتے ہیں اور نیک عمل اس کو بلند کرتے ہیں) اور:

﴿ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ﴾[والعصر:۳] (مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے اور آپس میں حق کی تلقین اور صبر کی تاکید کرتے رہے)۔

فصل

اتحادیہ جیسے مصنف فصوص الحکم وغیرہ کے مذہب کی حقیقت جس کی طرف ان کی کلام مؤول ہے اور جس کی کئی مواضع میں انہوں نے تصریح کی، یہ ہے کہ حقائق عقائد کے تابع ہوتے ہیں اور یہی سوفسطائیوں کے اقوال میں سے ایک قول ہے! تو ہر جس نے کوئی بات کہی یا اس کا اعتقاد رکھا وہ اس قائل و معتقد کے نزدیک حق ہے اسی لئے وہ کذب کو حق بناتے اور کہتے ہیں عارف کسی کو کاذب نہیں کہتا کیونکہ کذب بھی اپنی جگہ ایک امر موجود ہے اور وہ نفسِ کاذب میں حق ہے تو اگر وہ اس کا معتقد ہے تو اس کے اعتقاد اور کلام کی رو سے وہ حق ہے اور اگر وہ اسکا معتقد ہے تو اسکے اعتقاد اور کلام کی رو سے وہ حق ہے اور اگر ایسی بات کہی جس کا اعتقاد وہ نہیں رکھتا تو وہ

فقط اس کی کلام میں حق ہوگی لہذا یہ حضرات محقق کو کہتے ہیں کہ وہ ہر وہ اعتقاد رکھے جو خلقِ خدا رکھتی ہے جیسے (ان کے شاعر نے) کہا:

عَقَدَ الْخَلاَئِقُ فِی الإِلٰہِ عَقَائِداً وَاَنَا اعْتَقَدْتُ جَمِیْعَ مَا اعْتَقَدُوْہُ

(لوگوں کے الٰہ کے ضمن میں بے شمار اعتقادات ہیں اور میرا ان سب اعتقادات پر اعتقاد ہے)

حالانکہ معلوم امر ہے کہ باہم متناقض اعتقادات کے خارج میں معتقدات نہیں ہوسکتے ماسوائے نفسِ معتقد کے لہذا وہ بیک وقت نقیضین اور ضدین کی تصدیق کا حکم دیتے ہیں (اور یہ فطرت کے برخلاف ہے) اور اسے اپنے طریق وتحقیق کے اصول میں سے ایک قرار دیتے ہیں جبکہ معلوم ہے کہ نقیضین خارج میں باہم مجتمع نہیں ہوسکتے لیکن ان کے باہم اجتماع کا اعتقاد رکھنا ممکن ہے تو وہ فقط نفسِ معتقد میں حق ہوگا اور وہ مدعی ہیں کہ یہ کشفاً حاصل ہوتا ہے تو ان کا کشف متناقض ہے، میں نے ان کے ایک شخص سے اس ضمن میں بحث کی تو اس نے کہا دونوں حق ہیں، اس کی مثال وہ شخص جس پر منکشف ہوا کہ زہرہ عطارد سے اوپر ہے اور ایک وہ شخص جس پر منکشف ہوا کہ وہ عطارد سے نیچے ہے تو اس کے کشف میں وہ عطارد سے اوپر اور دوسرے کے کشف میں اس سے نیچے ہے تو یوں ان حضرات نے ثابت حقائق کو کشف و اعتقاد اور قول کے تابع بنادیا اسی لئے ان کا مقولہ ہے کہ جہاں چاہو چلو وہیں اللہ ہے اور جو چاہو کہہ دو کہ اللہ وسعت والا ہے، اس اصل کا مضمون یہ ہے کہ ہر انسان جو چاہے کہے اور جو چاہے عقیدہ رکھے بغیر حق و باطل اور سچ وجھوٹ کی تمیز کے اور یہ کہ عالمِ وجود میں کسی شئ کا انکار نہیں کرنا چاہئے، اسی طرح کہتے ہیں کہ یہ خبر اور علم کی جہت سے! جہاں تک امر اور عمل کی جہت سے تو ان کا محقق کہتا ہے کہ ہمارے ہاں کچھ حرام نہیں لیکن ان اہلِ حجاب نے کہا حرام تو ہم نے کہا ہے کہ وہ تم پر حرام ہے، تو یوں ان کے ہاں نہ امر ہے اور نہ نہی جیسے مجھے کسی نے مصنف فصوص کے شاگرد قاضی کے یہ اشعار سنائے (جو کچھ قبل گزرے)

مَا الْأَمْرُ اِلاَّ نَسَقٌ وَاحِدٌ مَا فِیْہِ مِنْ مَدْحٍ وَلاَ ذَمٍّ

وَاِنَّمَا الْعَادَۃُ قَدْ خُصِّصَتْ وَالطَّبْعُ وَ الشَّارِعُ بِالْحُکْمِ

تب اقوال وافعال کیلئے بجز مجرد قدرت کے کچھ باقی نہیں لہذا وہ ہمیشہ کون کے ساتھ چلتے ہیں تو کوئی بھی شئ جہاں اور جیسے پائی جائے ان کے نزدیک حق ہے تو جو تیرے ہاتھ لگ جائے وہ حلال ہے اور حرام جسے تو حرام کہے اور ہر بات جو تو منہ سے نکالے خواہ کیسی ہی ہو، حق ہے اور جو بات کسی نے نہیں کہی بس وہی باطل ہے، یہ لوگ ان اباحیت پسند ملاحدہ سے بھی بدتر ہیں جو تقدیرِ محض کے ساتھ چلتے ہیں تو یہ امر ونہی اور ثواب وعذاب کی تعطیل کرتے ہیں اسی طرح صانع، رسالت اور تمام حقائق کی، اور حقائق کو ہر انسان کے بحسب کر دیا اور انہیں فی نفسہا ثابت شدہ حقائق قرار نہ دیا، انہیں خود اپنے ساتھ متحقق اور اپنے نقیض کے ساتھ منتفی نہ کہا بلکہ یہ ان کے نزدیک انہیں اطلاق کا افادہ دیتا ہے کہ وہ معتقد کے ساتھ ہی وقوف کرتے ہیں بلکہ ان سب کا اعتقاد رکھا جائے جن کا لوگ رکھتے ہیں ان کی رائے میں چاہے متناقض اقوال ہی ہوں مگر عالمِ وجود میں ان سب کا سما جانا ممکن ہے اور وحدت الوجود ان سب کا اکٹھے متحمل

ہوسکتی ہے اورامرِ معلوم ہے کہ وجود دراصل ان اعتقادات کے وجود کا متحمل ہے نہ کہ فی نفسہا ان کے تحقُّق کا اوراس میں عقلاء کے مابین کوئی تنازُع نہیں تو باطل اعتقاداورکاذب قول وجود میں داخل اورموجودتو ہے لیکن یہ ان کے حق وصدق ہونے کو مقتضی نہیں تو حق وصدق کا اطلاق اگرخبری اقوال پر ہوتو اس سے مجرد ان کا وجود مرادنہیں ہوتا کیونکہ یہ حسی طور پر معلوم امر ہے تواس تقدیر پر یہ سب حق اورصدق ہیں اورامرِ معلوم ہے کہ ان کے حق اورصدق بارے سائل کے ہاں یہ حق وباطل اورصدق وکذب میں منقسم ہیں! توان کے حق وصدق ہونے سے مرادخبر کے مطابق ان کا ہونا یا نہ ہونا ہے! پھر یہ مطابقت کبھی قائل کے اعتقاد میں ہوگی نہ کہ خارج میں اوریہی خطا ہے اوریہ کبھی کذب کہلاتا ہے اورکبھی اس کا اطلاق نہیں کرتے تواول جیسے ایک بار نبی اکرم نے کہا تھا: (كَـذَبَ أَبُـو السَّـنَابِـلِ) (یعنی ابو السنابل نے غلط کہا) اورآپ کا یہ قول: (كَـذَبَ مَـنْ قَـالَهَـا، إِنَّ لَـهُ لَـأَجْـرَيْـنِ اثنين إنه لَجَاهِدٌ مُجَاهِدٌ) اورحضرت عبادہ کا قول:(كَذَبَ أَبُوْ كُمْ) اورابن عباس نے کہا تھا:(كَذَبَ نَوْفٌ)

اورثانی کی مثال نبی اکرم کا یہ قول:(لَـمْ أَنْـسَ وَلَـمْ تَـقْصُرْ) (نہ میں بھولا ہوں اورنہ ہی نماز میں کمی کی گئی ہے) اس پر ذوالیدین نے عرض کیا تھا:(بَلٰى قَدْ نَسِيْتَ) (کیوں نہیں، آپ کو بھول لگ گئی ہے) گویا فرق۔ واللہ اعلم۔ یہ ہے کہ جوایسے طریق جس کے ساتھ اس کا صواب وخطا معلوم ہوتا ہو میں اپنی تفریط کے باوجودخبر دے اورخطا کرے تووہ کاذب کہلائے گا بخلاف اس کے جو تفریط نہ کرے! کیونکہ اس نے اٹکل سے بلا دلیل وحجت بات کی ہے اورخطا کا مرتکب ہوا ہے جبکہ دوسرے نے تفریط نہ کرتے ہوئے خبر دی، یہ فرق درست ہے کہ اس کے ساتھ تفریق کی جائے اس کے درمیان جوکسی چیز پراس کا اعتقاد(یعنی اسے سچ سمجھتے ہوئے) رکھتے ہوئے قسم کھالےتووہ اسکی قسم کے برخلاف ظاہر ہوا وراس کے درمیان جواٹکل سے بلاکسی اصل کی طرف راجع ہوتے ہوئے قسم اٹھائے جیسے کسی نے بلامستنداصل کے قسم کھائی کہ یہ کوا ہے یا کہا کوانہیں، تواگر اسکا قول غلط ثابت ہوا تو یہ بھی حانث ہوگا اوروہ بھی، تو یہ بھی اسی کے مثل ہے اگراسکی خطامعلوم نہ ہوسکی اگرچہ درست ہواوریہی کسی کے اس بات پر یہ حلف اٹھانے کا مسئلہ کہ وہ جنتی ہے اوریہ جیسے کہوا گرمفتی نے بغیرعلم کےفتوی دیا تووہ آثم ہے اگرچہ درست ہی بتلایا ہواسی طرح بغیرسعی وکوشش کئے غیرِ قبلہ کی طرف رخ کرکے نماز ادا کرنا اوراسی طرح قرآن کی اپنی رائے کے ساتھ تفسیر کرنا، اسی لئے تم ان حضرات کو پاؤ گے کہ اپنی اخبار میں تمام انسانوں سے زیادہ جھوٹ بولنے والے ہیں بلکہ ان کے ہاں کذب صدق کی مثل ہے توضرورت کے وقت بلا دریغ اس کا سہارا لیتے ہیں اورانہیں کچھ پرواہ نہیں ہوتی کہ ایک ہی شیٔ بارے دومتناقض باتیں کہہ رہے ہیں، ان کے کئی اعمال بھی نفسانی خواہشات کے تابع پاؤ گے، کئی دفعہ دو باہم متناقض عمل بھی بجالائیں گے جب ایک وقت ایک ان کے حسبِ خواہش ہواور دوسرے وقت دوسرا اوریہ ہمیشہ حکومتِ وقت کا ساتھ دیتے ہیں چاہے حکمران مومن ہو یا کافر یا نیک یا بد یا صدیق ہو یا زندیق ہو، اسلام لانے سےقبل اگرچہ تاتاری اس رویہ میں ان کے شریک تھےلیکن خبریات میں وہ ان سے بہتر تھے کیونکہ الٰہی امور کے ضمن میں وہ متناقض باتیں نہ کرتے تھے بلکہ یہ یا توعلماً کسی شیٔ

کا اعتقاد رکھتے تھے یا تقلیداً یا پھر نہ رکھتے تھے لیکن متضاد باتیں تو بالکل نہ کرتے تھے تو یہ تاتاریوں سے بھی بدتر ہیں اس لئے ان کی کوئی عاقبت نہیں، نہ یہ متقی ہیں کہ مامور ومحظور اور صدق وکذب کا فرق کریں، عاقبت تو متقین کیلئے ہے، ان کا قیام ان کے حسبِ قدرت ہے اور معلوم امر ہے کہ قدرت دائمی نہیں ہوتی بلکہ انسان اسے بروئے کار لا کر ایسے اعمال بجالاتا ہے جو وبال کا سبب بنیں، بلاشبہ یہ لوگ اس فرمانِ خداوندی کا مصداق ہیں:

(اَلَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَضَلَّ اَعْمَالَهُم) [محمد : ۱] (جن لوگوں نے کفر کیا اور اللہ کے رستے سے روکا اللہ نے ان کے اعمال برباد کر دئے) اور:

(ذٰلِكَ بِاَنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا اتَّبَعُوا الْبَاطِل)[محمد : ۳] (یہاس لئے ہے کہ جن لوگوں نے کفر کیا انہوں نے جھوٹی بات کی پیروی کی) اور **(وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ کَسَرَابٍ بِقِیْعَةٍ یَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً حَتّٰٓی اِذَا جَآءَهٗ لَمْ یَجِدْهُ شَیْـًٔا وَّوَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ فَوَفّٰىهُ حِسَابَه) [النور: ۳۹]** (جن لوگوں نے کفر کیا ان کے اعمال کی مثال ایسی ہے جیسے میدان میں ریت کہ پیاسا اسے پانی سمجھے یہاں تک کہ جب اس کے پاس آئے تو اسے کچھ بھی نہ پائے اور اللہ ہی کو اپنے پاس دیکھے تو وہ اس کا حساب پورا پورا چکا دے اور اللہ جلد حساب کرنے والا ہے) اور:

(مَثَلُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ کَرَمَادِ نِ اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّیْحُ فِیْ یَوْمٍ عَاصِفٍ لَا یَقْدِرُوْنَ مِمَّا کَسَبُوْا عَلٰی شَیْءٍ)[الرعد : ۱۸] (جن لوگوں نے اپنے رب سے کفر کیا اُن کے اعمال کی مثال راکھ کی سی ہے کہ آندھی کے دن اُس پر زور کی ہوا چلے اُسے اڑا لے جائے جو کام وہ کرتے رہے ان پر ان کو کچھ دسترس نہ ہوگی یہی تو پرلے سرے کی گمراہی ہے) اور:

(صُمٌّۢ بُکْمٌ عُمْیٌ فَهُمْ لَا یَعْقِلُوْن) [البقرۃ: ۱۷۱] (یہ، بہرے گونگے اندھے ہیں کہ سمجھ ہی نہیں سکتے) اور:

(وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ کَثِیْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا یَفْقَهُوْنَ بِهَا وَ لَهُمْ اَعْیُنٌ لَّا یُبْصِرُوْنَ بِهَا وَ لَهُمْ اٰذَانٌ لَّا یَسْمَعُوْنَ بِهَا اُولٰٓئِكَ کَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَل) [الأعراف :۱۷۹] (اور ہم نے بہت سے جن اور انسان دوزخ کیلئے پیدا کئے ہیں، اُن کے دل ہیں لیکن اُن سے سمجھتے نہیں اور اُن کی آنکھیں ہیں مگر اُن سے دیکھتے نہیں اور اُن کے کان ہیں پر اُن سے سنتے نہیں یہ لوگ چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ اُن سے بھی بھٹکے ہوئے، یہی وہ ہیں جو غفلت میں پڑے ہوئے ہیں) لاریب حق کی دوانواع ہیں: ایک موجود حق، اسی سے خبرِ صادق متعلق ہوتی ہے اور دوم: مقصود حق، اس سے امرِ حکیم اور عملِ صالح متعلق ہوگا، ضدِ حق باطل ہے، ثانی باطل سے نبی اکرم کی یہ حدیث ہے:(كُلُّ لَهْوٍ يَلْهُوْ بِهِ الرَّجُلُ فَهُوَ بَاطِلٌ إِلَّا رَمْيَهُ بِقَوْسِهِ وَ تَأْدِيْبَهُ فَرَسَهُ وَ مُلَاعَبَتَهُ امْرَأَتَهُ فَإِنَّهُنَّ مِنَ الْحَقِّ) (ہرلہو جس کے ساتھ آدمی لہو میں مشغول ہو وہ باطل [یعنی فضول اور بے فائدہ] ہے مگر تیر کمان کی مشق، اپنے گھوڑے کی دیکھ بھال اور اپنی بیوی سے لاڈ پیار تو یہ حق سے ہیں

[یعنی کارآمد اور مفید]) اگر حقِ موجود کے برخلاف خبر دی جائے گی تو وہ کذب ہوگی! یہ حضرات حق و باطل اور حقِ موجود جس کا اعتقاد رکھنا چاہئے اور باطل معدوم خبر جس کی نفی کرنی چاہئے، کے درمیان کوئی تمیز نہیں کرتے اور نہ حقِ مقصود جسے معتمد سمجھنا چاہئے اور باطل جس سے اجتناب کرنا چاہئے کے مابین، بلکہ اپنی خواہش کو اپنا مقصد بناتے اور اسی کو ترجیح دیتے ہیں، حقِ موجود میں سے سب سے اصدق بات جو اللہ نے اپنے وجود کے بارے میں خبر دی اور حقِ مقصود وہ خبر اللہ نے جس کا امر دیا، اسے ان الفاظ سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے: حق بارے سچی ترین موجود خبر اللہ کی خبر ہے اور بہترین حق مقصود کا وہ امر جو اللہ نے صادر کیا اور ایمان ان دونوں اصول کا جامع ہے، اس کی سب اخبار کے ضمن میں اس کی تصدیق کرنے اور سب امور میں اس کی طاعت کرنے کے مابین مقرون کیا جائے گا تو اس آیت کا مصداق ظاہر ہوگا: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ اور عمل قول سے بہتر ہے جیسا کہ حسن بصری نے کہا تھا: (لَيْسَ الإِيْمَانُ بِالتَّمَنِّيْ وَلاَ بِالتَّحَلِّيْ وَلٰكِنْ مَا وَقَرَ فِي الْقَلْبِ وَصَدَّقَهُ الْعَمَلُ) (ایمان خالی دعوے کرنے اور ظاہری شکل بنا لینے کا نام نہیں لیکن جو دل میں جا گزین ہوا اور عمل نے اس کی تصدیق کی)۔

شیخ سے ایک ایسی جماعت کے بارہ میں سوال ہوا

جو فساد میں کئی متنوع امور پر اکٹھے ہوئے ہیں اور ان میں سے ہر ایک کسی نہ کسی سبب کے ساتھ اپنا ناطہ جوڑتا ہے، ان میں سے کوئی کہتا ہے (مثلاً) کہ یونس قتات اپنے پیروکاروں اور مریدوں کو برے حساب اور عذاب دردناک سے بچا لے گا، بعض کا زعم ہے کہ علیا حریری کو ایسا "حال" دیا گیا ہے کہ اگر وہ عورتوں اور نوعمر لڑکوں کے ساتھ خلوت میں جائے تو اس کی شرمگاہ عورت کی شرمگاہ جیسی ہو جاتی ہے، ان میں سے بعض نبوت کا مدعی ہے اور کہتا ہے کہ کسی خاص وقت میں اس کا (بطورِ نبی) ظہور ہوگا تب اس کے دین اور شریعت کو غلبہ ملے گا اور اس کی شریعتِ سوداء (یعنی کالی شریعت) میں عورتیں حرام ہیں جبکہ لواطت حلال ہے اور انجیر اور لیموں جیسی کئی حلال اشیاء کو حرام قرار دیتا ہے پھر کئی ایسے ہیں جنہوں نے نماز پڑھنی چھوڑ دی اور کثیر ایام ان کے ساتھ مخصوص لوگ جمع رہتے ہیں۔۔۔الخ

تو جواب میں کہا:

جہاں تک قائل کا یونس قتات بارے مذکورہ بات کہنا تو اس کا عمومی جواب تو یہ ہے کہ جس نے مشائخ میں سے کسی شیخ بارے یہ اعتقاد رکھا تو (گویا) اس نے دعوی کیا کہ یہ شیخ حضرت محمد صلعم سے افضل ہے اور جس نے یہ بات کہی اسے توبہ کا کہا جائے، کر لے تو ٹھیک وگرنہ قتل کر دیا جائے، صحیح حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا: اے فاطمہ بنت محمد، اے صفیہ عمۃ رسول اللہ، اے عباس عمِ رسول اللہ! جو چاہو مجھ سے میرا مال مانگ لو لیکن اللہ کے ہاں میں تمہارے کچھ کام نہ آسکوں گا اگر تم نے نیک عمل نہ کئے ہوئے، ایک حدیث صحیح میں فرمایا میں تمہارے کسی کو روزِ قیامت اس حال میں نہ پاؤں کہ اس کی گردن پر اونٹ سوار ہو جو بلبلا رہا ہو تو وہ کہے یا رسول اللہ میری مدد کو آیئے تو میں کہوں گا اب اللہ کے سامنے میں تمہارے لئے کچھ نہیں کر سکتا، میں نے تمہیں تبلیغ کر دی تھی، اس طرح کی کئی دیگر احادیث ہیں،

توجب رسول اللہ یہ بات اپنے گھر والوں، اقارب اور صحابہ جنہوں نے ہر موقع پر آپ کی مدد ونصرت کی اور آپ کے ساتھ ہوکر جہاد کیا، سے کہہ رہے ہیں تو کسی شیخ بارے یہ بات کیونکر کہی جاسکتی ہے جو زیادہ سے زیادہ تابعی ہوسکتا ہے، قرآن میں ہے:

﴿وَمَآ اَدْرٰکَ مَا یَوْمُ الدِّیْنِ ثُمَّ مَآ اَدْرٰکَ مَا یَوْمُ الدِّیْنِ یَوْمَ لَا تَمْلِکُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَیْئًا وَّالْاَمْرُ یَوْمَئِذٍ لِّلّٰہِ﴾ **[الانفطار: ۱۷۔۱۹]** (اور تمہیں کیا معلوم کہ جزا کا دن کیسا ہے؟۔ پھر تمہیں کیا معلوم کہ جزا کا دن کیسا ہے؟۔ جس روز کوئی کسی کا کچھ بھلا نہ کرسکے گا اور حکم اس روز صرف اللہ ہی کا ہوگا)

﴿ وَاتَّقُوْا یَوْمًا لَّا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَیْئًا﴾ [البقرۃ: ۴۸] (اور اس دن سے ڈرو جب کوئی کسی کے کچھ کام نہ آئے گا)

اور اس کی مثال کتاب وسنت میں کثیر نصوص ہیں، یہ بات معلوم ہے کہ روزِ قیامت انبیاء اور دیگر صرف شفاعت کرسکیں گے، صحیح کی ایک روایت میں ہے کہ لوگ ابو البشر حضرت آدم کے پاس جائیں گے تاکہ وہ شفاعت کریں تو وہ نفسی نفسی کہہ رہے ہوں گے، یہی بات حضرات نوح، ابراہیم، موسیٰ اور حضرت عیسیٰ کہہ رہے ہوں گے اور یہ اولوالعزم رسل (جو قرآن نے انہیں خطاب دیا) اور افضل الخلق ہیں، حضرت عیسی کے پاس جب آئیں گے وہ کہیں گے حضرت محمد ﷺ کے پاس جاؤ کہ وہ ایسے شخص ہیں کہ اللہ نے انہیں خوشخبری دی تھی کہ اللہ نے آپ کی کامل مغفرت کردی ہے، وہ آپ کے پاس اس غرض سے آئیں گے تو آپ ان کی درخواست قبول کریں گے اور بارگاہِ ایزدی میں جاکر سجدہ میں پڑ جائیں گے (جو سات دن جاری رہے گا) پھر اللہ فرمائے گا، اے محمد! سر اٹھایئے اور کہئے آپ کی بات سنی جائے گی اور مانگئے آپ کو عطا ہوگا اور شفاعت کیجئے آپ کی شفاعت قبول کی جائے گی، فرمایا میرے لئے ایک حد مقرر کی جائے گی (کہ اس کے اندر اندر شفاعت کرلیں) تو انہیں میں جنت میں داخل کروں گا، اسی کا مثل دوسری مرتبہ میں ذکر کیا، تو یہ حالت ہے خیر الخلق اور اللہ کے ہاں سب سے اکرم کی کہ جب وہ اپنے رب کو دیکھیں گے تو شفاعت نہ کریں گے حتی کہ اس کے سامنے سربسجود ہو جائیں اور حمد کریں پھر شفاعت کی اذن اور محدود اجازت ملنے پر ہی شفاعت کریں گے، اسی طرف اس آیت کے ساتھ اشارہ دیا:

﴿ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَہٗٓ اِلَّا بِاِذْنِہٖ﴾[البقرۃ: ۲۵۵] (کون ہے کہ اُس کی اجازت کے بغیر اُس سے سفارش کرسکے)

اور دیگر آیات، ایک حدیث میں وارد ہے کہ فرشتے، انبیاء اور مومنین بھی شفاعت کریں گے لیکن اللہ کی اذن کے ساتھ اور محدود امور میں تو اس میں معاملہ شافع کی مرضی پر منحصر نہ ہوگا، اگر کوئی یہ بات کہے کہ حضرت محمدؐ اپنے سب مریدین کو دوزخ سے خلاصی دلا دیں گے تو وہ جھوٹا ہے بلکہ آپ کی امت میں سے ایک خلق دوزخ جائے گی پھر آپ ان کے حق میں شفاعت فرمائیں گے! جہاں تک شیوخ تو ان کیلئے آنجناب کی شفاعت کے ہم رتبہ و مثل شفاعت نہیں، مردِ صالح اللہ کی اذن سے جس کی بابت اللہ چاہے گا شفاعت کرسکے گا اور شفاعت صرف اہلِ ایمان کے حق میں ہوگی

شیخ یونس مذکور کی طرف نسبت رکھنے والے کثیر ایسے ہیں جو اللہ ورسول کے منکر ہیں، نہ وہ نمازِ پنجگانہ کی فرضیت کے مقر ہیں

اور نہ رمضان کے روزوں اور حج کے، اسی طرح محرمات کے بھی قائل نہیں بلکہ ان سے اللہ اور رسول اور قرآن و اسلام کی گستاخی کے کلمات سرزد ہوئے ہیں، ان کی حقیقت سے آشنا پر یہ امر مخفی نہیں لیکن ان کے عوام الناس جو ان کے اسرار وحقائق سے واقف نہیں وہ عام اہلِ اسلام کی طرح مسلمان ہیں لیکن ان کا یہ اسلام ان سے نہیں بلکہ معاشرہ سے مستفاد و ماخوذ ہے، ان کے خواص مثلاً شیخ سلول، جہلان اور صہبانی وغیرہ نہ نماز کو واجب مانتے ہیں اور نہ رسول اکرم کی نبوت کا اقرار کرتے ہیں، ان کے اشعار میں ۔ جیسے کوجلی وغیرہ کے شعر ہیں۔ نبی اکرم اور قرآن اور اسلام بارے ایسی قابلِ اعتراض باتیں ہیں جو یہود و نصاریٰ بھی نہیں کہتے ! بعض کے مطابق تو یہ خود یونس کے اشعار ہیں جبکہ بعض کے مطابق انہیں غلط طور پر شیخ یونس کی طرف منسوب کیا گیا ہے لیکن معلوم وملحوظ امر یہ ہے کہ ان کی محافل میں کفریہ اشعار پڑھے جاتے ہیں جنہیں سن کر یہ حالتِ وجد میں آتے ہیں، ان کا کوئی طعام میں پیشاب کرتا ہے اور کہتا ہے: (شَــرَحَ کَبِدِیْ یونس) (یونس۔ایک شیخ طریقت۔ نے میرا جگر کھول دیا) یا: (مَاءُ وَرْدِ یونس) (یعنی یونس کے گلاب کا پانی) اور اسے وہ حلال طعام اور بابرکت سمجھتے ہیں، جہاں تک ان کی کفریہ باتیں مثلاً ان کا یہ قول:

(اَنَا حَمَیْتُ الْحِمیٰ واَنَا سَکَنْتُ فِیْہِ و اَنَا تَرَکْتُ الْخَلاَئِقَ فِیْ مَجَارَی التِّیْہِ مُوْسیٰ عَلَی الطُّوْرِ لَمَّا خَرَّ لِیْ نَاجَا وصاحب اَقرب انا جنبوہ حَتّٰی جَا یَوْمَ الْقِیَامَۃِ یَرَ الخلاق اَفواجا اِلیٰ (نبیہ) عِیْسیٰ یَقْضِیْ لَھُمْ حَاجَا) (یعنی میں نے ایک مقام اپنے رہنے کے لئے چنا ہے اور میں نے خلائق کو حیرانی کے میدانوں لا چھوڑا۔ موسیٰ طور پر جب بے ہوش ہوکر گرے تو ان سے سرگوشی کی، میرے ایک اقرب کو الگ کروحتی کہ وہ روزِ قیامت لوگوں کو گروہ در گروہ اس کے نبی عیسی کے پاس جاتا دیکھے گا جو ان کی حاجت برآری کریں گے)

یہ بھی کہا: (ترجمہ) آؤ جامع (مسجد) کو گرادیں اور اسے جلا کر راکھ بنا دیں، منبر توڑ ڈالیں اور اس کی لکڑیوں سے جنئو بنالیں، قرآن کے اوراق جلا ڈالیں اور اسے (نعوذ باللہ) گٹار بنالیں، قاضی کی داڑھی نوچ لیں اور اس سے تانت بنالیں، میں ہی عرش پر جلوہ افروز ہواحتی کہ اس میں دھمک پیدا ہوئی اور میں ہی ہوں جو محمد میں بولاحتی کہ ان کا شعلہ کوندا، ساتوں سمندر میری ہیبت سے لرزہ براندام ہیں

اور کئی اور امور جو ان مذکورات سے بھی خطرناک ہیں انہیں تونقل بھی نہیں کیا جاسکتا کیونکہ ان میں جو کفر ہے وہ کسی کے یہ کہنے کے کفر سے بھی بڑا ہے کہ اللہ صاحبِ اولاد ہے، جہاں تک دوسری بات کہ فلاں کی شرمگاہ عورتوں جیسی ہو جاتی ہے تو یہ صریح اور من گھڑت جھوٹ ہے، اس کے طریقہ میں ایسی منکرات ہیں جو اسلام کے مخالف اور اہلِ اسلام کیلئے اجنبی ہیں، اس کے اصحاب اس سے کفریہ اقوال نقل کرتے ہیں جیسے اس کا یہ قول: اگر میں ستر نبیوں کو بھی قتل کردوں تو خطا کار نہ بنوں حالانکہ ایک نبی کو بھی قتل کرنا عظم ترین کفر میں سے ہے، ایک مرفوع حدیث میں ہے قیامت کے دن سب سے سخت عذاب والا وہ شخص ہوگا جس نے نبی کو قتل کیا ہوگا یا جسے نبی نے قتل کیا، اگر کہا جائے (بزعم خود) حقیقت کے مشاہدین قدری کو نی بھی یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ بندوں کے افعال کا خالق ہے تو یہ

عذرِ گناہ بدتر از گناہ است والی بات ہوئی کیونکہ اگر تقدیر کا یوں سہارا لینا اوراپنے آپ کو معذور سمجھنا حجت ہوتی تو پھر ابلیس، فرعون اورنمرود جیسے کفار کا کیا دوش، نہ دنیا میں اور نہ آخرت میں، اس سے پوچھو اگر کوئی کسی پر زیادتی کرے اوراس سے لڑائی کرے یا گالم گلوچ ہوتو وہ تقدیر کو بطورِ حجت پیش نہیں کرسکتا تو اللہ و رسول کے ساتھ کفر کرنے والا کیونکر تقدیر کی حجت کا سہارا لے سکتا ہے؟ اورحضرت آدم علیہ السلام اس لئے مکالمہ میں حضرت موسیٰ پر غالب رہے کیونکہ انہوں نے عالمِ انسانیت کو پہنچی مصیبت پر انہیں ملامت کا نشانہ بنایا تھا، یہ ملامت اس وجہ سے نہ کی تھی کہ وہ اس کے باعث گناہ گار ہوئے کیونکہ انہوں نے توبہ کرلی تھی اورتائب ایسا ہو جاتا ہے گویا اس نے گناہ کا ارتکاب کیا ہی نہ ہو، بلکہ ان سے کہا تھا آپ کی وجہ سے ہم سب اورآپ بھی جنت سے نکالے گئے، اس پر ان کا جواب تھا کہ تم مجھے ایسے امر پر ملامت کرتے ہو جو اللہ نے میری تخلیق سے چالیس سال قبل ہی میرے لئے مقدر کر دیا تھا؟ اسی طرح ہر جسے کسی جہت سے کوئی مصیبت لاحق ہوتو اسے حکم ہے کہ وہ اللہ کی تقدیر کو تسلیم کرلے جیسا کہ فرمایا:

﴿وَمَنْ يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ﴾ [التغابن : **11**] (اور جو شخص اللہ پر ایمان لاتا ہے وہ اس کے دل کو ہدایت دیتا ہے) اس کی تفسیر میں علقمہ نے کہا یہ ایسا آدمی جسے مصیبت پہنچی تو جانتا ہے کہ یہ اللہ کی جانب سے ہے تو تسلیم و رضا کا نمونہ بنتا ہے! جہاں تک ذنوب تو انسان پر واجب ہے کہ ان کا ارتکاب نہ کرے اگر سرزد ہو جائیں تو توبہ کرلے تو جس نے توبہ کی اور نادم ہوا تو وہ ابو البشر حضرت آدم سے مشابہ ہوا اور جو گناہ پر مصر رہا اورحجتیں کیں وہ ان کے دشمن ابلیس سے مشابہ ہوا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿فَاصْبِرْ إِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ﴾ [غافر: ۵۵] (تو صبر کرو بے شک اللہ کا وعدہ سچا ہے اوراپنے گناہوں کی معافی مانگو) تو مومن مامور ہے کہ مصائب پر صبر کا دامن نہ چھوڑے اورذنوب و معاصی سے استغفار کرے۔

فصل

اور جو مدعیِ نبوت ہے اورلواطت جیسی بے حیائی کی اباحت کا قائل ہے اورنکاح کو حرام کہتا ہے تو اس کے کفر میں تو کوئی شک ہی نہیں، بلا شبہ وہ بالاجماع خبیث ترین مرتد ہے اس کا اوراس کے اتباع کا قتل واجب ہے، ان سے یا تو دلیل کے ساتھ بات کی جائے شائد کہ اللہ تعالیٰ ہدایت وتوبہ کی توفیق دے یا پھر (یعنی اگر یہ طریقہ مفید ثابت نہ ہوتو) حد قائم کی جائے اوراسے قتل کیا جائے تو جس کسی کو بھی ان دونوں میں سے کسی امر کی قدرت ہے وہ یہ کرے اور جو دونوں سے عاجز رہے تو اللہ ہر نفس کو اسی کا مکلّف بناتا ہے جس کی اس میں طاقت ہے لیکن اس پر واجب ہے کہ معروف کو پہچانے، اسے پسند کرے اورمنکر کا انکار کرے اور اسے ناپسند کرے جیسا کہ صحیح حدیث میں ہے: (مَنْ رَآىٰ مِنْكُمْ مُنْكَراً فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهٖ فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهٖ وَ إِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهٖ) اور فرمایا اس سے ورے ذرہ برابر بھی ایمان نہیں۔

استفتاء

ہمیں دو ایسے اشخاص کے بارہ میں فتوی دیجئے جن کی ان دو اشعار کی بابت باہم بحث وتمحیص ہوئی:

اَلرَّبُّ حَقٌّ وَ الْعَبْدُ حَقٌّ   یَا لَیْتَ شِعْرِیْ مَنِ الْمُکَلَّفُ
اِنْ قُلْتَ عَبْدٌ فَذَاکَ مَیِّتٌ   اَوْ قُلْتَ رَبٌّ اَنّٰی یُکَلَّفُ

(یہ اشعار گزرے ہیں، **نظریہ وحدت الوجود**) تو ایک نے کہا یہ کفر یہ قول ہے کیونکہ قائل نے رب اور بندے کو ایک حق قرار دے دیا بغیر تفریق کئے اور تکلیف (یعنی شرع کی قیود) کا ابطال کر دیا جب کہ دوسرے نے کہا تم مفہوم نہیں سمجھے اور تم نے قائل کے ذمہ وہ عقیدہ دھر دیا ہے جو اس کا اعتقاد اور قصد نہیں، اس نے دراصل کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ربوبیت میں اور بندہ اپنی عبودیت میں حق ہے تو نہ رب عبد ہے اور نہ عبد رب، جیسے تم نے گمان کیا، پھر شاعر نے کہا: (یَا لَیْتَ شِعْرِیْ الخ) تو حیرت میں ہوا کہ اس (یعنی تکلیف) کے ساتھ قیام کس کی طرف منسوب کرے؟ اگر کہو بندہ مکلّف ہے تو وہ تو میت ہے اور میت کے لئے کوئی حرکت نہیں بلکہ اسے تو دوسرے جیسے چاہیں ادل بدل کرتے ہیں، اسی طرح عبد کا معاملہ ہے۔ اگرچہ وہ زندہ ہو۔ تو وہ اپنے رب کے ساتھ اس طرح ہے گویا میت اپنے غاسل (یعنی غسل دینے والے) کے سامنے یعنی اللہ کے بغیر ذاتی طور سے کسی فعل پر وہ قادر نہیں کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ شرعی فرائض کی بجا آوری کی اسے طاقت نہ دے تو وہ اس پر قادر نہ ہوتا تو حقیقت میں ہر فعل اللہ کے لئے ہے اور عبد کی طرف اس کی نسبت مجازی ہے، اس کی دلیل ایک ذکر کے یہ کلمات ہیں: (لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ) یعنی معصیت سے بچنے اور طاعت بجالانے پر قوت نہیں مگر اللہ کے ساتھ، اور معلوم امر ہے کہ رب غیر مکلّف ہے کیونکہ اس کے لئے کوئی مکلِف نہیں اور عبد تکالیف کی بجا آوری پر پورا نہیں اتر سکتا مگر اللہ (کی توفیق) کے ساتھ اور تکلیف حق ہے تو اس شاعر نے اس حال کے ملحوظ کے وقت تعجب کیا ہے اور اس کے اقرار کے باوجود اس بابت وہ قعرِ حیرت میں گم ہے، ہاں البتہ اسے ہر کس و ناکس کے سامنے ایسی کلام پیش کرنے میں احتیاط کرنی چاہئے بالخصوص جو یہ باریکیاں نہیں سمجھتے تو یہ فہمِ ناقص کا قصور ہے جو مستفسر ہے کہ ان میں سے کون سی کلام حق ہے؟

شیخ نے مزید کہا اس ثانی کی کلام باطل ہے، اس نے اس موضوع پر لب کشائی ہے جس کا اس نے احاطہ نہیں کیا اور اس کی حقیقت سے وہ نا آشنا ہے اور نہ وہ ابن عربی کے قول اور اس کی اصل سے واقف ہوا ہے جس سے یہ شعر وغیرہ متفرع ہے اور نہ ہی اس نے اس لفظ اور اس کے مدلول کا اخذ کیا ہے! جہاں تک ابن عربی (کے عقیدہ) کی اصل تو وہ یہ ہے کہ وجود واحد ہے اور وجودِ واجب ہی عین وجودِ ممکن ہے اور یہ کہ معدوم (بھی ایک) شئ ہے اور معدومات کے اعیان عدم میں ثابت ہیں اور وجودِ حق ان پر فائض (یعنی اپنے فیض سے نوازتا) ہے تو ان کے نزدیک ہر شئ کا وجود عین وجودِ حق ہے۔ اس کی تفصیلی بحث ایک جگہ کی ہے۔ اسی لئے ابن عربی کا قول ہے کہ جب فرعون منصبِ تحکم میں صاحبِ وقت تھا اور خلیفہ بالسیف تھا (یعنی طاقت کا سرچشمہ) تو اگرچہ عرفِ ناموسی کی رو سے وہ ظالم اور جابر تھا اسی لئے کہا:

(اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى)[النازعات: ۲۴] (کہنے لگا کہ تمہارا رب اعلی ہوں)یعنی اگر چہ سبھی اپنے اپنے حساب سے ارباب ہیں لیکن میں سب سے بالا دست ہوں اس وجہ سے جو مجھے ان پر حکمرانی تفویض کی گئی ہے اور جادو گر اس کی اس کلام کے صدق کے معترف تھے لہذاانکار نہ کیا اور کہا:

(فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ اِنَّمَا تَقْضِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا)[طٰہٰ: ۷۲] (تو آپ کو جو حکم دینا ہو دے دیجئے اور آپ حکم دے سکتے ہیں وہ صرف اسی دنیا کی زندگی میں) کیونکہ حکمرانی اور طاقت اس کے پاس تھی لہذا (ابن عربی کی رائے ہے کہ) فرعون کا **(اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى)** کہنا صحیح ہے اگر چہ وہ عین الحق ہے،ابن عربی کے بقول اسمائے حسنیٰ میں سے ایک (اَلْعَلِیُّ) بھی ہے تو کن پر وہ علی (یعنی فائق و بالا دست) ہے؟ کائنات میں تو بس وہی ہے، پھر کن سے وہ علی ہے؟ کیونکہ بس وہی تو ہے، مزید کہا اعداد بارے ہماری تقریر (یعنی بحث ونظریہ) سے جو واقف ہے اور یہ کہ ان کی نفی عین ان کا اثبات ہے، وہ جانتا ہے کہ حقِ منزہ خلقِ مشبہ ہےتو آمرِ خالق ہی مخلوق اور مامورِ مخلوق ہی خالق ہے! یہ سب کے سب عین واحدۃ سے نہیں بلکہ عین واحدہ ہیں (یعنی وحدت الوجود) اور کہا کیا تم دیکھتے نہیں کہ حق خلق کی صفات کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے تو سب صفاتِ خلق (کتاب میں یہاں خلق کی بجائے حق ہے) اس کے لئے حق ہیں جیسے محدثات کی صفات خالق کے لئے حق ہیں، اس کا نحو اس کی کلام میں کثیر ہے، دراصل اس شخص (یعنی ابن عربی) کے سلوک میں ملحد قرامطہ کی ترتیب کی جنس سے ترتیب ہےتو اولین ظہور معتزلہ کلابیہ کا اعتقاد ہے جو خبری صفات کی نفی اور صرف سات یا آٹھ صفات کا اثبات کرتے ہیں پھر اس کے بعد فلاسفہ کا اعتقاد ہے جو صفات کی نفی کرتے ہیں اور ایک واجب ومجرد وجود کا اثبات کرتے ہیں جس سے ممکنات کا صدور ہوا پھر اس کے بعد وہ اس وجود کو ہر موجود کا وجود قرار دیتا ہے، تو اس کی نظر میں کائنات میں دو وجود نہیں: ایک واجب اور دوسرا ممکن اور نہ ایک خالق اور دوسرا مخلوق ہے بلکہ عین وجودِ واجب ہی عین وجودِ ممکن ہے البتہ مراتب الگ الگ ہیں، اس کے نزدیک مراتب عدم میں ثابت اعیان ہیں اس شخص کے حسبِ زعم جو قائل ہے کہ معدوم شئ ہے اور بلا شبہ جو معدوم کو ذہن سے خارج ایک ثابت شئ مانتا ہے اس کا خیال باطل ہے لیکن یہ حضرات کہتے ہیں کہ خالق نے ان اعیان کے لئے ایک مخلوق وجود بنایا ہے جبکہ ابن عربی قائل ہے کہ بلکہ خالق کا وجود ہی ان پر فائض ہے تو یہ اپنے وجود میں اس کے محتاج ہیں اور وہ (یعنی خالق) انہیں ثابت کرنے کا محتاج ہے، اسی لئے کہا: (فَيَعْبُدَنِیْ وَ اَعْبُدَهٗ وَ يَحْمِدَنِیْ وَ اَحْمَدهٗ) (یعنی میں اس کا اور میرا معبود ہے اور وہ میرا اور میں اس کا حامد ہوں) اور اسی لئے اس کی نظر میں تکلیف ممتنع ہے کیونکہ تکلیف مکلِف سے مکلَف کے لئے ہوتی ہے کہ ان کا ایک آمر اور دوسرا مامور ہوتا ہے، اس نے اپنے اس موقف کے لئے نبی اکرم کے اس فرمان کو بطورِ دلیل پیش کیا: (اِنَّ اللّٰهَ تَجَاوَزَ لِاُمَّتِیْ عَمَّا حَدَّثَتْ بِهٖ اَنْفُسُهَا مَا لَمْ تَتَكَلَّمْ بِهٖ اَوْ تَعْمَلْ بِهٖ) (بے شک اللہ میری امت کے دلوں کے خیالات کا مواخذہ نہ کرے گا حتی کہ انہیں زباں پہ لایا جائے یا عملی جامہ پہنایا

جائے) تو جب یہاں محدَث ہی محدَث ہے تو اسے رب کے وجود کے لئے مثل بنایا تو اس کے نزدیک عالَمِ وجود میں ہر کلام اسی کی کلام ہے، وہی متکلم اور وہی مستمع ہے اسی لئے کہا: (إنْ قُلْتَ عَبْدٌ فَذَاكَ مَيِّتٌ) ایک جگہ خود اس کے خط سے میں نے اسے یوں لکھا دیکھا: (إنْ قُلْتَ عَبْدٌ فَذَاكَ نَفْيٌ) کیونکہ اس کے نزدیک عبد کے لئے مخلوق وجود نہیں بلکہ اس کا وجود درحقیقت واجب و قدیم وجود ہے، اس پر ایک جگہ مفصل بحث ہے تو آدمی کی مختلف مواضع کی کلام ایک دوسری کی تفسیر کرتی ہے اور یہ اصل ۔یعنی وحدت الوجود کا نظریہ۔ اس کا اور ابن سبعین کا قول ہے اسی طرح اس کے تلامذہ واتباع: ششتری، تلمسانی، صدر قونوی، سعید فرغانی، عبداللہ بلیانی اور ابن فارض صاحبِ نظم السلوک اور کئی اور اہلِ الحاد کا، یہ سب وحدت الوجود، حلول اور اتحادِ ذات کے قائل ہیں

جہاں تک اس شعر کا مدلول تو اس کا قول: (يَا لَيْتَ شِعْرِيْ مَنِ الْمُكَلَّفُ) استفہام انکاری ہے پھر کہا: (إن قلت عبد الخ) ایک جگہ (فذاك نَفْيٌ) کہا تو یہ دونوں باطل ہیں کیونکہ عبد موجود وثابت (حقیقت) ہے معدوم اور منتفی نہیں اللہ تعالیٰ نے اسے موجود وثابت بنایا ہے، یہی مسلمانوں کا عقیدہ و دین ہے کہ ہر ماسوا اللہ اللہ کی موجود مخلوق ہے، اللہ کے اسے وجود مرحمت کرنے کے سبب تو بجز اللہ کی اِعطاء کے کسی شئ کے لئے وجود نہیں ہوسکتا اور وہ (یعنی مخلوق) اپنے نفس کے اعتبار سے بجز عدم کے کسی کا مستحق نہیں تو اللہ سبحانہ ہی نے زندہ کو زندہ کیا، اسی نے مسلمان کو مسلمان اور نمازی کو نمازی بنایا ہے جیسے حضرت ابراہیم نے دعا کی تھی: (رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ) اور (رَبِّ اجْعَلْنِيْ مُقِيْمَ الخ) یہ مسئلہ بندوں کے افعال کی خلق کا ہے اور یہی اہل سنت والجماعت کا مذہب ہے، ان کے اس امر پر اتفاق کے ساتھ کہ عبد مامور، منہی، مثاب، معاقَب، موعود اور متوعَد (یعنی وعید کا مخاطَب) ہے، اسی ذاتِ باری تعالیٰ نے سفید کو سفید اور سیاہ کو سیاہ بنایا اور طویل کو طویل، کوتاہ کو کوتاہ، متحرک کو متحرک، ساکن کو ساکن، تازہ کو تازہ، خشک کو خشک، نر کو نر، مادہ کو مادہ، میٹھے کو میٹھا اور کڑوے کو کڑوا بنایا، اس کے باوصف اعیان ان صفات کے ساتھ متصف ہیں اور اللہ تعالیٰ ذوات اور ان کی صفات کا (بھی) خالق ہے تو ذاتِ مخلوقہ کے اپنی صفات کے ساتھ اتصاف میں کیا تعجب ہے؟ تو قائل کے یہ کہنے: (الرَبُّ حَقٌّ والْعَبْدُ حَقٌّ) سے اگر مراد یہ کہ یہ حق عین وہ حق ہے تو یہ اتحاد اور الحاد ہے اور یہ تکلیف کے منافی ہے اور اگر مراد یہ ہے کہ عبد مخلوق حق ہے جسے خالق نے تخلیق کیا ہے تو یہی تو مسلمانوں کا مذہب ہے اور یہ اس امر کے منافی نہیں کہ خالق مخلوق کے لئے ممکن ہو جیسا کہ وہ اس کا خالق ہے، اس کا قول: (إن قُلْتَ عَبْدٌ فَذَاكَ مَيِّتٌ) کذب ہے، عبد میت نہیں بلکہ وہ زندہ ہے جسے اللہ نے حیات عطا کی ہے جیسے فرمایا:

(كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ كُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ)[البقرة : ۲۸] (تم اللہ تعالیٰ سے کیونکر منکر ہو سکتے ہو؟ جبکہ تم بے جان تھے تو اس نے تمہیں جان بخشی) اور اللہ نے میت کو مکلّف نہیں کیا وہ تو صرف زندہ کو مکلّف کرتا ہے، اگر کہا جائے اس کی مراد یہ ہے کہ اس کے اپنے نفس کے اعتبار اس کے لئے کوئی حیات نہیں تو کہا جائے گا اس کی مراد کی یہ تفسیر کرنا لفظی اور معنوی لحاظ سے فاسد ہے!

جہاں تک لفظ تو اس لئے کہ اس کی کلام اس کی مقتضی نہیں اور جہاں تک معنی تو اس وجہ سے کہ اگر یہ تفسیر کی جائے تو یہ تکلیف کے منافی نہیں تو اگر وہ اللہ کے اسے حیات مرحمت کرنے سے زندہ ہے تو پھر اللہ نے زندہ کو مکلّف کیا ہے نہ کہ میت کو، جہاں تک ملاحدہ اوران کا دفاع کرنے والوں کے ساتھیوں کا یہ کہنا: (لَيْتَ شِعْرِیْ مَنِ الْمُكَلِّفُ ؟) ان کے اس علم کے باوجود کہ تکلیف حق ہے تو وہ اس امر میں حیران ہے کہ کس کی طرف اسے منسوب کرے؟ اور سوال کرے کہ اگر عبد کی طرف اس کی نسبت کریں تو وہ اس طرح ہے جیسے غاسل کے سامنے میت ہو کہ اپنی مرضی سے کچھ نہیں کرسکتا تو بندہ بھی اللہ کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں کرسکتا لہذا اصل مکلف اللہ تعالی ہوا نہ کہ بندہ کیونکہ بغیر اللہ کے خود اس کی طرف سے اس کیلئے کوئی فعل نہیں تو ان سے کہا جائے گا یہ عذر کئی وجوہ سے باطل ہے:

(۱) اس لئے کہ حیران ہونے کی کوئی بات نہیں بلکہ بلاشبہ اور بلا حیرت عبد ہی مکلّف ہے اللہ تعالیٰ کی نسبت ممتنع ہے کہ وہ روزہ رکھنے اور طواف کرنے وغیرہ کے ساتھ مکلّف ہو بلکہ وہ تو ان کا آمر ہے اور عبد مامور تو اس ضمن میں حیرانی کا اظہار کرنے والا یا تو دیوانہ فاسد العقل ہے یا فاسد الدین ملحد وزندیق، اللہ کا عبد اور اس کے فعل کا خالق ہونا اس امر کے مانع نہیں کہ عبد مامور اور منہی ہو، کہ کسی نے نہیں کہا کہ اللہ ہی رکوع، سجدہ اور طواف کرتا ہے اور ماہِ رمضان کے روزے رکھتا ہے اور جمرات کو کنکریاں مارتا ہے بلکہ ساری امت متفق ہے کہ عبد ہی یہ سب افعال بجالاتا ہے، اہلِ سنت اور قدریہ کے مابین اس ضمن میں کوئی تنازع نہیں

(۲) اس کا کہنا کہ عبد اگرچہ زندہ ہے مگر اپنے رب کے ساتھ وہ غاسل کے سامنے میت کی مثل ہے، صحیح نہیں کیونکہ میت کے لئے نہ احساس ہے نہ ارادہ اور نہ کسی قسم کی حرکت اور نہ اس کی بابت کہا جاتا ہے کہ اس سے کسی نوع کا فعل صادر ہوتا ہے، زندہ کو تو اللہ تعالیٰ نے صاحبِ ارادہ وقدرت اور فاعل بنایا ہے وہ نماز اور روزہ اور دیگر اعمالِ طاعت بجالاتا ہے اسی طرح وہ اپنے اختیار سے معصیت کے کام بھی کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کی ذات، صفات اور افعال کا خالق ہے تو اس کے لئے مشیت ہے اور اللہ اس کی مشیت کا بھی خالق ہے جیسا کہ کہا:

(لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ)[کورت : ۲۸۔ ۲۹] (جو تم میں سے سیدھی چال چلنا چاہے۔ اور تم کچھ بھی نہیں چاہ سکتے مگر وہی جو اللہ رب العالمین چاہے) اور اس کے لئے قدرت ہے اور اللہ اس کی قدرت کا خالق ہے لہذا میت کے ساتھ اس کی تمثیل باطل تمثیل ہے

(۳) کہ کہا جائے اگر وہ غاسل کے سامنے میت کی طرح ہے تو غسل دینے والا (گویا) مکلِف ہے تو اللہ مکلّف ہوا تو لازم ہے کہ رب ہی مکلّف بنے

(۴) عقلائے بنی آدم اس فطرت (کی حقانیت) پر متفق ہیں جس پر اللہ نے بندوں کو پیدا کیا ہے کہ زندہ ہی امر و نہی کرتا ہے اور اپنے اختیاری افعال پر وہ محمود و مذموم ہے، اس امر پر بھی متفق ہیں کہ جس نے اپنے ظلم و زیادتی اور تقصیر پر تقدیر کا عذر پیش کیا تو یہ

اس سے قبول نہ کیا جائے گا لیکن کوئی عاقل میت کی ذم نہیں کرے گا اور نہ اسے امر ونہی دے گا تو اس پر زندہ کو کیونکہ قیاس کیا جا سکتا ہے؟ جہاں تک قائل کا کہنا کہ اگر اللہ تعالیٰ پابندیِ شرع پر بندے کو قوی نہ کرے تو وہ اس کی قدرت نہ رکھے، یہ صحیح کلام ہے لیکن اس میں کوئی ایسی چیز نہیں جو اس کے مکلف، مامور، منہی، نمازی، روزہ دار یا قاتل وزانی ہونے کے منافی ہو! جہاں تک اس کا کہنا کہ حقیقۃً سب افعال اللہ کے لئے ہیں بندے کی طرف اس کی نسبت مجازی ہے تو یہ باطل کلام ہے بلکہ بندہ ہی (حقیقۃً) نماز پڑھ رہا ہے، روزہ رکھ رہا ہے اور سب افعالِ خیر وشر بجا لاتا ہے اور اللہ تعالیٰ ان صفاتِ افعال میں سے کسی کے ساتھ موصوف نہیں کیا جا سکتا بلکہ وہ اس سے منزہ ہے لیکن اس نے بندے کو ان افعال کا فاعل بنایا ہے تو یہ افعال حقیقۃً اللہ کی مخلوقات اور مفعولات تو ہیں مگر بندے کے لئے بھی حقیقۃً افعال ہیں لیکن تقدیر کا اثبات کرنے والے اہلِ کلام کے ایک گروہ کا موقف ہے کہ فعل ہی مفعول اور خلق ہی مخلوق ہے تو جب انہوں نے اعتقاد رکھا کہ بندوں کے افعال اللہ کے لئے مخلوق ومفعول ہیں اور کہا یہ اللہ کا فعل ہیں تو ان سے پوچھا گیا کیا یہ بندے کا (بھی) فعل ہے؟ تو ان سے کوئی جواب نہ بن پڑا، بعض نے کہا یہ بندے کا فعل نہیں بلکہ کسب ہے مگر وہ فعل اور کسب کے درمیان کوئی محقق فرق بیان نہ کر سکے، بعض نے کہا بلکہ یہ دو فاعلوں کے درمیان فعل ہے اور بعض نے کہا بلکہ رب ذاتِ فعل اور بندہ صفاتِ فعل کا فاعل ہے، صحیح وہ جس پر ائمہ سنت اور جمہورِ امت ہیں کہ فعل ومفعول اور خلق ومخلوق کے درمیان فرق ہے تو بندوں کے افعال دیگر محدَثات کی طرح مخلوق ہیں جبکہ یہ اللہ کے لئے مخلوق ہیں جیسے بندے کا نفس اور اس کی سب صفات اللہ کی مخلوق ہیں اور یہ اس کا نفسِ خلق وفعل نہیں بلکہ مخلوق ومفعول ہیں اور یہ افعال فعلِ عبد ہیں، اسی سے یہ سرزد ہوئے نہ کہ اللہ سے اور وہ ان کے ساتھ متصف نہیں کیونکہ وہ اپنی مخلوقات ومفعولات کے ساتھ موصوف نہیں کیا جا سکتا، وہ صرف اپنی خلق وفعل کے ساتھ متصف ہے جیسے ان سب کے ساتھ جو اس کی ذات کے ساتھ قائم ہیں اور بندہ ان افعال کا فاعل اور ان کے ساتھ متصف ہے اور اس کے لئے ان پر قدرت ہے اور وہ اپنے اختیار ومشیت سے ان کا فاعل ہے اور یہ سب اللہ کے لئے مخلوق ہیں تو یہ فعلِ عبد اور مفعولِ رب ہیں لیکن یہ صفات (یعنی افعال) اللہ نے بندے کی قدرت کے توسط اور اس کی مشیت سے پیدا نہیں کیں بخلاف اس کے اختیاری افعال کے کہ اللہ نے ان کی تخلیق اپنی خلق کے توسط سے بندے کی مشیت اور اس کی قدرت کے لئے کی ہے جیسے دیگر مسببات کی اسباب کے واسطہ سے تخلیق کی، اس کی ایک جگہ تفصیلی بحث کی ہے یہاں اسی قدر بیان کافی ہے۔

استفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اور مفتیانِ شرع متین ایک کتاب کے بارہ میں جو حال ہی میں منصۂ ظہور میں آئی ہے، اس کے مصنف کا زعم ہے کہ اس نے اپنی یہ کتاب نبی اکرم کی اذن سے جو اسے آپ نے خواب میں دی، تالیف کی ہے اور اس کے اکثر مندرجات کتاب اللہ اور سنتِ رسول کے برخلاف اور معاکس ہیں، اس میں منجملہ باتوں کے یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت آدمؑ کو انسان کا نام

اس لئے دیا گیا کیونکہ وہ حق تعالی کی نسبت ایسے ہیں جیسے آنکھ کے لئے پتلی جس کے ساتھ انسان دیکھتا ہے، ایک جگہ لکھا: حقِ منزہ خلقِ مشبہ ہے، حضرت نوحؑ کی قوم بارے لکھا اگر وہ وَد، سواع، یغوث، یعوق اور نسر کی عبادت ترک کردیتے تو حق سے جاہل رہ جاتے، پھر لکھا: بے شک حق (باری تعالیٰ) کے لئے (دنیا کے) ہر معبود میں ایک وجہ ہے جسے اہلِ معرفت ہی پہچانتے ہیں اور بے شمار اس سے جاہل ہیں، تو عالم چاہے جس صورت کا بھی معبود ہو وہ اصل معبود کو جانتا ہے اور تفریق و کثرت صورتِ محسوسہ میں اعضاء کی مثل ہیں پھر حضرت ہودؑ کی قوم کی بابت کہا کہ وہ عینِ قرب میں واصل ہوگئے حتی کہ بُعد زائل ہوا تو ان کے حق میں مسمیٰ جہنم زائل ہوگیا تو وہ نعیم القرب کے ساتھ فائز ہوئے اس جہتِ استحقاق سے جو اللہ نے انہیں یہ لذیذ و ذوقی مقام عطا کیا ان پر احسان کرنے کی جہت سے تو انہوں نے اس کا اخذ کیا اس وجہ سے جو ان کے اعمال میں سے ان کے حقائق جس امر کے مستحق ہوئے جو وہ اعمال کرتے رہے اور کہا کہ وہ اللہ کی صراطِ مستقیم پر گامزن تھے، نیز اس نے اپنی کتاب میں انسانوں کے حق میں وعید کا انکار کیا ہے!

تو کیا اس کی ان باتوں کی تصدیق کرنے والا کافر ہو جائے گا یا نہیں؟ یا وہ ان پر راضی ہو یا نہیں؟ اور کیا اس کتاب کا عاقل و بالغ سامع آثم ہوگا اگر اپنی زبان یا دل کے ساتھ اس کا انکار نہ کرے؟ واضح اور مفصل جواب مرحمت فرمائیں۔

تو جواب میں لکھا:

الحمد للہ رب العالمین! یہ مذکورہ کلمات قابلِ انکار و رد ہیں، جو باتیں درج کی ہیں وہ سب کفر ہیں، تمام اہلِ ملل مسلمانوں، یہودیوں اور عیسائیوں کا اس پر اتفاق ہے، قائل کا حضرت آدم کی بابت مذکورہ بات کہنا مقتضی ہے کہ وہ حق تعالی کا جزو اور اس کا بعض ہیں اور وہ اللہ کا افضل جزو ہیں، یہ ان لوگوں کے مذہب کی حقیقت ہے اور یہ ان کے اقوال میں سے معروف ہے! دوسری بات کہ حقِ منزہ ہی خلقِ مشبہ ہے اسی کے موافق ہے، اسی لئے اس کے آخر میں کہا: تو امرِ خالق مخلوق اور امرِ مخلوق خالق ہے یہ سب ایک ہی عین سے ہیں، نہیں بلکہ ایک ہی عین ہیں اور کائنات میں کئی عیون ہیں **﴿فَانْظُرْ مَا ذَا تَرٰی﴾[الصافات: ۱۰۲]** (دیکھو تو تمہارا کیا خیال ہے؟) **﴿یَا اَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ﴾** (ابا جان جو آپ کو حکم ہوا ہے وہی کیجئے اللہ نے چاہا تو آپ مجھے صابروں میں پائیں گے) اور بیٹا اپنے والد کی عین ہے تو اسے سوائے اپنے آپ کے کسی کو ذبح کرتے نہ دیکھا تھا **﴿فَفَدَیْنَاہُ بِذِبْحٍ عَظِیْمٍ﴾[الصافات: ۱۰۷]** (اور ہم نے اس کے عوض ایک بڑی قربانی مہیا کی) تو مینڈھے کی صورت میں وہی ظاہر ہوا تھا جو انسان کی صورت میں ظاہر ہوا تھا اور وہ ایک صورت میں ظاہر ہوا نہ کہ ولد جو کہ عینِ والد ہے **﴿خَلَقَ مِنْھَا زَوْجَھَا﴾ [النساء: ۱]** (اس سے اس کا جوڑا بنایا) تو انہوں (یعنی حضرت آدم) نے اپنے آپ سے ہی نکاح کیا تھا، ایک جگہ کہا: (وَھُوَ الْبَاطِنُ عَنْ کُلِّ فَھْمٍ إِلَّا عَنْ فَھْمِ مَنْ قَالَ إِنَّ الْعَالَمَ صُوْرَتُہٗ وَھُوِیَّتُہٗ) (وہ ہر فہم سے باطن ہے مگر اس کی فہم سے جو قائل ہیں کہ کائنات اس کی صورت اور اس کی ہویت ہے) اور کہا اسمائے ربانی میں سے ایک علی ہے تو کس پر وہ بلند و برتر ہے؟

کا ئنات میں تو بس وہ ہی وہ ہے، وہ من حیث الوجود عینِ موجودات ہے، بس مسمیٰ محدثات ہے جو لذاتہا بلند وبالا ہے اور یہ نہیں مگر وہ، حتیٰ کہ کہا کہ وہ (عَیْـنُ مَا ظَهَرَ) (یعنی ظاہری موجودات کا عین) اور (عَیْـنُ مَا بَطَنَ) ہے (یعنی باطنی موجودات کا عین) اس کے حالِ ظہور میں اور کائنات میں کوئی شیٔ نہیں جو اس کی غیر نظر آتی ہو اور نہ یہاں کوئی اس کے سوا ناطق ہے پس وہ اپنے نفس کے لئے ظاہر اور اس سے باطن ہے اور وہ مسمی ابوسعید خراز ہے اور دیگر اسمائے محدثات میں سے، حتیٰ کہ کہا: لنفسہ (اَلْـعَلِیُّ) وہ ہوتا ہے جس کے لئے کمال ہو، وہ جس کے ساتھ تمام وجودی امور اور عدمی نسبتیں متفرق ہیں چاہے یہ عرفاً، عقلاً اور شرعاً محمود ہوں یا مذموم اور یہ نہیں مگر خاص مسمی اللہ کے لئے، اور کہا: کیا تم دیکھتے نہیں کہ حق محدثات اور نقص وذم کی صفات کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے اور اس کی اس نے اپنے آپ سے خبر دی ہے، کیا دیکھتے نہیں مخلوق صفاتِ حق کے ساتھ ظاہر ہوتی ہے تو یہ اول تا آخر اس کے لئے صفات ہیں جیسا کہ یہ محدثات کی صفات حق (تعالیٰ) کے لئے حق ہیں اور اس نوع کی اور کلام

تو کتابِ مذکور جو کہ فصوص الحکم ہے (مصنفہ ابن عربی) کا مصنف اور اس کے امثال مثلا اس کا شاگرد قونوی اور تلمسانی، ابن سبعین، ابن فارض اور ان کے اتباع وغیرہ کا مذہب یہ ہے کہ کائنات میں صرف ایک وجود ہے، یہ وحدت الوجود والے کہلاتے ہیں اور تحقیق وعرفان کے مدعی ہیں، یہ وجودِ خالق کو عین وجودِ مخلوقات قرار دیتے ہیں تو جب اور جہاں کہیں مخلوقات حسن، قبح، مدح اور ذم وغیرہ صفات کے ساتھ متصف ہوگی ان کی نظر میں اس کے ساتھ اصل متصف عینِ خالق ہے، ان کے ہاں خالق کے لئے اصلاً ہی مخلوقات کے وجود سے الگ کوئی وجود نہیں بلکہ ان کی نظر میں کائنات میں بجز خالق کے وجود اور ذات کے کچھ نہیں، ان کے مقولات میں سے ہے: (لَیْـسَ إِلَّا الـلّٰـهُ) (یہاں بس وہ ہی وہ ہے) تو بتوں کے پجاری دراصل اللہ کی ہی عبادت کر رہے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک اللہ کے سوا کچھ ہے ہی نہیں اسی لئے اس فرمانِ خداوندی:

﴿ وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ﴾[الإسراء : ۲۳] (اور تمہارے رب نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو) (قضیٰ) کا معنی (قَدَّرَ) کرتے ہیں (مقدر کیا ہے) کیونکہ کائنات بھر میں کوئی غیر اللہ ہے ہی نہیں جس کی پوجا کا تصور کیا جاسکے تو ہر صنم کا عابد دراصل اللہ کا عابد ہے اسی طرح یہ مصنف (قومِ حضرت موسیٰ کے) بچھڑے کے پجاریوں کو درست قرار دیتا اور ذکر کرتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے حضرت ہارونؑ پر اس لئے غصہ کا اظہار کیا تھا کیونکہ انہوں نے ان بچھڑے کے پجاریوں پر اظہارِ ناراضی کیا تھا، لکھتا ہے حضرت موسیٰ حضرت ہارون سے زیادہ معاملہ ہذا سے آگاہ تھے کہ جانتے تھے انہوں نے بچھڑے کی پوجا نہیں کی کیونکہ ان کے علم میں تھا کہ اللہ کا فیصلہ ہے کہ بجز اس کے کسی کی عبادت ہو ہی نہیں سکتی اور اللہ کا جو فیصلہ ہو وہی ہوتا ہے تو عارف وہ ہے جو ہر شیٔ میں حق (باری تعالیٰ) کو دیکھتا ہے بلکہ اسے وہ ہر شیٔ کا عین دیکھتا ہے اسی لئے یہ فرعون کو کبار عارفین اور محققین میں سے شمار کرتے ہیں اور یہ کہ اس کا دعوائے ربوبیت درست تھا جیسے اس کتاب میں لکھا: اور جب فرعون اپنے وقت کا صاحبِ حکم تھا اور عرفِ

ناموسی پر جاری تھا اسی لئے اس نے کہا: (**اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰی**) (کچھ قبل گزری) یعنی اگر چہ سبھی کسی نوع کے ارباب ہیں اور میں بوجہ اپنے منصب کے سب سے اعلیٰ رب ہوں اور جادوگروں نے اس کا انکار نہیں کیا کیونکہ اس کے اس دعویٰ کی درستگی جانتے تھے بلکہ اس کا اقرار کیا اور کہا: (**فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ**) (کچھ قبل گزری) کیونکہ حکومت آپ کے پاس ہے تو فرعون کا (**اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰی**) کہنا صحیح تھا اور وہ عین الحق تھا

ان کے کفر کی پہچان میں اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ ان کا اخف ترین قول یہ ہے کہ فرعون حالتِ ایمان میں مرا تھا اور گناہوں سے بری الذمہ تھا جیسے یہ بھی کہا کہ حضرت موسیٰؑ کی فرعون کے غرق ہوتے وقت حالتِ ایمان کا مشاہدہ کر کے آنکھیں ٹھنڈی ہو گئیں (بڑی دیر سے یہ پہچان آئی) جو اللہ نے اسے عطا کی اور اسے پاک وصاف کر کے روح قبض کی، اس میں کوئی برائی نہ تھی کیونکہ اس کی روح اس وقت قبض ہوئی جب ایمان لانے کے بعد ابھی ایک بھی گناہ کرنے کا اسے موقع نہ ملا تھا کیونکہ اسلام سابقہ سب گناہوں کو مٹا ڈالتا ہے حالانکہ تمام اہلِ ملل، مسلمانوں، یہودی اور نصاری بخوبی جانتے اور مقر ہیں کہ فرعون اللہ کی مخلوق کے کبار کافروں میں سے تھا بلکہ قرآن نے بطورِ خاص نام لے کر اس سے بڑے کافر کا قصہ بیان نہیں کیا اور نہ دنیا کا کوئی اور کافر ایسا ہے جس کا کفر فرعون کے کفر سے بڑا ہو، اس کے اور اس کے قوم کے بارہ میں خبر دی کہ وہ شدید تر عذاب میں ہوں گے کیونکہ آلِ فرعون کی ترکیب آلِ ابراہیم، آلِ داؤد، آلِ لوط اور آلِ ابی اوفی (یہ ایک حدیث میں واقع ہوئی) کی نظیر ہے، بالاتفاق اس میں مضاف بھی داخل ہے جب اللہ کے انسانوں میں سب سے بڑے دشمن اور کافر بارے یہ خیال ہے تو ان کی سب دیگر باتیں اور مقولات بھی اسی طرح کفریہ ہیں

امت کے سلف اور ائمہ متفق ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوقات سے بائن اور جدا ہے اس کی ذات میں اس کی مخلوقات میں سے کوئی شئ نہیں اور نہ اس کی مخلوقات میں اس کی ذات میں سے کوئی شئ ہے، سلف اور ائمہ نے جہمیہ کو کافر قرار دیا جب انہوں نے کہا کہ اللہ ہر جگہ موجود ہے، انہوں نے ان پر اعتراض کیا تھا کہ وہ پیٹ کے اندر اور درندوں اور گھوڑوں اور نجاستوں اور گندگیوں کے اندر کیونکر موجود ہو سکتا ہے؟ سلف اور ائمہ متفق ہیں کہ اللہ کی مثل کوئی شئ نہیں اور اللہ نے خود کا اور رسول پاک نے جو اس کا وصف کیا ہے وہ تشبیہ نہیں، مشبہہ اور مجسمہ ان جیسے کیونکر ہو سکتے ہیں، ان کے کفر کی غایت یہ ہے کہ اللہ کو مخلوقات کی مثل بنا دیا لیکن وہ قائل تھے کہ اللہ قدیم ہے جب کہ مخلوقات محدَث ہیں جب کہ یہ اللہ کو عینِ مخلوقات باور کرتے ہیں اور اسے صرف مصنوع اجسام کا نفس قرار دیا اور اسے تمام نقائص اور صفات ۔ اچھی و بری ۔ کے ساتھ موصوف کیا جن کے ساتھ مخلوقات موصوف ہوتی ہیں اللہ ان کے افک و کذب سے متعالی ہے اور ان کے ان گمراہ و فاسد خیالات سے منزہ و پاک ہے اللہ اپنی ذات، اپنے دین، کتاب، رسول اور اپنے مومن بندوں کے لئے منتقم ہے، یہ قائل ہیں کہ نصاری بوجہ تخصیص کرنے کے کافر ہوئے جب کہا:

(**قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ**)[**المائدۃ: ۱۷**] (کہا کہ اللہ عیسیٰ بن مریم ہے) نصاری نے جو کچھ سیدنا مسیح بارے کہا تھا یہ اللہ

بارے وہ سب کہتے ہیں، نصاری کا کفران کے کفر کا ایک جزو ہے، یہ مذکورہ کتاب جب ان کے افضل المتاخرین کو سنائی گئی تو ایک کہنے والے نے اس سے کہا یہ کتاب قرآن کے خلاف ہے تو وہ (نا ہنجار) بولا: قرآن تو سب کا سب شرک ہے، تو حید تو بس ہماری اس کتاب میں ہے، اس کی مراد یہ تھی کہ قرآن رب اور بندے کے مابین تفریق کرتا ہے جب کہ ان کے نزدیک حقیقتِ توحید یہ ہے کہ رب ہی عبد ہے، تو ایک قائل نے اس سے کہا تب میری بیوی اور میرے بیٹی کے مابین کیا فرق ہے؟ کہا کوئی فرق نہیں لیکن ان مجوب لوگوں (یعنی اہل سنت والجماعت) نے کہا حرام ہے تو ہم نے کہا تمہارے لئے حرام ہے، ان لوگوں کے اقوال بارے جب کہا جائے کہ کفریہ ہیں تو اس کا حال سمجھ نہیں آیا، دراصل کفر جنس ہے جس کے تحت متفاوت انواع ہیں بلکہ ہر کافر کا کفران کے کفر کا جزو ہے اسی لئے ان کے رئیس سے کہا گیا تم میرے نصیر (یعنی مددگار) ہو، تو وہ بولا نصیر میرا ایک جزو ہے، عبداللہ بن مبارک کہا کرتے تھے ہم یہود و نصاری کی کلام تو نقل کر سکتے ہیں مگر جہمیوں کی کلام نقل بھی نہیں کر سکتے اور یہ لوگ تو جہمیوں سے بھی برتر ہیں وہ تو بس اس حد تک گئے کہ کہا اللہ ہر جگہ موجود ہے (یعنی اللہ کے لئے جہتِ علو کا انکار کیا) جب کہ ان کا قول ہے کہ اللہ کا وجود ہر موجود میں ہے، ان کے نزدیک دو موجود نہیں کہ ایک حال ہو اور دوسرا محل، اسی لئے کہا حضرت آدم کی اللہ سے نسبت و منزلت ایسی ہے جیسی آنکھ کی پتلی کی انسان کی آنکھ سے اور مسلمان، یہودی اور عیسائی دینِ مرسلین سے بالاضطرار جانتے ہیں (یعنی یہ ایسی فطری اور بنیادی معلومات ہیں جو ہر ایک کو معلوم ہیں) کہ جس نے کسی بشر بارے کہا وہ اللہ کا جزو ہے وہ تمام اہلِ ملل کے نزدیک کافر ہوا کیونکہ نصاری نے بھی یہ نہیں کہا اگر چہ ان کا قول بھی اعظم کفر سے ہے مگر ان کے سوا کسی نے یہ بات نہیں کہی کہ عینِ مخلوقات خالق کا جزو ہے اور نہ یہ کہ خالق ہی مخلوق ہے اور نہ یہ کہ منزہ حق ہی مشبہ خلق ہے

اسی طرح اس کا یہ کہنا کہ اگر مشرکین اصنام کی عبادت ترک کر دیتے تو وہ حق سے جاہل (نا آشنا) رہ جاتے بقدر اس کے جو اس سے ترک کرتے! یہ بھی تمام اہلِ ملل کے ہاں معلوم بالاضطرار کفر ہے، اہل ملل متفق ہیں کہ تمام رسل نے بتوں کی عبادت سے منع کیا اور اس کے فاعل کو کافر کہا اور یہ کہ کوئی اس وقت تک مومن نہ ہوگا حتی کہ اصنام پرستی اور ماسوا اللہ ہر معبود سے اظہارِ براءت کرے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

(قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيٓ إِبْرَٰهِيمَ وَٱلَّذِينَ مَعَهُۥٓ إِذْ قَالُوا۟ لِقَوْمِهِمْ إِنَّا بُرَءَٰٓؤُا۟ مِنكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِن دُونِ ٱللَّهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ ٱلْعَدَٰوَةُ وَٱلْبَغْضَآءُ أَبَدًا حَتَّىٰ تُؤْمِنُوا۟ بِٱللَّهِ وَحْدَهُۥٓ)[الممتحنة: ۴] (تمہارے لئے ابراہیم اور ان کے رفقاء میں عمدہ نمونہ ہے جب انہوں نے اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ ہم تم سے اور ان سے جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے ہو بے تعلق ہیں تمہارے قائل نہیں اور جب تک تم اللہ واحد پر ایمان نہ لاؤ) حضرت ابراہیم نے اپنی قوم سے کہا تھا:

(أَفَرَءَيْتُم مَّا كُنتُمْ تَعْبُدُونَ ۝ أَنتُمْ وَءَابَآؤُكُمُ ٱلْأَقْدَمُونَ ۝ فَإِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّيٓ إِلَّا رَبَّ ٱلْعَٰلَمِينَ)[الشعراء: ۷۵-۷۷] (ابراہیم نے کہا کہ تم نے دیکھا کہ جن کو تم پوجتے ہو۔ تم بھی اور تمہارے اگلے باپ دادا بھی۔ وہ میرے دشمن ہیں لیکن اللہ

رب العالمین)اور اپنے والد اور قوم سے کہا:

﴿ اِنَّنِیْ بَرَآءٌ مِّمَّا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا الَّذِیْ فَطَرَنِیْ فَاِنَّهٗ سَیَهْدِیْنِ﴾[الزخرف: ۲۷۔ ۲۸] (جن چیزوں کوتم پوجتے ہو میں ان سے بیزار ہوں۔ ہاں جس نے مجھ کو پیدا کیا وہی مجھے سیدھا راستہ دکھائے گا) اور آپ امام الحنفاء تھے جن کی آل میں اللہ نے نبوت کا سلسلہ جاری کیا اور تمام اہلِ ملل کے ہاں متفقہ طور پر وہ معظم ہیں، فرمایا:

﴿ یٰقَوْمِ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ﴾[الأنعام: ۷۹] (میں نے سب سے یکسو ہو کر اپنے آپ کو اُسی ذات کی طرف متوجہ کیا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں) یہ ایسی اظہر بات ہے کہ جس پر کوئی نصِ خاص بطورِ دلیل پیش کرنے کی بھی ضرورت نہیں تو جس نے یہ مذکورہ بات کہی وہ یہود و نصاری سے بھی بڑا کافر ہے اور جو انہیں کافر نہ کہے وہ بھی کافر ہے، یہود و نصاریٰ تو خود بت پرستی کو کفر گردانتے تھے وہ اس طرح کا اعتقاد کیونکر رکھ سکتے تھے پھر اس کا یہ کہنا کہ عالم اس حقیقت سے آشنا ہے کہ اصل میں کون معبود ہے اور وہ کس صورت میں ظاہر ہوا ہے حتی کہ عبادت کیا گیا اور یہ کہ تفریق و کثرت کسی صورتِ محسوسہ میں اعضاء اور صورتِ روحانی میں معنوی قویٰ کی مثل ہے تو یہ بت پرستی سے بڑا کفر ہے کیونکہ بت پرستوں نے تو انہیں شفعاء، واسطے اور وسیلے بنایا ہوا تھا جیسے قرآن نے ان کا قول نقل کیا:

﴿مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِیُقَرِّبُوْنَآ اِلَی اللّٰهِ زُلْفٰی﴾[الزمر: ۳] (ہم ان کو اس لئے پوجتے ہیں کہ ہم کو اللہ کا مقرب بنا دیں) ایک جگہ اللہ نے فرمایا:

﴿ اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُفَعَآءَ قُلْ اَوَلَوْ كَانُوْا لَا یَمْلِكُوْنَ شَیْـًٔا وَّلَا یَعْقِلُوْنَ﴾[الزمر: ۴۳] (کیا انہوں نے اللہ کے سوا اور سفارشی بنا لئے ہیں؟ کہو کہ خواہ وہ کسی چیز کا بھی اختیار نہ رکھتے ہوں اور نہ سمجھتے ہی ہوں) وہ اس بات کے مقر تھے کہ اللہ ارض وسماوات کا خالق ہے اور ان بتوں کا بھی جیسے کہا:

﴿ وَلَىِٕنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَیَقُوْلُنَّ اللّٰهُ﴾[العنکبوت: ۶۱] (اور اگر ان سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا اور سورج اور چاند کو کس نے زیرِ فرماں کیا؟ تو کہہ دیں گے کہ اللہ نے) اور:

﴿وَمَا یُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ﴾[یوسف: ۱۰۶] (اور یہ اکثر اللہ پر ایمان نہیں رکھتے مگر شرک کرتے ہیں) ابن عباس نے (اس کی تفسیر میں) کہا پوچھو تو کہیں گے: ارض وسماء کا خالق اللہ ہے لیکن پھر اس کے غیر کی عبادت کی، مشرکین حج کے تلبیہ میں یہ کلمات کہا کرتے تھے: (لَبَّیْكَ، لَا شَرِیْكَ لَكَ إِلَّا شَرِیْكٌ هُوَ لَكَ تَمْلِكُهٗ وَ مَا مَلَكَ) (یعنی تیرا کوئی شریک نہیں مگر وہ جنہیں تو نے خود شریک بنا لیا ہے، حقیقی مالک تو ہی ہے) اسی لئے کہا:

﴿ضَرَبَ لَكُمْ مَّثَلًا مِّنْ أَنْفُسِكُمْ هَلْ لَكُمْ مِّنْ مَّا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ مِّنْ شُرَكَاءَ فِي مَا رَزَقْنَاكُمْ فَأَنْتُمْ فِيهِ سَوَاءٌ تَخَافُونَهُمْ كَخِيفَتِكُمْ أَنْفُسَكُمْ﴾ [الروم: ۲۸] (وہ تمہارے لئے تمہارے ہی حال کی ایک مثال بیان فرماتا ہے کہ بھلا جن کے تم مالک ہو وہ اس میں جو ہم نے تمہیں عطا فرمایا ہے تمہارے شریک ہیں؟ اور تم اس میں برابر ہو تم ان سے اس طرح ڈرتے ہو جس طرح اپنوں سے ڈرتے ہو؟ اسی طرح ہم عقل والوں کیلئے اپنی آیتیں کھول کھول کر بیان کرتے ہیں) لیکن یہ حضرات ان سے بڑے کافر ہیں اس جہت سے کہ انہوں نے بتوں کے عابد کو اللہ کا عابد اور بتوں کو اللہ کا۔ نہ کہ اس کے غیر کا۔ جزو قرار دیا جیسے انسان کی نسبت اس کے اعضاء ہیں اور نفس کی نسبت اس کی قویٰ، جبکہ مشرکینِ عرب مقر تھے کہ بت غیر اللہ ہیں اور مخلوق ہیں اور اس جہت سے کہ مشرکینِ عرب مقر تھے کہ آسمانوں اور زمین کا ان بتوں کے سوا ایک رب ہے جس نے ان کی تخلیق کی جبکہ یہ سمجھتے ہیں کہ آسمانوں، زمین اور دیگر مخلوقات کے لئے آسمانوں، زمین اور مخلوقات سے مغایر کوئی رب نہیں بلکہ مخلوق ہی خالق ہے اسی لئے اس نے قومِ عاد اور دیگر کفار کو صراطِ مستقیم کا سالک قرار دیا اور انہیں عین القرب میں کہا اور کہتا ہے کہ اہلِ نار آگ میں (معذب نہیں بلکہ) متمتع ہوں گے عین اس طرح جیسے اہلِ جنت جنت میں، حالانکہ دینِ اسلام کی بنیادی معلومات میں سے ہے کہ قومِ عاد اور قومِ ثمود اور فرعون اور اس کی قوم اور وہ تمام اقوام جن کے احوال اللہ نے بیان کئے وہ اللہ کے دشمن تھے اور آخرت میں وہ معذَب ہوں گے اور ان پر اللہ کی لعنت اور غضب ہے تو جس نے ان کی تعریف کی اور انہیں مقربین اور اہلِ نعیم میں سے باور کیا وہ اس وجہ سے یہود و نصاریٰ سے بھی بڑا کافر ہے

یہ فتویٰ ان کی جملہ کلام و اقوال اور ان کے کفر و الحاد کو تفصیل سے بیان کرنے کا متحمل نہیں ہوسکتا، یہ باطنی قرامطہ اور اسماعیلیہ کی جنس سے ہیں جو یہود و نصاریٰ سے بڑے کافر تھے اور ان کا قول سب کتب و رسل کے ساتھ کفر کو متضمن ہے جیسا کہ شیخ ابراہیم جعبری نے کہا تھا جب ان کی کتابِ ہٰذا کے مصنف ابن عربی سے ملاقات ہوئی تو بیان کیا میں نے اسے ایک نجس بوڑھا پایا جو ہر آسمانی کتاب اور رسول کی تکذیب کرتا تھا، فقیہ ابو محمد بن عبدالسلام جب قاہرہ آئے اور لوگوں نے ان سے ابن عربی بارے پوچھا تو ان کے الفاظ تھے: (هُوَ شَيْخٌ سُوْءٍ كَذَّابٌ مَقْبُوْحٌ) (یعنی مجسمِ برائی، کذاب اور بدصورت بوڑھا ہے) جو عالم کی قدامت کا قائل ہے اور کسی شرمگاہ کو حرام قرار نہیں دیتا، تو قدامتِ عالم کا اس کا قول ہے اور یہ معروف کفر ہے تو یوں اس کے سبب فقیہِ مذکور نے اسے کافر قرار دیا اور ابھی اس کا یہ قول ظاہر نہ ہوا تھا کہ عالمِ وجود ہی اللہ ہے اور عالم اللہ کی صورت اور ہویت ہے تو یہ پہلے سے بھی کفر میں اعظم ہے تو قدامتِ عالم کے قائلین واجب الوجود کا اثبات کرتے اور کہتے ہیں اسی سے وجودِ ممکن کا صدور ہوا ہے، بعض اس کے ملاقاتیوں نے بتلایا کہ وہ کذاب اور مفتری ہے اور اس کی کتب فتوحاتِ مکیہ وغیرہ میں اکاذیب ہیں جو کسی عاقل پر مخفی نہیں اسے ابن سبعین، قونوی، تلمسانی اور ان جیسوں سے اسلام سے اقرب سمجھا جاتا ہے، اگر اس کے کفر کا یہ حال ہے

کہ وہ یہود ونصاریٰ کے کفر سے اعظم واخطر ہے تو ان مذکورین کا حال کیا ہوگا ؟ ابھی تو اس کی کفر یہ باتوں اور عقائد کا یہاں عشر عشیر بھی ذکر نہیں کیا، لیکن ان اہل علم پر ان لوگوں کا حال مخفی ہوا ہے جو ان کے احوال سے واقف نہیں جیسے ایک زمانہ میں باطنی قرامطہ کا حال ملتبس تھا کیونکہ وہ اپنے آپ کو فاطمی کہتے تھے اور تشیع کی طرف اپنی نسبت کرتے تھے تو ان کے باطنی کفر سے ناواقف ان کی باتوں کی طرف مائل ہو گئے، ان کی طرف میلان رکھنے والا یا تو زندیق منافق ہوگا اور یا جاہل وگمراہ، اسی طرح یہ اتحادیہ ہیں تو ان کے بڑے کفر کے ائمہ اور واجب القتل ہیں ان میں سے کسی کی توبہ قبول نہیں اگر اس سے قبل ہی ہتھے چڑھ جائے، یہ اعظم زنادقہ میں سے ہیں جو اس کا اسلام ظاہر کرتے ہیں مگر باطن میں عظیم کفر ہے، یہ اسلام کی مخالفت خوب سوچ سمجھ کرتے ہیں تو ہر جو ان کی طرف منتسب ہو یا ان کا دفاع کرے یا ان کی یا ان کی کتب کی تعریف کرے یا ان سے تعاون کیا اور ان کی مدد کی یا ان کی بابت بات کرنا ناگوار سمجھا یا ان کی طرف سے معذرتیں کیں کہ اصل میں اس کلام کی حقیقت سمجھی نہیں گئی اس کی گوشمالی لازم ہے تو ایسے دجل وکذب پیش کرنے والوں کی بیخ کنی عظیم فرائض میں داخل ہے کیونکہ یہ لوگوں کی عقل ودین کے فساد وخرابی کا سبب بنتے ہیں اور کئی علماء ومشائخ اور بادشاہ اور وزراء ان کی باتوں میں آ کر گمراہ ہو چکے ہیں، یہ زمین میں فساد مچاتے اور اللہ کے راستہ سے روکتے ہیں، دین میں ان کا ضرر ان مفسدوں کے ضرر سے بڑا ہے جو دنیوی ضرر دیتے ہیں، یہ تو لوگوں کے دین وایمان پر ڈاکہ ڈالتے ہیں، تاتاری تو فقط مال لوٹتے تھے یہ دین لوٹتے ہیں، ان کا ضلال واِضلال وصف وبیان سے باہر ہے، یہ باطنی قرامطہ سے مشابہ ہیں اسی لئے یہ تاتاریوں کے اقتدار کے خواہاں ہیں اور مسلمانوں کے خلاف ان کی مدد کرتے ہیں ماسوا ان کے اتباع عامی لوگوں کے جو ان کی حقیقتِ حال سے ناآشنا ہیں، اسی لئے یہ یہودیوں اور نصاریٰ کی روش کو درست سمجھتے ہیں اور انہیں حق پر قرار دیتے ہیں جیسے بت پرستوں کو بھی، ان کے ساتھ حسنِ ظن رکھنے والا اگر ان کی حقیقت جان کر بھی حسنِ ظن پر قائم رہے تو اسے انہی کا حصہ سمجھا جائے اور جو کہتے ہیں ان کی کلام کے لئے شریعت کے موافق تاویل موجود ہے وہ بھی انہی کے ائمہ اور رؤوس میں سے ہے، وہ اگر ذکی ہے تو ضرور اپنے اس قول ورائے کے فساد وکذب سے واقف ہوگا، جو ان کے کفریہ عقائد اور خیالات جان کر بھی انہیں قابلِ تاویل سمجھتا ہے اسے چاہئے کہ نصاریٰ کی تثلیث اور اتحادیہ کے خیالات اور آراء کی بھی تاویل کر لے۔

شیخ الاسلام کا جوابی خط:

حمد وثناء کے بعد لکھا

امابعد: تمہارا مکتوب ملا جس میں تم خواہاں ہو کہ ان اتحادیہ کا مذہب بیان کروں اور اس کا بطلان واضح کروں، اگرچہ بالمشافہ تم ان کے بارہ میں کچھ بیان مجھ سے سن چکے ہو مگر تنگیٔ وقت کی وجہ سے بیان پورا نہ ہو سکا تھا اور تمہیں مصر جانے کی جلدی تھی، میں نے تمہارے ہمرائیوں میں طریقت وحقیقت کی طرف اپنے آپ کا انتساب کرنے والے کئی ایسے صاحبان بھی پائے تھے جو ان کی

باتوں کی تائید کرتے تھے، اب تمہارا خط ملا تو میں نے سوچا تفصیل سے ان کے خلافِ شریعت نظریات کا بیان کروں اس امید کے ساتھ کہ اللہ اہلِ ایمان کو اس سے نفع دے اور ان ملحدوں اور منافقوں کی شرارتوں سے ہم سب کو محفوظ رکھے جو اللہ کے اسماء اور اس کی مخلوق نشانیوں اور اس کی نازل کردہ تعلیمات میں الحاد سے کام لیتے ہیں تاکہ اہلِ علم ومعرفت کا ان سے تفرقہ ہو اور جن باتوں کو یہ حضرات عین دین اور حق باور کرتے ہیں ان کی بابت وضاحت ہو کہ یہ مرتد، کفار اور منافقین کے فاسد نظریات کا مرقع ہیں اور ان کا کفر و دجل کسی صورت بھی فرعون اور اس کے اتباع اور باطنی قرامطہ اور مسیلمہ کذاب اور اسود عنسی وغیرہما جھوٹے مدعیانِ نبوت کے کفر سے کمتر نہیں، ان کا صدیقین، شہداء اور صالحین کے گروہ سے کوئی تعلق نہیں، اللہ نے لوگوں کے لئے ان کے مابین اختلافات پیدا ہونے کی صورت میں اپنی کتابِ مبین کو ثالث بنایا ہے اسی طرح حق و باطل کے درمیان فرق کرنے والی، ارشاد کیا:

﴿أَمْ حَسِبَ الَّذِينَ اجْتَرَحُوا السَّيِّئَاتِ أَنْ نَجْعَلَهُمْ كَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَوَاءً مَحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ﴾ [الجاثیۃ: ۲۱] (جو لوگ بُرے کام کرتے ہیں کیا وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم ان کو ان لوگوں جیسا کر دیں گے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے اور ان کی زندگی اور موت یکساں ہو گے؟ یہ جو دعوے کرتے ہیں بُرے ہیں) تو یوں حق اور باطل کے درمیان ایک واضح لکیر کھینچ دی ہے، فرمایا:

﴿أَمْ نَجْعَلُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ كَالْمُفْسِدِينَ فِي الْأَرْضِ أَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِينَ كَالْفُجَّارِ﴾ [ص: ۲۸] (جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے کیا ان کو ہم ان کی طرح کر دیں گے جو ملک میں فساد کرتے ہیں یا پرہیزگاروں کو بدکاروں کی طرح کر دیں گے؟) اور:

﴿أَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِينَ كَالْمُجْرِمِينَ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ﴾ [ن: ۳۵۔ ۳۶] (کیا ہم فرمانبرداروں کو نافرمانوں کی طرح کر دیں گے؟ تمہیں کیا ہو گیا ہے کیا مجوز کرتے ہو؟) ان لوگوں کا حال بیان کیا جو انبیاء اور اہلِ علم و ایمان سے متشبہ بنے مگر حقیقت میں وہ اہلِ کذب و فجور ہیں اور دین و تقوی کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے، اللہ نے خبر دی ہے کہ ان کے لئے تنزُّل اور وحی ہے لیکن (رحمٰن کی طرف سے نہیں بلکہ) شیاطین کی طرف سے! چنانچہ فرمایا:

﴿وَإِنَّ الشَّيَاطِينَ لَيُوحُونَ إِلَى أَوْلِيَائِهِمْ لِيُجَادِلُوكُمْ وَإِنْ أَطَعْتُمُوهُمْ إِنَّكُمْ لَمُشْرِكُونَ﴾ [الأعراف: ۱۲۱] (اور شیاطین اپنے رفیقوں کے دلوں میں یہ بات ڈالتے ہیں کہ تم سے جھگڑا کریں اور اگر تم لوگ اُن کے کہے پر چلے تو بے شک تم بھی مشرک ہوئے) اور:

﴿هَلْ أُنَبِّئُكُمْ عَلَى مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيَاطِينُ تَنَزَّلُ عَلَى كُلِّ أَفَّاكٍ أَثِيمٍ﴾ [الشعراء: ۲۲۱۔ ۲۲۲] (کیا میں تمہیں بتاؤں کہ شیطان کس پر اترتے ہیں۔ ہر جھوٹے گنہگار پر اترتے ہیں) اور بتلایا کہ ہر جو اللہ کے دین سے مرتد ہوا تو اللہ کی سنت ہے

کہ اس کا متبادل لاتا ہے جو دین مبین کا متولی بنے، فرمایا:

﴿ يَآأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَنْ يَرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ فَسَوْفَ يَأْتِي اللَّهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِينَ يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ ذَٰلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ﴾[المائدۃ:۵۴] (اے ایمان والو! اگر کوئی تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے گا تو اللہ ایسے لوگ پیدا کر دے گا جن کو وہ دوست رکھے اور جسے وہ دوست رکھیں اور جو مومنوں کے حق میں نرمی کریں اور کافروں سے سختی سے پیش آئیں، اللہ کی راہ میں جہاد کریں اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں، یہ اللہ کا فضل ہے وہ جسے چاہتا ہے دیتا ہے اور اللہ بڑی وسعت والا اور جاننے والا ہے) اس لئے کہ ان ملحدوں کی باتیں اور اشعار واضح اور بین من گھڑت اور باطل ہیں، ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ سے کہا اے خلیفۂ رسول لوگوں کی تالیفِ قلبی کریں تو انہوں نے ان کی داڑھی پکڑ لی اور کہا: (عَلَامَ أَتَأَلَّفُهُمْ ؟ أَعَلَىٰ حَدِيثٍ مُفْتَرَىٰ ؟ أَمْ شِعْرٍ مُفْتَعَلٍ ؟) (یعنی میں کس چیز پر ان کی تالیفِ قلبی کروں؟ کیا ان کی خود ساختہ باتوں پر یا گھڑے ہوئے شعر پر؟) اور کہا میں حدیثِ مفتریٰ جیسے مسیلمہ کا (مزعومہ) قرآن اور شعرِ مفتعل جیسے طلیحہ اسدی کے اشعار (اس نے بھی دعوائے نبوت کیا تھا) کی طرف دعوت نہیں دیتا، ہر دور کے اہلِ فجور وافک کی یہی روش رہی ہے کہ ان دو انواعِ کلام کے ساتھ قرآن مجید کا معارضہ کرتے رہے ہیں، اللہ نے فرمایا:

﴿ فَلَا أُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُونَ وَمَا لَا تُبْصِرُونَ إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ قَلِيلًا مَا تُؤْمِنُونَ وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ قَلِيلًا مَا تَذَكَّرُونَ تَنْزِيلٌ مِنْ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾[الحاقۃ: ۳۸۔۴۳] (تو ہم کو ان چیزوں کی قسم جو تم کو نظر آتی ہیں۔ اور جو تمہیں نظر نہیں آتیں۔ کہ یہ ایک معزز فرشتہ کا قول ہے۔ اور یہ کسی شاعر کا کلام نہیں لیکن تم لوگ بہت ہی کم ایمان لاتے ہو۔ اور نہ کسی کاہن کا قول ہے لیکن تم لوگ بہت کم فکر کرتے ہو۔ یہ تو پروردگار عالم کا اتارا ہوا ہے) اور:

﴿ وَإِنَّهُ لَتَنْزِيلُ رَبِّ الْعَالَمِينَ نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ عَلَىٰ قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنْذِرِينَ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُبِينٍ﴾ [الشعراء: ۱۹۲۔۱۹۵] (اور یہ رب العالمین کا اتارا ہوا ہے۔ اس کو امانت دار فرشتہ لے کر اترا ہے۔ تمہارے دل پر تاکہ تم ڈرانے والوں میں سے ہو جاؤ۔ فصیح عربی زبان میں) تا آخرِ سورۃ، ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے کاذب کاہنوں اور نفس پرست شاعروں کی علامت ذکر کی ہے اور قرآن کو ان دونوں انواع کلام سے منزہ رکھا ہے جیسے سورۃ الحاقۃ میں ارشاد فرمایا:

﴿ إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ ذِي قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِينٍ﴾[کورت: ۱۹۔۲۰] (بے شک یہ فرشتہ عالی مقام کی زبان کا پیغام ہے۔ جو صاحبِ قوت مالک عرش کے ہاں اونچے درجے والا) آخرِ سورۃ تک! یہاں رسول کا لفظ حضرت جبریل کے لئے مستعمل ہوا ہے جب کہ پہلی آیت میں اس سے مراد حضرت محمدؐ ہیں اسی لئے وہاں آنجناب کو اس امر سے منزہ کیا کہ آپ شاعر یا کاہن

ہوں اور یہاں رسول (یعنی حضرت جبریل) کو اس امر سے منزہ کیا کہ وہ شیاطین میں سے ہوں

فصل

جان لو۔ اللہ تجھے ہدایت دے۔ کہ ان لوگوں کے مذہب کا تصور ہی اس کے فساد کے بیان میں کافی ہے اور یہ کسی دلیل کا محتاج نہیں، شبہ اس لئے واقع ہو جاتا ہے کہ اکثر لوگ ان کی حقیقتِ حال اور مقاصد سے آگاہ نہیں کیونکہ ان کی روش ہے کہ اپنی کلام میں مجمل اور مشترک الفاظ استعمال کرتے ہیں بلکہ وہ خود بھی اپنی کلام اور قصد کی حقیقت کے مدرک نہیں اسی لئے بکثرت تضاد بیانی کا شکار ہیں، ان کی اکثر باتیں اور ضابطے خود ساختہ ہیں اسی لئے ان کے متعدد فرقے ظاہر ہوئے اور یہ اپنے فرقوں کے درمیان بھی تمیز نہیں کر پاتے بس یہ شعور ہے کہ ان کے کئی فرقے ہیں، جب ان کے کئی اتباع و رؤساء کے سامنے میں نے ان کی باتوں کی حقیقت کھولی اور مذہب کا سرّ واضح کیا تو ان کیلئے یہ ایک دھچکا تھا، اگر میں ساتھ ہی ان کے عقائد و آراء پر ذم وتنقید نہ کرتا تو وہ مجھے اپنے مذہب کے ائمہ میں سے سمجھتے اور میرے بے دام مرید بن جاتے! تو بات یہ ہے کہ ان کی باتوں کو قبول کرنے والا یا تو ان کی حقیقتِ امر سے نا آشنا ہے یا پھر وہ ظالم ہے جو زمین میں علو و فساد کا متلاشی ہے یا دونوں وصفوں کا جامع ہے، یہی فرعون کے اتباع کا حال تھا اللہ نے ان کے بارہ میں کہا: **﴿فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهُ فَأَطَاعُوهُ﴾ [الزخرف: ۵۴]** (اس نے اپنی قوم کی مت ماردی اور انہوں نے اس کی بات مان لی) یا جیسے قرامطہ کا اپنے رؤساء کے ساتھ حال ہے اسی طرح منافقین اور کفار کا اپنے ائمہ کے ساتھ جو آگ کی طرف ان کے قائد اور داعی ہیں۔

فصل

ان کا نظریہ یہ ہے کہ کائنات کا وجود عین اللہ کا وجود ہے اور یہاں اس کے وجود کے سوا کچھ نہیں اور جو ایسوں کو حلولیہ کا نام دیتے ہیں یا حلول کے قائلین انہیں یہ الزام دیتے ہیں کہ یہ ان کے قول کی معرفت سے محجوب ہیں اور انہیں یہ توفیق نہیں ملی کہ ان کے باطنِ امر سے آگاہ ہوں کیونکہ جس نے کہا اللہ مخلوقات میں حالّ (حلول کئے ہوئے) ہے تو اس نے (گویا) کہا محل غیرِ حالّ ہے اور یہ ان کے نزدیک تثنیہ (جیسے نصاری کے ہاں تثلیث کا عقیدہ ہے) اور دو وجودوں کا اثبات ہے: ایک وجودِ حق حال اور دوم وجودِ مخلوق محل اور یہ قطعاً دو وجودوں کے اثبات کے مقر نہیں اور بلا شبہ یہ قول سابق الذکر کے قول سے کفر میں اقل ہے اور یہ کثیر جہمیہ کا قول ہے، اکثر سلف ان کی تردید کرتے تھے جبکہ ان کا دعوی تھا کہ اللہ اپنی ذات کے ساتھ ہر جگہ موجود ہے، ائمہ اور سلف کی ایک جماعت نے یہ قول جہمیہ سے نقل کیا اور اس وجہ سے انہیں کافر قرار دیا بلکہ بعض ائمہ مثلا ابن مبارک اور یوسف بن اسباط اور دیگر کئی ہل علم اور احمد وغیرہ کے اتباع میں سے اہل حدیث نے اس وجہ سے انہیں بہتر (۷۲) فرقوں سے خارج قرار دیا، بلا شبہ ان متاخرین کا الحاد، تجہم اور زندیقیت انہی اولین ملحد جہمیہ اور زنادقہ کا ذیلی حصہ ہے، جہاں تک انہیں اتحادیہ کا نام دیا جانا تو

اس ضمن میں دو روش موجود ہیں ایک یہ کہ وہ اس نام پر راضی نہیں کیونکہ اتحاد اقتران کے معنی میں ہے جو دو اشیاء کو مقتضی ہے جو ایک دوسری کے ساتھ مقترن ہو جائیں جبکہ یہ تو دو وجود کے مقر نہیں، دوسری روش یہ کہ یہ نام صحیح ہے اس امر پر بنا کرتے ہوئے کہ کثرتِ وحدت ہوگئی ہے، آگے ان کے تضاد بیانی کی تفصیل ذکر کروں گا، یہ طریقہ یا تو ابن عربی کے مذہب پر ہے جس نے وجود کو غیرِ ثبوت قرار دیا اور کہا وجودِ حق میں سب ممکنات سموئے گئے ہیں تو یوں وجود اور اثبات کے درمیان اتحاد صحیح ہے، لیکن جو یہ تفریق نہیں کرتے وہ قائل ہیں کہ کثرتِ خیالیہ کشف کے بعد وحدت بن گئی یا کثرتِ عینیہ وحدتِ اطلاقیہ بن گئی۔

فصل

جب ان کا اصول۔ جس پر اپنے نظریہ کی بناء کی۔ یہ ہے کہ مخلوقات اور اور مصنوعات حتی کہ جن وشیاطین اور کافر، فاسق بلکہ کتوں، خنازیر، درندوں، نجاسات، کفر، فسوق، عصیان الغرض ہر جو کائنات میں ہے وہ دراصل عین وجودِ رب ہے اور وہ ان سے جدا اور منفصل نہیں اگر چہ یہ تمام اشیاء اس کے لئے مخلوق، مربوب اور مصنوع ہیں اور وہ ان کے ساتھ قائم ہے اور وہ حسی اور عقلی طور پر شاہد ہیں کہ کائنات میں تفرُّق اور کثرتِ ظاہرہ ہے تو ایک جمع کے محتاج ہیں جو کثرت کی مزیل ہو اور ایک وحدت کے جو اس تفرق کو مع اس کے ثبوت کے ختم کرے تو یوں یہ تین مقالات میں تقسیم ہوئے، تمہیں ان کی تفصیل بیان کروں گا اگر چہ وہ خود اپنے مقالہ اور دوسروں کی رائے کی تبیین نہیں کر سکتے حق کے شہود اور تصور کے عدم کی بنا پر۔

پہلا مقالہ: یہ مصنف فصوص الحکم ابن عربی کا ہے: یہ کفر یہ تو ہے لیکن یہ شخص دیگر کی نسبت اسلام سے اقرب ہے کیونکہ اس کی کلام میں کثیر اچھی چیزیں بھی ہیں اور اس لئے کہ یہ اتحاد کے نظریہ پر غیر اللہ کا اثبات نہیں کرتا بلکہ اس ضمن میں اس کی کلام میں کثیر اضطراب ہے وہ دراصل اپنے وسیع خیال کے ساتھ قائم ہے جس میں کبھی حق کا تخیل کرتا ہے اور کبھی باطل کا اور اس کا خاتمہ کس امر پر ہوا؟ یہ اللہ ہی جانتا ہے تو اس کا نظریہ دو اصول پر مبنی ہے، ایک: کہ معدوم عدم میں ثابت شیٔ ہے (گویا اس نے عدم کو ایک عالَم قرار دیا) اور اس میں معتزلہ اور رافضیہ میں سے اس کے قائلین کی موافقت کی ہے، اسلام میں اس نظریہ کا اولین قائل ابوعثمان شحام ابوعلی جبائی ہے، معتزلہ اور رافضیہ میں سے بدعتی قدریہ کے کئی لوگوں نے اس پر اس کی موافقت کی، یہ قائل ہیں کہ ہر معدوم کا وجود ممکن ہے کیونکہ اس کی حقیقت، ماہیت اور عین عالمِ عدم میں ثابت ہے کیونکہ اگر اس کا ثبوت نہ ہو تو مخبر عنہ معلوم شیٔ غیر مخبر عنہ معلوم سے کیونکہ متمیز ہو؟ اور کسی شیٔ کے عالمِ وجود میں لانے کا قصد کیسے صحیح ہو؟ کیونکہ ایسا قصد تمییز کو متدعی ہے اور تمییز نہیں ہوتی مگر ثابت شیٔ میں لیکن یہ حضرات اگر چہ انہوں نے اس نظریہ کو پیش کیا جو فی نفسہا باطل ہے اور اس کی وجہ سے اہلِ سنت کے متکلمین کی ایک جماعت نے ان کی تکفیر کی مگر یہ اعتراف کرتے ہیں کہ اللہ ان موجودات کا خالق ہے اور اس امر کے قائل نہیں کہ عینِ موجودات عین وجودِ حق ہے

جہاں تک مصنفِ فصوص اور اس کے اتباع تو یہ قائل ہیں کہ ان کا عینِ وجود عین وجودِ حق ہے تو یہ عدم میں ثابت، اپنی

ذوات کے ساتھ متمیز اور وجودِ حق کے ساتھ متحد ہیں (یعنی ساتھ جڑی ہیں) جو ان کے ساتھ قائم ہے، اس کی عمومی کلام اسی پر مبنی ہے، تامل کرنے والے پر یہ بخوبی آشکار ہے، ابن عربی نے جب اعیان کو ثابت قرار دیا تو اسے ہر ممکن کا وجود لازم ہوا اور معتزلہ اس کے قائل نہیں تو یہ تیسرا فرق ہے اور یہ قائلین کہ معدوم عدم میں ثابت شیٔ ہے چاہے کہیں کہ ان کا وجود اللہ کی خلق ہے یا کہیں وہ اللہ (کا جزو) ہے اس امر کے بھی قائل ہیں کہ ماہیات اور اعیان غیر مجعول اور غیر مخلوق ہیں اور ہر شیٔ کا وجود اس ماہیت پر ایک قدر زائد ہے اور کبھی یہ کہتے ہیں وجود موجود صفت کے لئے ہے، یہ اگرچہ اس میں قدامتِ عالم کے قول کی مشابہت ہے یا مادہ عالم اور اس کے ہیولی کی قدامت کا قول جو اس کی صورت سے جدا ہے مگر بعینہ یہ وہ نہیں البتہ دونوں کے مابین قدرِ مشترک ہے، تمام معقولیوں کے ہاں بالاتفاق حیوانات، نباتات اور معادن سے یہ محدث صورتیں قدیم نہیں بلکہ غیر کائن ہونے کے بعد کائن ہوئیں اسی طرح اجسام سماوات کے ساتھ قائم صفات و اعراض اور عناصر کے ساتھ قائم استحالات مثلا کواکب، چاند و سورج، بادلوں، بارش، رعد و برق وغیرہ کی حرکات یہ سب ہر حسِ سلیم والے کے نزدیک حادث غیر قدیم ہیں کہ وہ اسے بعینہ دیکھتا ہے! جو قائل ہیں کہ معدوم کا عین قدیم میں ثابت ہے یا اس کا مادہ قدیم ہے وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ان تمام اشیاء کی اعیان قدیم میں ثابت ہیں اور کہتے ہیں کہ تمام موجودات کے مواد قدیم ہیں لیکن صورتیں اور اشکال قدیم نہیں

ذہن میں رکھو کہ اگر کوئی مذہب فی نفسہ باطل ہو تو اس کے ناقد کے لئے ممکن نہیں ہوتا کہ اسے ایسی وجہ پر نقل کرے جو اس کے حقیقی تصور کے مطابق ہو کہ یہ صرف حق کے ساتھ خاص ہے، جہاں تک باطل قول تو اگر اسے بیان کیا جائے تو اس سے اس کا فساد ظاہر ہو گا حتی کہ کہا جا سکتا ہے یہ فلاں پر کیونکہ مشتبہ ہوا؟ وہ ان کے اس اعتقاد پر متعجب ہو گا اور عجب انسان کے لئے لائق نہیں، تو باطل کی انواع میں سے کوئی متخیل شیٔ نہیں مگر لوگوں کا ایک فریق اس کا قائل ہوا ہے اسی لئے اہلِ باطل کا اللہ تعالیٰ نے وصف یہ کیا کہ وہ اموات (یعنی زندہ لاشیں) ہیں اور (صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ) ہیں (گونگے، بہرے اور اندھے) اور انہیں کچھ عقل وفقہ نہیں اور یہ اس آیت کا مصداق ہیں: **فِي قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ يُؤْفَكُ عَنْهُ مَنْ أُفِكَ[الذاریات : ۸]** (تم ایک متناقض بات میں ہو۔اس سے وہی پھرتا ہے جو پھیرا جائے) اور: **(فِي رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُونَ)[التوبۃ :۴۵]** (وہ اپنے شک میں ڈانواڈول ہو رہے ہیں) اور: (يَعْمَهُونَ) ہیں (یعنی اندھے بنے ہوئے) ان حضرات کو۔واللہ اعلم۔شبہ اس وجہ سے لاحق ہوا کہ انہوں نے دیکھا کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کا اس کے معرضِ وجود میں آنے سے پہلے ہی عالم ہے یا **(إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ)**[یس: **۸۲]** (اس کی شان یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس سے کہتا ہے ہو جاؤ تو وہ ہو جاتی ہے) تو خیال کیا کہ معدوم جس کی اللہ تعالیٰ تخلیق کرتا ہے وہ اس کے علم، ارادہ اور قدرت میں موجود و متمیز تھا (یعنی اس کا خاکہ) تو اسے اس کے ذات کے تمیز کی بناء پر ثابت قرار دیا حالانکہ معاملہ ایسا نہیں

وہ دراصل اللہ کے علم و کتاب میں متمیز ہے اور ہمیں صرف موجودات کا علم ہے اور معدوم ممکن اور معدوم مستحیل کا جبکہ اللہ ما کان (جو تھا) مثلاً آدم اور سب انبیاء اور ما یکون (جو ہوگا) مثلاً قیامت اور حساب وغیرہ کا علم رکھتا ہے اسی طرح اسے اس کا بھی علم ہے جو کائن نہیں اور اگر کائن ہو تو کیسے ہو، جیسا کہ جانتا ہے جو اہلِ جہنم کے بارہ میں اس نے (قرآن میں) خبر دی کہ:

﴿وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ﴾ [الأنعام: ۲۸] (اور اگر یہ لوٹائے بھی جائیں تو جن سے ان کو منع کیا گیا تھا وہی کچھ دوبارہ کرنے لگیں) اور:

﴿وَلَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِيْهِمْ خَيْرًا لَّاَسْمَعَهُمْ﴾ [الأنفال: ۲۳] (اور اگر اللہ ان میں نیکی دیکھتا تو ان کو سننے کی توفیق بخشتا) اور:

﴿لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا﴾ [الأنبياء: **۲۲**] (اگر آسمان اور زمین میں اللہ کے سوا اور معبود ہوتے تو زمین و آسمان درہم برہم ہو جاتے) اور:

﴿لَوْ خَرَجُوْا فِيْكُمْ مَّا زَادُوْكُمْ اِلَّا خَبَالًا﴾ [التوبة:۴۷] (اگر وہ تم میں نکل بھی کھڑے ہوتے تو تمہارے حق میں شرارت کرتے) اور:

﴿وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ مَا زَكٰى مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَبَدًا﴾ [النور: **۲۱**] (اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور مہربانی نہ ہوتی تو ایک شخص بھی تم میں پاک نہ ہوسکتا) اور اس طرح کے شرطیہ جملے جن میں انتفائے شرط یا اس کے ثبوت کو وہ جانتا ہے تو یہ امور ہم جنہیں جانتے اور جن کا تصور رکھتے ہیں یا تو ان کی نفی کرتے ہوئے یا خارج میں اثبات کرتے ہوئے یا جن کی بابت ہم متردد ہیں تو مجرد ہمارے ان کی نسبت تصور کے ساتھ (ہمارے علم اور اذہان سے) خارج میں ان کے اعیان ثابت نہیں جیسے مثلاً ہم یاقوت کے ایک پہاڑ یا پارے کے سمندر کے یا سونے کے انسان یا پتھر کے گھوڑے کا تصور کریں تو علم اور اندازے میں کسی شیٔ کا ثبوت خارج میں اس کا ثبوت نہیں ہوتا بلکہ ہر عالم کئی اشیاء بارے جانتا اور ان کی بابت کلام کرتا اور لکھتا ہے اور اس کا کوئی خارجی ثبوت بلکہ اصلاً ہی وجود نہیں ہوتا، یہی اللہ تعالیٰ کی اپنی خلق کی نسبت تقدیرِ سابق ہے جیسا کہ مسلم میں عبداللہ بن عمرو نبی اکرم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا اللہ نے آسمانوں اور زمین کی تخلیق سے پچاس ہزار برس قبل ہی خلائق کی مقادیر لکھ دی تھیں، سنن ابو داؤد میں حضرت عبادہ بن صامت نبی اکرم سے راوی ہیں کہ فرمایا اللہ نے سب سے پہلے قلم کو پیدا کیا اور کہا: لکھو، اس نے کہا: اے رب کیا لکھوں؟ فرمایا جو قیامت تک ہونے والا ہے اسے لکھو، بقول ابن عباس اللہ نے خلق کو پیدا کیا اور اس کے علم میں ہے جو وہ اعمال کریں گے پھر اپنے علم سے کہا: تم کتاب ہو جاؤ تو وہ ہو گیا، اس کی تصدیق اس نے قرآن میں یوں نازل کی:

﴿اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِى السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِنَّ ذٰلِكَ فِيْ كِتٰبٍ﴾ [الحج: ۷۰] (کیا تم نہیں جانتے کہ جو کچھ آسمان اور زمین میں ہے اللہ اُس کو جانتا ہے یہ کتاب میں ہے) یہی اس حدیث کا مفہوم ہے جسے احمد نے مسند میں میسرۃ

الفجر سے روایت کیا، کہتے ہیں میں نے عرض کی یا رسول اللہ (مَتیٰ کُنْتَ نَبِیّاً ؟) (آپ کب نبی تھے؟) ایک روایت میں ہے: (مَتیٰ کُتِبْتَ نَبِیّاً؟) (آپ کب نبی [کے بطور] مکتوب ہوئے؟) فرمایا جبکہ آدم ابھی روح وجسد کے درمیان تھے، صحیح حدیث کے یہی الفاظ ہیں

لیکن جو الفاظ یہ جہال ذکر کرتے ہیں جیسے ابن عربی نے فصوص الحکم میں اور دیگر نے کہا: (کُنْتُ نَبِیّاً وَ آدَمُ بَیْنَ الْمَاءِ وَالطِّیْنِ) اور: (کُنْتُ نَبِیّاً وَ آدَمُ لَا مَاءٌ وَ لَاطِیْنٌ) (میں نبی تھا جب ابھی آدم نہ پانی اور نہ مٹی تھے) تو ان کی کوئی اصل نہیں اور نہ صادق اہلِ علم میں سے کسی نے انہیں روایت کیا ہے اور نہ یہ معتمد کتبِ حدیث میں موجود ہیں بلکہ یہ کہنا باطل ہے کیونکہ حضرت آدم کبھی پانی اور مٹی کے درمیان نہ تھے اللہ نے تو انہیں مٹی سے پیدا کیا ہے اور مٹی کو پانی کے ساتھ خلط کیا تھا حتی کہ وہ طین بنی اور طین کو خشک ہونے دیا حتی کہ وہ کھنکھناتی ٹھیکرے جیسی بنی تو ماء اور طین کے درمیان جو پانی اور مٹی کا مرکب ہو ان کے لئے کوئی حالت نہ تھی اگر (بَیْنَ الْمَاءِ وَالتُّرَابِ) کہا جاتا تو یہ محال سے ابعد ہوتا حالانکہ اس حالت کے لئے بھی کوئی اختصاص نہیں، آنجناب نے دراصل: (بَیْنَ الرُّوْحِ وَالْجَسَدِ) کہا ہے اور یہ بھی کہا: (وَإِنَّ آدَمَ لَمُنْجَدِلٌ فِیْ طِیْنَتِهٖ) (ابھی آدم ڈھانچے کی شکل میں تھے) کیونکہ حضرت آدم کا جسد اس میں روح پھونکی جانے سے قبل چالیس سال پڑا رہا، اسی بارے ارشادِ ربانی ہوا:

(هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا) [الدهر : **۱**] (بے شک انسان پر زمانے میں ایک ایسا وقت بھی آ چکا ہے کہ وہ کوئی قابل ذکر چیز نہ تھا) اور:

(وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ) [الحجر: **۲۸**] (اور جب تمہارے رب نے فرشتوں سے فرمایا کہ میں کھنکھناتے سڑے ہوئے گارے سے ایک بشر بنانے والا ہوں) دو آیتیں اور فرمایا:

(الَّذِيْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ) [الم السجدة: **۷**] (جس نے ہر چیز کو بہت اچھی طرح بنایا (یعنی) اس کو پیدا کیا اور انسان کی پیدائش کو مٹی سے شروع کیا) دو اور آیات، خلقِ آدم اور ان میں نفخِ روح بارے احادیث کتبِ حدیث وتفسیر وغیرہما میں مشہور ہیں تو آنجناب نے خبر دی کہ آپ نبی تھے، یعنی نبی کی حیثیت سے (لوح محفوظ میں) مکتوب تھے جبکہ حضرت آدمؑ ابھی روح اور جسد کے درمیان تھے اس لئے کہ۔ اللہ اعلم۔ اس حالت میں وہ تقدیر روبعمل لائی جاتی ہے جو خلق پر مامور کے فرشتوں کے ہاتھوں میں ہوتی ہے تو اسے ظاہر کر دیا جاتا ہے اور روح پھونکی جانے سے قبل اس سے متعلقہ ہر چیز لکھ دی جاتی ہے جیسا کہ صحیحین اور دیگر امہات الکتب کے مصنفین نے یہ روایت تخریج کی ہے اور یہ صحیح ہے جسے اہلِ علم نے تلقی بالقبول کیا اور اس کی تصدیق پر ان کا اجماع ہے، اسے اعمش نے زید بن وہب عن ابن مسعود سے نقل کیا کہتے ہیں ہمیں نبی اکرم نے بیان کیا اور آپ صادق ومصدوق ہیں کہ ابن آدم کی ماں کے پیٹ میں تخلیق کی کیفیت یہ ہے کہ چالیس دن تک وہ نطفہ

ہی رہتا ہے پھر اتنے ہی دن وہ جما ہوا خون پھر اتنے ہی دن وہ لوتھڑا رہتا ہے پھر (ایک سو بیس دن پورے ہونے پر) اللہ تعالیٰ فرشتہ بھیجتا ہے، اسے چار امور کا حکم ملتا ہے کہ اس کا رزق، عمر، عمل اور شقی ہے یا سعید، لکھ دو پھر اس میں روح پھونکی جاتی ہے، فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے تمہارا کوئی اہلِ جنت کا سا عمل کرتا رہتا ہے حتی کہ اس کے اور اس کے مابین گز بھر فاصلہ رہ جاتا ہے تو اس پر تقدیر سبقت لے جاتی ہے تو اہلِ نار کا سا عمل اس سے سرزد ہو جاتا ہے تو یوں آگ میں جا داخل ہوتا ہے اور تمہارا کوئی اہلِ نار کا سا عمل کرتا رہتا ہے حتی کہ..........الخ تو جب صادق ومصدوق نے خبر دی ہے کہ فرشتہ روح کے نفخ سے قبل یہ باتیں لکھتا ہے تو آدم جو ابوالبشر ہیں کی نسبت بھی یہی مناسب تھا کہ ان کے جسد کی خلق اور ان میں روح کے نفخ سے قبل یہ سب لکھا جائے اور ہمارے نبی اکرم تمام اولادِ آدم کے سردار ہیں اور آپ سب سے عظیم المرتبت ہیں تو آپ نے خبر دی کہ آپ تب نبی کے بطور لکھے گئے اور آپ کی نبوت کی کتابت سے مراد آپ کی نبوت کا ہونا تو یہ ہونا کتابی تقدیر میں ہے! یہ نہیں کہ وجودِ عینی میں تھی کیونکہ آپ کی نبوت کا وجود نہ تھا تا آنکہ آپ کی عمر مبارک چالیس برس کی ہونے پر اللہ نے اس بابت آپ کو آگاہی دی جیسا کہ قرآن میں آپ سے تخاطب کیا:

﴿ وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ الخ﴾ [الشوریٰ:۵۲]

(اور اسی طرح ہم نے اپنے حکم سے تمہاری طرف روح القدس کے ذریعے سے بھیجا ہے تم نہ تو کتاب کو جانتے تھے اور نہ ایمان کو الخ) اور کہا:

﴿ اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى﴾ [والضحیٰ: ۶] (کیا اس نے تمہیں یتیم پا کر جگہ نہیں دی؟) اور:

﴿ نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ﴾ [يوسف:۳] (ہم اس قرآن کے ذریعے سے جو ہم نے تمہاری طرف بھیجا ہے تمہیں ایک نہایت اچھا قصہ سناتے ہیں اور تم اس سے پہلے بےخبر تھے) یہ معنی عرباض بن ساریہ کی نبی اکرم سے ایک روایت میں مذکور ہے، فرمایا: (اِنِّیْ عِنْدَ اللّٰهِ مَكْتُوْبٌ خَاتَمَ النَّبِيِّيْنَ وَاِنَّ آدَمَ لَمُنْجَدِلٌ فِيْ طِيْنَتِهٖ) آگے ہے: میں تمہیں اپنے اول امر (یعنی آغاز) کی خبر دیتا ہوں اور وہ: حضرت ابراہیم کی دعا اور حضرت عیسی کی بشارت ہے اور میری والدہ کا خواب جو تب دیکھا جب مجھے جنا کہ ان سے ایک نور نکلا ہے جس سے شام کے محلات روشن ہو گئے، حدیث کے یہ الفاظ ابن وہب کی روایت سے ہیں اسے بغوی نے شرح السنۃ میں (معاویۃ بن صالح عن سعید بن سوید عن عبدالأعلی بن ھلال السلمی عن العرباض) سے انہی الفاظ کے ساتھ نقل کیا اسی طرح لیث بن سعد نے ان سے اس کا نحو، احمد نے اپنی مسند میں اسے ابن مہدی (حدثنا معاویۃ بن صالح الخ) سے تخریج کیا، ان کی روایت میں مزید یہ الفاظ بھی ہیں: (وَكَذٰلِكَ أُمَّهَاتُ النَّبِيِّيْنَ يَرَيْنَ) (یعنی انبیاء کی والدائیں ایسا خواب دیکھتی رہی ہیں) قولہ:

(لَمُنْجَدِلٌ فِیْ طِیْنَتِہٖ) کا معنی ہے کہ سطحِ زمین پر مٹی سے بنے ڈھانچے کی صورت میں پڑے رہے اور ابھی ان میں روح نہ پھونکی گئی تھی، **مروی ہے کہ اللہ نے عرش پر ہمارے نبی پاک کا اسم گرامی لکھا** اور جنت کے دروازوں، گنبدوں اور اوراق پر بھی، اس ضمن میں ثابت احادیث کے متعدد آثار موجود ہیں جن سے آپ کے اسم مبارک کی شان کا اظہار اور آپ کے ذکر کا علو ظاہر ہوتا ہے!

سیرت فجری کی روایت کا ذکر گزرا اسے ابوالحسین بن بشران نے بھی ابوالفرج بن الجوزی کے طریق سے (اَلْوَفَاء بفضائل الْمُصْطَفیٰ) (میرے پاس اس کتاب کا جو نسخہ ہے اس میں یہ عنوان لکھا ہے: الوفاء بأحوال المصطفیٰ) میں نقل کیا، ان کی سند یہ ہے: (حدثنا ابوجعفر محمد بن عمرو حدثنا احمد بن اسحاق بن صالح ثنا محمد بن صالح ثنا محمد بن سنان العوفی ثنا ابراھیم بن طھمان عن یزید بن میسرۃ عن عبداللہ بن سفیان عن میسرۃ) اس میں ہے کہ ان کے سوال: (مَتیٰ کُنْتَ نَبِیّاً؟) کے جواب میں فرمایا جب اللہ نے زمین کی تخلیق کی اور آسمان کی طرف مستوی ہوا تو انہیں سات آسمان بنایا اور عرش پیدا کیا تو اس کے پائے پر لکھا: (مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰہِ خَاتَمُ الأَنْبِیَاءِ) اور جب اللہ نے جنت پیدا کی وہ جس میں آدم وحواء کو بسایا تھا تو میرا نام اس کے دروازوں، پتوں، گنبدوں اور خیموں پر لکھا اور آدم ابھی روح اور جسد کے درمیان تھے تو جب اللہ کے ان میں حیات پیدا کی (یعنی روح پھونکی) تو انہوں نے عرش کی طرف نظر کی تو میرا نام لکھا تو انہیں اللہ نے خبر دی کہ یہ تمہاری اولاد کا سردار ہے، پھر جب وہ شیطان کے درغلانے میں آئے تو توبہ کی اور میرے نام کے ساتھ اللہ کے سامنے استشفاع کیا (یعنی واسطہ دیا)

حافظ ابونعیم نے کتاب دلائل النبوت میں ابوالفرج کے طریق کے ساتھ حضرت عمر سے روایت نقل کی کہ آنجناب نے فرمایا جب حضرت آدم سے خطا سرزد ہوئی تو سر اٹھایا تو کہا اے رب (بِحَقِّ مُحَمَّدٍ إلَّا غَفَرْتَ لِیْ) (یعنی تجھے محمد کا واسطہ میری ضرور مغفرت فرما) تو ان کی طرف وحی کی کہ محمد کون؟ تمہیں کیا پتہ؟ عرض کی اے رب جب تو نے میری خلقت کی تکمیل کی تھی تو میں نے تیرے عرش کی طرف سر اٹھایا تو اس پر لکھا تھا: (لَا إلٰہَ إلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰہِ) تو ذہن میں آیا کہ یہ تیری سب مخلوق سے بڑھ کر تیرے ہاں عزت والے ہیں کیونکہ تو نے اپنے نام کے ساتھ ان کا نام مقرون کیا ہے، فرمایا ہاں، میں نے تمہاری مغفرت کر دی اور یہ تمہاری ذریت میں سے آخر الانبیاء ہیں اور اگر یہ نہ (ہونے) ہوتے تو میں تمہیں بھی پیدا نہ کرتا، تو یہ حدیث سابق الذکر کی تائید کرتی ہے اور یہ دونوں اس ضمن کی صحیح احادیث کی تفسیر کی طرح ہیں، صحیحین میں حضرت عائشہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم پر ابتدائے وحی سچے خوابوں کی صورت تھی، آپ کوئی خواب نہ دیکھتے مگر وہ صبح کے اجالے کی مانند سامنے آجاتا پھر خلوت آپ کو محبوب کر دی گئی تو آپ غارِ حراء میں خلوت نشین ہوکر عبادت میں (کئی دن تک) لگے رہتے پھر زاد ختم ہوتا تو حضرت خدیجہ کے پاس لوٹ کر گئی اور دن کا زاد لے کر خلوت گاہ کی طرف پلٹ جاتے، اسی دوران ایک دن فرشتہ آگیا اور کہا پڑھئے ......الخ تو اس میں ہے کہ آپ قبل ازیں قاری نہ تھے تو یہ قرآن کی اولین آیات ہیں جو آپ پر نازل کی گئیں جن کی رو سے آپ کی بعثت عمل

میں آ گئی پھر سورۃ المدثر کا نزول ہوا اور اس کے ساتھ آپ رسول ہو گئے کیونکہ اس میں تھا: (**قُمْ فَاَنْذِرْ**)[المدثر : ۲] (اٹھو اور تبلیغ شروع کرو) اسی لئے اس سورۃ میں اللہ تعاولیٰ نے وجودِ عینی اور وجودِ علمی کا ذکر کیا اور یہ بین امر ہے جسے انسان اپنے دل کے ساتھ سمجھتا ہے اور اس ضمن میں وہ سمع کا محتاج نہیں ہوتا کیونکہ کوئی شئ اپنے کون (یعنی ہونے) سے قبل نہیں ہوتی، جہاں تک اشیاء کا کون سے قبل اللہ کے علم میں ہونا تو یہ حق ہے اس میں کوئی شک نہیں اسی طرح ان کا اللہ کے ہاں مکتوب ہونا یا اس کے فرشتوں کے پاس جیسا کہ اس پر کتاب وسنت کی دلالت ہے اور آثار اس کے ساتھ وارد ہیں اور یہ علم وکتاب وہ تقدیر ہے جس کے غالی قدریہ منکر ہیں اور زعم کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو بندوں کے افعال کا تب علم ہوتا ہے جب وہ وجود میں آ جائیں، یہ کفار ہیں، ائمہ مثلاً شافعی اور احمد وغیرہما نے انہیں کافر قرار دیا ہے

کتاب وسنت نے اس تقدیر کی تبیین کی ہے! نبی اکرم نے ایک سائل جس نے کہا تھا اگر ہر چیز مقدر ہے تو پھر ہم عمل ترک نہ کر دیں؟ کے جواب میں فرمایا تھا جیسا کہ صحیحین میں حضرت علی نے روایت کی کہ نبی اکرم بقیع الغرقد میں ایک جنازہ کے لئے تشریف فرما تھے اور ہم بھی آپ کے گرد بیٹھے ہوئے تھے آپ کے پاس ایک چھڑی سی تھی، سر جھکائے زمین پر اس کے ساتھ لکیریں کھینچ رہے تھے کہ فرمایا کوئی نفس ایسا نہیں مگر اللہ نے جنت یا جہنم میں اس کا ٹھکانہ لکھ رکھا ہے اور یہ بھی کہ وہ بد بخت ہے یا خوش بخت! جس پر ایک شخص نے کہا یا رسول اللہ تو کیا پھر ہم اپنی اس کتاب پر نہ ٹھہرے رہیں اور عمل چھوڑ دیں؟ جو اہلِ سعادت سے ہے وہ اہلِ سعادت کے عمل پر لگ جائے گا اور جو اہلِ شقاء سے ہے وہ ان کے عمل پر! فرمایا: (اِعْمَلُوْا فَكُلٌّ مُيَسَّرٌ لِمَا خُلِقَ لَهٗ) (تم عمل کئے جاؤ کہ ہر کسی کو انہی عملوں کی توفیق ملتی ہے جس کے لئے اس کی تخلیق ہوئی ہے) پھر یہ آیت پڑھی: (**فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى**)[والليل : ۵] (پس جس نے راہِ خدا میں دیا اور پرہیزگاری کی) آخر تک، صحیحین میں حضرت عمران بن حصین سے مروی ہے کہ کہا گیا یا رسول اللہ کیا (اس وقت) اہلِ جنت اور اہلِ جہنم معلوم ہیں؟ (یعنی اللہ کو) فرمایا ہاں، عرض کی پھر عمل کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ تو جواب میں یہی مذکورہ بات کہی، ایک روایت میں ہے مزینہ قبیلہ کے دو اشخاص آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی یا رسول اللہ آپ کیا فرماتے ہیں لوگ جو عمل کرنے کی مشقت اٹھا رہے ہیں کیا یہ ایسی شئ ہے جو ان پر لکھ دی گئی اور تقدیر بن کر سبقت لے گئی ہے یا یہ پہلے سے طے شدہ امر نہیں؟ فرمایا بلکہ یہ طے شدہ امر ہے اور اس کی تصدیق قرآن نے ان آیات میں کی ہے: (**وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا**) [والشمس : ۷۔۸] (اور انسان کی اور اس کی جس نے اس کو برابر کیا۔ پھر اسے فجور اور تقوی ملہم کیا)

صحیح مسلم میں حضرت جابر بن عبداللہ راوی ہیں کہ سراقہ بن مالک بن جعشم آئے اور عرض کی یا رسول اللہ آپ ہمارا دین ہمارے لئے یہ سمجھ کر واضح اور بین فرما دیں کہ گویا ہم اب پیدا ہوئے ہیں؟ تو آج پھر عمل کس لئے؟ کیا اس کے ساتھ (کاتب

تقدیر) اقلام خشک ہوچکیں اور تقدیر جاری ہوچکی یا یہ مستقبل میں ہونا ہے؟ فرمایا نہیں بلکہ اقلام خشک ہوگئیں اور تقدیر اس کے ساتھ جاری ہوچکی، عرض کیا پھر عمل کس لئے؟ فرمایا: (اِعْمَلُوْا فَکُلٌّ الخ) مسلم نے حضرت عبداللہ بن عمرو سے روایت نقل کی کہتے ہیں میں نے نبی اکرم سے سنا فرماتے تھے اللہ نے خلق کی تقدیر آسمانوں اور زمین کی تخلیق سے پچاس ہزار قبل لکھ دی تھی اور اس کا عرش پانی پر تھا، سنن ابوداؤد میں حضرت عبادہ بن صامت سے مروی ہے کہ انہوں نے اپنے بیٹے سے کہا اے بیٹے تم ایمان کی حقیقت کا ذائقہ ہرگز نہ پاؤ گے حتی کہ جان لو (یعنی اعتقاد رکھو) کہ جو تجھے ملنے والا ہے وہ تم سے رہ نہیں سکتا اور جو نہیں ملنا وہ تمہیں مل نہیں سکتا، میں نے نبی اکرم سے سنا فرمایا اللہ نے سب سے قبل قلم کو پیدا کیا اور اسے کہا: لکھو، اس نے عرض کی کیا لکھوں؟ کہا ہر شیٔ کی تقدیر حتی کہ قیامت قائم ہو، اے بیٹے آنجناب سے سنا کہ جو اس اعتقاد کے غیر پر فوت ہوا وہ مجھ سے نہیں، اسے ترمذی نے ایک اور سند کے ساتھ ولید بن عبادہ بن صامت سے نقل کیا، کہتے ہیں والد صاحب نے اپنی موت کے وقت مجھے طلب کیا اور کہا اے بیٹے اللہ سے ڈرتے رہنا اور جانو کہ تقوی تب حاصل ہوگا جب تم اللہ پر اور ہر طرح کی خیر وشر تقدیر پر ایمان رکھو گے اور اگر اس عقیدہ کے غیر پہ مرے تو آگ میں داخل ہوگے، میں نے نبی اکرم سے سنا............ آگے یہی حدیث ذکر کی

ترمذی میں ابوحراثہ عن ابیہ سے مروی ہے کہ ایک شخص حاضرِ خدمت ہوا اور کہا آپ کا کیا خیال ہے جو دم ہم کراتے اور جو علاج معالجہ اور جو احتیاطیں کرتے ہیں یہ اللہ کی تقدیر میں سے کچھ پلٹا سکتی ہیں؟ فرمایا یہ سب بھی تقدیر کا حصہ ہیں لیکن تقدیر میں وہی کچھ ثابت ہے جو معدوم وممکن ہے، جو ہوگا، لیکن جو معدوم اور ایسا ممکن جو نہیں ہوگا مثلا اہلِ ایمان کو آگ میں داخل کرنا اور قیامت کا قبل از وقت قائم ہوجانا اور پہاڑوں کا مٹی بن جانا وغیرہ تو یہ معدوم ممکن ہے اور یہ عدم میں ثابت شیٔ ہے ان حضرات کے نزدیک جو قائل ہیں کہ معدوم (بھی) ایک شیٔ ہے! ہاں یہ ہے کہ اس کا ہونا (یعنی معرضِ وجود میں آنا) مقدر نہیں اور اللہ ہی اس کی حقیقت کو جانتا ہے، اسے علم ہے کہ وہ ممکن ہے اور یہ کہ وہ وجود میں نہ آئے گی، اسی طرح ممتنعات مثلا باری تعالیٰ کا شریک اور اس کیلئے اولاد کا ہونا تو اللہ جانتا ہے کہ نہ اس نے جنا اور نہ وہ جنا گیا اور نہ کوئی اس کا ہمسر ہے اور وہ جانتا ہے کہ بادشاہی میں کوئی اس کا شریک نہیں اور اسے کسی مددگار کی ضرورت نہیں ہے اور جانتا ہے کہ وہ حی اور قیوم ہے، نہ اسے اونگھ آتی ہے اور نہ نیند اور جانتا ہے کہ سماوات اور زمین میں کوئی ذرہ بھی اس سے پوشیدہ نہیں

تو یہ معدوم ممتنعات معقولیوں کے بالاتفاق اشیاء نہیں اگرچہ (اللہ کے) علم میں یہ ثابت ہیں تو ثابت ہوا کہ کائنات میں ایسی اشیاء ہیں جو ثابت فی العلم ہیں مگر موجود نہیں اور ان کا موجود ہونا ممتنع نہیں کہ علم واسع ہے، اگر توسعاً کوئی کہے کہ معدوم علم میں (ثابت) شیٔ ہے یا علم میں موجود ہے تو (اس کا یہ کہنا) صحیح ہے البتہ فی نفسہ اس کا شیٔ ہونا (یعنی مجسم) تو یہ باطل ہے تو اس سے اس مسئلہ میں حاصل شبہ کا ازالہ ہوا، اہل سنت والجماعت اور تمام اصناف کے عقلائے بنی آدم کا موقف یہ ہے کہ معدوم فی نفسہ کوئی شیٔ نہیں اور اس کا ثبوت،

اس کا وجود اور اس کا حصول شئ واحد ہے، اس پر کتاب وسنت اور اجماعِ قدیم دال ہے اللہ تعالیٰ نے حضرت زکریاؑ سے فرمایا تھا:

(وَقَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ تَكُ شَيْئًا)[مریم : ۹] (اور میں پہلے تم کو بھی تو پیدا کر چکا ہوں اور تم کوئی چیز نہ تھے) تو بتلایا کہ وہ لاشئ تھے، فرمایا:

(اَوَلَا يَذْكُرُ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ يَكُ شَيْئًا) [مریم: **۶۷**] (کیا انسان یاد نہیں کرتا کہ ہم نے اس کو پہلے بھی تو پیدا کیا تھا اور وہ کچھ بھی چیز نہ تھا) اور کہا:

(اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ اَمْ هُمُ الْخٰلِقُوْنَ)[الطور: **۳۵**] (کیا یہ کسی کے پیدا کئے بغیر ہی پیدا ہو گئے ہیں یا یہ اپنے آپ کے خود ہی خالق ہیں) تو ان کا انکار کیا کہ یہ اعتقاد رکھیں کہ وہ غیرِ شئ سے پیدا کئے گئے ہیں اللہ نے ان کی تخلیق کی ہے یا خود انہوں نے اپنے آپ کی تخلیق کر لی؟ اسی لئے حضرت جبیر بن مطعم کہتے ہیں جب میں نے نبی اکرم کو یہ سورۃ پڑھتے سنا (اور ابھی وہ حالتِ کفر میں تھے) تو محسوس کیا (یہ واشگاف حقیقت سن کر) میرا دل پھٹ گیا ہے اور اگر معدوم شئ ہوتب یہ انکارِ خداوندی تام نہ ہوا کیونکہ تب جائز تھا کہ وہ کہہ دیتے ہماری تخلیق شئ سے ہوئی ہے (نہ کہ لاشئ سے) لیکن وہ معدوم ہے تب ان کی تخلیق کرنے والا خالق معدوم شئ ہوگا، فرمایا:

(فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا) [النساء:۱۲۴] (تو ایسے لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان کی تِل برابر بھی حق تلفی نہ کی جائے گی) اور اگر معدوم شئ ہوتو تقدیرِ کلام یہ ہوتی: (لَا يُظْلَمُوْنَ مَوْجُوداً وَلَا مَعْدُومًا) اور معدوم متصور نہیں کہ مظلوم ہو، جہاں تک قولہ تعالیٰ: **(اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيْمٌ)** [الحج: **۱**] (بے شک قیامت کا زلزلہ ایک عظیم حادثہ ہوگا) تو یہ ایک واقع ہونے والے زلزلہ بارے اِخبار ہے کہ وہ عظیم شئ ہوگا، فی الحال موجود زلزلہ بارے یہ اِخبار نہیں، اسی لئے کہا: **(يَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّآ اَرْضَعَتْ)**[الحج : **۲**] (جس دن تم اُسے دیکھو گے کہ تمام دُودھ پلانے والی عورتیں اپنے بچوں کو بھول جائیں گی) اور اگر اس کے ساتھ قیامت مراد ہوتی ہے تو مراد یہ ہوتی کہ وہ اللہ کے علم و تقدیر میں ایک عظیم شئ ہے، قولہ تعالیٰ:

(اِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَيْءٍ اِذَآ اَرَدْنٰهُ اَنْ نَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ) [النحل: **۴۰**] (جب ہم کسی چیز کا ارادہ کرتے ہیں تو اُس کو کہہ دیتے ہیں ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے) کے ساتھ ان حضرات نے استدلال کیا جو قائل ہیں کہ معدوم (بھی) شئ ہے حالانکہ یہ ان کے خلاف حجت ہے کیونکہ خبر دی کہ وہ جسے شئ بنانے کا ارادہ کرتا ہے تو وہ ہو جاتی ہے (گویا قبل ازیں شئ نہ تھی) جب کہ ان کے نزدیک وہ عدم میں ثابت ہے اور مراد اس کا وجود نہ کہ اس کا عین اور نفس اور قرآن نے خبر دی کہ جب اس کا نفس مراد ہوتا ہے تو وہ ہو جاتی ہے اور یہ اس کے مسئلہ کی فروع میں سے ہے، اہل سنت والجماعت اور اکثر عقلاء کا موقف ہے کہ ماہیات مجعول ہیں اور ہر شئ کی ماہیت اس کا عینِ

وجود ہے اور شئ کا وجود اس کی ماہیت سے قدرِ زائد نہیں بلکہ خارج میں نہیں مگر وہی شئ جو کہ شئ ہے اور وہ اس کا عین، نفس، ماہیت اور اس کی حقیقت ہے اور خارج میں اس کا وجود وثبوت اس سے زائد نہیں، جبکہ یہ کہتے ہیں کہ وجود ماہیت پر ایک قدرِ زائد ہے اور ماہیات غیر مجعول ہیں اور ہر شئ کا وجود اس کی ماہیت پر زائد ہے، **بعض فلسفی وجود، واجب اور ممکن کے درمیان یہ تفرقہ کرتے** اور کہتے ہیں واجب وجود عینِ ماہیت ہے جبکہ ممکن وجود ماہیت پر زائد ہے، ان حضرات کو وہی شبہ لاحق ہے جو گزرا کہ انسان کبھی کسی شئ کی ماہیت جانتا ہے مگر اس کا وجود نہیں ہوتا اور وجود موجودات کے درمیان مشترک ہے اور ہر شئ کی ماہیت اس کے ساتھ مختص ہوتی ہے جو تدبر کرے اس کے لئے حقیقتِ امر واضح ہوگی کہ ہم نے علمی وجود اور عینی وجود کے مابین تفرقہ کیا ہے اور یہ فرق وجود، عین، ثبوت اور ماہیت وغیرہ میں ثابت ہے تو علم، کتاب اور کلام میں ان امور کا ثبوت اس سے خارج میں ان کے ثبوت کے مترادف نہیں اور وہ ان کی حقیقت اور ماہیت کا ثبوت جو کہ وہ ہے تو انسان اگر ماہیت کا تصور کرے تو اس کے ذہنی وجود کا وہ عالم ہو لیکن اس سے حقیقی و خارجی وجود کا ہونا لازم نہیں تو قائل کا یہ کہنا کہ میں نے شئ کی حقیقت اور اس کی عین، نفس اور ماہیت کا تصور کیا ہے مگر مجھے اس کے وجود کا علم نہیں یا اس کا علمی وجود تو حاصل ہوا لیکن عینی وحقیقی نہیں اور نہ اس کی حقیقی ماہیت، عینی حقیقت اور حقیقی وخارجی نفس کا وہ عالم ہوا تو اس کے لئے وجود کے لفظ اور ماہیت کے لفظ کے مابین فرق نہیں البتہ یہ کہ ہے کہ کبھی دونوں میں سے ایک لفظ کے ساتھ ذہنی اور دوسرے کے ساتھ خارجی (وجود) سے تعبیر کیا جاتا ہے تو محل کی جہت سے فرق موجود ہے، ماہیت اور وجود کی جہت سے نہیں

جہاں تک ان کا قول : کہ وجود مشترک ہے اور حقیقت میں کوئی اشتراک نہیں ہوتا تو اس بارے بھی یہی بات ہے تو خارج میں معین وجود موجود ہے جس میں اشتراک نہیں جیسا کہ خارج میں موجود معین حقیقت میں اشتراک نہیں ہے، یہ دراصل علم ہے جو مشترک موجود کا ادراک کرتا ہے جیسے مشترک ماہیت کا بھی تو مشترک، ذہن میں ثابت ہے نہ کہ خارج میں اور خارج میں جو ہے اس میں قطعاً بھی اشتراک نہیں، ذہن اگر خارج میں موجود معین ماہیت کا ادراک کرے تو اس میں اشتراک نہ ہوگا، اشتراک دراصل ان عام مطلق امور میں ہے جن کا وہ ادراک کرتا ہے اور خارج میں اطلاق وعموم کے وصف کے ساتھ کوئی عام اور مطلق شئ موجود نہیں، اس میں فقط مطلق بغیر شرطِ اطلاق ہے اور یہ خارج میں موجود نہیں مگر معین ہی تو عاقل کو چاہئے کہ وہ شئ کے فی نفسہ ثبوت و وجود اور علم میں اس کے ثبوت و وجود کے درمیان فرق کرے تو وہی حقیقی وخارجی عینی وجود ہے، جہاں تک یہ تو اسے ذہنی اور علمی وجود کہا جائے گا اور کوئی شئ نہیں مگر اس کے لئے یہ دونوں ثبوت ہیں تو علم اس سے لفظ کے ساتھ تعبیر کرتا ہے اور لفظ کو خط کے ساتھ لکھتا ہے تو یوں ہر شئ کے لئے چار مراتب ہوں گے : اعیان میں وجود، اذہان میں وجود، زبان میں [پر] وجود اور بنان میں (یعنی مجسم) وجود، عینی اور علمی اور لفظی اور رسمی وجود، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے سب سے قبل (**اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ**) [العلق : **1**] (اپنے رب کا نام لے کر پڑھو جس نے پیدا کیا) کو نازل کیا اور اس میں دو انواع کا ذکر کیا اور کہا: (**اِقْرَاْ بِاسْمِ**

رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ﴾ تو تمام مخلوقات کا عموماً پھر خصوصاً ان کے عینی وجود کے ساتھ ذکر کیا تو انسان کو خلق کے ساتھ خاص کیا بعد اس کے کہ اس کے غیر کا عمومی ذکر کیا پھر کہا:

﴿اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ﴾ [العلق : ۳۔۵] (پڑھو اور تمہارا رب بڑا کریم ہے۔ جس نے قلم کے ذریعے سے علم سکھایا۔ اور انسان کو وہ باتیں سکھائیں جن کا اس کو علم نہ تھا) تو تعلیم کی انسان کے لئے تخصیص کی، تعلیم بالقلم کی تعمیم کے بعد اور قلم کا ذکر کیا کیونکہ قلم کے ساتھ تعلیم حوخط ہے اور یہ لفظ کی تعلیم کو مستلزم ہے کیونکہ خط اس کے مطابق ہوگا اور لفظ کی تعلیم بیان ہے اور یہ تعلیمِ علم کو مستلزم ہے کیونکہ عبارت معنی سے مطابقت رکھتی ہے تو اس کی قلم کے ساتھ تعلیم تین مراتب کو مستلزم ہے: لفظی، علمی اور رسمی! بخلاف اس امر کے کہ اگر تعلیم کا مطلقاً ذکر ہوتا یا فقط علم کی تعلیم کا ذکر ہوتا تب یہ ان مراتب کا مستوعب نہ ہوگا تو اس سورۃ میں عینی اور علمی وجود کا ذکر کیا اور یہ کہ ان کا عطا کرنے والا اللہ ہی ہے تو وہ ہی خلق کا اور انسان کا خالق ہے اور وہ قلم کے ساتھ معلم اور انسان کا معلم ہے، جہاں تک خارج میں شئ کے وجود کا اثبات اس کے (عملی) وجود سے قبل تو یہ عقلی اور سمعی لحاظ سے معلوم الفساد امر اور کتاب وسنت اور اجماع کے مخالف ہے۔

فصل

تو یہ **ابن عربی کے دو اصول** میں سے ایک ہے اور جو دوسری اصل ہے تو یہ ان کا قول کہ اعیان کا وجود ہی وجودِ حق کا نفس وعین ہے اور اس قول کے ساتھ وہ اثباتِ صانع کرنے والے تمام مسلمانوں، یہودیوں، عیسائیوں، مجوسیوں اور مشرکین سے متفرد ہے، یہ دراصل فرعون کے اور قرامطہ کے قول کی حقیقت ہے جو صانع کے وجود کے منکر ہیں جیسا کہ آگے اس کے تفصیل آئے گی، تو جس نے یہ سمجھ لیا اس نے ابن عربی کی کلام اور اس کی نظم ونثر سمجھ لی اور جس امر کا وہ مدعی ہے کہ حق خلق کے ساتھ مغتذی (یعنی غذا پاتا) ہے کیونکہ اعیان کا وجود عدم میں ثابت اعیان کے ساتھ مغتذی ہوتا ہے اسی لئے وہ من حیث الوجود اور ماہیت واعیان کے مابین فرق کے مدِ نظر قائل بالجمع ہے اور زعم کرتا ہے کہ یہی تقدیر کا راز ہے اس لئے کہ ماہیات انہی کو قبول کرتی ہیں جو عدم میں ان کے لئے ثابت ہو تو انہی نے اچھا کیا اور برا کیا اور حمد وذم کی اور حق انہیں کوئی شئ عطا نہیں کرتا مگر جس پر وہ حالتِ عدم میں تھیں، اس کے کلام میں تامل کرو، کیونکر اس نے دو چیزوں کو باہم جوڑا ہے: وجودِ حق کا انکار اور اس کی طرف سے مخلوقات کی خلق کا انکار تو وہ رب کا منکر ہے جو خالق ہے تو وہ نہ رب کا مقر ہے اور نہ اس کی صفتِ خلق کا، وہ رب العالمین کا منکر ہے، اس کے نزدیک نہ رب ہے اور نہ اس کے مربوب عالمین (یعنی جہان اور کائنات) کیونکہ کائنات میں بس ثابت اعیان ہیں اور ایک ان کے ساتھ قائم وجود تو نہ تو اعیان مربوب ہیں اور نہ وجود مربوب ہے اور نہ اعیان مخلوق ہیں اور نہ وجود مخلوق ہے نیز وہ مظاہر اور ظاہر اور مجلیٰ اور متجلی کے درمیان تفریق کرتا ہے کیونکہ اس کے نزدیک مظاہر عدم میں ثابت اعیان ہیں اور جو ظاہر ہے وہ وجودِ خلق ہے۔

فصل

جہاں تک اس کا شاگرد صدر فخر رومی تو وہ اس بات کا قائل نہیں کہ وجود ماہیت پر قدر زائد ہے، وہ نظر اور علمِ کلام میں اپنے شیخ سے زیادہ دخیل تھا لیکن اس سے اکفر تھا اور علم و بیان میں اس سے اقل تھا، اسی طرح اسلام اور مشائخ کی کلام کی معرفت میں بھی! جب ان کا مذہب کفر یہ ہے تو ہر جو اس میں ماہر ہوا کفر میں بڑھتا چلا گیا، اس نے جب دیکھا کہ اشیاء کے وجود اور اعیان کے درمیان تفریق مستقیم نہیں اور اس کے نزدیک اللہ (مجسم) وجود ہے اور اس کے اور اس کے مابین فرق ضروری ہے تو اس نے مطلق اور معین کے مابین فرق کیا تو اس کے نزدیک اللہ وجودِ مطلق ہے جو نہ متعین اور نہ متمیز ہے اور وہ جب متعین اور متمیز ہوا تو وہ پھر خلق ہے چاہے یہ تعین مرتبہ الوہیت میں ہو یا اس کے غیر میں، اس قول میں کفر کی تصریح پہلے قول سے زیادہ ہے اور یہ فرعون اور قرامطہ کے مذہب کی حقیقت ہے اگر چہ اول کی فساد وخرابی اس کے اشیاء کے وجود اور ان کے ثبوت کے درمیان تفریق کی جہت سے زیادہ ہے، یہ اس لئے کہ اول قول پر ممکن ہے کہ حق کے لئے اعیان ممکنات سے خارج ایک وجود ثابت کیا جائے اور یہ کہ وہ ان پر فائض ہے تو اس میں رب کے وجود کا اعتراف ہے جو بنفسہ قائم اور اپنی خلق سے مستغنی ہے اگر چہ اس میں اس جہت سے کفر ہے کہ اس نے مخلوق کو خالق اور مربوب کو رب کیا ہے بلکہ اصلاً ہی خلق کا اثبات نہیں کیا، پھر میں نے اسے نہیں دیکھا کہ اس نے رب کے وجود کی تصریح کی ہو ایسا جو وجود سے متمیز اور اعیانِ ممکنات کے ساتھ قائم ہو لیکن یہ جو ہے تو اس نے تصریح کی ہے کہ کائنات میں بس وجودِ مطلق ہے جو تمام معین موجودات میں سرایت کئے ہوئے ہے اور مطلق کے لئے وجودِ مطلق نہیں تو خارج میں بشرطِ اطلاق کوئی مطلق جسم نہیں ہے اور نہ انسانِ مطلق اور نہ بشرطِ اطلاق حیوانِ مطلق بلکہ وہ موجود نہیں مگر معین شیٔ میں

حقائق کے لئے تین اعتبارات ہیں: اعتبارِ عموم، خصوص اور اطلاق، تو جب ہم کہیں: حیوانِ عام یا انسانِ عام یا جسمِ عام یا وجودِ عام تو یہ نہ ہوگا مگر علم اور زبان میں! جہاں تک ان سے خارج تو کائنات میں کسی ایسی شیٔ کا خارجی وجود نہیں جو دو اشیاء کو عام ہو لہٰذا عموم زندہ کی صفات کے عوارض سے ہے تو کہا جائے گا: علمِ عام، ارادہِ عامہ، غضبِ عام، خبرِ عام اور امرِ عام، اور صاحبِ صفت بھی عموم کے ساتھ موصوف کیا جائے گا جیسا کہ سنن ابوداؤد کی ایک حدیث میں ہے کہ آنجناب کا گزر حضرت علی سے ہوا جو دعا میں مشغول تھے تو فرمایا: (يَا عَلِيُّ عُمَّ فَإِنَّ فَضْلَ الْعَمُوْمِ عَلَى الْخَصُوْصِ كَفَضْلِ السَّمَاءِ عَلَى الأَرْضِ) (یعنی سب کے لئے عام کر کہ عموم کی خصوص پر فضیلت ایسی ہے جو آسمان کی زمین پر ہے) ایک حدیث میں ہے جب قولہ تعالیٰ: (**وَأَنْذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِيْنَ**) [الشعراء: **۲۱۴**] (اور اپنے قریب کے رشتہ داروں کو تبلیغ کرو) نازل ہوا تو آپ نے ہر عام وخاص کو تبلیغ شروع کر دی، اسے مسلم نے موسی بن طلحہ عن ابو ہریرہ سے نقل کیا

صفت کو عموم کے ساتھ موصوف کیا جاتا ہے جیسے حدیثِ تشہد میں ہے: (اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا وَ عَلٰى عِبَادِ اللّٰهِ الصَّالِحِيْنَ) فرمایا

جب تم یہ کلمات کہو گے تو ارض وسماء کے ہر مردِ صالح کو یہ سلام پہنچ جائے گا، جہاں تک مطلق بارے یہ اطلاق کہ عموم فقط لفظ کے عوارض میں سے ہے تو ایسا نہیں کیونکہ دل میں جاگزین الفاظ کے معانی الفاظ سے بڑھ کر عموم کے حقدار ہیں اور تمام صفات مثلاً ارادہ، حب، بغض، غضب اور رضا تو ان کی نسبت عموم وخصوص سے وہ سب عارض ہوتا ہے جو قول کے لئے ہوتا ہے اور ذہن سے خارج معانی ہی خارج میں موجود ہوتے ہیں جیسے لوگوں کا کہنا: (مَطَرٌ عَامٌّ وَ خَصِبٌ عَامٌّ) (یعنی عام بارش اور عام [ہر سو پھیلی ہوئی] ہریالی) تو ان کی بابت لوگوں نے باہم اختلاف کیا کہ یہ وصف بالعموم حقیقت ہے یا مجاز؟ تو دو قول ہیں ایک: کہ یہ مجاز ہے کیونکہ بارش اور ہریالی کے اجزاء میں سے ہر جزو میں واقع نہیں ہوتا مگر جہاں دوسرے کا وقوع ہو لہٰذا یہاں کوئی عموم نہیں، دوم: کہ یہ حقیقت ہے کیونکہ مطلق بارش عام ہوئی

جہاں تک خصوص تو وہ ان کیلئے عارض ہے جب وہ خارج میں موجود ہوں گی تو ہر شئ کے لئے اس کے ساتھ مختص ذات اور عین ہے اور اسی سے اس کا دوسری اشیاء سے امتیاز ہے، میری مراد عینی اور شخصی حقیقت ہے جس میں اشتراک نہیں ہوتا مثلاً: یہ شخص اور یہ دانہ اور یہ درہم (یعنی جب کسی خاص شخص ...... کی طرف اشارہ کر کے کہا جائے) تو ذہن میں وہ عارض ہوگا کیونکہ ذہنی تصور خارجی حقائق سے زیادہ وسیع ہوتا ہے کیونکہ وہ موجود، معدوم، ممتنع اور مقدرات سب کو شامل ہوتا ہے! جہاں تک اطلاق تو بلا شبہ وہ ان کیلئے عارض ہے جب وہ ذہن میں ہوں کیونکہ عقل ایک مطلق انسان اور ایک مطلق وجود کا تصور کرتی ہے لیکن خارج میں کیا مطلق شئ متصور ہے؟ اس بارے دو قول ہیں، کہا گیا مطلق کے لئے خارجی وجود ہے کیونکہ وہ معین کا جزو ہے، دوسرا قول ہے کہ اس کیلئے کوئی خارجی وجود نہیں کیونکہ خارج میں صرف معین ومقید ہی موجود ہے اور مطلق جس میں متعدد مشترک ہوں وہ اس معین کا جزو نہیں ہوتا جس میں وہ اس کا مشارک نہ ہو

تحقیق یہ ہے کہ مطلق بلاشرط میں اصلاً مقید اور معین داخل ہے لیکن مطلق بشرطِ اطلاق میں معین ومقید داخل نہیں اور یہ جیسے فقہاء نے: مطلق پانی کی اصطلاح استعمال کی تو بشرطِ اطلاق اس میں مضاف (یعنی کوئی اضافی مادہ) داخل نہیں لیکن جو بلاشرطِ اطلاق مطلق ہے اس میں مضاف داخل ہے تو اگر ہم کہیں: پانی کی تین اقسام ہیں: طہور، طاہر اور نجس تو یہ تینوں پانی کی اقسام ہیں، طہور وہ پانی جس میں غیرِ طہور پانی مثلاً عصارات (یعنی پھلوں کے جوس) اور نجس پانی داخل نہیں تو مقسوم پانی مطلق بلاشرطِ اطلاق ہے اور جو پانی باقی دو کا قسیم ہے وہ بشرطِ اطلاق مطلق ہے لیکن یہ اطلاق اور تقیید جو فقہاء نے اسمِ ماء کے ضمن میں کہا وہ فقط اطلاق اور لفظی تقیید میں ہے اور یہ جو مطلق لفظ میں داخل ہوا جیسے ماء (پانی) کا لفظ یا مقید لفظ میں جیسے (مَـاءٌ نَـجِسٌ) (ناپاک پانی) یا (مَـــاءُ وَرْدٍ) (عرقِ گلاب) اور جس بابت ہم نے گفتگو شروع کی وہ لفظ کے معانی میں اطلاق اور تقیید ہے تو دو انواع کے مابین فرق ہے، لوگ اکثر اس فرق کو ملحوظ نہ رکھ کر سخت غلطی کرتے ہیں، اس کی تفصیل یہ کہ ہر اسم یا تو اس کا مسمی معین ہوگا جو شرکت کو قبول نہ کرے مثلاً: میں، یہ اور زید، اسے معین اور جزو کہا جاتا ہے، اور یا پھر وہ شرکت قبول کرتا ہے اور یہ مطلق وکلی معنی ہے اور اس

کے لئے تین اعتبارات ہیں جیسا کہ گزرا، جہاں تک مطلق اور مقید لفظ تو اس کی مثال: **(تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ)[النساء:۹۲]** (گردن آزاد کرانا) اور **(وَلَمْ تَجِدُوْا مَاءً)[المائدة:٦]** (اور تمہیں پانی نہ مل سکے) یہ اس لئے کہ معنی کبھی مطلق اللفظ میں داخل ہے مگر لفظ مطلق میں داخل نہیں ہوتا یعنی لفظ بلاشرطِ اطلاق داخل ہے مگر بشرطِ اطلاق نہیں جیسے ہم نے پانی کے لفظ بارے کہا کیونکہ مطلق پانی کا تو منی پر بھی اطلاق ہوا ہے جیسے قرآن نے کہا: **(مِنْ مَّاءٍ دَافِقٍ)[والطارق:٦]** (وہ اچھلتے ہوئے پانی سے پیدا کیا گیا ہے) (اور حدیث میں ہے: اَلْمَاءُ مِنَ الْمَاءِ) اور جیسے (مَاءُ الْوَرْدِ) کہا جاتا ہے لیکن اطلاق کے وقت یہ اس کے مسمیٰ میں داخل نہ ہوں گے البتہ تقیید کے وقت ہوں گے تو جب پانی کے مطلق لفظ اور مقید لفظ کے مابین قدرِ مشترک کا اخذ کیا جائے تو وہ بلاشرطِ اطلاق مطلق ہے تو مطلقاً پانی کہا جائے گا، تو کہا جائے گا پانی مطلق اور مضاف کی طرف منقسم ہے اور موردِ تقسیم کے لئے مطلق اسم نہیں لیکن قرینہ کے ساتھ جو شمول اور عموم کو مقتضی ہو اور یہ ہمارا کہنا کہ پانی کی تین اقسام ہیں تو یہاں بھی تین اشیاء ہیں: موردِ تقسیم اور وہ عام پانی جو بلاشرط مطلق ہے لیکن اس کے لئے مفرد لفظ نہیں بلکہ مؤلف ہے اور مطلق قسم اور وہ بشرطِ اطلاق لفظ، اور ثانی مقید لفظ اور وہ بشرطِ تقیید لفظ، یہ اس لئے کہ متکلم باللفظ یا تو اسے مطلق رکھے گا یا مقید، کوئی تیسرا حال نہیں، اگر اطلاق کیا تو اسکے لئے جدا مفہوم ہے اور اگر مقید کیا تو اس کے لئے جدا ہے پھر اگر اسے مقید کیا تو یا تو یہ بقیدِ عموم ہوگا یا بقیدِ خصوص تو قیدِ عموم جیسے ان (یعنی فقہاء) کا قول: پانی کی تین اقسام ہیں اور قیدِ خصوص جیسے: (مَاءُ الْوَرْدِ)

لفظ کی تقیید اور اطلاق کے درمیان اور معنی کی تقیید و اطلاق یہ فرق جاننے کے بعد معلوم ہوا کہ معنی کے لئے تین احوال ہیں: یا تو وہ بھی مطلق ہوگا، یا قیدِ عموم کے ساتھ مقید اور یا قیدِ خصوص کے ساتھ مقید، مطلق معانی کی دو انواع ہیں: مطلق بشرطِ اطلاق اور مطلق بلاشرط، اسی طرح الفاظ ہیں تو ان میں سے مطلق کبھی بشرطِ اطلاق مطلق ہوں گے جیسے ہمارا قول: (الْمَاءُ الْمُطْلَقُ) (یعنی کوئی سا بھی پانی) اور (الرَّقَبَةُ الْمُطْلَقَةُ) (یعنی کوئی سی گردن) اور کبھی بلاشرطِ اطلاق مطلق ہوگا جیسے ہمارا قول: انسان، تو مقید بالا طلاق مطلق میں اطلاق کے منافی کے ساتھ مقید داخل نہیں لہٰذا مطلق پانی میں (مَاءُ الْوَرْدِ) داخل نہ ہوگا البتہ بلاکسی قید کے مطلق میں مقید داخل ہے جیسے اسمِ انسان میں ناقص انسان بھی داخل ہے تو واضح ہوا ان کے معانی جو بشرطِ اطلاق مطلق ہیں، کے لئے خارج میں وجود نہیں ہے لہٰذا خارج میں کوئی مطلق انسان نہیں بلکہ لازم ہے کہ یہ اِس یا اُس کے ساتھ متعین ہو اور اس میں مطلق حیوان نہیں اور بشرطِ اطلاق مطلق مطر، جہاں تک الفاظ میں سے وہ جو بشرطِ اطلاق مطلق ہوتے ہیں مثلاً مطلق پانی تو اس کا مسمی خارج میں موجود ہے کیونکہ یہاں شرطِ اطلاق مانع نہیں کہ اس کا معنی معین ہو اور وہاں معنی میں بشرطِ اطلاق، بشرطِ اطلاق مسمی المطلق متصور نہیں کیونکہ ہر موجود کے لئے ایک حقیقت ہے جس کے ساتھ وہ متمیز ہے اور جس کے لئے کوئی ممیز حقیقت نہیں وہ شئ بھی نہیں، پہلی صورت میں اس کی تمییز مانع ہے کہ وہ ہر وجہ وجہت سے مطلق ہو کیونکہ ہر وجہ سے جو مطلق ہو سکے اس کے لئے تمییز نہیں تو ہمارے لئے کوئی ایسا موجود نہیں جو بشرطِ اطلاق مطلق ہو البتہ عدم محض کی نسبت کہا جا سکتا ہے کہ وہ بشرطِ اطلاق مطلق ہے کیونکہ اس کی نسبت

کوئی متمیز حقیقت نہیں اور نہ متحقق ذات حتی کہ کہا جائے یہ حقیقت اس کے غیر کے لئے مانع ہے کہ وہ یہ ہو

اور معانی میں سے جو بلا شرطِ اطلاق مطلق ہیں تو اگر خارج میں ان کے وجود کا قائل ہوا جائے تو وہ دراصل ایک معین اور ممیّز مخصوص وجود ہے اور معین ومخصوص بلا شرطِ اطلاق مطلق میں داخل ہے مگر بشرطِ اطلاق مطلق میں نہیں کیونکہ ایسا مطلق اعم ہوتا ہے، اگر مطلق بلا شرط خارج میں موجود ہے تو لازم نہیں کہ مطلق مشروط بالاطلاق بھی خارج میں موجود ہو، اس لئے کہ یہ اس سے اخص ہے تو جب ہم نے کہا: حیوان، یا انسان یا جسم یا وجودِ مطلق تو اگر ہماری اس سے مراد بشرطِ اطلاق مطلق ہے تو اس کا کوئی خارجی وجود نہیں اور اگر ہماری مراد بلا شرط مطلق ہے تو تب معین ومخصوص کا ہی وجود ہوگا تو خارج میں کوئی شئ نہیں مگر وہی جو معین، ممیّز اور دیگر سے اپنی حدّ و حقیقت کے ساتھ منفصل ہے، تو جس نے کہا: وجودِ حق وجودِ مطلق ہے نہ کہ معین تو اس کے قول کی حقیقت یہ ہوگی کہ حق کا اصلاً ہی وجود نہیں اور نہ ثبوت مگر معین وممیّز اشیاء کا نفس، اور معین اشیاء وجودِ حق نہیں تو (نتیجہ یہ نکلا کہ) وہ اصلاً ہی کوئی شئ نہیں ہیں

اس نکتہ کی تلخیص یہ ہے یہ اگر اس سے بشرطِ اطلاق مطلق مراد ہے تب اس کا کوئی خارجی وجود نہیں لہذا اصلاً ہی وجودِ حق نہیں، اور اگر اس سے مراد بلا شرط مطلق ہے تو اگر خارج میں اس کے عدم وجود کا قائل ہوا جائے تب کلام نہیں اور اگر اس کے وجود کے قائل ہوں تب موجود نہیں مگر معین تو حق کے لئے وجود نہ ہوگا مگر اعیان کا وجود تو اس سے دو محذور لازم آتے ہیں ایک: حق کے لئے (علیحدہ سے) کوئی وجود نہیں مگر سوائے مخلوقات کے وجود کے، دوم: تناقض اور یہ اس کا قول کہ وہ وجود مطلق ہے نہ کہ معین، تو اس کے قول میں تدبر کرو کہ وہ حق کو کائنات میں یوں کرتا ہے جیسے کلی اپنی جزئیات میں ہوتی ہے اور جنس، نوع اور خاص کے بمنزلہ اور جیسے عدم میں ثابت فصل اپنے تمام موجودہ اعیان میں، اس قول کا قائل مظاہر اور مراتب کو متعینات میں کرتا ہے جیسے اول نے انہیں عدم میں ثابت اعیان میں کیا۔

فصل

جہاں تک **تلمسانی اور اس جیسے تو وہ ماہیت اور وجود** کے درمیان تفریق نہیں کرتے اور نہ مطلق اور معین کے درمیان بلکہ اس کے نزدیک جہان میں اس کے سوا کوئی موجود نہیں اور نہ کسی وجہ کے ساتھ غیر، کائنات اسکے اجزاء اور ابعاض ہیں جیسے سمندر میں اس کی لہریں ہیں اور جیسے گھر کے اجزاء کی گھر سے نسبت ہوتی ہے، ان کے اشعار میں سے ہے:

اَلْبَحْرُ لَا شَكَّ عِنْدِیْ فِیْ تَوَحُّدِہٖ　　وَاِنْ تَعَدَّدَ بِالأَمْوَاجِ وَ الزَّبَدِ

فَلاَ يَضُرُّنَّكَ مَا شَاهَدْتَ مِنْ صُوَرٍ　　فَالْوَاحِدُ الرَّبُّ سَارِی الْعَيْنِ فِی الْعَدَدِ

(سمندر بلا شبہ ایک ہے اگر چہ موجیں اور جھاگ لا تعداد ہیں۔ تو کائنات میں ہر طرف بکھری صورتوں پہ نہ جاؤ کہ سب میں رب تعالی ہی جلوہ فگن ہے) اور:

فَمَا الْبَحْرُ اِلَّا الْمَوْجُ لَا شَیْءَ غَیْرُہٗ وَاِنْ فَرَّقَتْہٗ کَثْرَۃُ الْمُتَعَدِّدِ

(سمندر نہیں ہے مگر موج اس کے سوا کوئی شئ نہیں اگر چہ لا تعداد۔موجوں۔نے اسے مفرق کر دیا)

بلاشبہ یہ نظریہ وعقیدہ رکھنا کفر اور زندیقیت ہے کیونکہ وجود اور ماہیت کے مابین تمییز اور معدوم کو شئ قرار دینا یا خارج میں مطلق اور معین کے مابین تمییز اور مطلق کو ذہن میں معینات سے ماوراء شئ قرار دینا ضعیف اور باطل نظریات ہیں، گہری نظر رکھنے والا محقق جانتا ہے کہ جس نے خارج میں موجود ان امور میں دو اشیاء کیں: ایک ان کا وجود اور دوم ان کی ذوات یا ان کے لئے ان کے عینِ موجود سے زائد موجودِ مطلق حقیقت باور کی تو اس نے فاش غلطی کی اور اس پر وہ امر مشتبہ ہوا جو عقل تعیین اور خارجی وجود سے مجرد ماہیات اس کے ساتھ جو اس سے خارج میں موجود ہے، سے مجرد مطلق معانی ملحوظ کرتی ہے اور نہ جانا کہ عقل کے متصورات اور مقدرات اس سے اوسع ہیں جو موجود اور بذاتہ حاصل ہیں جیسے وہ معدومات اور ممتنعات اور مشروطات کا تصور کرتی ہے اور ایسی ایسی چیزوں کو فرض کر سکتی ہے جن کا ممکنات اور ناممکنات میں سے قطعاً ہی وجود نہیں اور معینات کی مطلق صفات اور موجودات میں سے متصور ذوات کا اخذ کرتی ہے! یہ قول اللہ تعالیٰ کے ساتھ شدید ترین جہل وکفر ہے کیونکہ اس قائل نے مظاہر اور ظاہر کے درمیان تفرقہ نہیں کیا اور وہ کثرت وتفرقہ کو فقط انسان کے ذہن کا تصور قرار دیتا ہے اس وجہ سے کہ وہ شہودِ حقیقت سے محجوب ہے تو جب اس کا پردہ ہٹایا جائے تو وہ معاینہ کر لے گا کہ وہ کوئی غیر نہیں بلکہ یہ ناظر عینِ منظور اور یہ شاہد عینِ مشہود ہے۔

فصل

یہ نظریات اس وجہ پر میں ان حضرات سے قبل اس امت کے کسی ایک شخص کے پاس بھی موجود نہیں پاتا لیکن ارسطو سے منقول بعض فلسفہ کی کتب میں پڑھا کہ بعض فلاسفہ کی طرف یہ قول منسوب کیا گیا ہے کہ وجود واحد ہے اور اس کا رد کیا گیا، تو یہ کیسا موقف ہے جو خود صابئین کے متکلمین کو ہی پسند نہیں؟ یہ نظریات اور تحریرات تاتاریوں کے اقتدار کے قائم ہونے کے ساتھ منظر عام پر آئے ہیں، کفر دراصل حلولِ عام یا اتحاد یا حلولِ خاص تھا اور اس کی وضاحت یہ کہ رباعی تقسیم ہے کیونکہ جس نے رب کو حقیقۃً عبد قرار دیا تو یا تو وہ عبد میں اس کے حلول کا قائل ہوگا یا اس کے ساتھ اتحاد کا اور دونوں تقدیروں پر یا تو وہ اسے بعض خلق کے ساتھ مختص کہے گا جیسے حضرت مسیح (نصاریٰ کے نزدیک) یا اسے تمام خلق کے لئے عام کہے گا تو یوں ہمارے سامنے چار اقسام ہیں:

اول: حلولِ خاص، یہ نصاریٰ کے نسطوریوں اور ان جیسوں کا قول ہے جو قائل ہیں کہ لاہوت نے ناسوت میں حلول کیا اور اس کے ساتھ مختلط ہوا جیسے پانی برتن میں حالّ ہو جاتا ہے، ان لوگوں نے نصاریٰ کا کفر محقق کیا ان کے مسلمانوں کے ساتھ اکٹھے رہنے کے سبب، ان کا اولین شخص مامون کے دور میں تھا اور یہ نظریہ اس امت کے ان غالی لوگوں کا ہے جنہوں نے نصرانیوں کی ہمنوائی کی جیسے غالی رافضی جو قائل ہیں کہ رب تعالیٰ نے حضرت علی بن ابو طالب اور ائمہِ اہل بیت میں حلول کیا اور غالی نساک جو سب یا

بعض اولیاء میں حلول کے قائل ہیں جیسے حلاج، یونس اور حاکم اور ان جیسے

دوم: اتحادِ خاص، یہ نصاریٰ کے یعقوبیہ کا قول ہے اور ان کا یہ قول اخبث الاقوال ہے اور یہ سودان اور قبطی ہیں جو قائل ہیں کہ لاہوت اور ناسوت باہم مختلط اور ممتزج ہوئے جیسے پانی اور دودھ ہو جاتے ہیں، اسلام کی طرف اپنی نسبت کرنے والے بعض غالی حضرات نے اس قول میں ان کی ہمنوائی کی

سوم: حلولِ عام، یہ وہ قول ہے جسے اہلِ سنت وحدیث کے ائمہ نے متقدمین جہمیہ کی ایک جماعت سے نقل کیا، اکثر جہمی متعبدہ کا یہی عقیدہ ہے جو کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات کے ساتھ ہر جگہ موجود ہے، یہ قرآن کی متشابہ آیات کے ساتھ اس پر تمسک کرتے ہیں مثلاً: (وَهُوَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوَاتِ وَ فِي الأَرْضِ) [الأنعام :۳] (اور آسمان اور زمین میں وہی اللہ ہے) (وَهُوَ مَعَكُمْ)[الحدید : ۴] (وہ تمہارے ساتھ ہے) ائمہِ سنت اہلِ معرفت اور علمائے حدیث کی کلام میں ان کا رد کثیر و مشہور ہے

چہارم: اتحادِ عام، یہ ان ملحدوں کا قول ہے جو زعم کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ عین وجودِ کائنات ہے، یہ دو وجہ سے یہود و نصاریٰ سے بھی بڑے کافر ہیں، اول اس جہت سے کہ یہ قائل ہیں کہ رب اپنے عبد کے ساتھ متحد ہے (اتحادِ ذات) وہ جسے اس نے مقرب کیا اور چن لیا بعد اس کے کہ دونوں باہم متحد نہ تھے اور یہ بھی کہتے ہیں کہ رب ہمیشہ عبد و دیگر مخلوقات ہی میں رہے گا، وہ ان کا غیر نہیں اور دوم اس جہت سے کہ انہوں نے ان کے ساتھ اس کی تخصیص کی جنہیں یہ معظم سمجھتے ہیں مثلاً حضرت مسیح، انہوں نے رب کو کتوں، خنزیروں، گندگیوں اور میل کچیل (الغرض کائنات کی ہر شئ) میں سرائت کئے ہوئے قرار دیا، اللہ نے قرآن میں کہا:

(لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ) [المائدة: ۱۷] (جو لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ عیسیٰ بن مریم، اللہ ہیں وہ بے شک کافر ہیں) یعنی اللہ کی ذات کو حضرت مسیح کے ساتھ متحد قرار دینے والوں کو اللہ نے کافر قرار دیا ہے تو وہ کیوں نہ کافر ہوں گے جو کہتے ہیں کہ کفار، منافق، بچے، دیوانے، نجس لوگ اور ہر شئ (میں) اللہ ہے؟ اللہ نے یہود و نصاریٰ کا رد کیا جب انہوں نے کہا:

(نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ)[المائدة: ۱۸] (کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے پیارے ہیں) اور ان سے کہا:

(قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ)[المائدة: ۱۸] (کہو کہ پھر وہ تمہاری بداعمالیوں کے سبب تمہیں عذاب کیوں دیتا ہے؟) تو ان کی بابت کیا خیال ہے جو زعم کرتے ہیں کہ یہود و نصاریٰ عین وجودِ خالق ہیں، نہ وہ ان کا غیر ہے اور نہ یہ اس کا غیر اور متصور نہیں کہ اللہ اپنے آپ کو عذاب دے اور کون میں ہر جو ناطق ہے وہ عینِ سامع ہے جیسے ایک حدیث میں ہے: (إِنَّ اللّٰهَ تَجَاوَزَ لِأُمَّتِیْ مَا حَدَّثَتْ بِهٖ اَنْفُسُهَا) (گزری) اور ناکح عینِ منکوح ہے حتیٰ کہ ان کا شاعر کہتا ہے:

وَ تَلْتَذُّ إِنْ مَرَّتْ عَلٰی جَسَدِیْ یَدِیْ　　　لِأَنِّیْ فِی التَّحْقِيْقِ لَسْتُ سِوَاكُمْ

(ص: ۷۴ میں گزر رہا ہے) ان حضرات کا کفر جب ان کے اس قول میں کہ اللہ اپنی تمام مخلوقات ہے نصاری کے اس قول کہ اللہ مسیح ابن مریم ہے، کے کفر سے بڑا ہے اور نصاری گمراہ تھے اور ان کے اکثر توحید بارے اپنے مذہب کو نہیں سمجھتے تھے کہ وہ ایسی متخیل شیٔ ہے جو نہ جانی اور نہ سمجھی جا سکتی ہے اس طور کہ رب کو ایک جوہر باور کیا پھر اسے تین جواہر میں قرار دیا (عقیدۂ تثلیث) اور اس کی تعددِ خواص و اشخاص کے ساتھ تاویل کی جو کہ اقانیم ہیں اور ان کے نزدیک خواص جواہر نہیں تو یوں اپنے کفر میں وہ متناقض ہوئے، اسی طرح یہ اتحادیہ ملحد بھی گمراہ ہیں کہ ان کے اکثر اپنے رؤساء کے قول کی فہم نہیں رکھتے اور اس میں وہ نصاری کی مانند ہیں، ان کے نزدیک شیخ جتنا احمق واجہل ہوگا اللہ کا اتنا ہی بڑا عارف ہوگا، ان کے لئے اس رب کی عبادت سے حظ ونصیب ہے جس کا کفر کیا جیسے نصاری کے لئے بھی یہ ہے جب تک کوئی حجاب میں ہے، جب اس کے دل سے حجاب اٹھ جائے اور اسے معرفت حاصل ہو جائے کہ وہ تو وہی (یعنی رب) ہے تو اب اسے اختیار ہے کہ چاہے تو حلال وحرام اور امر ونہی کی شرعی قیود پر چلتا ہے یا شتر بے مہار بن جائے اور جو چاہے کرے تا کہ محجوب لوگ۔ اور یہی خلق کی اکثریت ہیں۔ اس کی اقتداء کرتے ہیں، ان کا زعم ہے کہ انبیاء کی یہی روش تھی اگر انہیں کامل شمار کریں۔

فصل

ان اتحادیہ مثلا ابن عربی، ابن سبعین، قونوی اور تلمسانی کا مذہب تین مواد سے مرکب ہے:

(۱) جہمیہ کا (یعنی ان سے ماخوذ) سلب اور تعطیل

(۲) صوفیہ کے مجملات اور یہ جو بعض صوفیہ کی تحریرات میں مجمل اور متشابہ باتیں پائی جاتی ہیں جیسے نصاری حضرت مسیحؑ سے اس طرح کی باتوں کے نقل کے ساتھ گمراہ ہوئے تھے تو وہ متشابہ کی پیروی اور محکم کا ترک کرنے لگے، اسی طرح مغلوب العقل لوگوں کے کلمات جو انہوں نے حالتِ سکر میں بولے

(۳) فلسفیانہ زندیقیت میں سے جو تجہّم کی اصل اور اساس ہے اور ان کی کلام وجودِ مطلق، عقول، نفوس، وحی، نبوت، وجوب، امکان اور جو اس میں حق و باطل ہے، کی بابت ہے تو یہ مادہ ابن سبعین اور قونوی کی تحریرات میں غالب ہے جبکہ دوسرا موضوع اور مادہ ابن عربی کے ہاں اغلب ہے اسی لئے بقیہ کی نسبت وہ اسلام سے اقرب ہے البتہ یہ سبھی تجہّم میں مشترک ہیں، تلمسانی ان سب ے بڑا زندیق اور اتحادیہ ہے اور اللہ، اس کی کتب، اس کے رسل، اس کی شرائع اور یوم آخرت کا اکفر ہے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ وہ کہتا ہے کہ اللہ مجھ میں اپنی وحدتِ ذاتی کے ساتھ متجلی ہے، اپنے آپ کو جانتا ہے اور اسے جو اس سے صادر ہوتا ہے اور معلومات سب کی سب حقیقتِ علم میں منکشف تھیں اور وہ ان کے لئے شاہد تھا، تو اسے کہا جائے گا: تم نے اس سے صادر کے بارہ میں اس کے علم کا اثبات کیا اور ان معلوم کی بابت اس کے علم کا جن کا وہ اپنے نفس کے سوا شاہد ہے پھر تم نے ذکر کیا کہ اس نے ان کونی، مشہود اور معدوم حقائق پر اپنا آپ پیش کیا تب اس نے (أنَــا) کے ساتھ تعبیر کیا اور نبوت کی حقیقت ظاہر ہوئی جس میں حق واضح ہو کر ظاہر ہوا اور اس میں وجودِ مطلق منعکس ہوا اور وہی اسمِ رحمٰن

کے ساتھ مسمیٰ ہے جیسا کہ اول اسمِ اللہ کے ساتھ مسمیٰ ہے اور تم نے آخر کار یہ بھی کہا: (وَهُوَ الآن عَلیٰ مَا عَلَیْهِ کَانَ) (یعنی اب وہ اسی پہ ہے جس پر تھا) تو یہ ہے جس کی بابت اس نے جانا کہ اس سے صادر ہوا ہے اور وہ اس کا مشہود اور فی نفسہ معدوم ہے، وہ حق ہے یا اس کا غیر؟ اگر وہ حق ہے تو لازم ہوا کہ رب معدوم تھا اور یہ کہ وہ اپنے نفس سے صادر ہو پھر وہ متناقض ہوا، اور اگر اس کا غیر ہے تو تم نے اس غیر کو وجودِ مطلق کے انعکاس کا آئینہ بنایا اور وہ رحمٰن ہے تو یوں خلق رحمٰن ہوئی؟

تو یوں تم متردد اور حائر ہو اس امر کے درمیان کہ اسے قرار دو کہ معدوم کو جانا جو اس سے صادر ہوا تو اس کے لئے غیر ہو اور وہ رحمٰن نہیں اور اس امر کے درمیان کہ اس ظاہر ہونے والے واصف کو حق قرار دو اور وہ رحمٰن ہے تو وہ معدوم نہ ہوگا اور نہ اس سے صادر، جہاں تک یہ بات کہ کبھی تم خالق حق کے خصائص کے ساتھ شئ کو متصف کرو اور کبھی عبدِ مخلوق کے خصائص کے ساتھ تو یہ اپنے تناقض کے باوصف غلیظ ترین کفر میں سے ہے اور یہ نصاریٰ کے نظریہ لاہوت ناسوت کی نظیر ہے لیکن یہ کئی وجوہ سے اس سے بڑا کفر ہے:

پہلی وجہ: کہ یہ کونی حقائق جن کی بابت تم نے ذکر کیا کہ یہ فی نفسہا معدوم تھے اور ان کے اعیان اس کی مطلق تجلی میں اس کے علم میں مشہود تھے جس میں وہ اپنی وحدتِ ذاتی کے ساتھ اپنے نفس میں متحد تھا تو کیا ان کی تخلیق کی اور انہیں بنایا اور عدم کے بعد انہیں وجود میں لے آیا؟ یا یہ ابھی تک معدوم ہیں؟ اگر ابھی تک معدوم ہیں تو واجب ہے کہ کونیات میں سے کوئی شئ موجود نہ ہو اور یہ حس، عقل اور شرع کے لئے مکابرت (یعنی ہٹ دھرمی) ہے اور کوئی عاقل یہ بات نہیں کہہ سکتا اور نہ کسی عاقل نے ایسا کہا ہے اور اگر یہ عدم کے بعد موجود ہوئے ہیں تو ممتنع ہے کہ یہ حق کی ذات ہوں کیونکہ اللہ تعالیٰ معدوم نہ تھا کہ پھر موجود ہوا، اور یہ اتحادی نظریہ کا بطلان کرتا ہے اور تب واجب آتا ہے کہ جو موجود ہے وہ اللہ نہ ہو بلکہ یہ اس کی خلق، اس کے مملوک اور اس کے عبید ہیں اور یہ تمہارے اس قول کہ: (وَهُوَ الآن لَا شَیْءَ مَعَهُ عَلیٰ مَا عَلَیْهِ کَانَ) (یعنی اب اس کے ساتھ کوئی شئ ایسی نہیں جیسی کبھی تھی) کا ابطال کرتا ہے

دوسری وجہ: کہ تمہارا قول: (تَرَکَّبَتِ الْخِلْقَةُ الإِلٰهِیَّةُ مَنْ کَانَ إِلیٰ سِرٍّ شَأْنُهُ) (یعنی خِلقتِ الٰہیہ اس سے مترکب ہوئی ہے جس کا حال راز میں ہے) یا تمہارا یہ قول کہ حق اس میں ظاہر ہوا یا اس طرح کے دیگر الفاظ جن کا یہ اتحادیہ اس موضوع میں اطلاق کرتے ہیں جیسے ان کا قول: (ظَهَرَ الْحَقُّ وَ تَجَلّٰی) (حق ظاہر اور متجلی ہوا) (وَهٰذِهٖ مَظَاهِرُ الْحَقِّ وَ مَجَالِیْهِ) (یہ حق کے مظاہر اور اس کی تجلیات ہیں) (وهٰذَا مَظْهَرٌ إِلٰهِیٌّ وَ مَجْلًی إِلٰهِیٌّ) (یہ مظہرِ الٰہی اور تجلیِ الٰہی ہے) اور اس کے نحو! تو کیا تمہاری مراد یہ ہے کہ اس کی عینِ ذات کا یہاں حصول ہوا؟ یا یہ مراد ہے کہ وہ ان کے لئے ظاہر اور متجلی ہوا اس طور کہ انہوں نے اسے جان لیا؟ یا یہ مراد ہے کہ وہ ان کے ساتھ اپنی خلق کے لئے ظاہر اور متجلی ہوا اور کوئی چوتھی قسم موجود ہو نہیں سکتی

اگر اول تمہاری مراد ہے۔ اور یہی اتحادیہ کا قول ہے۔ تو تم نے تصریح کی کہ وہ عینِ مخلوقات ہے اور مخلوقات میں تو کتے، خنزیر، نجاستیں، شیاطین اور کفار بھی ہیں تو کیا یہ سب اللہ کی ذات ہیں؟ یا یہ اور اللہ کی ذات باہم متحد ہوئے ہیں یا اللہ کی ذات نے

ان میں حلول کیا ہے اور یہ ان لوگوں کے کفر سے بھی بڑا کفر ہے جنہوں نے کہا بے شک اللہ ہی مسیح ابن مریم ہے اور اللہ تین کا تیسرا ہے اور اللہ جنتا ہے اور وہ جنا گیا ہے اور اس کے بیٹے اور بیٹیاں ہیں، اگر یہ باتیں صراحت سے کہو تو مسلمان اچھی طرح تمہارا قول پہچان لیں گے اور تمہیں تمہارے بنی جنس کے ساتھ ملحق کر دیں گے تو پھر صاف صاف کہو، مجمل الفاظ کیوں استعمال کرتے ہو؟

اور اگر تمہاری مراد یہ ہے کہ وہ ان کے لئے ظاہر اور متجلی ہوا تو حقیقۃً ان کے لئے معلوم بنا اور بلا شبہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے لئے معروف ہوتا ہے (یعنی اسے اس کی معرفت نصیب ہوتی ہے) لیکن تمہاری اس ضمن کی کلام دو جہت سے باطل ہے ایک اس جہت سے کہ تم نے اسے معدومات کے لئے معلوم قرار دیا وہ جن کا کوئی وجود نہیں، اس لئے کہ وہ ان کا عالم ہے اور تم نے اعتقاد کیا کہ جب وہ معلوم بنیں تو جائز ہے کہ عالم بھی ہوں اور یہ عین باطل ہے اس جہت سے کہ اگر اسے علم ہے کہ ایک شئ وجود میں آئے گی تو جائز نہیں کہ وہ اپنے وجود سے قبل ہی (اپنے آپ کی) عالم وقادر اور فاعل ہو

دوم اس جہت سے کہ یہ سب معلوم کائنات کا حکم نہیں بلکہ ان کے بعض کا ہے اور یہ وہی جن کا عالم ہونا علمِ صحیح ہے، اگر تم کہو کہ اللہ ان کا عالم ہے اس لئے کہ وہ اس پر دال نشانیاں ہیں تو یہ بات حق ہے اور یہی اہلِ اسلام کا دین اور عارفین کا شہود ہے لیکن تم نے دو وجوہ کی بناء پر یہ نہیں کہا، ایک: کہ وہ نشانیاں نہ بنیں گی مگر بعد اسکے کہ ان کی تخلیق کرے اور انہیں موجودات بنائے، نہ کہ اس حال میں کہ وہ معدوم معلوم ہوں اور تم نے ثابت نہیں کیا کہ اس نے ان کی تخلیق کر دی ہے اور انہیں وجود میں لے آیا ہے بلکہ تم نے تو اس کے نفس کو ان کے لئے متجلی قرار دیا، دوم: تم نے تصریح کی ہے کہ وہ ان کے لئے متجلی اور ظاہر ہوا نہ کہ یہ کہ انہیں اپنی خلق کی دلیل اور ایسی آیات بنایا جو ہر عبدِ منیب کے لئے تبصرہ اور ذکریٰ ہوں (یعنی باعثِ عبرت) اور اللہ نے اپنی کتاب میں خبر دی ہے کہ وہ ان مصنوعات میں آیات یعنی علامت اور دلالت بناتا ہے، جیسے کہا:

﴿وَ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ــــ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ﴾ تک **[البقرۃ: [۱۶۳۔ ۱۶۴]** (اور تمہارا معبود ایک ہی ہے) اور کبھی خود انہیں نشانی قرار دیتا ہے جیسے اس آیت میں کہا:

﴿وَ اٰيَةٌ لَّهُمُ الْاَرْضُ الْمَيْتَةُ اَحْيَيْنٰهَا﴾ [یٰس: **۳۳]** (اور ایک نشانی ان کے لئے زمین مُردہ ہے کہ ہم نے اس کو زندہ کیا) اور اللہ نے یہ جو اپنی کتاب میں ذکر کیا حق ہے تو اگر اس کی نظیر میں کہا جائے: وہ ان کے ساتھ متجلی اور ظاہر ہوا جیسے کہا جاتا ہے: ان کا عالم و عارف ہوا تو یہ صحیح معنی ہوگا لیکن اس موضع میں تجلی اور ظہور کے الفاظ غیر ماثور ہیں اور ان میں ابہام اور اجمال ہے کیونکہ ظہور اور تجلی سے عین کا تجلی اور ظہور سمجھا جائے گا بالخصوص تجلی کے لفظ سے، تو عین کیلئے تجلی میں اس کا استعمال غالب ہے اور یہ اتحادیہ کا مذہب ہے، ابن عربی نے اس کی تصریح کی اور کہا: (فَلَا تَقَعُ الْعَيْنُ إِلَّا عَلَيْهِ) (یعنی جدھر دیکھتا ہوں اُدھر تو ہی تو ہے) اور اگر ان کے نزدیک آنکھوں کو جو کچھ بھی نظر آتا ہے وہ اللہ ہے تو یہ مسلمانوں کے ہاں بالاتفاق صریح کفر ہے بلکہ صحیح مسلم میں ثابت ہے کہ نبی اکرم نے

فرمایا جان لو کہ تم میں سے کوئی اس زندگی میں اپنے رب کو ہرگز نہیں دیکھ سکتا، بالخصوص اگر کہا جائے: (ظَهَرَ فِيهَا وَ تَجَلّٰى) تو لفظ مشترک ہو جائے گا اس امر کے مابین کہ اس کی ذات ان میں ہو اور اس امر کے مابین کے وہ ان کے لئے آئینہ کی مثل ہو جس میں دیکھنے والے کی مثال (یعنی اس کا عکس اور اس جیسا) ظاہر ہوتا ہے اور یہ دونوں باطل ہیں تو اللہ کی ذات مخلوقات میں نہیں ہے اور نہ اس کی ذات میں مخلوقات دکھائی دیتی ہیں جیسے آئینہ میں اپنی شکل دکھائی دیتی ہے لیکن ان کا ظہور اس کی (ذات) پر دلالت اور اس کے لئے شہادت ہے اور یہ اس کی ذات پر آیات اور صفات ہیں جیسا کہ کتاب اللہ نے کہا

تیسری وجہ: کہ الف و نون کی مقارنت جن سے (أَنَا) کے ساتھ تعبیر کیا گیا اور (حقیقة النبوة) اور (الرُّوحُ الإضَافِي) جیسے الفاظ، کیا اللہ کے اسماء کے مسمی میں داخل ہیں؟ اس طور کہ یہ ان اشیاء میں داخل ہیں جو اس کے ظاہر اور مضمر اسماء کے مسمی میں داخل ہیں؟ یا اس کے اسماء کے مسمی میں داخل نہیں؟ اگر اول ہے تو (اس کا مطلب ہوا کہ) تمام مخلوقات اسمائے حسنی کے مسمیٰ میں داخل ہیں اور مخلوقات اللہ کا جزو اور اس کی صفت ہوئیں اور اگر ثانی ہے تو (مطلب ہوا کہ) یہ اشیاء معدوم ہیں جن کے لئے فی نفسہا وجود نہیں تو کیونکر تصور کیا جائے کہ موجود لا موجود، ثابت لا ثابت اور منفی لا منفی ہو؟ اور یہ واضح تقسیم ہے اور یہ اس تلبیس کی حقیقت منکشف کرنے کی ایک دلیل ہے

تو یہ امور جو اس کے لئے معلوم (مگر ابھی) معدوم تھے، نزولِ خلیہ کے وقت یہ امور جو اس نے ذکر کئے ظاہر ہوئے تو یہ جو اس نزول کے بعد ظاہر و معلوم ہوئے (أَنَا) بن گئے اور حقیقتِ نبوت اور روحِ اضافی اور فعلِ ذات اور مفعولِ ذات اور معنائے وسط تو اگر یہ سب اللہ میں ہیں تو یہ بات کہنے میں دو عظیم کفر ہیں: ایک تمام مخلوقات کا اللہ کا جزو ہونا اور دوم ان تغیرات کا حامل ہونا جو نقص سے کمال تک اور پھر کمال سے نقص تک ہوتے ہیں اور اگر یہ اس کی ذات سے خارج تھے تو یہ اشیاء معدوم تھیں اور ان کے نزدیک انہیں اپنے سے خارج خلق نہیں کیا تو وہ پھر حلول کرنے والا کیونکر ہو سکتا ہے؟

چوتھی وجہ: کہ حقیقتِ نبوت اور جو اس کے ساتھ ہے، کا عقدہ یا تو ایسی شیٔ ہے جو بنفسہ قائم ہے یا اس کے لئے یا اس کے غیر کے لئے صفت ہے! تو اگر بنفسہ قائم ہے تو یا تو وہ اللہ ہے یا اس کا غیر، اگر اللہ ہے تو اللہ وہ ظاہری نقطہ ہوگا اور وہ حقیقتِ نبوت ہے اور وہی روحِ اضافی ہے، اس کے بعد اس نے کہا: اس نے روحِ اضافی کو اپنے فعلِ ذات میں کیا اور اس نے حضرت محمد کو اپنی نبوت کا عقدہ دیا تو یوں وہ ایسا ہوا کہ اپنے نفس کو اپنے فعل کی صورت کیا اور حضرت محمد کو اپنی ذات عطا کی، اور یہ ابین اور افتح کفر ہونے کے ساتھ ساتھ باہم متضاد بھی ہے تو معطی کون اور معطیٰ کون ہے؟ اگر اس نے اپنی ذات اپنے غیر کو عطا کی ہے، اور اگر یہ اشیاء بنفسہا قائم اعیان ہیں اور یہ غیر اللہ ہیں تو برابر ہے کہ ملائکہ ہوں یا ان کے غیر، جو بھی ماسوا اللہ اعیان ہیں تو وہ اللہ کے فعلِ خلق سے مخلوق اور اس کے مربوب اور مصنوع ہیں اور اللہ ہر شیٔ کا خالق ہے اسی نے ظہورِ حق کو واصف کیا اور وہی اسمِ رحمٰن کے ساتھ مسمیٰ ہے تو اسمِ رحمٰن کے ساتھ مسمی اپنے نفس کے لئے واصف مخلوق

کیونکر ہوسکتا ہے؟ اور یہ صریح کفر اور ان لوگوں کے الحاد سے بھی بڑا الحاد ہے جنہیں جب کہا گیا کہ رحمٰن کو سجدہ کرو تو کہا: (**قَالُوْا وَمَا الرَّحْمٰنُ**) [الفرقان: ۶۰] (کہتے ہیں کہ رحمٰن کیا؟) (یعنی کہا: رحمان کون؟) اور ان لوگوں کے الحاد سے بھی جن کی بابت کہا: (**وَهُمْ يَكْفُرُوْنَ بِالرَّحْمٰنِ**) [الرعد: ۳۰] (یعنی رحمان کو نہیں مانتے) کیونکہ انہوں نے اس کے اسم اور صفت دونوں کا کفر کیا جبکہ وہ رب العالمین کے مقر تھے اور ان لوگوں نے اسم کا اقرار کیا اور مسمیٰ کو اس کی مخلوقات میں سے ایک مخلوق قرار دیا۔

اور یا یہ کہ اس حقیقت اور جو اس کے ساتھ ہے، سے مراد صفت ہو، تو یا تو یہ صفت اللہ کے لئے ہوگی یا اس کے غیر کے لئے، اگر اللہ کے لئے ہے تو جائز نہیں کہ یہ اسمِ رحمٰن کے ساتھ مسمیٰ ہو کیونکہ یہ اللہ کی ذات نہ کہ اس کی صفات، کے لئے اسم ہے اور سجدہ اللہ کے لئے ہوتا ہے نہ کہ اس کی صفات کے لئے، اسی طرح دعا بھی اللہ سے ہوتی ہے نہ کہ اس کی صفات سے، اور اگر یہ اس کے غیر کے لئے صفت ہے تو یہ بہت بڑا اور سب سے بڑا الزام ہے اور یہ ایسی تقسیم ہے جس سے مفر نہیں کہ اللہ کے اسماء میں الحاد کے اس مرتکب نے اس عقدہ کو جسے وہ حقیقتِ نبوت کے عقدہ کا نام دیتا ہے اور جسے اس نے حق کے علم بنفسہ کی صورت بنایا اور جسے اس نے وجودِ مطلق کے انعکاس کے لئے آئینہ کیا اور اس کی قدیم صفات کے تمیز کا محل باور کیا اور یہ کہ وہ حق جو اس میں اپنی صورت وصفت کے ساتھ ظاہر ہوا اسے اپنے نفس کا وصف واحاطہ کرنے والا واصف قرار دیا اور وہ اسمِ رحمٰن کے ساتھ مسمیٰ ہے پھر ذکر کیا کہ اس نے یہ عقدہ حضرت محمد کو عطا کر دیا اور معلوم ہے کہ اسمِ رحمٰن کے ساتھ مسمیٰ وہی ہے جو اسمِ اللہ کے ساتھ ہے جیسے کہا:

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى) [الإسراء: ۱۱۰] (کہہ دو کہ تم اللہ پکارو یا رحمٰن جس نام سے پکارو اُس کے سب نام اچھے ہیں) تو یوں وہ عقدہ وہ خود ہوگا جسے اس نے حضرت محمد کو عطا کیا اور اگر یہ اس کے لئے یا اس کے غیر کے لئے صفت ہیں تو وہ رحمٰن ہوئے تو یہ ملحد دائر ہے اس کے درمیان کہ رحمٰن اللہ کی خلق میں سے ایک خلق ہو یا اس کی صفات میں سے ایک صفت اور اس کے امر کے درمیان کہ رحمٰن کو اللہ نے حضرت محمد کو ہبہ کیا ہو اور یہ دونوں (نظریہ) کفر کی قبیح ترین صورت ہیں

پانچویں وجہ: کہ اس حقیقت کے لئے اس کے قول کے دو پہلو ہیں: ایک حق کا پہلو جو ان کے مواجہ ہے جس میں وجودِ اعلیٰ واصفاً ظاہر ہوا اور دووسرا اس سے عالم کے ظہور کی طرف کا پہلو اور یہی روحِ اضافی کے ساتھ مسمیٰ ہے تو اس نے کلام میں ظہورِ وجود اور ظہورِ عالم کا ذکر کیا اور پہلے گزرا کہ حق تھا (ازل میں) اور اس کے ساتھ کوئی شئ نہ تھی اور وہ اپنے نفس کے ساتھ اپنی وحدتِ ذاتیہ کے ساتھ متجلی تھا اور جب خلیہ الہیہ کا نزول ہوا تو حقیقتِ نبوت کے عقدہ کا ظہور ہوا تو وہ وجود کے انعکاس کے لئے آئینہ کی مثل ہوئی تو اس میں حق واصفاً صورت وصفت کے ساتھ ظاہر ہوا، اس کلام میں اس کی طرف مواجہ حق کا ذکر کیا اور وجودِ اعلیٰ کا جو اس حق میں ظاہر ہوا اور اس پہلو کا جو اس کیلئے حق کی طرف سے ہے تو یوں یہاں تین اشیاء ذکر کیں: حق، وجود اور طرف جبکہ سابق الذکر کلام میں اس نے حق وہ وجودِ مطلق قرار دیا جو منعکس ہوا اور یہ وہ حق ہے جو اس میں واصفاً ظاہر ہوا تو کبھی وہ وجودِ مطلق کو حق قرار دیتا

ہے اور کبھی کہتا ہے کہ وجودِ مطلق اس حق میں ظاہر ہوا ہے اور یہ تناقض ہے

پھر اسے کہا جائے: تمہارے نزدیک یہ دونوں رب تعالیٰ سے عبارت ہیں تو تم نے اسے ظاہر اور مظہر قرار دیا تو اگر ظہور سے تمہاری مراد وجود ہے تو (گویا) رب مرۃ بعد مرۃ (یعنی یکے بعد دیگرے) موجود ہوا اور یہ (نظریہ رکھنا) شنیع کفر ہے! کیسے اس کے وجود کا تکرار متصور کیا جائے اور کیونکر یہ عقیدہ رکھا جائے کہ وہ فی نفسہ موجود پایا گیا بعد اس کے کہ وہ فی نفسہ موجود نہ تھا؟ اور اگر تمہاری مراد وضوح اور تجلی ہے تو کوئی ایسی مخلوق نہیں جس کے لئے وہ ظاہر اور متجلی ہوتا ہو کیونکہ ابھی تو یہ عالم تخلیق نہ ہوا تھا اور تم قائل ہو کہ حق اس میں واصفاً ظاہر ہوا اور تم نے اسے رحمٰن کا نام دیا اور اس کے ظہور کو تم معلوم اور مشہود قرار نہیں دیتے ہو تو کیونکر متصور ہو کہ وہ اپنے آپ کیلئے متجلی ہوا بعد اس کے کہ متجلی نہ تھا؟ یہ اس امر کے مترادف ہوگا کہ وہ اپنے آپ کا عالم نہ تھا حتی کہ اپنے آپ کو جانا، نیز تمہارا قول ہے کہ وہ اپنی وحدت کے ساتھ اپنے آپ کے لئے متجلی تھا تو یہ کفر اور تضاد بیانی ہے

چھٹی وجہ: یہ تحیر و تناقض نصاریٰ کے اپنے اقانیم کی بابت تحیر اور تناقض کی مثل ہے تو وہ قائل ہیں کہ باپ، بیٹا اور روح القدس تین آلہہ ہیں اور یہ (تینوں مل کر) ایک الٰہ ہے اور مسیح کے قالب میں جو ہے وہ بیٹا ہے اور کہتے ہیں یہ وجود، علم، حیات اور قدرت ہے تو ان سے پوچھا جائے اگر یہ صفات ہیں تو آلہہ تو نہ ہوئیں اور متصور نہیں کہ مسیح کے ساتھ متدرع الہ ہو، الا یہ کہ وہ باپ ہو اور اگر جواہر ہیں تو واجب ہے کہ وہ ایک الہ نہ ہو کیونکہ تین جواہر ایک جوہر نہ ہوں گے، وہ اس کے لئے ہمارے قول: (زَيْدٌ الْعَالِمُ الْقَادِرُ الْحَيُّ) کے ساتھ تمثیل دے سکتے ہیں تو وہ اپنے عالم ہونے کی حیثیت کے ساتھ اپنے قادر ہونے کی حیثیت میں نہیں (یعنی یہ صفات ایک دوسرے سے دیگر ہیں) اگر ان سے کہا جائے یہ سب مانع نہیں کہ وہ ایک ذات ہو جس کے لئے متعدد صفات ہیں اور تم اس کے قائل نہیں ہو! نیز حضرت مسیح کے ساتھ متحد اگر اللہ ہے تو ممتنع ہے کہ وہ صفت ہو بلکہ وہ موصوف ہی ہوگا اور تم یہ نہیں کہتے! تو جو حق ہے تم وہ نہیں کہتے اور جو تم کہتے ہو وہ حق نہیں، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

(يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ وَلَا تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ إِلَّا الْحَقَّ)[النساء: ۱۷۱] (اے اہلِ کتاب! اپنے دین میں حد سے نہ بڑھو اور اللہ کے بارے میں حق کے سوا کچھ نہ کہو) تو نصاریٰ حیرت میں مبتلا اور تناقض کا شکار ہیں، اگر وہ اقنوم کو صفت قرار دیں تو ممتنع ہے کہ مسیح الہ ہو، اور اگر اسے جوہر باور کریں تب ممتنع ہے کہ الٰہ واحد ہوا اور وہ چاہتے ہیں کہ مسیح کو اللہ قرار دیں اور اللہ کا بیٹا بھی اور باپ، بیٹا اور روح القدس کو ایک الٰہ قرار دیں اسی لئے قرآن نے کبھی شرک کے ساتھ انہیں موصوف کیا اور کبھی انہیں مشرکین سے جدا ایک قسم قرار دیا کیونکہ وہ دونوں باتیں کرتے ہیں اگرچہ وہ متناقض ہیں، تو یہی حال ان حضرات کا ہے، یہ چاہتے ہیں کہ عالم کے اتحاد کی بات کہیں اور یہ کہ کائنات میں کوئی غیر نہیں اور یہ بھی چاہتے ہیں کہ عالم کے وجود کا اثبات کریں تو ثبوتِ عالم کو اللہ کے علم میں قرار دے لیا اور وہ اس کے لئے شاہد ہے اور اسے اس مشہود لہ کے لئے متجلی باور کیا تو اگر اس میں متجلی ہے تو وہی متجلیٰ ہے نہ کہ

اس کا غیر اور یہ مشہود اعیان ہی عالَم تھے

یہ شخص اور ابن عربی اس میں تو مشترک ہیں لیکن ایک اور جہت سے دونوں باہم متفرق ہیں وہ یہ کہ ابن عربی قائل ہے کہ وجودِ حق ان اعیان میں ثابت ہوا جو فی نفسہا ثابت ہیں اگر چاہو تو اسے حق کہہ لو اور چاہو تو اسے خلق قرار دے لو یا چاہو تو حق اور خلق دونوں کا اطلاق کرو اور چاہو تو کہو کہ ہر وجہ سے وہ (یعنی کلی طور پر) حق ہے اور نہ ہر وجہ سے خلق اور چاہو تو اسے حیرت قرار دے لو (یعنی تذبذب) جبکہ یہ کہتا ہے اعیانِ مشہودہ اس کے لئے متجلیٰ ہیں، دونوں نے جمیع خلق کی بابت وہ بات کہی جو نصاریٰ کے ملکیہ کے حضرت مسیح بارے قول سے مشابہ ہے جب کہا: لاہوت اور ناسوت دونوں ایک جو ہر بنے جس کے دو اقنوم ہیں! جہاں تک تلمسانی تو وہ کسی حال میں تعدد کا اثبات نہیں کرتا، وہ نصاریٰ کے یَعاقِبہ کے مثل ہے اور وہ اَکفر نصاریٰ ہیں، نصاریٰ نے یہ بات ایک شخص بارے کہی ہے، وہ قائل ہیں کہ لاہوت ناسوت کے ساتھ متدرع ہے بعد اس کے کہ وہ اس کے ساتھ متدرع نہ تھا اور یہ قائل ہیں کہ وہ تمام عالم میں ہے اور ازل سے ہے تو یوں اس کے عموم اور لزوم کے جبکہ نصاریٰ اس کے خصوص اور حدوث کے قائل ہوئے، حتیٰ ان کے ایک نے کہا نصاریٰ اس وجہ سے کافر ہوئے کہ تخصیص کر دی (یعنی صرف حضرت مسیح میں اللہ کا حلول قرار دیا جبکہ۔ان کے نزدیک۔ساری کائنات میں اس کا حلول ہے) یہ بات ابن عربی نے فصوص کے متعدد مقامات میں ذکر کی ہے اور لکھا کہ انبیاء کا بت پرستوں پر رد وانکار تخصیص کی وجہ سے تھا وگرنہ مکمل عارف وہ ہے جو ہر مظہر میں اس کی عبادت کرے، تو وہ عابد بھی ہے اور معبود بھی اور بت پرست اگر اپنی عبادت کا ترک کریں تو اپنے اس ترک کے بقدر وہ حق کے تارک بنیں اور حضرت موسیٰ نے حضرت ہارونؑ پر اس لئے غصہ کا اظہار کیا تھا کہ انہوں نے بنی اسرائیل کو بچھڑے کی پوجا سے منع کیا تھا کیونکہ ہارونؑ کا علم محدود تھا اور موسیٰ جانتے تھے کہ وہ (بظاہر بچھڑے کی پوجا کر کے) بجز اللہ کے کسی اور کی عبادت نہیں کر رہے تھے

اور حضرت ہارون نے بھی بچھڑے کا انکار اس لئے کیا تھا تا کہ وہ اللہ کی ہر صورت میں عبادت کریں اور سب سے بڑا مظہر جس میں اس کی عبادت کی گئی وہ ہویٰ ہے (یعنی نفسانی خواہش) تو ہویٰ سے بڑا کوئی معبود نہیں (نعوذ باللہ) البتہ ابن عربی عدم میں اعیان کا اثبات کرتا ہے جب کہ ابن حمد یہ انہیں فقط عالَم میں مشہود ثابت کرتا ہے اور یہی قول صحیح ہے لیکن اس کے ساتھ اس کا نظریہ اتحاد تام نہیں اسی لئے وہ تحقیقِ اتحاد سے ابعد اور اسلام سے اقرب ہے (یعنی دیگر فلاسفہ کی نسبت) اگر چہ ان کی اکثر کلام تناقض اور ہذیان کا مظہر ہے تو بہرحال کثرتِ ہذیان کثرتِ کفر سے بہتر ہے، اس کی کلام کا مقتضا یہ ہے کہ اس نے وجودِ حق کو وجودِ عالم کے ساتھ مشروط کیا اگر چہ عالم کے سوا بھی اس کے لئے کوئی وجود ہے جیسے آنکھ کا نور پلکوں کے وجود کے ساتھ مشروط ہے اگر چہ وہ حدقہ (یعنی قرنیہ) کے ساتھ مستقل حیثیت سے بھی قائم ہے تو اس پر اللہ کی عالَم کی طرف وہی احتیاج ہے جو آنکھ کے نور کی دونوں پلکوں کی طرف ہے، قرآن میں ہے:

﴿لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّ نَحْنُ اَغْنِيَآءُ﴾ [آل عمران :۱۸۱] (اللہ نے ان لوگوں کا قول سن لیا ہے جو کہتے ہیں کہ اللہ فقیر ہے اور ہم امیر ہیں) آخرِ آیت تک! تو اگر یہ اس کا قول ان کے بارہ میں ہے جنہوں نے اللہ کا یہ وصف کیا کہ وہ ان کے اموال کا محتاج ہے تاکہ انہیں فقراء کو عطا کرے تو ان کی بابت اس کا قول کیا ہوگا جو اس کی ذات کو اس کی مخلوقات کی طرف مفتقر اور محتاج باور کرتے ہیں اس طور کہ اگر اس کی مخلوقات نہ ہوتیں تو اس کی ذات کا شیرازہ بکھرا ہوتا اور وہ متفرق ومعدوم ہوتی جیسے پلکوں کے بغیر آنکھوں کا نور منتشر ومتفرق اور معدوم ہوگا، اللہ تعالیٰ نے قرآن میں کہا:

﴿اِنَّ اللّٰهَ يُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا وَلَئِنْ زَالَتَآ اِنْ اَمْسَكَهُمَا مِنْ﴾[الفاطر: ۴۱] (اللہ ہی آسمانوں اور زمین کو تھامے رکھتا ہے کہ ٹل نہ جائیں اگر وہ ٹل جائیں تو اللہ کے سوا کوئی ایسا نہیں جو ان کو تھام سکے) الآیۃ۔ اور کہا:

﴿وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ تَقُوْمَ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ بِاَمْرِهٖ﴾ [الروم : ۲۵] (اور اُسی کے نشانات میں سے ہے کہ آسمان اور زمین اُسی کے حکم سے قائم ہیں) الآیۃ اور:

﴿رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا﴾[الرعد: ۲] (اللہ وہی تو ہے جس نے ستونوں کے بغیر آسمان جیسا کہ تم دیکھتے ہو) اور:

﴿وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَلَا يَئُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ﴾ [البقرة :۲۵۵] (اُس کی بادشاہی آسمان اور زمین سب پر حاوی ہے اور اُسے اُن کی حفاظت کچھ بھی دشوار نہیں اور وہ بڑا عالی رتبہ اور جلیل القدر ہے) ابوداوٗد کی ایک حدیث میں ہے کہ سب آسمان، زمیں اور جو دونوں کے درمیان ہے کرسی کی نسبت ان کی مثال یہ ہے جیسے صحرا میں ایک کڑا پڑا ہوا اور کرسی کی یہی مثال عرش کے مقابلہ میں ہے، قرآن میں ہے:

﴿وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ﴾ [الأنعام : ۹۱] (اور ان لوگوں نے اللہ کی قدر جیسی جاننی چاہیئے تھے نہ جانی) الآیۃ

صحاح میں حضرات ابو ہریرہ، ابن عمر اور ابن مسعود کی روایات میں ہے بے شک اللہ نے آسمانوں اور زمینوں کو اپنے ہاتھ سے تھام رکھا ہے تو کوئی بتلائے ایسی ذات جس کی مٹھی میں ارض وسماوات ہوں اور جس کے ساتھ یہ قائم ہوں اور جس کی کرسی کی وسعت ان سماوات وارض سے بہت زیادہ ہو کیا وہ ان کا محتاج ومفتقر ہوسکتا ہے؟ کہ اگر یہ ختم ہو جائیں تو اس کا شیرازہ بھی بکھر جائے اور وجود متفرق ہو اور جب مسلمان ایسے شخص کو کافر قرار دیتے ہیں جو قائل ہو کہ آسمانوں اور زمین نے اسے اٹھایا ہوا ہے یا یہ اس پر سایہ کناں ہیں کیونکہ اس سے اس کی اپنی مخلوقات کی طرف محتاجگی ثابت ہوتی ہے تو جو کہے وہ عرش پر مستوی ہونے کے ضمن میں عرش کا محتاج ہے جیسے محمول اپنے حامل کا محتاج ہوتا ہے تو کیا وہ کافر نہ ہوگا؟ کیونکہ اللہ حی اور قیوم ہے اور سب کائنات سے غنی ہے، وہ غنیِ مطلق ہے اور سب اس کا ماسوا اس کا محتاج ہے حالانکہ عرش پر اصل استواء کتاب وسنت کی رو سے ثابت ہے اس پر امت کے سلف اور ائمہِ سنت کا اتفاق ہے بلکہ یہ تمام آسمانی کتب میں مذکور وثابت ہے تو اس کی نسبت کیا کہیں جو قائل ہو کہ اللہ

تعالیٰ سماوات اور زمین کا محتاج ہے اور یہ اگر اٹھ جائیں تو وہ متفرق ومنتشر اور معدوم ہو جائے تو جب وہ عرش کا بھی محتاج نہیں تو دیگر کی اسے کیا احتیاج ہوسکتی ہے؟ پھر ان سے کہا جائے اگر تم سماوات اور ارض کی قدامت اور ان کے دوام کے قائل ہو تو یہ کفر ہے اور اگر ان کے حدوث کے قائل ہو تو بتلاؤ ان کی تخلیق سے قبل اللہ تعالیٰ کیسا تھا؟ کیا وہ منتشر، متفرق اور معدوم تھا؟ پھر جب انہیں خلق کیا تو وہ موجود اور مجتمع ہوا؟ کیا کوئی عاقل یہ بات کہہ سکتا ہے؟

تم دراصل کفر کی دو انوع کے درمیان دائر ہو اور اس کے ساتھ ساتھ انتہائی درجہ کے جہل اور ضلال میں بھی ہو جسے چاہو اختیار کر لو، کائنات مسلسل تحرک پذیر ہے اور اس کی صورتیں فنا کے گھاٹ اترتی رہتی ہیں اور ان کا بدل وعوض عالم میں حادث ہوتا رہتا ہے مثلاً حیوانات، نباتات اور معاون اور اس کی مثل جس کا اللہ فضا میں اِحداث کرتا ہے مثلاً بادل، رعد و برق اور بارش وغیرہ تو کائنات کی جب کوئی شئ معدوم ہو جاتی ہے تو آیا اسی قدر نورِ حق میں کمی آ جاتی ہے؟ اسی طرح جب کوئی نئی شئ معرضِ وجود میں آئے تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے نور میں اضافہ ہو گیا اور وہ مجتمع وموجود ہوا؟ اگر اس کی مراد یہ ہے کہ اللہ کے نور کو آسمانوں اور زمین کے زوال کے بعد بھی بقاء ہے لیکن اس میں کسی شئ کا ظہور نہ ہوگا تو کیا شئ ہے جو ان اشیاء کے عدم کے بعد ظاہر ہوگی؟ اور اللہ کے نور کے حفظ و بقاء میں آسمانوں اور زمین کی کیا تاثیر ہے؟ صحیح میں حضرت ابوموسیٰ اشعری سے مروی ہے کہ نبی کریم نے فرمایا اللہ تعالیٰ سوتا نہیں ہے اور یہی اس کے لئے لائق ہے وہ میزان کو رکھتا اور اٹھاتا ہے اور اسی کی طرف رات کا عمل دن کے عمل اور دن کا عمل رات کے عمل سے قبل اٹھایا جاتا ہے، نور اس کا حجاب ہے اگر اسے ہٹا دے تو اس کے چہرہِ اقدس کے سبحات (یعنی نقوش) ساری خلق کو بھسم کر دیں، عبداللہ بن مسعود نے کہا تمہارے رب کے ہاں نہ رات ہے اور نہ دن، آسمانوں کا نور اس کے چہرہ سے ہے، تو یوں صادق ومصدوق نے خبر دی ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ اپنا حجاب ہٹا لے تو حدِ نظر تک ساری کائنات اور ارض وسماء بھسم ہو جائیں تو یہ اس کا حجاب ہے جو انہیں بھسم ہونے سے بچائے ہوئے ہے نہ کہ ارض وسماوات کے ساتھ اس کی نور کی حفاظت کی جا رہی ہے

ساتویں وجہ: اس کا قول کہ علویات (یعنی عالَمِ بالا) اس کی اوپر والی پلک اور سفلیات (یعنی زمین اور اہلِ زمین) اس کی نیچے والی پلک ہے اور بشری تفرقہ سفلیات میں اوپر والی پلک کا پپوٹہ اور نفسِ کلیہ اس کا سواد (آنکھ کے اندرون کا سیاہ حصہ) اور روحِ اعظم اس کا بیاض (سفید حصہ) ہے تو اس سے کہا جائے اگر یہ سارا عالم اس کی آنکھ ہے تو اس کی دوسری آنکھ پھر کیا شئ ہے؟ اور باقی اعضاء کدھر ہیں؟ یہ تمہارے قول کا لازم ہے، اگر عین سے تمہاری مراد متعین (جزو) ہے، اور اگر تمہاری مراد ذات اور نفس ہے تو تم نے سماوات، ارض، حیوانات اور ملائکہ کے نفسِ وجود کو اللہ کے اجزاء بنا دیا اور یہ زنادقہ فرعونیہ اتحادیہ کا قول ہے جو اس دنیا میں بھی لعنت کا شکار کئے گئے اور آخرت میں بھی وہ برے انجام والوں میں سے ہوں گے، اس سے کہا جائے تمہاری ان باتوں کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ نے کوئی چیز پیدا نہیں کی اور نہ وہ رب العالمین ہے اس لئے کہ یا تو وہ

خود اپنی تخلیق کرے یا اس کا غیر (اس کی تخلیق) کرے، اس کا خود اپنی تخلیق کرنا محال ہے اور یہ بدیہی حقیقت ہے کہ کوئی شئ اپنے آپ کی تخلیق نہیں کرسکتی اسی لئے اللہ تعالیٰ نے کہا: ﴿**اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ اَمْ هُمُ الْخٰلِقُوْنَ**﴾ **[والطور: ۳۵]** (کیا یہ کسی کے پیدا کئے بغیر ہی پیدا ہو گئے ہیں یا یہ اپنے آپ کے خود ہی خالق ہیں) یعنی کیا وہ بغیر خالق کے پیدا ہو گئے ہیں یا خود انہوں نے اپنے آپ کو پیدا کیا؟ اسی لئے جبیر بن مطعم راوی ہیں کہ جب نبی اکرم کو یہ آیت پڑھتے سنا تو یوں محسوس کیا گویا دل پھٹ گیا ہے اور وہ (یعنی مشرکینِ عرب) جانتے تھے کہ خالق خود تو مخلوق نہیں ہوسکتا اور غیر کا اسے تخلیق کرنا ان کی اصل کی رو سے ممتنع ہے کیونکہ یہ اشیاء جو اس کے اجزاء ہیں اس کے لئے غیر نہیں

آٹھویں وجہ: اس نے عالمِ بشریت کو اللہ کی حقیقت کی جفن کے اہداب قرار دیا اور بشر گھٹتے بڑھتے رہتے اور مرتے ہیں اور نئے پیدا ہوتے ہیں اور ان میں مومن و کافر اور نیک و بد ہیں تو گویا اللہ کی حقیقت کے جفن (یعنی پلک) کے اہداب (یعنی پپوٹے) بکھرے ہوئے، منتشر اور فاسد ہیں اور یہ مشرک، یہودی اور عیسائی اس کی حقیقت کے اجفان ہیں جبکہ اللہ نے ان لوگوں پر لعنت کی ہے جو بعض بشر کو اس کے بیٹے قرار دیتے ہیں تو ان کا کیا حال ہو جو انہیں اس کے نفس کا حصہ قرار دیتے ہیں؟

نویں وجہ: اس کی یہ کلام متناقض ہے اس طور کہ اس نے روح کو اس کی آنکھ کا بیاض، نفسِ کلیہ کو اس کا سواد، آسمانوں کو بالائی ہدب اور زمینوں کو نچلا ہدب کہا اور معلوم امر ہے کہ انسان کی آنکھ کے دونوں پپوٹے سواد و بیاض کو محیط ہیں اور روح و نفس اس کے ہاں آسمانوں اور زمین کے اوپر ہے، ارض و سما کے درمیان نہیں مگر جیسے آنکھ کا سواد اور بیاض دونوں پلکوں کے مابین ہوتا ہے اور یہ تمثیل اپنے قبیح تر کفر ہونے کے ساتھ ساتھ جہل و تضاد کا نمونہ بھی ہے جو تم دیکھ رہے ہو

دسویں وجہ: نفسِ کلیہ ایسی ترکیب اور اسم ہے جو اس نے صابی فلاسفہ سے اخذ کی ہے، جہاں تک روح تو اس سے اس کا مقصود وہ جسے وہ لوگ عقل کا نام دیتے ہیں جو اول الصادرات ہے، اسے اس نے روح کا نام دیا اور یہ صابئہ کے نظریہ پر بناء کرتے ہوئے، یہ حنفاء کے دین سے نہیں اور اس میں مضمر خرابی ہم ایک جگہ واضح کر چکے ہیں لیکن صابی فلاسفہ ان لوگوں سے بہتر ہیں کہ وہ کم از کم واجب الوجود کے مقر تو ہیں جس سے عقول، نفوس، اخلاق اور زمین کا صدور ہوا، وہ ان اشیاء کو وہ قرار نہیں دیتے جبکہ یہ ایسا کرتے ہیں تو ان کا قول معطلہ مثلاً فرعون اور اس کے گروہ پر منطبق ہے جس نے کہا تھا: (**وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ**؟) اور کہا:

(**مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ**)**[الغافر: ۳۸]** (میں تمہارا اپنے سوا کسی کو معبود نہیں جانتا) اور کہا:

(**يٰهَامٰنُ ابْنِ لِيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْٓ اَبْلُغُ الْاَسْبَابَ**) **[الغافر: ۳۸]** (اے ہامان میرے لئے ایک محل بنواؤ تاکہ میں موسیٰ کے معبود کی طرف چڑھ جاؤں) الآیۃ، فرعون اس عالم کے وجود کا اقرار کرتا تھا اور کہتا تھا اس سے فائق کوئی رب نہیں اور نہ کوئی اس کے سوا خالق ہے اور انہوں نے جب کہا کہ وہ سماوات اور زمین کی آنکھ ہے تو گویا اس چیز کا انکار کیا جس کا فرعون نے کیا تھا اور اس کا اقرار جس

کا اس نے کیا تھا البتہ فرعون نے اسے الہ کا نام نہ دیا اور نہ اسے اللہ کہا اور یہ قائل ہیں کہ یہی اللہ ہے! تو یہ صانع کے مقر تو ہیں لیکن اسے بھی وہ صفت باور کرتے ہیں، یہ درحقیقت معطلین ہیں اور اپنے اعتقاد میں (یعنی بظاہر) مقر، فرعون بالعکس تھا وہ بظاہر صانع کا منکر مگر بباطن اس کا مقر تھا، وہ ان سے بڑا کافر تھا اور یہ اس سے بڑھ کر اجہل اور اضل ہیں اسی لئے یہ اسے از حد قابلِ تعظیم سمجھتے ہیں

گیارھویں وجہ: قائل کا قول: بلکہ یہ متبع حق صریح ہے نہ کہ وہ جو اسلام کے مناہج اور اس کے دین سے منحرف خیال کرتا ہے جو اپنی گمراہی اور جہالت کے صحراء میں متحیر ہے، تو اس سے پوچھا جائے اولین وآخرین میں سے کوئی اور ہے جو تمہارے اس حق کو حق کہتا ہے؟ یہ اللہ کی کتاب ہے جو اس کی کلام، وحی اور تنزیل ہے، اسے اول تا آخر پڑھ لو اس میں تو ایسی بات نہیں اور نہ کسی ایک نے بھی نبی اکرم سے ایسی بات نقل کی اور نہ یہ اسلام کے ائمہ اور مشائخ سے منقول ہے ماسوائے اللہ پر افتراء باندھنے والے ان لوگوں سے جو اپنے آپ کو دین کے مشائخ سمجھتے ہیں اور یہ ایسے ہی ہے جیسے امرِ حرب وضرب میں چنگیز خان ہے تو ان کا دین اس کے اقتدار سے مشابہ ہے (یعنی دھونس، ظلم اور باطل پر مبنی) شاید اس کا صانع کا مقر ہونا ان کے اقرار بالصانع سے بہتر ہے! ہاں یہ ہے کہ اسلام کا نام تو لیتے ہیں تو بس اس وجہ سے یہ تاتاریوں سے بہتر ہیں

جہاں تک ان کے محققین اور جمہور تو ان کے نزدیک تہوُّد، تنصُّر، اسلام، شرک الغرض دنیا کا ہر مذہب اختیار کرنا جائز ہے، وہ ہر دین کو درست قرار دیتے ہیں بلکہ ان کے نزدیک کوئی شئ حرام نہیں اور نہ کسی پر کوئی شئ واجب ہے تو اس لحاظ سے یہ تاتاری ان سے بہتر ہیں، یہ لوگ اسلام سے مرتد اور قبیح ترین ارتداد کے مرتکب ہیں اور مرتد اصلی کافر سے کئی وجوہ کی بنا پر بدتر ہوتا ہے، اگر حضرت ابوبکر صدیق نے مانعینِ زکاۃ سے جنگ جائز سمجھی تو ان سے جنگ کرنا تو اولیٰ ہے اور یہ جو اس نے اس شخص سے نقل کیا جسے یہ شیخ محقق، عالمِ ربانی، ساتواں غوث اور شمعہ میں جلوہ افروز قرار دیتا ہے کہ اس نے کہا: جان لو کہ یہ سارا جگ اللہ کی آنکھ کا ڈھیلہ ہے تو اس پر کئی وجوہ سے اعتراضات ہیں:

(۱) قولِ ہذا کے قائل کو محقق، عالمِ ربانی کہنا نری ضلالت اور غوایت ہے بلکہ اس طرح کی کلام تو عیسائی اور بت پرستوں نے بھی نہیں کہی، تو اگر اس کا قائل مسلوب العقل ہے تب وہ مرفوع القلم ہے تو اسے نظر انداز کیا جائے اور اگر ذی شعور ہے تب یہ اللہ پر بہت بڑی جرات اور جسارت ہے جو کہتا ہے:

﴿ وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا إِدًّا تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ﴾ [مریم: ۸۹۔۹۱] (اور کہتے ہیں کہ اللہ بیٹا رکھتا ہے۔تم نے بُری بات کہی ہے۔قریب ہے کہ اس سے آسمان پھٹ پڑیں) آخرِ آیات تک اور فرمایا:

﴿ وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحَانَهُ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ لَا يَسْبِقُوْنَهُ بِالْقَوْلِ﴾(الظالمین) تک[الأنبياء: ۲۶۔ ۲۹]

(اور کہتے ہیں کہ اللہ بیٹا رکھتا ہے، وہ پاک ہے، اُس کے عزت والے بندے ہیں۔اس کے آگے بڑھ کر بول نہیں سکتے) اور کہا:

﴿لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا اِنْ اَرَادَ اَنْ يُّهْلِكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗ﴾ تک ﴿اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ﴾ [المائدة: ۱۷] (جولوگ اس بات کے قائل ہیں کہ عیسیٰ بن مریم، اللہ ہیں وہ بے شک کافر ہیں، کہہ دو کہ اگر اللہ تعالیٰ عیسیٰ بن مریم اوران کی والدہ کواور جتنے لوگ زمین میں ہیں سب کو ہلاک کرنا چاہے تو اس کے آگے کس کی پیش چل سکتی ہے؟ اور آسمان اور زمین اور جو کچھ ان دونوں میں ہے سب پر اللہ ہی کی بادشاہی ہے وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے) اگر اللہ کی یہ تہدید ولعنت ان لوگوں کی بابت ہے جنہوں نے بعض کو اللہ کے بیٹے اور خود کواس کے محبوب قرار دے لیا تو ان کی بابت اس کا کیا وطیرہ ہوگا جو کہتے ہیں کہ لوگ اس کی آنکھ کے پپوٹے ہیں، اللہ تعالیٰ ان ظالموں کے باطل اقاویل سے بہت ہی بلند اور برتر ہے

(۲) یہ گمراہ شیخ ہے جس نے کفر وضلال سے بھرا یہ قول کہا پھر اس کی آخرِ کلام اولِ کلام سے متضاد ہے تو عین کا لفظ شیٔ کے نفس اور دیکھنے والے عضو اور دیگر مسمیات (مثلا عین بمعنی چشمہ، مال، نمایاں شخص وغیرہ) کے مابین مشترک ہے تو اگر اس کی مراد عین الشیٔ بمعنی النفس ہے یعنی جس کے ساتھ وہ اپنے غیر سے متمیز ہے تو اگر وہ کہتا ہے کہ سارا عالم اللہ کی آنکھ کا حدقہ ہے جو سوتی نہیں ہے تو اس سے مراد دیکھنے والا عضو ہے پھر آخرِ کلام میں کہتا ہے: (وَنَعْنِیْ بِعَيْنِ اللّٰهِ مَا يَتَعَيَّنُ اللّٰهُ فِيْهِ) (یعنی اللہ کی عین سے ہماری مراد کہ جس میں اللہ متعین ہے) تو یہ عین بمعنی نفس ہے اوراس عین کا نہ حدقہ ہوتا ہے اور نہ پلکیں، یہ بمنزلہ اس شخص کے ہے جس نے کہا: (نَبَعَتِ الْعَيْنُ وَفَاضَتْ وَ شَرِبْنَا مِنْهَا وَ اغْتَسَلْنَا وَ وَزَنْتُهَا فِي الْمِيْزَانِ فَوَجَدْتُهَا عَشْرَةَ مَثَاقِيْلَ ذَهَباً خَالِصاً) (یعنی چشمہ پھوٹ اور ابل پڑا اور ہم نے اس سے پیا اور نہائے اور ترازو میں اس کا وزن کیا تو وہ دس مثقال خالص سونا نکلا) (یعنی بے تکی باتیں) اس کا سبب یہ ہے کہ وہ کثیر اوقات حروف والفاظ میں بلا سوچے سمجھے اوران کے معانی کا قصد کئے تصرف کرتا ہے

(۳) ایک اور وجہ سے بھی تناقض موجود ہے وہ یہ کہ اگر جہان اس کی عین کا حدقہ ہے تو لازم ہے کہ اللہ کے باقی اعضاء بھی ہوں پھر جب آخر میں کہا: (وَ اللّٰهُ هُوَ نُوْرُ الْعَيْنِ) (اللہ ہی آنکھ کا نور ہے) تو گویا اللہ اس آنکھ کا جزو ہوا یا یہ اس کے لئے صفت بنی تو یوں اس نے شروع کی کلام میں عالم کو اللہ کا جزو قرار دیا اور آخری کلام میں اللہ کو عالم کا جزو بنا لیا اور یہ دونوں اقوال کفریہ (اور باہم متناقض) ہیں بلکہ ان لوگوں کے کفر سے بھی بڑا کفر جن کی بابت کہا:

﴿وَجَعَلُوْا لَهٗ مِنْ عِبَادِهٖ جُزْءًا اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ مُّبِيْنٌ اَمِ اتَّخَذَ مِمَّا يَخْلُقُ بَنٰتٍ وَّاَصْفٰكُمْ بِالْبَنِيْنَ﴾ [الزخرف: ۱۵-۱۶] (اور انہوں نے اس کے بندوں میں سے اس کے لئے اولاد قرار دی بے شک انسان صریح ناشکرا ہے۔ کیا اس نے اپنی مخلوقات میں سے خود تو بیٹیاں لیں اور تمہیں بیٹوں کے لئے چن لیا؟) تو اگر اللہ نے اس وجہ سے کہ ان لوگوں نے اس کے بعد عباد کو اس کا جزو بنالیا، انہیں کافر قرار دیا تو وہ کیوں نہ ہوں گے جو کبھی اللہ کو عالم کائنات کا جزو اور کبھی کائنات کو اس کا

جزوقرار دیتے ہیں؟ اللہ نے ایسی باتیں کرنے والوں کوملعون قرار دیا ہے

(۴) ایک اور جہت سے بھی تناقض ہے یہ جب اس نے کہا: (اَلْعَیْنُ مَا یَتَعَیَّنُ اللّٰهُ فِیْهِ) اور یہ کائنات اس کی آنکھ جسے نیندنہیں آتی، کا حدقہ (یعنی ڈھیلا) ہے تو اس نے اللہ کوکل عالم میں متعین بنالیا پھر آگے جب کہا کہ اللہ اس آنکھ کا نور ہے تو آنکھ کے باقی اجزاء مثلاً سفیدی، سیاہی، پلکیں اور پپوٹے تو ان میں اللہ متعین نہ ہوا تو یوں اس کے قول کی رو سے اللہ متعین بھی ہے اور غیر متعین بھی

(۵) آنکھ کا نور آنکھ کا محتاج ہوتا ہے اور اسی کے ساتھ اس کا قیام ہے تو اس کا مطلب یہ بنا کہ اللہ عالم کا محتاج ہے، یہ قول حلولیہ کے قول سے مشابہ ہے جو کہتے ہیں اللہ عالم میں اس طرح ہے جیسے روئی میں پانی جذب ہو جاتا ہے یا جیسے جسم میں حیات ہو اور اس کا نحو، اور قائل ہیں کہ وہ اپنی ذات کے ساتھ ہر جگہ موجود ہے، یہی قدیم جہمیہ کا قول ہے جنہیں ائمہ اسلام نے کافر قرار دیا، جہم سے منقول ہے کہ اللہ اس ہوا کی مثل ہے یا کہا: وہ یہ ہوا ہے، اولاً اس کا قول کہ یہ اللہ کی آنکھ کا حدقہ ہے اتحادیہ کے قول سے مشابہ ہے جو کہتے ہیں وہ شمع کی مثل ہے جو مختلف صورتوں میں متصور ہوتی ہے حالانکہ وہ ایک ہے تو ان کے نزدیک وجود ہے اور اس کے اختلافِ احوال شمع کے اختلافِ احوال کی مانند ہے تو ان مقالات کا مصنف اور قائل متخبط (یعنی ٹامک ٹوئیاں مار رہا) ہے جو موحد و مخلص مسلمانوں کے ہاں مستقر نہیں اور نہ وہ ان اتحادیہ ملحدوں کے عارفین محققین کے ہاں مستقر ہے بلکہ یہ سب اقوال نصیریوں اور اسماعیلیوں کی جنس سے ہیں، رب کے بارہ میں ان کے نظریات انہی کے نظریات کی جنس سے ہیں، اُن میں بھی بعض شریعت کے متمسک ہیں اور کچھ اس سے متخلی اور یہ بھی اسی طرح ہیں لیکن وہ زندیقت میں احذق ہیں اور جانتے ہیں کہ وہ فرعون کی مانند معطل ہیں اور جاہل ہیں جو سمجھتے ہیں کہ اچھا کر رہے ہیں: **(وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا)** [الکھف: **۱۰۴**] (اور وہ یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ اچھے کام کر رہے ہیں)

(۶) اس کا کہنا: کہ اگر علویات وسفلیات اٹھ جائیں تو اللہ تعالیٰ کا نور پھیل جائے اور صورتِ حال یہ ہو کہ اصلاً ہی اس میں کوئی شئ ظاہر نہ ہو، یہ مجمل کلام ہے اور بلا شبہ اس کا قائل کفر وایمان کے درمیان مذبذبین میں سے ہے، اس کی تفصیل یہ کہ اتحادیہ کہتے ہیں اگر سماوات اور ارض کی عین زائل ہو جائے تو اللہ معدوم ہو جائے، یہ بات ان کے بعض نے صراحت کے ساتھ کہی ہے البتہ ان کے اکثر یہاں اشارت سے کام لیتے ہیں اور ان کے عوام موجودین کے مذہب سے اسے نہیں سمجھتے تو یہ حضرات قرامطہ اور باطنیہ کی جنس سے ہیں، وہ حضرات بلاغِ اکبر تک پہنچے کے مدعی ہوتے ہیں جو ان کے خواص کا آخری مرتبہ ہے اسی لئے مجھے اتحادیہ کے بعض اکابر نے اس صاحبِ مقالہ بارے بیان کیا کہ وہ یہ بھی کہتا تھا کہ توحید اور الحاد کے درمیان بس لطیف سا فرق ہے تو میں نے کہا یہ کہنا تو ابطل الباطل سے ہے بلکہ کسی دونوں مذہبوں کے مابین کوئی فرق اتنا بڑا نہیں جو فرق توحید اور الحاد کے مابین ہے، یہ بات اس نے اس خلط اور التباس کی بناء پر کہی ہے جس کا وہ شکار بنا ہوا ہے جیسے اس کا یہ قول کہ علویات اور سفلیات اگر اٹھ جائیں تو

اللہ کا نور اس طور پھیل جائے کہ اس میں کوئی شئ ظاہر نہ ہو تو اس سے کہا جائے اگر سفلیات وعلویات اٹھ جائیں تو تم اللہ کے نور کے پھیلنے سے کیا مراد لیتے ہو؟ کیا اس کا تفرق اور عدم جیسے اگر انسان کی آنکھ کے پپوٹے نہ ہوں تو آنکھ کا نور متفرق ہو جائے گا (یعنی مرتکز نہ ہو سکے گا) یا تمہاری مراد یہ ہے کہ ایک موجود شئ پھیل جائے گی؟ اور پھر کیا چیز ہے جو پھیلے گی؟ کیا اللہ کا نفس؟ یا اس کی صفات میں سے کوئی صفت؟ پھر کس شئ پر وہ پھیلے گا؟ اور اس میں کیا کچھ ظاہر ہوگا اور کیا کچھ نہیں؟

اگر اول تمہاری مراد ہے اور یہی تمہاری اول کلام کا مقتضا ہے کیونکہ تم نے کہا: ہم علویات اور سفلیات کو اللہ کی آنکھ کی پلکیں اس لئے قرار دیتے ہیں کیونکہ یہ دونوں ظہورِ نور پر محافظت کرتی ہیں تو اگر انسانی آنکھ کی پلکیں کاٹ دی جائیں تو اس کی آنکھ کا نور متفرق اور منتشر ہو جائے گا اس طور کہ اسے اصلاً ہی کچھ نظر نہ آئے گا اسی طرح اگر علویات وسفلیات مرتفع ہو جائیں تو اللہ کا نور پھیل جائے اس طور کہ اصلاً ہی اس میں کوئی شئ ظاہر نہ ہو، اور تم نے کہا اللہ آنکھ کا نور ہے اور روحِ اعظم اس آنکھ کی سفیدی اور نفسِ کلیہ اس کی سیاہی ہے اور معلوم ہے کہ نورِ عین کے وجود کی شرط پلکیں ہیں تو اگر شرط مرتفع ہو جائے تو مشروط بھی مرتفع ہو جائے گا تو تمہارے نزدیک عالم اللہ کے وجود کی شرط ہے، اگر عالم مرتفع ہو جائے تو انتفائے شرط کے سبب اللہ کی حقیقت بھی مرتفع ہو جائے گی اور اگر تم اللہ کے لئے غیرِ عالَم ذات کا اثبات کرتے ہو تو یہ اتحادیہ کا دو میں سے ایک قول ہے، وہ کبھی وجودِ حق عین وجودِ مخلوقات قرار دیتے ہیں اس پر عدم مخلوقات کے ساتھ اس کا وجود متصور نہیں، تو یہ صانع کی تعطیلِ محض ہے اور یہی قونوی اور تلمسانی کا قول ہے اسی طرح مصنف فصوص الحکم کا اس کی کثیر کلام میں اور کبھی وہ اسے بنفسہ قائم و جود قرار دیتے ہیں پھر اس وجود کو وہ مخلوقات کا وجود قرار دیتے ہیں اس معنی میں کہ وہ ان پر فائض ہے اور یہ اول کی نسبت کم تر کفر ہے اگر چہ ہیں دونوں ہی غلیظ وقبیح ترین کفر! مصنف فصوص وغیرہ کی بعض مواضع میں کلام اس قول کے موافق ہے اسی طرح اس کی کلام بھی کہ وہ بھی اسی معنی کی طرف اشارت کناں ہے پھر اس کے باوصف کیا وہ اس کے وجود کو عالم کے وجود کے ساتھ مشروط کہتے ہیں کہ تب وہ عالم کا محتاج ہوگا یا نہیں؟ تو دونوں اقوال ان کے ہاں ملتے ہیں

(۷) وہ ضلال، حیرت، ظلم، خطا اور اس عذاب کی مدح سرائی کرتے ہیں جو اللہ نے سابقہ امم کو دیا اور اللہ اور اس کے رسول کی کلام کو قلب کر کے قبول کرتے ہیں جس کا فساد عقلی ضرورات کی رو سے معلوم ہے مثلاً مصنف فصوص کا یہ قول: اگر حضرت نوحؑ نے اپنی قوم کو دین کی دو رخی دعوت نہ دی ہوتی تو وہ ایمان لے آتے کہ جہاراً انہیں دعوت دی (یعنی سرِ عام) پھر اسراراً دعوت دی (یعنی خفیہ) پھر لکھا: ان کی قوم ان کی دعوت قبول کرنے سے رک گئے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ان کی دعوت قبول کرنے کے ضمن میں ان پر کیا واجب ہے تو اللہ بارے علم رکھنے والوں نے جان لیا جس طرف حضرت نوح نے اپنی قوم کے حق میں اشارہ کیا کہ بلسانِ ذم ان کی تعریف کی اور جان گئے کہ انہوں نے اس لئے ان کی دعوت قبول نہیں کی کیونکہ اس میں فرقان ہے اور امر قرآن ہے نہ کہ

فرقان اور جسے قرآن کی معرفت دی گئی وہ فرقان کی طرف توجہ نہ دے گا اگر چہ اس میں ہو، تو یوں اس چیز کی تعریف اور مدح سرائی کی جس کی اللہ نے ذم کی اور اس پہ لعنت کی اور اس سے نہی کی اور وہ اللہ پر اور اس کے اسماء وآیات میں افتراء اور الحاد کے مرتکب بنے اور ایسے اقاویل گھڑے کہ ارض وسماء پھٹ جائیں جیسے فصوص الحکم کے مصنف نے فصِ نوح میں (مِمَّا خَطِيْئَاتِهِمْ أُغْرِقُوْا)[نوح : ۲۵] (وہ اپنے گناہوں کے سبب ہی غرقاب کر دیئے گئے) کی تشریح یہ کی کہ: (فَهِيَ الَّتِيْ خَطَتْ بِهِمْ فَغُرِقُوْا فِيْ بِحَارِ الْعِلْمِ بِاللّٰهِ وَهُوَ الْحَيْرَةُ) (یعنی یہ انہیں لے کر ایسا چلی کہ اللہ بارے علم کے سمندروں میں غرق ہو گئے اور یہ حیرت) (فَأُدْخِلُوْا نَاراً) (پھر آگ میں ڈال دئے گئے) کی تفسیر کرتے ہوئے کہا: (فِيْ عَيْنِ الْمَاءِ فِي الْمحمدتَيْنِ) (**وَإِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ**)[کورت: ۶] (اور جب سمندر دہکا دئے جائیں گے) بارے کہا یعنی: (سُجِّرَتِ التَّنُّوْرُ إِذَا أَوْقَدْتَهُ) (تنور میں جب آگ جلائی جائے تو وہ دہک اٹھتا ہے) **فَلَمْ يَجِدُوْا لَهُمْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ أَنْصَاراً**[نوح: ۲۵] (تو انہوں نے اللہ کے سوا کسی کو اپنا مدد گار نہ پایا) کی بابت کہا: تو اللہ عین ان کا انصار بنا تو اس میں ابد تک وہ فنا ہوئے، اگر تم انہیں فطرت کے ساحل کی طرف نکالو تو اس رفیع درجہ سے نازل ہو جائیں گے اگر چہ سب کچھ اللہ کے لئے اور اس کے ساتھ ہے بلکہ یہ سب کچھ اللہ ہے

(**وَقَالَ نُوْحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكَافِرِيْنَ دَيَّاراً**[نوح: ۲۶] (اور نوح نے دعا کی کہ میرے رب کسی کافر کو زمین پر بسا نہ رہنے دے) کی تفسیر یہ کی: جنہوں نے اپنے کپڑے پھاڑے اور کانوں میں انگلیاں ٹھونسیں، ستر کی طلب میں کیونکہ حضرت نوح نے انہیں بلایا تا کہ ان کی مغفرت کر دے اور غفر ستر ہے (دَيَّارًا) یعنی (أَحداً) (کسی ایک کو بھی) تا کہ منفعت عام ہو جیسے دعوت عام ہوئی (**يُضِلُّوْا عِبَادَكَ**) یعنی انہیں حیران کر دیں گے اور عبودیت سے انہیں نکال دیں گے اس طرف جس میں ربوبیت کے اسرار ہیں تو وہ اپنے آپ کو ارباب دیکھیں گے بعد اس کے کہ اپنے تئیں عبید تھے تو اب وہ ارباب ہیں (وَلَا يَلِدُوْا) ای ما يُنْتِجُوْنَ ولَا يُظْهِرُوْنَ (یعنی نہ نتیجہ دیں گے اور نہ ظاہر کریں گے) (إلَّا فَاجِراً) یعنی مستور کو ظاہر کرنے والا (كَفَّارًا) یعنی اس امر کا ساتر جو اپنے ظہور کے بعد ظاہر ہوا تو وہ مستور ہوئے کو ظاہر کریں گے پھر اس کے ظہور کے بعد اسے مستور کریں گے تو یوں ناظر حیرت میں گم ہو گا اور فاجر کا اس کے فجور میں قصد نہ جان سکے گا اور نہ کافر کا اس کے کفر میں اور شخص واحد ہے (رَبِّ اغْفِرْ لِيْ) یعنی میری پردہ پوشی کر اور میرے مراحل مستور کر تا کہ میری قدر و مقام مجہول ہو جیسے تیری قدر مجہول ہوئی جیسے تو نے کہا: (**وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهِ**)[الأنعام: ۹۱] (**وَلِوَالِدَيَّ**) یعنی میں جن کا نتیجہ ہوں اور وہ عقل وفطرت ہیں (**وَلِمَنْ دَخَلَ بَيْتِيَ**) یعنی (قَلْبِيْ) (یعنی [بَيْتِيْ] سے مراد: میرا دل ہے) (مُؤْمِناً) یعنی الٰہی اخبار کی تصدیق کرنے والا اور یہ جو دل میں خیالات پیدا ہوتے ہیں (**وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ**) عقول میں سے (**وَالْمُؤْمِنَاتِ**) نفوس میں سے (**وَلَا تَزِدِ الظَّالِمِيْنَ**) ظلمات سے، یہ اہلِ غیب جو ظلمانی (یعنی تاریک) پردوں کے پیچھے چھپے بیٹھے ہیں (**إِلَّا تَبَاراً**) (یہ سورۃ نوح کی آخری آیت ہے) أي هلاكاً، تو اپنے نفوس کی معرفت نہ کر

سکیں ان سے کمتر وجہِ حق کے مشاہدہ کے سبب، یہ سب اللہ کی کلام میں تبدیل وتحریف کا قبیح ترین نمونہ (اور لا یعنی کلام) ہے، اللہ نے اہلِ کتاب کی قرآن میں اس تحریف کی وجہ سے ذم کی ہے جو اس مذکورہ تحریف سے کمتر درجہ کی تھی انہوں نے تو صرف کلمات کی ان کے مواضع سے تحریف کی تھی اور وہ:

﴿ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ ﴾ [البقرۃ: ۷۹] (پس ہلاکت ہے ان کیلئے جو اپنے ہاتھ سے کتاب لکھتے ہیں اور کہتے یہ ہیں کہ یہ اللہ کے پاس سے ہے تا کہ اس کے عوض تھوڑی سی قیمت حاصل کریں، پس ہلاکت ہے اس سے جو ان کے ہاتھوں نے لکھا اور ہلاکت ہے اس سے جو یہ کرتے ہیں) جبکہ ان لوگوں نے کلام اللہ کی اس کے مواضع سے قبیح ترین تحریف کی اور اپنے ہاتھوں سے نفاق والحاد کی کتب تحریر کیں اور زعم کیا کہ یہ سب اللہ کی طرف سے ہے! کبھی یہ دعوی کرتے ہیں کہ یہ وہاں سے اخذ کرتے ہیں جہاں سے فرشتہ وہ اخذ کرتا تھا جسے وہ نبی کریم کی طرف وحی کرتا تھا، تو گویا یہ اپنے آپ کو نبی سے بھی ایک درجہ آگے سمجھے ہیں اور کبھی ان کا کوئی زعم کرتا ہے کہ نفاقِ عظیم اور الحادِ بلیغ کی یہ باتیں خواب میں اسے نبی اکرم نے عطا کی ہیں اور اسے حکم دیا ہے کہ امت کو ان کی آگہی دے اور وہ بلا کم وکاست آپ کے کہے پر عمل کر رہا ہے! فضلاء کی ایک جماعت حتی کہ مجھ سے بحث کرنے والے بعض اس کے حمایتیوں نے کہا وہ کذب کو حلال سمجھتا ہے اور اس ضمن میں یہ کہنا پسند کرتے ہیں: (كَانَ يَتَعَمَّدُ الْكِذْبَ) (یعنی عمداً جھوٹ بولتا تھا) اور یہ کفر سے اہون ہے پھر ان فضلاء نے تصریح کی کہ اس کا نظریہ کفر ہے! میں نے یہ فتوی متعدد مشائخ اور علماء سے سنا ہے اور یہ امر مخفی نہیں کہ اس طرح فتوی کی بات اللہ اور اس کے رسول پر ابلغ کذب میں سے ہے اور اس کا قائل اس آیت کا پورے طور مصداق ہے:

﴿ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ قَالَ اُوْحِيَ اِلَيَّ وَلَمْ يُوْحَ اِلَيْهِ شَيْءٌ ﴾ [الأنعام: ۹۳] (اور اُس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹ افتراء کرے یا یہ کہے کہ مجھ پر وحی آتی ہے حالانکہ اس پر کچھ بھی وحی نہ آئی ہو) اور کثیر متنبئین کذابین مثلا مختار بن ابوعبید (ثقفی) اور اس جیسے اہلِ کذب وافتراء اس حد تک نہیں پہنچے بلکہ مسلیمہ کذاب نے بھی اتنے بڑے جھوٹ نہیں بولے، یہ سب نبی اکرم کا تعظیم کرتے اور آپ کے لئے رسالت کا اقرار کرتے تھے لیکن مدعی تھے کہ وہ بھی رسول ہیں اسی طرح یہ رب کے وجود کے بھی منکر نہ تھے اور نہ بظاہر قرآن کے جبکہ ان لوگوں نے رب کا انکار کیا اور ہر شئ کو اس کا شریک بنایا اور یہ کتب وتحریرات گھڑیں جنہیں وہ قرآن سے بھی اعظم خیال کرتے ہیں اور بعض وجوہ سے اپنے آپ کو رسول اکرم سے افضل خیال کرتے ہیں جیسے مصنف فصوص الحکم نے خاتم الالیاء سے اس کی تصریح نقل کی! مجھے ایک قابلِ اعتماد شخص نے فاجر تلمسانی بارے بتلایا کہ وہ کہتا تھا قرآن شرک سے بھرا ہوا ہے اس میں توحید کا نام ونشان نہیں، توحید تو ہماری کلام میں ہے! جہاں تک ضلال وحیرت تو اللہ نے کبھی اس کی مدح نہیں کی اور نہ نبی اکرم نے دعا کی تھی جو اس نے نقل کی: (زِدْنِیْ فِیْكَ تَحَیُّراً) اسے کسی محدث نے نقل

نہیں کیا اور نہ یہ علمائے حدیث کی کتب میں ہے بلکہ ان عام علماء کی کتب میں بھی نہیں جو اللہ و رسول کے عارف ہیں، اسی طرح اس آیت کے ساتھ اس کا احتجاج:

(**كُلَّمَآ اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيْهِ وَاِذَآ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا**)[البقرة : **۲۰**] (جب بجلی ان پر روشنی ڈالتی ہے تو اس میں چل پڑتے ہیں اور جب اندھیرا ہو جاتا ہے تو کھڑے کے کھڑے رہ جاتے ہیں) یہ تو مرتد منافقین کا حال ہے، ضلال و حیرت ان امور سے ہیں جن کی اللہ نے قرآن میں ذم کی، چنانچہ فرمایا:

(**قُلْ اَنَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُنَا وَلَا يَضُرُّنَا وَنُرَدُّ عَلٰٓى اَعْقَابِنَا بَعْدَ اِذْ هَدٰىنَا اللّٰهُ كَالَّذِى اسْتَهْوَتْهُ الشَّيٰطِيْنُ فِى الْاَرْضِ حَيْرَانَ**) [**الأنعام : ۷۱**] (کہو کیا ہم اللہ کے سوا ایسی چیز کو پکاریں جو نہ ہمارا بھلا کر سکے اور نہ بُرا اور جب ہمیں اللہ نے سیدھا راستہ دکھا دیا تو ہم الٹے پاؤں پھر جائیں؟ جیسے کسی کو جنات نے جنگل میں بھلا دیا ہو حیران) الآیۃ، یہی ان متحیر گمراہوں کی خواہش ہے کہ وہ اہلِ اسلام کے ساتھ کریں، یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کو چھوڑ کر ایسوں کو پکاریں جو نہ انہیں نفع دے سکتے ہیں اور نہ ضرر اور یہ مخلوقات، بت اور صنم ہیں اور ہر وہ جسے اللہ کے سوا معبود بنایا گیا، یہ چاہتے ہیں کہ مومنین کو ایڑیوں کے بل پلٹا دیں، انہیں مرتد بنا دیں اور وہ انہی کی مانند ضلال و حیرت میں گم ہو جائیں، فرمایا:

(**وَنُقَلِّبُ اَفْـِٕدَتَهُمْ وَ اَبْصَارَهُمْ**) الی قولہ: (**يَعْمَهُوْنَ**) [**الأنعام :۱۱۰**] (اور ہم اُن کے دلوں اور آنکھوں کو الٹ دیں گے جیسے یہ اس پر پہلی دفعہ ایمان نہیں لائے اور ان کو چھوڑ دیں گے کہ اپنی سرکشی میں بہکتے رہیں) ای: (يَـحَـارُوْنَ) (یعنی حیرت میں گم) نیز فرمایا:

(**وَارْتَابَتْ قُلُوْبُهُمْ فَهُمْ فِىْ رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُوْنَ**) [التوبة :۴۵] (اور ان کی دل شک میں پڑے ہوئے ہیں پس وہ اپنے شک میں ڈانواڈول ہو رہے ہیں) اور: (**اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ الخ**) تو ہمیں حکم دیا کہ اس سے ہمیشہ صراطِ مستقیم کی دعا کرتے رہیں جبکہ ان کے نزدیک صراطِ مستقیم مذموم ہے، یہ اہلِ ضلال و حیرت کی صراط کی تعریف میں رطب اللسان ہیں جو اللہ کی کتب اور اس کے رُسل کے مخالف ہے اور اس فطرت کے بھی جس پر اللہ نے اپنے بندوں کو فطر کیا۔

فصل: ابن عربی کے بعض الفاظ کے بارے میں

جن سے ہمارا بیان کردہ اس کا مذہب مزید واضح ہوتا ہے، اکثر لوگ اسے سمجھ نہیں سکے

فصِ یوسف میں لکھا: بعد اس کے کہ کائنات کی اللہ کی طرف نسبت یہ کی جیسے آدمی کا سایہ ہوتا ہے اور اس تشبیہ میں وہ تناقض کا شکار ہوا، کہتا ہے ہر جس کا تمہیں ادراک ہے وہ ممکنات کے اعیان میں وجودِ حق ہے تو ہویتِ حق کی حیثیت سے یہ اس کا وجود ہے اور اس میں اختلافِ صور کی حیثیت سے وہ اعیانِ ممکنات ہے تو جس طرح اختلافِ صور کے ساتھ اس سے اسمِ ظل زائل

نہیں ہوگا اسی طرح اختلافِ صور کے ساتھ اسمِ عالم یا اسمِ سوی الخلق بھی زائل نہ ہوگا تو اس کے ظل ہونے کی احدیت کی حیثیت سے وہ حق ہے کیونکہ وہ واحد اور احد ہے اور کثرتِ صور کی حیثیت سے وہ عالَم ہے، اسے خوب اچھی طرح سمجھ لو

اگر معاملہ یہی ہے، جو اس کے حوالے سے ذکر ہوا تو کائنات ایک متوہم شیٔ بنی، اس کے لئے حقیقی وجود نہیں اور یہ معنائے خیال ہے یعنی تمہارے لئے تخیل ہوا ہے وہ قائم بنفسہ امرِ زائد ہے، وجودِ حق سے خارج، اور نفس الامر میں وہ ایسا نہیں، کیا حسی طور پر اسے (یعنی سایہ کو) نہیں دیکھتے کہ اس شخص کے ساتھ متصل ہے جس سے وہ پھیلا اور نکلا ہے، اس اتصال سے انفصال اس پر مستحیل ہے کیونکہ شیٔ کیلئے خود اپنی ذات سے انفکاک (یعنی الگ ہونا) مستحیل ہے تو اپنے عین کو پہچانو اور یہ کہ تم کون ہو اور تمہاری ہویت کیا ہے؟ اور حق کی طرف تمہاری کیا نسبت ہے اور کس چیز کے ساتھ تم حق اور کس کے ساتھ تم عالم، سوا اور غیر ہو؟ فصوص کے آغاز میں لکھتا ہے: کلمۂ آدمیہ میں حکمتِ الٰہیہ کے فص کے بعد اور کلمۂ شیثیہ میں حکمتِ نفسیہ کے بعد: عطاء اللہ کے امر سے منقسم ہے، یہ مانگے اور بن مانگے دونوں طرح سے ہوتی ہے، وہ قسم ذکر کی جس کا سوال نہیں ہوتا کیونکہ وہ اللہ کی ہبہ شیٔ ہے تا آنکہ کہا: ان لوگوں سے میں سے ایسے ہیں جو جانتے ہیں کہ اللہ اپنے تمام احوال میں اس کا عالم ہے، یہ جس پر وہ اپنی عین کے ثبوت کی حالت میں اس کے وجود سے قبل تھا اور جانتا ہے کہ حق اسے عطا نہیں کرتا مگر وہی جو اس کا عین اسے اپنے بارے علم میں سے عطا کرے اور یہ وہ جس پر تھا اپنے حالِ ثبوت میں تو اللہ کے اپنے بارے علم کو جانتا ہے کہ کہاں سے وہ حاصل ہوا، اہل اللہ کی طرف سے اس صنف سے اعلیٰ و اکشف تصنیف نہیں، وہی قدر کے راز سے واقف ہیں اور وہ دو قسم پر ہیں:

ا۔ جو اس کا اجمالی علم رکھتے ہیں　۲۔ جو اس کا تفصیلی علم رکھتے ہیں

مفصل علم رکھنے والے دیگر سے اعلیٰ اور اتم ہیں کہ وہ جانتے ہیں جو اللہ کے اس بابت علم میں متعین ہوا ہے یا تو اللہ کے انہیں یہ علم دینے کے باعث اس چیز کا جو اس کی عین نے اپنے بارے آگہی دی اور یا اس کی ثابت عین سے جو انہیں کشف ہوا اور اس کے انتقالاتِ احوال سے اس طرف جو غیر متناہی ہے اور وہ اعلیٰ ہے کیونکہ اپنے آپ کی بابت آگہی میں وہ اللہ کی اپنے بارے آگہی کے بمنزلہ ہے کیونکہ یہ اخذ ایک ہی معدن سے ہے الا یہ کہ بندے کی جہت سے یہ اللہ کی اس کے لئے سابق عنایت ہے، یہ اس کی عین کے جملہ احوال سے ہے جنہیں یہ صاحبِ کشف پہچانتا ہے کیونکہ اللہ نے اس پر اسے مطلع کیا یعنی اپنی عین کے احوال پر، یہ مخلوق کے بس میں نہیں! جب اللہ اسے اس کی ثابت عین کے احوال پر مطلع کرے جو اس پر وجود کی صورت واقع ہوئے ہیں کہ وہ اس حال میں حالتِ عدم میں ثابت ان اعیان پر حق باری تعالیٰ کے مطلع ہونے پر مطلع ہو، اس لئے کہ یہ ذاتی نسب ہیں جن کے لئے صورت و شکل نہیں تو اس قدر کے ساتھ ہم کہتے ہیں: بے شک الٰہی عنایت جو اس بندے کے لئے اس مساوات کے ساتھ افادہِ علم میں سابق ہوئی ہے، اسی سے یہ فرمانِ خداوندی ہے **﴿حَتّٰى نَعْلَمَ﴾ [محمد: ۳۱]** (حتیٰ کہ معلوم کریں) اور یہ محققۃ المعنی کلمہ ہے اس طرح کا نہیں جس کا

ایسا شخص توھُّم کرے جس کا یہ مشرب نہیں، غایتِ منزہ یہ ہے کہ یہ حدوث فی العلم تعلق کے لئے قرار دیا جائے اور یہ اعلیٰ وجہ ہے جو اس مسئلہ میں متکلم کے لئے ہوگی، اگر وہ علم کو ذات سے زائد امر باور نہ کرلے تو تعلق اس کے لئے کرے نہ کہ ذات کے لئے اور اس کے ساتھ وہ صاحبِ کشف وشہود اہل اللہ محقق سے منفصل ہوگا، پھر اہم عطایا کی طرف لوٹتے اور کہتے ہیں بے شک عطایا یا ذاتی ہوتے ہیں یا آسمانی، جہاں تک تحفے اور ہبات اور ذاتی عطایا تو یہ کبھی نہ ہوں گے مگر الوہی تجلی سے اور تجلی ذات سے کبھی نہ ہوگی مگر متجلیٰ لہ بندے کی استعداد کی صورت کے لئے، اس کے علاوہ نہیں تو تب متجلیٰ لہ نے حق کے آئینہ میں سوائے اپنی صورت کے کچھ نہ دیکھا اور اس نے حق کو (بھی) نہ دیکھا اور یہ ممکن بھی نہیں کہ وہ اسے دیکھے اپنے یہ جاننے کے باوصف کہ اس نے اپنی صورت نہ دیکھی مگر اس میں، مثالِ آئینہ کی شاہد میں تم جب اپنی شکل دیکھو تو اسے نہ دیکھو گے اپنے اس علم کے باوصف کہ تم نے اس میں صورتیں یا اپنی صورت نہیں دیکھی تو اللہ نے اسے (یعنی آئینہ کو) اپنی ذاتی تجلی کیلئے مثال بنایا ہے تاکہ متجلیٰ لہ جان لے کہ اس نے اسے نہیں دیکھا اور رؤیت اور تجلی سے انسب اور اقرب اس سے بہتر مثال موجود نہیں، جب آئینہ میں اپنی صورت دیکھو تو خوب کوشش کرو کہ آئینہ کا جسم دیکھ سکو، تم کبھی بھی اسے دیکھ نہیں سکتے حتی کہ بعض جس نے اس کے مثل کا مرئی کی صورت میں ادراک کیا رائے ظاہر کی کہ مرئی صورت دیکھنے والے کی نظر اور آئینہ کے مابین ہوتی ہے، یہ اس بارے ہمارا مبلغِ علم ہے، اسے ہم نے (اپنی دوسری کتاب) فتوحات مکیہ میں بھی بیان کیا ہے، جب اس کی فہم کرلو تو گویا ایسا ذائقہ چکھا جس کے اوپر مخلوق کے حق میں کوئی غایت نہیں، تو طمع نہ کرو اور اپنے آپ کو مت تھکاؤ اس امر میں کہ اس مقام سے اوپر ہو جاؤ، اصلاً یہاں اور مابعدہ وہ نہیں ماسوائے عدم محض کے! پس وہ تمہارا آئینہ ہے تمہاری اپنے آپ کی رؤیت میں اور تم اس کے آئینہ ہو اس کی اپنے اسماء اور اس کے احکام کے ظہور میں اور یہ سوائے اس کی عین کے کچھ نہیں تو معاملہ مبہم اور مختلط ہے

ہم میں بعض ایسے ہیں جو اس کی آگہی کے ضمن میں ناواقف رہے تو کہا: (وَالْعَجْزُ عَنْ دَرْكِ الإِدْرَاكِ إِدْرَاكٌ) (یعنی ادراک کے درک سے عجز [بذاتِ خود] ایک [نوع کا] ادراک ہے) اور بعض ایسے ہیں جنہوں نے اس جیسی بات نہ کہی اور یہ اعلیٰ ترین قول ہے بلکہ اسے علم نے سکوت عطا کیا جو اسے عجز نے کیا اور یہ اللہ بارے اعلی عالم ہے اور یہ علم سوائے خاتم الرسل اور خاتم الانبیاء کے کسی کو حاصل نہیں اور دیگر کوئی نبی اور رسول اسے نہیں دیکھ سکتا مگر خاتم الرسل کے روزن سے، اسی طرح کوئی ولی بھی نہیں دیکھ سکتا مگر خاتم الاولیاء کے روزن سے حتی کہ رسل بھی اگر دیکھنا چاہیں تو نہیں دیکھ سکتے مگر خاتم الاولیاء کے روزن سے کیونکہ رسالت اور نبوت ۔ یعنی نبوتِ تشریع ۔ اب منقطع ہے لیکن ولایت کبھی منقطع نہیں ہوگی، تو مرسلین کی اگر حالت یہ ہے تو خاتم الاولیاء سے کمتر درجہ کے اولیاء کا کیا حال ہوگا؟ اگرچہ خاتم الاولیاء حکماً اس شریعت کا تابع ہے جو خاتم الرسل لائے تو یہ ان کے مقام کے لئے قادِح نہیں اور ہمارا موقف جو بیان ہوا اس کے مناقض نہیں کیونکہ ایک جہت سے ان کا مقام اگر کمتر ہے تو دوسری جہت سے اعلیٰ ہے اور ہماری ظاہرِ شرع میں بھی یہ امر ظاہر ہوا جس سے ہمارے اس موقف کی تائید ہوتی ہے، یہ بدر کے

قیدیوں کے بارہ میں حضرت عمرؓ کی رائے اور کھجور کے درختوں کی پیوندکاری کی بابت جو واقعہ پیش آیا تھا تو کامل کی نسبت لازم نہیں کہ اس کے لئے ہر شیٔ اور ہر مرتبہ میں فوقیت ہو

افراد کی تقدم وفوقیت کی طرف نظر اللہ بارے علم کے مرتبہ میں ہے، وہیں ان کا مطلب ومقصود ہے! جہاں تک حوادثِ اکوان توان کے خواطر کو ان سے کوئی تعلق نہیں، اس سے ہمارا موقف ثابت ہوا، جب نبی اکرم نے نبوت کی مثال اینٹوں کی دیوار سے دی جو مکمل تھی ماسوائے ایک اینٹ کی جگہ کے تو نبی اکرم کی نبوت سے وہ اینٹ لگ گئی (اور دیوار مکمل ہوئی) البتہ آنجناب اسے نہ دیکھتے تھے مگر۔جیسا کہ کہا۔اینٹ! جہاں تک خاتم الاولیاء تو ان کے لئے یہ رؤیت لازم ہے تو وہ اسے دیکھتے ہیں جو نبی اکرم نے مثال دی، تو وہ دیوار میں دو اینٹوں کی جگہ (خالی) دیکھتے تھے، ایک سونے اور ایک چاندی کی تو وہ ان دو اینٹوں کو دیکھتے تو جو دیوار میں ناقص تھیں اور پھر ان کے ساتھ مکمل ہوگئی تو ضروری ہے کہ وہ اپنے آپ کو ان دو اینٹوں کی جگہ میں لگا ہوا دیکھے تو خاتم الاولیاء وہ دو اینٹیں ہیں، تو دیوار مکمل ہوئی، ان کے اپنے آپ کو یہ دو اینٹیں دیکھنے کا موجب سبب یہ ہے کہ وہ ظاہر میں خاتم الرسل کی شرع کے تابع ہیں اور وہ دچاندی کی اینٹ کی جگہ ہیں اور وہ اس کا ظاہر ہے اور جس کے (ظاہری) احکام میں وہ تابع ہیں جیسا کہ وہ باطن میں اللہ تعالیٰ سے اس کے (براہِ راست) آخذ ہیں ظاہر میں جس کے وہ متبع ہیں کیونکہ انہوں نے اس امر کو اس کی حقیقت پر دیکھا ہے تو لازم ہے کہ کہ اس طرح ان کی رؤیت ہو اور یہ باطن میں سونے کی اینٹ کیونکہ وہ اس معدن سے اخذ کرتے ہیں جس سے فرشتہ اخذ کرتا ہے جو رسول کی طرف وحی لے کر آتا ہے (یہ سب باتیں نقلِ کفر کفر نہ باشد کے زمرہ میں ہیں، مترجم)

اگر میرے یہ اشارات سمجھ چکے ہو تو تمہارے لئے علمِ نافع حاصل ہوا، حضرت آدم سے لے کر آخری نبی تک ہر نبی خاتم النبیین کے روزن سے ہی اخذ کرتا رہا اگر چہ ان کی طینت (یعنی وجودِ خاکی) کا وجود متاخر ہوا مگر وہ اپنی حقیقت کے لحاظ سے موجود تھے اور یہی آپ کے اس فرمان کا مطلب ہے: (كُنْتُ نَبِيّاً وَآدَمُ بَيْنَ الْمَاءِ وَالطِّيْنِ) جب کہ دیگر انبیاء میں سے ہر نبی اس وقت نبی بنتا تھا جب ان کی بعثت ہوتی تھی اسی طرح خاتم الاولیاء ولی تھے جب کہ آدم ابھی پانی اور مٹی کے درمیان تھے جب کہ دیگر اولیاء تب ولی بنتے ہیں جب الوہی اخلاق میں سے ولایت کی شرائط ان میں حاصل ہوجائیں اور ان کے ساتھ ان کا اتصاف اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ کو (وَلِيٌّ حَمِيْدٌ) کہا جاتا ہے تو خاتم الرسل کی اپنی ولایت کی حیثیت سے ختمِ ولایت کے ساتھ ان کی نسبت انبیاء و رسل کی آپ کے ساتھ نسبت کی مثل ہے تو آپ ولی، رسول، نبی ہیں اور خاتم الاولیاء ولی، وارث، اصل سے اخذ کرنے والے اور مراتب کے مشاہد ہیں اور خاتم الرسل حضرت محمدؐ کی حسنات میں سے ایک حسنہ جو جماعتِ (انبیاء پر) مقدم اور بابِ شفاعت کھولنے میں سب اولادِ آدم کے سردار ہیں تو آپ کی شفاعت کے ساتھ ایک خاص حال معین ہوا جو عام نہیں اور اس خاص حال میں آپ اسمائے الٰہیہ پر متقدم ہوئے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے اہلِ بلاء کو عذاب کے وقت سفارش نہیں مانی مگر شفاعت کرنے والوں کی

شفاعت کے بعد تو حضرت محمدؐ اس مقامِ خاص میں سیادت پر فائز ہوئے تو جو ان مقامات اور مراتب کی فہم رکھتا ہے اس پر اس طرح کی کلام قبول کرنا مشکل نہیں۔اھ، تو اس فص میں مصنف نے اپنے مذہب کی حقیقت ذکر کی جس پر اس کی ساری کلام کی بناء ہے تو اس میں موجود کفر بارے غور کرو جو ایسا ہے کہ:

﴿تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا﴾ [مریم: **۹۱**] (قریب ہے کہ اس سے آسمان پھٹ پڑیں اور زمین شق ہو جائے) اور جو اس میں اللہ کے خلق و امر کا اور اس کی ربوبیت اور الوہیت کا جحد و انکار ہے اور جو اس میں رسل وصدیقین کی سب وشتم اور تنقیص وتوہین ہے اور جھوٹے دعوی کے ساتھ بلا دلیل ان سے فوقیت کا اثبات کیا گیا ادنی عقل وایمان اور کتاب وسنت کی معمولی شد بد رکھنے والے پر بھی ان باتوں کا فساد مخفی نہیں اس نے کفار، منافقین اور فراعنہ کو اہل اللہ اور اس کے خواص اور اہلِ کشف بنا دیا اور اس کا باطل ہونا کئی وجوہ سے ثابت ہے:

(۱) اس نے اس کے لئے وجود سے قبل ہی عینِ ثابت کا اثبات کیا ہے اور تمام موجودات کا بھی اور اس کے مطابق اعیان، صفات، جواہر اور اَعراض میں سے ہر موجود کا عین اس کے وجود سے قبل ثابت تھا اور یہ گمراہی ہے جیسا کہ ذکر گزرا

(۲) اس نے اللہ کے بندے بارے علم کا ماخذ عدم میں ثابت اسی عین کو قرار دیا اور کہا یہ عبد کی حقیقت ہے، یہ اللہ کا ذاتی علم نہیں اور عدم میں ثابت اعیان اور ان کے احوال کی بابت اللہ کا علم مانع ہے کہ ان کے سوا کی خلق کرے اور یہی تقدیر کا راز ہے تو یہ بات اللہ تعالیٰ کے اعیان کے محتاج ہونے اور ان کے اس سے استغناء کے وصف کو متضمن ہے اور اس امر کی نفی کو جس کا وہ بنفسہ مستحق ہے اپنے کمالِ علم وقدرت سے اور تجہیل وتعجیز کے لزوم کو اور اس کلام میں جس کا بعض اس چیز کے لئے مضاہات ہے جس کا اللہ نے ذکر کیا، ان لوگوں کی نسبت جن کے بارہ میں کہا:

﴿لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِيَآءُ﴾[آل عمران: ۱۸۱] (اللہ نے ان لوگوں کا قول سن لیا ہے جو کہتے ہیں کہ اللہ فقیر ہے اور ہم امیر ہیں) الآیۃ، تو اس نے عدم میں ثابت اعیان کے حقائق کو اللہ سے مستغنی قرار دیا اور رب کو اپنے ان کا علم ہونے میں محتاج ومفتقر! تو اس نے ان کی بابت اپنا علم مستفاد نہ کیا مگر ان سے جیسے بندہ محسوسات کی بابت علم کو اپنے ان کیلئے ادراک سے مستفاد کرتا ہے، ان مدرکات کے مدرِک سے استغناء کے باوصف جبکہ مسلمان جانتے ہیں کہ اللہ کو اپنے قدیم وازلی علم کے باوصف ان اشیاء کا علم ان کے ہونے سے قبل ہی تھا اور یہ قدیم وازلی علم اس کی مقدس ذات کے لوازم میں سے ہے، اس نے اس کا اخذ ان اشیاء سے نہیں کیا، فرمایا:

﴿ اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ﴾[الملك: ۱۴] (آگاہ رہو کہ جس نے پیدا کیا وہ جانتا ہے وہ تو پوشیدہ باتوں کا جاننے والا اور آگاہ ہے) تو یہ **آیت اللہ کو اشیاء بارے علم ہونے کے وجوب پر دلالت کرتی ہے ان وجوہ سے** جو مذکورہ

براہین سے اہلِ نظر اور عقلی قیاس کرنے والوں کے لئے مرتب ہوئیں اہل کلام وفلسفہ وغیرہم میں سے، ان وجوہ میں سے :

۱۔ کہ وہ ان کا خالق ہے اور خلق ابداع بتقدیر ہے اور یہ خارجی تشکیل سے قبل علم میں ان کی تقدیر (اور خاکہ سازی) کو متضمن ہے

۲۔ کہ یہ ارادہ ومشیت کو متضمن ہے اور یہ مطلوب کے تصور اور اس کی نسبت شعور کو مستلزم ہے اور اکثر اہلِ کلام کے نزدیک مشہور طریقہ (اور اصول) ہے

۳۔ کہ یہ اشیاء اس سے صادر ہیں اور وہ ان کا تام سبب ہے اور اصلِ امر کا علم اور اس کا سبب اس سے مسبب فرع کے علم کو موجب ہوتا ہے تو اس کا بنفسہ علم تمام ان اشیاء کے بارہ میں اسے علم ہونے کو مستلزم ہے جو اس سے صادر ہونی تھیں

۴۔ کہ وہ فی نفسہ لطیف ہے، دقیق اور خفی کا مدرک ہے اور یہی اشیاء کے بارے میں علم ہونے کو مقتضی ہے تو وہ اشیاء کی بابت اپنے علم میں بنفسہ ان سے مستغنی ہے جیسا کہ وہ اپنی تمام صفات میں اپنے نفس کے ساتھ مستغنی ہے پھر جب اس نے اشیاء کو ان کے وجود کے بعد دیکھا اور اپنے بندوں کی کلام سنی اور اس کا نحو تو وہ ہر اس کا مدرک ہے جس کا اس نے ابداع وخلق کیا اور جو اس کی محتاج ہے، اس علم وادراک میں وہ اپنے غیر کا قطعاً محتاج نہیں تو یہ کہنا جائز نہیں کہ اس نے اشیاء کی بابت اپنے علم کو ان ثابت اشیاء سے اخذ کیا ہے اور یہ اپنے ثابت ہونے میں اس سے غنی ہیں

جہاں تک اس کی قدرت کا انکار تو اس لئے کہ مصنف نے باور کیا ہے کہ رب قادر نہیں مگر عدم میں ثابت ان اعیان میں اپنی تجلی پر اور یہ اس سے غنی ہیں تو اس کی قدرت انہی تک محدود اور انہی پر مقصور ہے جبکہ یہ اس سے غنی ہیں اور ان کے حقائق اس کے بغیر ہی ثابت ہیں، اس کے نزدیک یہی وہ راز ہے جس نے اللہ کو عاجز کیا کہ وہ اپنی خلق کے غیر پر قادر ہو، اس کے نزدیک اللہ قادر نہیں کہ عالم میں ایک ذرہ کی بھی کمی وبیشی کر سکے یا اپنی صفات اور حرکات وسکنات میں کوئی تبدیلی لا سکے یا بارش میں ایک قطرہ کی کمی بیشی کر سکے یا پانی کو اس کی گزرگاہ سے روک پائے یا گمراہ کو ہدایت یافتہ اور ہدایت یافتہ کو گمراہ کر سکے اور ساکن کو متحرک اور متحرک کو ساکن کرے تو فی الجملہ اسے صرف موجودات پر ہی قدرت حاصل ہے کیونکہ جو موجود ہے اس کی عین عدم میں ثابت تھی اور وہ ان اعیان کی نسبت ان کے ظہور سے زیادہ پر قادر نہیں، یہ تجہیل وتعجیز جس کا اس نے ذکر کیا اور زعم کیا کہ یہی تقدیر کا راز ہے اگرچہ اس میں دوسروں کی کہی گمراہی کی باتیں بھی شامل ہیں تو اس میں وہ کفر ہے جو اس سے دیگر گمراہوں کو بھی پسند نہیں

چنانچہ معدوم کے شیٔ ہونے کے قائلین یہ بات ہر اس کی بابت کہتے ہیں جو ممکن ہو یا نہ ہو، وہ اس کے اشیاء بارے علم کو ان اشیاء سے ماخوذ قرار نہیں دیتے اس سے قبل کہ یہ معرضِ وجود میں آتیں اور نہ اس نظریہ کے قائل ہیں کہ اس کی خلق وقدرت انہی پر مقصور ہے جن کا ان میں سے اسے علم ہوا تو وہ ممکنات کی کئی انواع جانتا ہے جنہیں (ابھی) اس نے تخلیق نہیں کیا، ممکنات بارے اس کا علم ان سے اوسع ہے جنہیں اس نے تخلیق کیا، وہ عدم میں ثابت اعیان کے اس وجود کے سوا کو قبول نہ کرنے کو اس امر

کا مانع تصور نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ ایسی اشیاء کو تخلیق کرے جو اس کی خلق کردہ کا غیر ہوں ! بلکہ ان کے نزدیک ایک اور صفت پر ان کا وجود ممکن ہے اور یہ بھی عدم میں ثابت ممکنات میں ہیں تو ان کا یہ نظریہ اس وجہ سے تجہیل اور تعجیز پر منتج نہیں ہوتا، وہ صرف کبھی یہ کہہ سکتے ہیں کہ مانع اس سے بس یہ ہوسکتا ہے کہ یہ اکمل وانسب الوجوہ ہے تو اسکا علم کہ اس سے اکمل کوئی نہیں اس کے لئے مانع ہوسکتا ہے کہ اس چیز کا ارادہ کرے جو اس کی حکمت کی رو سے اکمل نہیں ! تو وہ مانع کو ایسا امر قرار دیتے ہیں جو خود اس کی ذاتِ مقدسہ کی طرف راجع ہے حتی کہ وہ اسے اس کے غیر سے باور نہیں کرتے

تو ایسے لوگ جو اس کے غیر سے کچھ اس کے لئے مانع اور اس کی قضاء وقدر کا راد (یعنی پلٹانے والا) نہیں خیال کرتے ان حضرات کی مانند کیونکر ہو سکتے ہیں جو ایسا سمجھتے ہیں؟ اسی طرح جو اسے بنفسہ عالم مانتے ہیں ان کی مانند کیونکر ہو سکتے ہیں جو اسے اپنے غیر سے علم کا آخذ قرار دیتے ہیں، پھر اکثر لوگوں نے یہ کہنے والوں کا انکار کیا ہے کہ امکان میں اس عالم سے ابدع نہیں

(۳) اس کا دعوی ہے کہ اس صنف میں سے جسے اس نے اہل اللہ میں سے سب سے اعلیٰ قرار دیا، ایسے اشخاص ہو سکتے ہیں جن کا علم اللہ کے علم کے بمنزلہ ہو کیونکہ ایک ہی معدن سے اخذ کرنے والے کیلئے اگر ثابت فی العدم اعیان کے احوال کشف کئے جائیں تو وہ ان کا اسی طرح عالم ہوگا جس طرح اللہ ہے، البتہ عبد کی نسبت یہ اللہ کی طرف سے سابق عنایت ہے کہ اس کی عین کے منجملہ احوال سے ہے جن کی معرفت اس صاحبِ کشف کو ہوئی بسبب اس کے کہ اللہ نے اسے ان پر مطلع کیا تو یوں اس نے بندے (یعنی صاحبِ کشف) کے علم کو اور اللہ کے علم کو ایک ہی معدن سے ماخوذ قرار دیا

(۴) اس نے اللہ کو ان اشیاء کا عالم باور کیا بعد اس کے کہ وہ ان کا عالم نہ تھا اور یوں اس نے قرآن کے متشابہات مثلاً: (حَتّٰى نَعْلَمَ) کی پیروی کی اور زعم کیا کہ یہ لفظ محققۃ المعنی ہے اپنی اس فاسد اصل پر بناء کرتے ہوئے کہ عبد کا وجود عین وجودِ رب ہے تو ہر مخلوق نے وہ کچھ جانا جو اس کے احاطۂ علم میں نہ تھا تو (گویا) یہ اللہ ہے جس نے وہ جانا جس کا قبل ازیں اس سے علم نہ تھا اور یہ ایسا کفر ہے جو اس سے قبل کے کسی کافر نے اختیار نہیں کیا، تو اللہ کی تقدیر کے مکذب کی غایت یہ ہے کہ وہ کہے: بے شک اللہ کو علم ہوا اس کا جس کا وہ عالم نہ تھا لیکن یہ نظر یہ رکھنا کہ مخلوق کیلئے علم میں سے جو متجدد ہو بس وہی اللہ کے لئے متجدد ہوگا اور اللہ اس چیز کا عالم نہ تھا جس کی ہر مخلوق عالم ہوئی حتی کہ (پہلے) اس مخلوق کو اس کا علم ہوا (اور اللہ کو بعد میں) تو یہ ایسا افتراء ہے جو اس کے سوا کسی اور نے اختیار نہیں کیا

(۵) اس نے زعم کیا ہے کہ ذاتی تجلی متجلی اور متجلیٰ لہ کے استعداد کی صورت میں وہی ہے جو اس نے حق کے آئینہ میں اپنی صورت کے سوا دیکھی ہے اور ممکن نہیں کہ وہ حق کو دیکھے اپنے یہ جاننے کے باوصف کہ اس نے اس کی صورت نہ دیکھی مگر اس میں، اس نے آئینہ کے ساتھ مثال دی تو حق کو آئینہ اور آئینہ میں (مرئی) صورت کو اس کی صورت قرار دیا، تو یہ ہے اس کے مذہب کی تحقیق، تو خلاصہِ کلام یہ ہوا کہ اس کے نزدیک اعیان کا وجود حق کا وجود ہے اور اعیان عدم میں ثابت تھے تو ان میں وجودِ حق ظاہر ہوا تو متجلیٰ

لہ۔اور یہ عبد ہے۔وجود کو ذوات سے مجرد نہیں دیکھتا، وہ انہی ذوات کو دیکھتا ہے جن میں وجود ظاہر ہوا تو وجود کی رؤیت کی اس کے لئے کبھی کوئی سبیل نہیں، یہ اس کے نزدیک وہ غایت ہے کہ مخلوق کے حق میں جس سے فائق کوئی غایت نہیں اور اس کے بعد فقط عدمِ محض ہے تو وہ تمہاری اپنے نفس کی رؤیت میں تمہارا آئینہ ہے اور تم اس کی اپنے اسماء اور ان کے احکام کے ظہور میں اس کا آئینہ ہو اور یہ اس لئے کہ بندہ اپنے نفس کو نہیں دیکھتا جو کہ اس کا عین ہے مگر وجودِ حق میں جو اس کا وجود ہے اور بندہ اس کے اپنے اسماء اور ان کے احکام کے ظہور میں اس کا آئینہ ہے کیونکہ اس کی نظر میں اسمائے حق وہ نسبتیں اور اضافات ہیں جو اعیان اور وجودِ حق کے درمیان ہیں اور اسماء کے احکام عدم میں ثابت شدہ احکام ہیں اور ان احکام کا ظہور حق کی ان اعیان میں تجلی کے ساتھ ہے اور اعیان جو کہ حقیقتِ عیان ہیں،حق کا آئینہ ہے جس میں وہ اپنے اسماء اور ظوہر احکام کو دیکھتا ہے تو وہ جب اعیان میں ظاہر ہوا تو وہ نسبت حاصل ہوئی جو وجود اور اعیان۔اور یہ اسماء ہیں۔کے اور ان کے احکام۔اور یہ اعیان ہیں۔کے مابین ظاہر ہوئے اور ان اعیان کا وجود ہی حق باری تعالیٰ ہے اسی لئے اس نے کہا:(وَلَيْسَتْ سِوَى عَيْنِهِ ...... الخ) تو یوں معاملہ مختلط اور مبہم ہے! تو اس کلام میں غور کرو تمہیں ذاتِ حق وراس کے اسماء بارے اس کے عقیدہ کی پہچان ہوگی، کہ اس کے نزدیک ذاتِ حق مخلوقات کا وجود ہی ہے اور اس کے اسماء وہ نسبت ہیں جو وجود اور اعیان کے درمیان ہیں اور ان اسماء کے احکام اعیان ہیں تو تم جان لو گے کہ اس کی کلام کیسے اور اللہ اور اس کے اسماء کے جو دو انکار پر مشتمل ہے اسی طرح اس کی صفات اور اس کے لئے خلق وامر کے انکار پر، اور اللہ کے اسماء وآیات میں الحاد پر، یہ جو اس نے ذکر کیا اللہ کے اسماء وآیات میں غایت درجہ کا الحاد ہے اس نے اللہ کے کسی اسم و آیت کا اثبات نہیں کیا کیونکہ کائنات میں اس کے مطابق بس ایک ہی وجود ہے اور یہ نہ اسم ہے اور نہ آیت (یعنی نشانی) اور ثابت اعیان اس کے اسماء وآیات نہیں اور جب اس نے دو اشیاء کا اثبات کیا تو وجود اور ثبوت کے ساتھ ان کے درمیان تفرقہ کیا اور دونوں کے مابین فرق نہیں تو یوں اس پر معاملہ ملتبس اور مبہم ہوا

یہ اس کی کلام کی حقیقت اور اس کے مذہب کا سرّ ہے جس کے بل بوتے پر وہ اپنے آپ کو اللہ بارے اعلم الناس قرار دیتا ہے اور یہ کہ وہ اس کی رو سے صدیقین پر بھی سبقت لے گیا جو ناواقف رہے اور کہا: (اَلْعِجْزُ عَنْ دَرْكِ الإِدْرَاكِ إِدْرَاكٌ) اور مرسلین سے بھی فائق ہوا جنہیں اس کا علم حاصل نہ ہوا مگر اس کے روزن سے اور اس کی یہ باتیں کفر وضلال کی اتنی انواع پر مشتمل ہیں کہ ان کے شمار سے بات طویل ہو جائے گی،مثلاً: اللہ کی ذات کا انکار کیونکہ اس کے ہاں بجز مخلوق کے وجود کے کچھ نہیں،اسی طرح اللہ کے اسماء کا انکار کیونکہ یہ اس کی نظر میں سوائے عدمی امور کے کچھ نہیں تو جب ہم نے کہا:(**اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ**) تو اس کے نزدیک رب نہیں مگر ثبوت کی طرف نسبت

(۲) اس کا قول ہے: (فَاخْتَلَطَ الأَمْرُ بَيْنَهُمْ) (تو معاملہ ان پر مختلط ہوا) یا یہ اس کی مختلط ومبہم اصلِ فاسد پر ہے جب کہ اصلِ

ہدی و ایمان پر (اللہ کی بابت) کوئی التباس اور ابہام نہیں، اللہ نے اپنی کتاب میں حق کو باطل اور ہدایت کو ضلال سے ممیّز اور مبین کر دیا ہے، اس نے ایک جگہ لکھا: تو ہم میں سے جو اس کی بابت جاننے میں جاہل رہا اس نے کہا: (اَلْعِجْزُ عَنْ دَرْكِ الإِدْرَاكِ إِدْرَاكٌ) اس قول کی نسبت حضرت ابوبکر صدیق کی طرف مشہور ہے تو یوں اس دریدہ دہن نے انہیں جاہل متصور کیا اور اگرچہ یہ مقولہ حضرت ابوبکر صدیق سے محفوظ نہیں اور نہ معتمد نقول میں ان کی طرف منسوب ہے البتہ ابن ابوالدنیا نے کتاب الشکر میں اس کا نحو بغیر نام لئے بعض تابعین سے ذکر کیا ہے! بہرحال مراسیل میں ان سے کثرتِ اخطاء معروف ہے، جیسا کہ حضرت عمر سے بھی نقل کرتے ہیں کہ نبی اکرم اور حضرت ابوبکر کئی دفعہ باہم ایسی گفتگو کرتے کہ میں ان کے درمیان زنجی (یعنی حبشی) کی طرح ہوتا تھا، یہ بھی اہلِ معرفت کے بالاتفاق کذب ہے، صحیح میں ابوسعید خدری سے بس یہ مروی ہے کہ نبی اکرم نے ہمارے سامنے تقریر کی جس میں کہا اللہ نے ایک بندے کو دنیا و آخرت کے درمیان اختیار دیا تو اس بندے نے جو کچھ اللہ کے پاس ہے اسے اختیار کیا، یہ سن کر ابوبکر رونے لگے اور کہا ہماری جانیں اور اموال آپ پر قربان! تو لوگ آپس میں کہنے لگے انہیں کیا ہوا؟ نبی پاک نے تو ایک شخص بارے بات کہی ہے اور یہ رونے لگ گئے ہیں تو دراصل نبی اکرم نے اپنا ذکر کیا تھا اور ابوبکر اس بات کے ہم میں سے اعلم تھے تو ابوبکر نبی اکرم کی اس بات سے مراد اور مقصد کے اعلم تھے اگرچہ اس کی فہم میں سب مشترک تھے اور یہ جیسا کہ صحیح میں ہے کہ حضرت علی سے پوچھا گیا کیا نبی اکرم نے خاص آپ (اہل بیت) کے ہاں کوئی باتیں چھوڑیں؟ ایک روایت میں ہے کیا آپ حضرات کو آنجناب نے کوئی خاص وصیتیں کیں جو دیگر لوگوں کو نہ کی ہوں؟ تو انہوں نے کہا نہیں! قسم ہے اس ذات کی جس نے دانہ اگایا اور روحیں پیدا کیں مگر وہ فہم جو اللہ تعالیٰ اپنی کتاب کی بابت کسی کو عطا کرے یا جو کچھ اس صحیفہ میں ہے اور اس میں دیت اور قیدی چھوڑنے/چھڑانے کے احکام تھے اور یہ کہ مسلمان کو کافر کے بدلہ میں قتل نہ کیا جائے گا

اس اور اس طرح کی صحیح احادیث سے علماء نے استدلال کیا ہے کہ یہ جو حضرت علی اور دیگر اہل بیت کے بارہ میں بعض لوگ ذکر کرتے ہیں کہ نبی اکرم کی طرف سے ان کے پاس کوئی خاص علم تھا جو اوروں کے پاس نہ تھا، یہ کذب ہے جیسے مثلاً علمِ جفر، بطاقہ اور جدول (یعنی زائچہ بنانا) وغیرہ کئی امور جو ان کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں اور جو باطنی قرامطہ ان سے نقل کرتے ہیں، اس ضمن میں زیادہ تر کذب بیانی جعفر صادق کے حوالے سے کی گئی ہے، اس کی تفصیل ایک جگہ آئے گی، تو اسی طرح نساک اور حقائق جاننے کے مدعی حضرات نے ابوبکر وغیرہ پر کذب بیان کی اور یہ کہ نبی اکرم کئی دفعہ ان سے ایسی باتیں کرتے تھے کہ حضرت عمر باوجود وہاں موجود ہونے کے سمجھ نہ پاتے، پھر یہ دعوی کرتے ہیں کہ ان باتوں کو ہم سمجھ چکے ہیں تو یہ سب زندیقیت اور الحاد ہے، ایسے کثیر لوگ اس پر حضرت ابوہریرہ کے ایک قول سے حجت اخذ کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا تھا میں نے نبی اکرم سے دو بورے احادیث کے حفظ کئے تھے ایک کو تمہارے سامنے بیان کر دیا ہے اور اگر دوسرے کو بیان کروں تو تم میری گردن کاٹ دو، یہ حدیث صحیح ہے لیکن

جس بورے میں محفوظ احادیث کوانہوں نے بیان نہ کیا تھا اس میں علمِ دین اور اللہ کی معرفت وتوحید سے متعلق کوئی شئ نہ تھی کہ (ان کے حسبِ زعم) اولیاء اللہ ان کے ساتھ مختص ہیں اور ابو ہریرہ تو اکابر صحابہ میں سے نہ تھے جو اس کے مثل کے ساتھ خاص کئے جاتے ہیں (اگر کئے جائیں) اگر یہ اس میں سے ہے جس کے ساتھ وہ خاص کئے گئے، دراصل اس بورے میں فتنوں بارے احادیث تھیں جو مسلمانوں کے مابین واقع ہونے والے تھے، نبی اکرم نے اس ضمن میں پیشین گوئیاں کی تھیں اور بڑی جنگوں بارے جو اہلِ اسلام اور کفار کے درمیان ہونی تھیں، اسی لئے جب حضرت عثمان کی شہادت اور ابن زبیر کے دور کے سانحات ہوئے تو ابن عمر نے کہا اگر ابو ہریرہ تمہیں یہ احادیث بیان کر دیتے کہ تم اپنے خلیفہ کو شہید کرو گے اور خانہ کعبہ منہدم کرو گے تو تم کہتے ابو ہریرہ کذب بیانی کر رہے ہیں (یعنی نبی اکرم نے ایسا کچھ نہیں کہا) تو اسی حکمت کے پیشِ نظر فتنوں کے وقوع سے قبل ان کے بارہ میں کی گئی نبوی پیشین گوئیاں روایت کرنے سے ابو ہریرہ ممتنع رہے کیونکہ خواص اور عوام اس کے متحمل نہ ہو سکتے تھے

اسی طرح یہ **حضرات حضرت حذیفہ بن یمان کی حدیث سے حجت پکڑ سکتے ہیں کہ وہ آنجناب کے رازداں تھے** اور آپ نے وہ باتیں انہیں بتلائی تھیں جنہیں کوئی اور نہیں جانتا اور ان کی حدیث معروف ہے لیکن جو راز صرف یہی جانتے تھے کوئی اور نہیں وہ ان منافقین کے نام تھے جو غزوہ تبوک میں ہمراہ گئے اور کہا جاتا ہے راستہ میں موقع پا کر نبی اکرم کو شہید کرنا چاہتے تھے تو اللہ نے وحی کے ذریعہ آپ کو خبر دار کر دیا اور آپ نے حضرت حذیفہ کو ان کے اسماء سے آگاہ کیا، اسی لئے حضرت عمر صرف اسی شخص کی نماز جنازہ پڑھتے تھے جس میں حضرت حذیفہ بھی حاضر ہوتے کیونکہ منافقین کی نماز جنازہ پڑھنے سے منع کیا گیا ہے، صحیح میں حضرت حذیفہ سے منقول ہے کہ انہوں نے جب فتنوں کا ذکر کیا اور وہ صحابہ میں سب سے بڑھ کر ان کی بابت معلومات رکھتے تھے تو بیان کیا کہ نبی اکرم نے ان اخبار کے ساتھ صرف انہیں ہی خاص نہ کیا تھا بلکہ سبھی کو یہ باتیں بیان کی تھیں مگر حذیفہ نے انہیں خصوصی طور پر یاد رکھا، اس کی مزید تبیین اس امر سے ملتی ہے کہ نبی اکرم نے فتحِ مکہ کے موقع پر چند افراد کا خون ہدر (یعنی مباح) کیا ان میں عبداللہ بن ابو سرح بھی تھے تو انہیں لے کر حضرت عثمان آپ کی خدمت میں (یعنی ان کے سفارشی بن کر) حاضر ہوئے تا کہ آپ ان کی بیعت قبول کر لیں، آپ نے ایک ساعت توقف کیا پھر بیعت لے لی اور پھر فرمایا کیا تم میں کوئی دانا آدمی نہ تھا جو مجھے دیکھتا کہ توقف کر رہا ہوں تو اس کی گردن مار دیتا؟ ایک انصاری نے کہا آپ نے یا رسول اللہ مجھے اشارہ کیا ہوتا، فرمایا نبی کے لئے لائق نہیں کہ گوشۂ چشم سے اشارے کرے، تو اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نبی کریم کا ظاہر و باطن ایک جیسا تھا، آپ لوگوں کے لئے خلافِ باطن ظاہر نہ کرتے تھے جیسے زندیق فلسفی، قرامطی اور گمراہ صوفی وغیرہم ادعاء کرتے ہیں

(۷) مصنف نے کہا: کہ ہم میں سے بعض کو علم ہوا مگر اس کا مثل نہ کہا اور وہ اعلیٰ قول ہے بلکہ اسے علم اور سکوت نے وہ کچھ عطا کیا جو اسے عجز نے کیا ہے اور یہی اللہ کے بارہ میں سب سے بڑھ کر جاننے والا ہے اور یہ علم صرف خاتم الرسل اور خاتم الاولیاء کو ہے

اور دیگر کئی نبی یا ولی انہی کے روزن سے اس کا اخذ کرتے ہیں حتی کہ رسل بھی اسے نہیں دیکھتے مگر خاتم الاولیاء کے روزن سے کیونکہ رسالت ونبوت۔ میری مراد تشریعی ثبوت ورسالت سے ہے۔ اب منقطع ہوئیں اور ولایت کبھی منقطع نہیں ہوگی......اگر چہ خاتم الاولیاء حکمی لحاظ سے خاتم الرسل کی شریعت کا تابع ہے تو یہ اس کے مقام کے لئے قادِح نہیں اور نہ ہماری رائے کے مناقض، ایک جہت سے وہ اَنزل ہے جیسا کہ دوسری جہت سے اعلیٰ......الخ

تو یہ کلام کئی انواع کے کفر والحاد اور انبیاء ورسل کی تنقیصِ شان پر مشتمل ہے، ایسی بات تو یہودی اور نصرانی بھی نہیں کرتے، یہ نہ عقل ہے اور نہ قرآن، یہ کہنا کہ انبیاء ورسل خاتم الاولیاء کے روزن سے فیض حاصل کرتے ہیں عقل کے خلاف ہے! پہلے آنے والے بعد میں آنے والے سے کیونکر مستفید ہو سکتے ہیں؟ اور یہ شرع کے بھی مخالف ہے کیونکہ یہ سب اہلِ اسلام کو معلوم اور عقیدہ کا جزوِ لازم ہے کہ رسل اولیاء سے افضل ہیں، اولیاء نہ نبی ہیں اور نہ رسل پھر اس کا دعوی کہ اس کے پاس اللہ بارے جو علم ہے وہ اعلیٰ علم ہے اور وجودِ خالق وجودِ مخلوق ہے، یہ صانع کی حقیقت کی تعطیل اور اس کا انکار ہے، یہ وہ قول ہے جس کا فرعون نے اظہار کیا تھا، اس نے اسے حق قرار دینے پر ہی اکتفاء نہ کیا حتی کہ زعم کیا کہ یہ اعلیٰ علم ہے پھر یہیں پہ بس نہیں کیا حتی کہ دعوی کیا کہ سب رسل خاتم الاولیاء کے روزن سے فیض پاتے ہیں تو یوں اس نے خاتم الاولیاء کو تمام انبیاء ورسل سے اعلم باللہ بنا ڈالا اور یہ کہ وہ علم باللہ کی رویت اسی کے روزن سے پاتے ہیں پھر اس کی علت ذکر کرتے ہوئے کہا چونکہ رسالت اور نبوت منقطع ہے جب کہ ولایت ہمیشہ جاری وساری ہے، غور کرو کہ صرف نبوتِ تشریع کو منقطع کہا کیونکہ یہ لوگ نبی اکرم کے بعد کسی کو نبی اور رسول تو قرار نہ دے سکتے تھے کہ یہ ظاہر کفر ہے تو نبوتِ تشریع کی بیخ لگائی (یہی قادیانیوں والا عقیدہ جو مرزا غلام احمد کو ظلی نبی مانتے ہیں) گویا نبوت اور رسالتِ تحقیق۔ اور یہ ان کے نزدیک ولایت ہے۔ منقطع نہیں ہوئی اور ان کے ہاں یہ ولایت نبوت ورسالت سے افضل ہے اسی لئے ابن عربی نے اپنی ایک تحریر میں یہ شعر ذکر کیا:

مَقَامُ النُّبُوَّةِ فِیْ بَرْزَخٍ فُوَیْقَ الرُّسُلِ وَ دُوْنَ الْوَلِی

(یعنی مقامِ نبوت برزخ میں ہے، رسل سے کچھ اوپر مگر ولی سے کمتر) فصوص میں (کلمۃ عزیزیۃ) کے تحت لکھتا ہے: جب اہل اللہ میں سے کسی سے سنو یا اس سے تمہیں بیان کیا جائے کہ ولایت نبوت سے اعلیٰ ہے تو اس کی مراد وہی ہے جو ہم نے ذکر کیا، یا اگر کہے: ولی نبی اور رسول سے فائق ہے تو اس کی مراد ایک ہی شخص میں یہ تینوں خصائص جمع ہونا ہے اور یہ آنجناب تھے اس طور کہ آپ کا ولی ہونا آپ کے صرف نبی اور رسول ہونے سے اتم ہے، یہ نہیں کہ نبی کا تابع ولی اس سے اعلیٰ ہوگا کہ تابع متبوع کے مقام کو کبھی نہیں پا سکتا ان امور میں جن میں وہ اس کا تابع ہے کہ اگر پالے تب وہ اس کا تابع نہ رہے، جب اس ضمن میں وضاحت مانگی گئی تو یوں بات بنائی: نبی کی ولایت اس کی نبوت سے اور اس کی نبوت اس کی رسالت سے فائق ہے کیونکہ وہ اپنی ولایت کی رو سے اللہ سے اخذ کرتا ہے (یعنی بغیر کسی درمیانی واسطہ کے) پھر وہ اس کی مثل ولایت کا خود اپنے لئے اثبات کرتا ہے اور خاتم

الاولیاء کی ولایت کو نبی کی ولایت سے افضل قرار دیتا ہے اور یہ کہ رسول کی ولایت اس مزعوم خاتم الاولیاء کی ولایت کے تابع ہے

اس کلام میں (کفر کی) کئی انواع ہیں جن کا بیان ہم نے ایک جگہ کیا ہے مثلا خاتم الاولیاء کے وجود کا دعوی جو باطن اور بالکل بے اصل ہے، اس سے قبل کسی معروف شخص نے یہ دعوی نہیں کیا ماسوائے ابوعبداللہ محمد بن علی ترمذی حکیم کے، کتاب ختم الولایت میں، اس کتاب میں خطا، غلط اور کتاب وسنت اور اجماع کے مخالف باتوں کی تبیین ہے، ترمذی حکیم رحمہ اللہ اگر چہ صاحبِ فضل ومعرفت تھے اوران کی تحریرات میں حسن، مقبول، نافع حقائق اور قابلِ تعریف اشیاء بھی ہیں لیکن متعدد اغلاط بھی پائی گئی ہیں جن کا رد لازم ہے اور بڑی اغلاط میں سے جو اپنی مذکورہ کتاب میں دعویٰ کیا کہ متاخرین میں کئی ایسے درجہ والے لوگ ہوں گے جو اللہ کے نزدیک ابوبکر وعمر وغیرہ سے افضل ہوں گے پھر ایک اور جگہ اس سے متضاد بات کہی جب بعض لوگوں کے حوالے سے نقل کیا کہ ولی لوگوں سے منفرد شخص ہوتا ہے تو اس کا ابطال کیا اور ابوبکر وعمر کے ساتھ حجت پکڑی اور لکھا اس سے لازم آتا ہے کہ وہ ابوبکر وعمر سے افضل ہو لیکن یہ بات باطل اور مردود ہے، اس نے بھی اسی طرح اپنی کتاب (یعنی فصوص الحکم) میں ذکر کیا جس کا مفہوم یہ بنتا ہے کہ ظاہری اعمال کا ترک۔ اگر چہ یہ مشروع تطوعات ہوں۔ ایسے کامل کے حق میں افضل ہے جو قلبی اعمال والا ہے، یہ بات بھی ائمہ طریقت کے نزدیک غلط ہے، آنجناب سے زیادہ کامل کون ہوگا اور آپ کی روش ہی بہترین روش ہے اور آپ وفات تک بدنی اوراد اور تطوعات پر قائم رہے

اسی طرح جو اس نے خاتم الاولیاء کا دعویٰ کیا جو آخری زمانہ میں ہوگا اور وہ تمام سابقہ اولیاء سے افضل ہوگا اور اس کی ان میں وہ حیثیت ہوگی جو نبی اکرم کی رسل میں ہے، یہ واضح ضلال ہے، اس امت کے افضل اولیاء ابوبکر، عمر، عثمان اور علی اور ان جیسے مہاجرین وانصار میں سے سابقین اولین صحابہ ہیں جیسا کہ مشہور نصوص کے ساتھ یہ ثابت ہے (ولی تو کسی عام صحابی سے بھی افضل نہیں ہوسکتا جس نے فقط ایک بار ایمان کی حالت میں نبی اکرم کی زیارت کی ہو) اور بہترین دور حضرت محمد کا دور ہے جیسا کہ صحیح حدیث میں ثابت ہوا پھر وہ جو آپ کے بعد کا ہے پھر جو اس کے بعد ہے، ترمذی وغیرہ میں ہے کہ آپ نے ابوبکر وعمر بارے کہا یہ اہلِ جنت کے تمام اولین وآخرین بڑی عمر کے لوگوں کے سردار ہیں ماسوائے نبیوں اور رسولوں کے! بقول ترمذی یہ حسن ہے بخاری نے حضرت علی بارے نقل کیا کہ ان سے ان کے بیٹے نے پوچھا (یہ محمد ابن حنفیہ تھے) ابا جان! سب سے بہترین آدمی (نبی کریم کے بعد) کون ہے؟ فرمایا اے بیٹے وہ ابوبکر ہیں، پوچھا پھر کون؟ کہا پھر عمر، اسی (۸۰) سے زائد لوگوں نے ان سے نقل کیا کہ کہا نبی اکرم کے بعد اس امت کے افضل ترین آدمی ابوبکر ہیں پھر عمر، اور یہ ایک وسیع باب ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿فَأُولَٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ﴾ [النساء: ۶۹] (تو وہ اُن لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے بڑا فضل کیا یعنی انبیاء، صدیقین اور شہداء) تو بندوں کے چار مراتب ہیں: سب سے افضل انبیاء پھر صدیقین پھر شہداء پھر صالحین، نبی اکرم نے ایک حدیث میں منع کیا کہ کوئی اپنے آپ کو حضرت یونس بن متی سے افضل

باور کرے حالانکہ قرآن نے ان کی بابت کہا﴿ **وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ** ﴾[ن : ۴۸] (اور مچھلی والے کی طرح نہ ہونا) اور یہ بھی کہا: **وَهُوَ مُلِيْم**[الصافات : ۱۴۲] (اور وہ الزام کھایا ہوا تھا) تو یہ اس امر کی تنبیہہ ہے کہ دیگر انبیاء تو اس بات کے اولیٰ ہیں کہ کوئی اپنے آپ کو ان سے افضل نہ گردانے، صحیح بخاری میں ابن مسعود سے مروی ہے کہ نبی کریم نے فرمایا تم میں سے کوئی یہ نہ کہے کہ میں یونس بن متی سے بہتر ہوں، بخاری کی ان سے ایک اور روایت میں ہے کہ نبی کریم نے فرمایا کسی بندے کے لئے لائق نہیں کہ وہ یونس بن متی سے بہتر ہو، ابو ہریرہ سے بخاری نے نقل کیا کہ آنجناب نے فرمایا جس نے کہا میں یونس بن متی سے بہتر ہوں وہ کاذب ہے، صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ راوی ہیں کہ آپ نے فرمایا کسی کے لئے لائق نہیں کہ کہے میں یونس بن متی سے بہتر ہوں صحیحین کی ابن عباس سے ایک روایت میں ہے کہ آپ نے حدیثِ قدسی کے بطور بیان کیا کہ کسی کے لئے لائق نہیں کہ کہے میں یونس بن متی سے بہتر ہوں اور یہ نہی عام ہے

یہ جو بعض حضرات روایت بیان کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا مجھے یونس بن متی سے افضل مت قرر دو، اور اسے صاحبِ معراج کے حال اور صاحبِ حوت (یعنی حضرت یونسؑ) کے حال کے استواء کے ساتھ مفسر کرتے ہیں تو یہ روایت بھی باطل اور یہ تفسیر بھی باطل ہے، نبی اکرم نے ایک موقع پر فرمایا: اے احد ثابت رہو کہ تمہارے اوپر نبی ہے یا صدیق یا شہید، ابو بکر افضل الصدیقین ہیں، نیز خاتم الاولیاء کی اصطلاح امت کے سلف میں سے کسی کی کلام میں نہیں ہے اور نہ امت کے ائمہ نے اسے ذکر کیا اور نہ کتاب و سنت میں کہیں یہ مذکور ہے، اس ترکیب کا موجب یہ بنتا ہے کہ وہ آخری مومن متقی ہیں جبکہ اللہ کہتا ہے:

﴿**أَلَآ إِنَّ أَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ**﴾[یونس : ۶۲] (آگاہ رہو کہ جو اللہ کے دوست ہیں اُن کو نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غمناک ہوں گے) تو ہر مومن متقی اللہ کا ولی ہے اور یہ دو درجہ پر ہیں: ایک، سابقین مقربین اور دوم، امقتصدین صحاب الیمین جیسا کہ سورۃ فاطر، الواقعہ، الدھر اور المطففین میں یہ تقسیم مذکور ہوئی، بخاری میں حضرت ابو ہریرہ سے نبی اکرم کا فرمان مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا جس نے میرے ولی سے دشمنی مول لی اس نے میرے خلاف اعلانِ جنگ کیا اور بندہ فرائض کے مثل اور نوافل کے ساتھ میرے قریب ہوتا جاتا ہے حتیٰ کہ اسے میری محبت نصیب ہو جاتی ہے جب یہ مرحلہ آجاتا ہے تو میں **اس کا کان بن جاتا ہوں جس کے ساتھ وہ سنتا ہے، اس کی آنکھ ہو جاتا ہوں** جس سے دیکھتا ہے، اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس کے ساتھ پکڑتا ہے اور اس کا پاؤں ہو جاتا ہوں جس سے چلتا ہے اور میں نے کسی شئ بارے جسے کرنا چاہتا ہوں کبھی ایسا تردد نہیں کیا جیسا تردد اپنے مومن بندے کی روح قبض کرتے وقت کرتا ہوں، اسے مرنا برا لگتا ہے جبکہ مجھے اس کی یہ ہچکچاہٹ نا گوار لگتی ہے اور اس سے چارا نہیں، اھ

تو فرائض کے ساتھ اللہ کے تقرب کے جویا بندے، ابرار، مقتصد اصحاب الیمین ہیں جب کہ نوافل بجالانے کے ساتھ اللہ کا تقرب پانے والے سابقین مقربین ہیں اور نوافل فرائض کے بعد ہوتے ہیں (یعنی فرائض ادا کرنے والا ہی نوافل کا عامل بنے گا) حضرت ابو بکر نے حضرت عمر کو وصیت کرتے ہوئے کہا تھا جان لو کہ تمہارے ذمہ اللہ کا ایک حق رات کو ہے جسے وہ دن کو قبول نہ کرے گا

اور جو اس کا حق دن کو ہے اسے وہ رات کو قبول نہ کرے گا اور نوافل اسے قبول نہ ہوں گے حتی کہ پہلے فرائض بجالاؤ

اتحادیہ کا زعم ہے کہ نوافل کے ذریعہ تقرب پانا اس امر کا موجب ہے کہ عینِ حق اس کے عینِ اعضاء بن جائے جبکہ قربِ فرائض موجب ہے کہ حق عین اس کا کل وجود بن جائے (یعنی حدیث میں مذکور تمثیل کو وہ حقیقی معنی پر محمود کرتے ہیں، بالفعل اللہ اس کا ہاتھ...... بن جاتا ہے) اور یہ کئی وجوہ سے فاسد بلکہ صریح کفر ہے جیسا کہ ایک جگہ اس کا مفصل بیان کیا تو اگر خاتم الاولیاء دنیا میں آخری متقی مومن ہے تو پھر یہ افضل اور اکمل الاولیاء کیونکر ہوا؟ بلکہ افضل واکمل سابقین ہیں جو دیگر کی نسبت افضل الرسل کے ساتھ اخص ہیں تو ولی رسول کے ساتھ اختصاص اور رسول سے اخذ کی حیثیت اور ان کے لئے موافقت کے اعتبار سے جتنا اعظم ہوگا اتنا ہی وہ افضل ہوگا کیونکہ ولی تبھی ولی بنتا ہے جب وہ رسول کا متبع ہو، باطنی اور ظاہری کے لحاظ سے تو رسول کی اتباع کے بقدر ہی اللہ کے لئے اس کی ولایت ہوگی، اولیاء میں اگرچہ کئی محدَّث بھی ہوتے ہیں جیسا کہ صحیحین میں مروی ہے کہ نبی اکرم نے فرمایا سابقہ امتوں میں محدَث ہوا کرتے تھے اگر ایسا میری امت میں کوئی ہے تو وہ عمر ہے تو یہ حدیث دال ہے کہ اس امت کے اولین محدَّث حضرت عمر ہیں اور حضرت ابوبکر ان سے افضل تھے کیونکہ وہ مقامِ صدیقیت پر فائز ہیں تو محدَّث اگرچہ ملہَم ہے اور وہ اللہ کی جہت سے باتیں کرتا ہے تو لازم ہے کہ ان باتوں کو کتاب وسنت کی روشنی میں پرکھا جائے تاکہ پتہ چلے کہ وہ واقعۃً محدَث ہے؟ (کہیں ڈبا پیر تو نہیں؟) کیونکہ وہ معصوم نہیں جیسا کہ ابوالحسن شاذلی نے کہا: ہمارے لئے اس چیز میں عصمت کی ضمانت ہے جو کتاب وسنت میں وارد ہے لیکن کشف والہام میں نہیں اسی لئے حضرت عمر کتاب اللہ کے پاس وقاف تھے (یعنی قرآن کے مقابلہ میں اپنی مرضی نہ چلاتے تھے) اور ابوبکر ان کے لئے کچھ ان اشیاء کی تبیین کیا کرتے تھے جو ان کی رائے اور خیال کے بر خلاف ہوتی تھیں جیسے حدیبیہ کے موقع پر انہیں وضاحت کی اور نبی اکرم کی وفات کے روز اور مانعینِ زکاۃ سے قتال کے معاملہ میں، اپنے دور میں حضرت عمر بکثرت صحابہ سے مشورے کرتے تھے، کبھی وہ اپنی رائے چھوڑ کر ان کے موقف کی طرف رجوع کر لیتے اور کبھی صحابہ کرام! ایسا بھی ہوا کہ ایک بات کہی تو ایک عورت کی مراجعت پر حق ان کے لئے متبین ہو جاتا تو اس کی بات قبول کر لی اور اپنا قول چھوڑ دیا جیسے مہر کی مقدار مقرر کرنے کے ضمن میں ہوا اور بسا اوقات کوئی رائے قائم کرتے تو ان سے نبی اکرم کی حدیث ذکر کی جاتی تو رائے چھوڑ کر اس کے عامل بن جاتے، متعدد فیصلے اپنے سے کمتر صحابہ سے سنت کا اخذ کر کے کئے، اکثر کہتے: عمر ایک بات کہتا ہے مگر نہیں جانتا کہ وہ درست ہے یا نہیں؟

تو جب امام المحدَّثین کی یہ حالت ہے تو جو محدَث رتبہ میں ان سے کم ہیں ان کی ہر بات کیونکہ غلطی سے مبرا ہو سکتی ہے؟ کہ ان میں سے کوئی بھی معصوم نہیں بلکہ ان سب سے غلطی کے صدور کا جواز ہے، اگرچہ ایک گروہ کا دعوی ہے کہ ولی محفوظ ہوتا ہے اور انبیاء کی مانند ان کے لئے بھی عصمت ہے جیسا کہ حکیم ترمذی نے اس کی طرف اشارہ دیا مگر یہ باطل اور سنت واجماع کے

مخالف ہے لہذا اہلِ اسلام متفق ہیں کہ ماسوائے رسول اکرم کے ہر شخص کی بات قبول بھی کی جائے گی اور رد بھی ! ہدایت، نور اور درستگی رائے میں سب باہم متفاوت ہیں لہذا صدیق محدَث سے افضل ہے کیونکہ صدیق مشکاۃِ نبوت سے اخذ کرتا ہے تو وہ ہمیشہ محفوظ اور غلطی سے مبرا شیٔ کا ہی اخذ کرے گا، جہاں تک محدث تو اس سے صواب وخطا دونوں کا امکان ہے اور اس کی پرکھ کتاب و سنت کی روشنی میں ہوگی اسی لئے تمام اولیاء کتاب وسنت کے محتاج ہیں، لازم ہے کہ وہ اپنے تمام امور آثارِ رسول کے ترازو میں تولیں تو جو ان کے موافق ہو وہ برحق اور جو مخالف ہو وہ باطل ہے اگرچہ وہ مجتہد ہی ہوں تو اللہ تعالیٰ ان کے اجتہاد (چاہے وہ درست نہ بھی ہو) پرانہیں ثواب دے گا اور غلطی سے درگزر فرمائے گا، سب کو معلوم ہے کہ سابقین اولین آثارِ نبوی کی اتباع اور ہدایت یافتہ ہونے کے ضمن میں سب سے افضل تھے، ان کا ایمان وتقوی سب سے اعلیٰ و برتر تھا، بعد والے اولیاء کسی صورت ان کا مقام ومرتبہ نہیں پاسکتے اور یہ جو حدیث بیان کی جاتی ہے کہ میری امت کی مثال بارش کی سی ہے، نہیں علم کہ اس کا اول بہترین ہو یا آخر! تو اس کی سند میں کلام ہے بفرضِ صحت اس کا مفہوم یہ ہے کہ آخرِ امت میں بھی ایسے افراد ہوں گے جو اولِ امت کے افراد سے مقارب ہوں گے حتی کہ بعض لوگوں پر معاملہ مشتبہ ہو جائے گا کہ ان میں سے بہتر تر کون سے ہیں؟ جیسے بعض لوگوں پر کپڑے کے دو کنارے مشتبہ ہو جائیں، اس قطعیت کے ساتھ کہ اولین آخرین سے افضل میں اسی لئے حدیث میں (لَا یُــــدْرِیٰ) کا لفظ مذکور ہوا اور معلوم امر ہے کہ اس سلب کے لئے عموم نہیں تو لازم ہے کہ معلوم ہو کہ افضل کون ہیں؟

پھر خاتم الاولیاء کا یہ مزعومہ مرتبہ موہوم چیز ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں (نہ کتاب وسنت میں اس کا ذکر ہے) ہر آدمی اٹھ کر اس کا مدعی ہوسکتا ہے یا اس کے مرید یہ ادعاء کر سکتے ہیں اور متعدد نے یہ دعوی کیا بھی ہے اور یہ سب وہ ہیں جن کی کلام میں ایسی باطل اشیاء ہیں جنہیں یہود ونصاریٰ نے بھی نہیں کہا جیسا کہ مصنف فصوص کا ادعاء! مصنف (الکلام فی الحروف) نے اس کی متابعت کی اور ان کے اتباع میں سے ایک شیخ نے بھی جو دمشق میں تھا اور ایک اور نے کہا یہ حضرت مہدی ہوں گے جو اپنی بیٹی کا بیاہ حضرت عیسی سے کریں گے اور یہ کہ وہی خاتم الاولیاء ہیں، یہ حضرات کئی اس قسم کے (غیبی) امور کی بابت بتلاتے ہیں جو صرف اللہ وحدہ کے لئے ہی لائق ہیں، یہ ایسے ہی دعاوی ہیں جو نصاری نے حضرت مسیح بارے کئے تھے پھر مصنف فصوص اور اس جیسوں نے اس امر کی بنا اس بات پر کی ہے کہ ولی اللہ سے بلا واسطہ اخذ کرتا ہے جبکہ نبی کا اخذ بالواسطہ ہوتا تھا لہذا خاتم الاولیاء ان کے نزدیک اس جہت سے نبی سے افضل ہے، یہ باطل وکذب ہے، ولی اللہ تعالی سے بلا واسطہ اخذ نہیں کرتا بلکہ پیامبر کے ذریعہ، اگر وہ محدَث ہے تو اس کی طرف القاء ہوتا ہے اور ضروری ہے کہ کتاب وسنت کے رازو میں اسے تولا جائے

اللہ تعالی کی اپنے بندوں سے تکلیم تین اوجہ پر ہوتی ہے:

(ا) ماروائے حجاب، جیسے حضرت موسی سے ہمکلام ہوا

(۲) پیامبر بھیج کر، جیسے رسل کی طرف ملائکہ آتے رہے

(۳) بذریعہِ ایحاء (یعنی الہام اور القاء)

اس آخری میں اولیاء کا حصہ ہوتا ہے لیکن اول دونوں مرتبے (اور حالتیں) انبیاء کے ساتھ خاص ہیں تو اولیاء جن پر رسل کے ساتھ حجت قائم ہوئی علم دین کا اخذ نہیں کرتے مگر اللہ کی طرف سے اپنی طرف بھیجے گئے رسل کے ذریعہ، وہ اللہ سے اخذ کے معاملہ میں کبھی بھی نبی یا رسول کے مرتبہ تک نہیں پہنچ سکتے، وہ براہِ راست اللہ سے کیونکر اخذ کر سکتے ہیں پھر تو یہ اخذ سب سے اعلیٰ ہوا، وہ تو تکلیمِ موسی کے مقام تک بھی نہیں پہنچ سکتے اور نہ اس رتبہ تک کہ فرشتے وحی لے کر ان پر نازل ہوں جیسے وہ رسل وانبیاء پر نازل ہوتے تھے، یہی مسلمانوں، یہودیوں اور عیسائیوں کا عقیدہ ہے

لیکن یہ جہمیہ اتحادیہ تو انہوں نے اپنی اس اصلِ فاسد پر بناء کی کہ اللہ وہ وجودِ مطلق ہے جو ہر موجود کے لئے ثابت ہے اور ان کے دلوں میں جو بھی خیالات وخواطر در آتے ہیں اگرچہ وہ شیطان کے وساوس ہوں ان کی بابت ان کا زعم ہے کہ یہ ان کا بالواسطہ اللہ سے اخذ ہے اور حضرت موسی کی طرح ان سے بھی ہمکلامی کی جاتی ہے، ان کے بعض تو دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کا حال حضرت موسی کے حال سے بھی افضل ہے کیونکہ حضرت موسی نے درخت سے سماعِ خطاب کیا تھا جبکہ وہ اپنے حسبِ زعم ایک زندہ ناطق سے سماعِ خطاب کرتے ہیں جیسے مصنف فصوص سے یہ شعر نقل کیا جاتا ہے:

وَ كُلُّ كَلَامٍ فِي الْوُجُوْدِ كَلَامُهٗ سَوَاءٌ عَلَيْنَا نَثْرُهٗ وَ نِظَامُهٗ

(کائنات میں ہر کلام اسی کی کلام ہے، ہمارے لئے کیا نثر کیا شعر، سب ایک برابر ہے)

اس پر ان کی مدد کی ہے جو ان کا جہیمہ اور ان کے اتباع کے مذاہب سے اعتقاد ہوا جو مدعی ہیں کہ اللہ کی حضرت موسی سے تکلیم دراصل الہام کی جنس سے تھی اور بندہ اس دنیا میں کبھی اللہ کو دیکھ سکتا ہے اگر اس کی آنکھ سے مانع زائل ہو جائے! کیونکہ ان کے نزدیک رؤیت کے لئے بندے سے منفصل کوئی حجاب نہیں اور حجاب دراصل اس سے متصل ہے تو جب وہ مرتفع ہو جائے تو وہ مشاہدۂ حق کر لے گا اور وہ نہیں مشاہدہ کرتے مگر اس کا جسے وہ وجودِ حق سمجھ کر متمثل کرتے ہیں، جس کی کوئی حقیقت نہیں مگر ان کے اذہان میں یا پھر کسی مخلوق کے وجود میں تو رب ان کے ہاں مشہود ہے جو ان کے حسبِ زعم ان سے مخاطب ہوتا ہے، سوائے ان کے ذہنوں کے اس کا کوئی وجود نہیں یا سوائے وجودِ مخلوقات کے اور یہ رب تعالیٰ کے لئے تعطیل ہے، اسی طرح اس کی کتب اور رسل کی بھی! بدعات کفر اور نفاق کی دہلیز ہیں جیسے تشیع رفض کی اور رفض قرمطہ اور تعطیل کی دہلیز ہے اور جس کلام میں تــجـھُّــم ہو (یعنی جہمیہ جیسے نظریات) وہ زندیقیت اور تعطیل کی دہلیز ہے، مسلم میں ہے کہ نبی اکرم نے فرمایا جان لو تم میں سے کوئی اپنے رب کو نہیں دیکھ سکتا حتی کہ وہ مرے، اسی لئے امت کے سلف اور ائمہ متفق ہیں کہ اللہ کا دیدار آخرت ہی میں ہوگا اور اس دنیا میں ان آنکھوں کے ساتھ کوئی اللہ کو دیکھ نہیں سکتا، نبی

کریم کی اللہ تعالیٰ کی رؤیت کا انکار کیا تھا جب کہ مسلم میں ابن عباس سے ان کا یہ قول منقول ہے کہ حضرت محمد نے اپنے دل کے ساتھ دو مرتبہ اللہ تعالیٰ کا دیدار کیا، یہی احمد نے ابو ذر وغیرہ سے نقل کیا ہے احمد اور کئی دیگر ائمہِ سنت بھی یہی موقف رکھتے ہیں مگر کسی ایک سے بھی دنیا میں ہوتے ہوئے اس ظاہری آنکھ کے ساتھ رؤیت کا اثبات منقول نہیں جیسا کہ کسی سے آخرت میں بھی انکارِ رؤیت کا قول ثابت نہیں لیکن ان دونوں باتوں کے جہمیہ کے کئی گروہ قائل ہیں تو ان کے متکلمین نفیِ رؤیت اور ان کے متصوفہ اثباتِ رؤیت کے قائل ہیں مثلاً اتحادیہ اور ان کے غیر سے ایک گروہ اور یہ اتحادیہ نفی اور اثبات کے مابین جمع کرتے ہیں جیسے ابن سبعین نے کہا:

عَیْنُ مَا تَریٰ ذَاتُ لَا تَریٰ وَ ذَاتُ لَا تَریٰ عَیْنُ مَا تَریٰ

(یعنی جو کچھ تو دیکھ رہا ہے وہ عین وہ ذات ہے جو تجھے دکھائی نہیں دے رہی اور جو ذات تجھے نظر نہیں آ رہی وہ عین وہ ہے جو کچھ تجھے نظر آ رہا ہے) اور اس کا نحو، اس لئے ان کا مذہب جمع بین ضدین کو مستلزم ہے تو یہ عمومِ کائنات بارے وہ کچھ کہتے ہیں جو نصاریٰ نے حضرت مسیح بارے کہا اسی لئے وہ اس ضمن میں نصاریٰ کے حضرت مسیح کی نسبت تنوع کی مثل تنوع کا شکار ہوئے ہیں، حکیم ترمذی نے قطعاً نہیں کہا کہ خاتم الاولیاء خاتم الانبیاء سے افضل ہے اور نہ مشائخ میں سے کسی معروف شیخ نے یہ کہا، بلکہ ترمذی مذکور قدر و ایمان کے لحاظ سے رفیع المرتبت اور اس امر سے اجل ہیں کہ اس صریح کفر کا افتراء کریں لیکن ایک معمولی خطا کے وہ مرتکب ہوئے اور یار لوگوں نے ان کی خطا پر ایسی باتیں مفرع کر لیں جو کفر بنیں، اس سے بھی بڑی بات ان کا یہ زعم کہ اولیاء اور انبیاء اپنی ولایت کی حیثیت سے خاتم الاولیاء کے تابع اور ان کے روزن سے آخذ ہیں تو یہ نظریہ عقلی اور دینی لحاظ سے باطل اور بے بنیاد ہے، متقدم متاخر سے کیسے اخذ کر سکتا ہے؟ اور انبیاء اپنے غیر سے اخذ نہیں کرتے پھر ان لوگوں نے اس سے بھی بڑی بات کہ ان لوگوں نے انہیں علم باللہ میں خاتم الاولیاء کا تابع بنا دیا جو ان کا اشرف العلوم ہے اور اس سے بھی اظہر کہ اس نے علم باللہ کو اہلِ وحدت الوجود کا مذہب قرار دیا جو قائلین ہیں کہ وجودِ مخلوق ہی عین وجودِ خالق ہے تو اہلِ ایمان کو چاہئے کہ وہ درجہ بدرجہ اس قبیح کفر میں اور اس دریدہ دہن کے غیرِ نبی کے نبی سے افضل ہونے کا امکان ظاہر کرنے پر تامل کریں اور اس کے حق میں حضرت عمر کے قصہ (یعنی بدر کے قیدیوں بارے ان کی رائے جس کی اللہ نے تائید نازل کی تھی) اور تابیرِ نخل (یعنی کھجور کے درختوں کی پیوند کاری جس کی بابت نبی پاک نے اپنی ذاتی رائے ظاہر کی تھی کہ اگر یہ ایسا نہ بھی کریں تو فرق نہ پڑے مگر اس سال کی پیداوار میں فرق پڑا، آپ کو بتلایا گیا تو فرمایا تم اپنے دنیوی امور کو مجھ سے زیادہ جانتے ہو، ہاں جب اللہ سے کسی امر کا میں بیان کروں تو اس میں شک نہیں ہونا چاہئے) سے استشہاد کرنے میں! کیا کوئی مسلمان کہہ سکتا ہے کہ حضرت عمر نبی اکرم سے افضل ہیں؟ یا وہ کاشتکار جو درختوں کی پیوند کاری کرتے تھے وہ نبی سے افضل تھے؟ پھر اسی پر بس نہ کی حتیٰ کہ کہا: کامل کی نسبت لازم نہیں کہ وہ ہر علم و مرتبہ میں سب سے آگے ہو، دراصل افراد کا اللہ بارے علم کے مرتبہ میں تقدُّم ملحوظ ہوتا ہے، اس پر اس نے زعم کیا کہ وہ خاتم الانبیاء سے بڑھ کر اللہ

بارے عالم ہے اوراس جہت سے وہ خاتم الانبیاء سے آگے ہے (اس کفر سے نعوذ باللہ) جبکہ خاتم الانبیاء فقط تشریع کی جہت سے ان سے آگے ہیں، یہ اس اعظم کفر کی ایک مثال ہے جس میں غالی فلسفی، صوفی اور متکلم واقع ہوئے جن کا زعم ہے کہ وہ علمی امور میں رسل سے افضل ہیں مثلاً علم باللہ اوراس کا نحواور رسل کا ان سے تقدم وافضلیت صرف تشریعِ عام کی جہت سے ہے جواس دنیا میں لوگوں کی اصلاح کا کام دیتی ہے! کبھی یہ کہتے ہیں کہ شرائع عدلی قوانین ہیں جو دنیوی مصلحت کے لئے وضع کئے گئے، جہاں تک معارف، حقائق اور دنیا وآخرت میں بلند درجات تو ان امور میں وہ اپنے آپ کو افضل باور کرتے ہیں اور یہ کہ ان کے طرق انبیاء اوران کے طرق سے فائق ہیں

حالانکہ دینِ اسلام سے معلوم بالاضطرار ہے کہ اس طرح کا اعتقاد ونظریہ اعظم کفر وضلال سے ہے اوراس کا سبب ان حقائق کا انکار ہے جن کی رسولوں نے خبر دی اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان کے امر سے اوران کا زعم کہ اس باب میں جو یہ کہتے ہیں وہی حق ہے، رسل کی اخبار بابت ان کی روش یہ ہے کہ کبھی وہ ان کی تکذیب کرتے اور کبھی تحریف اور کبھی تفویض (یعنی ان کے مفاہیم اللہ کے سپرد) کرتے ہیں اور کبھی خیال کرتے ہیں کہ رسل کبھی عمومی مصلحت کے مدِ نظر جھوٹ بھی بول لیتے تھے، ان آراء کے حاملین کے عامۃ الناس انبیاء ورسل کو اپنے سے افضل گردانتے ہیں البتہ ان کے غالی اس کے برعکس رائے رکھتے ہیں اور یہی قولاً اوراعتقاداً بدترین لوگوں میں سے ہیں! ہمارے ہاں (یعنی دمشق میں) ایک شیخ تھا جوتھا تو اجہل الناس میں سے مگر عجمیوں کے ایک گروہ نے اسے شیخ اور پیر کا رتبہ دے رکھا تھا اور اسے وہ خاتم الاولیاء پکارتے تھے، اس کا دعوی تھا کہ وہ علم کی دو وجھوں کے ساتھ تفسیر کرتا ہے جبکہ نبی کریم ایک وجہ کے ساتھ علم کی تفسیر وتشریح کیا کرتے تھے اور وہ آنجناب سے اکمل ہے، اسے اس نے مصنفِ فصوص سے اخذ کیا ہے! ہمارے دور میں (اور ہمارے دور میں بھی) اس طرح کے کثیر لوگ (فراڈیے) موجود ہیں اور یہی فلاسفہ اور اہلِ تصوف وکلام کی گمراہی کا سبب ہیں جن کی گمراہی انہی جیسی ہے، بہرحال یہ اس کی تفصیل بیان کرنے کا مقام نہیں! غرض یہ اشارہ دینا ہے کہ مصنفِ فصوص اوراس قماش کے آدمی انہی جیسی ہفوات اور خرافات کے قائل ہیں، جہاں تک اس شخص کا کفر جو اپنے آپ کو حضرت محمد ﷺ سے افضل کہتا ہے جیسے مصنف فصوص نے ذکر کیا تو یہ ظاہر ہے لیکن ان میں سے بعض ایسا نہیں سمجھتے البتہ خیال کرتے ہیں کہ اس کے پاس اللہ تک پہنچنے کا اتباعِ نبوی کے سوا بھی طریق ہے اور وہ خود کو اس طریق کا سالک باور کرتا ہے اگرچہ یہ شرعِ رسول کے مخالف ہو، وہ اس پر **حضرات موسیٰ وخضر کے قصہ سے حجت پکڑتے ہیں** جبکہ دو وجہ سے اس میں حجت نہیں

اول: کہ حضرت موسیٰ حضرت خضر کی طرف مبعوث نہ تھے اور نہ ان پر ان کی اتباع واجب تھی، وہ تو صرف بنی اسرائیل کی طرف مبعوث تھے اسی لئے صحیح حدیث میں ہے کہ حضرت موسیٰ نے جب حضرت خضر کو السلام علیکم کہا تو وہ بولے اس علاقہ میں یہ سلام کہاں؟ کہا میں موسیٰ ہوں، کہا بنی اسرائیل والے موسیٰ؟ کہا ہاں، کہا آپ کے پاس اللہ کی طرف سے ایسا علم ہے جو میرے پاس نہیں اور میرے پاس بھی اس کی طرف سے وہ علم ہے جو آپ کے پاس نہیں، اسی لئے ہمارے نبی اکرم نے فرمایا ہمیں دیگر امم پر

پانچ چیزوں کے ساتھ فضیلت دی گئی ہے:

(۱) ہماری صفیں فرشتوں کی صفوں کی مانند کی گئیں

(۲) تمام زمین ہمارے لئے مسجد وطہور بنادی گئی ہے تو جہاں کہیں نماز کا وقت آن لے وہیں ادا کی جاسکتی ہے اور مٹی سے طہارت حاصل کی جاسکتی ہے

(۳) غنائم میرے (اور میری امت) کے لئے حلال کی گئیں اور یہ کسی سابقہ امت کے لئے حلال نہیں تھیں

(۴) مجھے شفاعت عطا کی گئی ہے

(۵) سابقہ ہر نبی صرف اپنی قوم کی طرف مبعوث کیا جاتا تھا جب کہ میری بعثت تمام عالمِ انسانیت کے لئے عام ہے اور فرمایا مجھے پانچ ایسی چیزیں عطا کی گئیں جو مجھ سے قبل کسی کو نہ دی گئیں: ایک ماہ کی مسافت تک دشمنوں پر میری ہیبت طاری ہے، باقی چار وہی جن کا پہلے ذکر ہوا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا﴾ [سبأ: **۲۸**] (اورہم نے تم کوتمام لوگوں کے لئے خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے) اور:

﴿قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا﴾ [الأعراف :۱۵۸] (کہہ دو کہ لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں) تو آنجناب کل ثقلین ۔انسان اور جن ۔عرب وعجم، ملوک وزہاد، اولیاء وغیرِ اولیاء۔کی طرف مبعوث ہیں تو کسی ایک کو بھی آپ کی اتباع سے خروج کا حق نہیں، ظاہراً بھی اور باطناً بھی اور نہ اس سے جو کچھ کتاب وسنت میں مذکور ہے، یہ چھوٹی بات ہو یا بڑی، نہ علوم میں اور نہ اعمال میں! کسی کو حق نہیں کہ وہ حضرت خضر جیسی بات کہے جو انہوں نے حضرت موسیٰ سے کہی کیونکہ حضرت موسیٰ ان کی طرف مبعوث نہ تھے

دوم: کہ قصہِ خضر میں کوئی مخالفِ شریعت بات نہیں بلکہ جو افعال وہ بجالئے وہ ان کی شریعت میں مباح تھے اگر بندہ ان کے اسباب سے واقف ہو جیسے حضرت خضر واقف تھے، اسی لئے ان اسباب کو بیان کیا تو انہوں نے اس پر ان کی موافقت کی، اگر وہ ان کی شریعت کے مخالف ہوتے تو وہ کبھی موافقت نہ کرتے، ہم نے ان کی تفصیل ایک جگہ ذکر کی ہے، کشتی میں سوراخ کرنے کا مضمون یہ ہے کہ انسان کے لئے جائز ہے کہ مالِ معصوم کی حفاظت کا بندوبست کرے اگرچہ یہ اس کے بعض حصہ کے اتلاف کی صورت کے ساتھ ہو، یہ بالکلیہ اس کے ضیاع سے بہتر ہے جیسے عہدِ نبوی میں چرواہے کو اجازت ملی کہ اگر ریوڑ میں سے کوئی بکری مر رہی ہو تو اسے ذبح کرلے (تاکہ حلال رہے اور مردار نہ بنے) لڑکے قتل کا مضمون یہ بنتا ہے کہ صائل (یعنی لوگوں کی جان ومال کے لئے خطرہ بنے) نابالغ کا قتل جائز ہے اسی لئے ابن عباس نے نجدہ (یہ خوارج کا امیر تھا اور اس نے ابن عباس کو ایک خط لکھا تھا جس میں چند سوالات کے

جواب چاہے) سے کہا تھا اگر لڑکوں کی بابت وہ کچھ علم ہو جائے جو حضرت خضر کو اس لڑکے کی بابت علم ہوا تھا تو انہیں قتل کرو، وگرنہ نہیں، جہاں تک دیوار کی مرمت تو یہ تو بھلائی کا فعل ہے جس پر اجرت بھی نہ لی حالانکہ ضرورت مند تھے جو نیک لوگوں کی خاطر کیا تھا

(۸) اس نے لکھا: جب نبی کریم نے ایک عمارت کے ساتھ نبوت کی تمثیل دی...... الخ یہ متضمن ہے کہ علم کی دو انواع ہیں: ایک علمِ شریعت، وہ اسے براہِ راست اللہ سے اخذ کرتا ہے جیسے نبی کرتے ہیں تو اس نے لکھا: اس کے وہاں دو اینٹیں دیکھنے کا موجب سبب یہ ہے کہ وہ فی الظاہر خاتم الرسل کی شریعت کا متبع ہے اور وہ چاندی کی اینٹ کی جگہ ہیں اور یہ اس کا ظاہر ہے اور جو اس ضمن کے احکام کی وہ اتباع کرتا ہے جیسا کہ وہ فی الباطن اللہ سے آخذ ہے، تو جو ظاہری صورت میں ہے اس میں وہ متبع ہے کیونکہ وہ امر کو اس کی حقیقت پر دیکھتا ہے تو لازم ہے کہ وہ یوں دیکھے

تو یہ جو اس نے دعوی کیا ہے کہ ولی بباطن اللہ سے (براہ راست) وہ احکامِ شریعت اخذ کرتا ہے جن میں وہ بظاہر رسول کا متبع ہے، تو اس کلام میں جو الحاد ہے وہ اللہ اور اس کے رسل پر ایمان والوں پر مخفی نہیں، یہ مدعی ہے کہ اسے بھی وہ کچھ منجانب اللہ دیا گیا ہے جو رسل کو دیا گیا اور کہتا ہے کہ اس کی طرف وحی کی گئی حالانکہ کچھ اس کی طرف وحی نہیں کیا گیا اور وہ رسل کو بمنزلہ طب، حساب اور نحو وغیرہ کے معلمین کے سمجھتا ہے، کبھی متعلم بھی وہ دلیل جان لیتا ہے جو اس کے معلم کو معلوم ہوتی ہے تو اس کے لئے اس کی موافقت چاہئے ہوتی ہے کیونکہ علم میں اس کے لئے اس کی مشارکت حاصل ہوئی نہ کہ اس وجہ سے کہ وہ اس کی طرف اللہ کی جانب سے امر و نہی کی تبلیغ میں رسول اور واسطہ ہے اور یہ کفر مسیلمہ کذاب اور اس جیسوں کے کفر سے مشابہ ہے جس نے دعوی کیا تھا کہ وہ رسالت میں آنجناب کا مشارک ہے اور اس کا موذن اذان میں یہ کلمات کہتا تھا: (اَشۡهَدُ اَنَّ مُحَمَّداً وَ مُسَيۡلِمَةَ رَسُوۡلاَ اللّٰهِ) (یعنی میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد اور [استغفر اللہ] مسیلمہ دونوں اللہ کے رسول ہیں)

دوم، علمِ حقیقت اور اس میں وہ اپنے آپ کو رسول سے فائق کہتا ہے جیسے لکھا کہ یہ فی الباطن سونے کی اینٹ کی جگہ ہے تو اس نے اس معدن سے اخذ کیا ہے جس سے فرشتۂ وحی نے اخذ کیا، یہ مدعی ہے کہ یہ علم سونے کی اینٹ کی جگہ ہے اور یہ باطن اور حقیقت کا علم ہے جس میں اسے رسول پر فوقیت حاصل ہے کیونکہ رسول فرشتہ سے جبکہ وہ فرشتہ کے ماخذ سے اخذ کرتا ہے، یہ دعوی تو مسیلمہ کذاب کے دعوی سے بھی بڑا ہے، اس نے تو رسول سے الٰہی علوم میں سے کسی علم میں اعلی ہونے کا دعوی نہ کیا تھا جبکہ یہ کہتا ہے کہ میں علم باللہ میں رسول سے فائق ہوں

پھر کہا: اگر تم میری بات سمجھ گئے ہو تو تمہیں علمِ نافع حاصل ہوا اور معلوم ہے کہ یہ کفر یہود و نصاری کے کفر سے بڑا کفر ہے کیونکہ وہ اس امر پر راضی نہیں کہ کسی مومن کو حضرت موسی اور حضرت عیسی سے فائق قرار دیں جبکہ یہ زعم کرتا ہے کہ وہ اور اس جیسے جن کی بابت وہ **خاتم الاولیاء ہونے کا مدعی** ہے، تمام رسل سے فائق ہیں اور سب سے بڑھ کر اعلم باللہ ہیں، عقلائے فلاسفہ بھی اس کلام پر راضی نہیں، یہ بات صرف ان کے غالی لوگ اور اہلِ حماقت کہتے ہیں جو عقل اور دین سے ابعد الناس ہیں

(۹) اس کا کہنا: کہ حضرت آدم سے لے کر ہر نبی ......الخ تو یہ کلام متضمن ہے کہ سب انبیاء و رسل اخذ نہیں کرتے مگر خاتم النبیین کے روزن سے، وہ یہ بات اس لئے کرتا ہے تا کہ اسے اپنے لئے اس ادعاء کی تمہید بنائے کہ سب انبیاء خاتم الاولیاء کے روزن سے اخذ کرتے ہیں، یہ دونوں باتیں ضلال ہیں، رسل میں سے کوئی ایک دوسرے سے اخذ نہیں کرتا ماسوائے ان کے جو سابقہ شریعت کی اتباع کے مامور تھے جیسے انبیائے بنی اسرائیل جنہیں تورات کی اتباع کا حکم تھا جیسا کہ ارشاد ہوا:

﴿ إِنَّا أَنْزَلْنَا التَّوْرَاةَ فِيهَا هُدًى وَنُورٌ ﴾ [المائدۃ:۴۴] (بے شک ہم نے ہی تورات نازل فرمائی جس میں ہدایت اور روشنی ہے) الآیۃ، جہاں تک حضرت ابراہیم تو وہ حضرات موسیٰ اور عیسیٰ سے آخذ نہ تھے اور حضرت نوح نے حضرت ابراہیم سے اخذ نہیں کیا اسی طرح ان سب نے حضرت محمد ﷺ سے اخذ نہیں کیا اگر چہ آپ کی آمد و بعثت کی بشارت دی اور ایمان لائے جیسے کہا:

﴿ وَ إِذْ أَخَذَ اللّٰهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَا آتَيْتُكُمْ مِنْ كِتَابٍ وَحِكْمَةٍ ﴾ [آل عمران : ۸۱] (اور جب اللہ نے پیغمبروں سے عہد لیا کہ جب میں تم کو کتاب اور دانائی عطا کروں الخ) الآیۃ، بقول ابن عباس اللہ نے کوئی نبی نہیں بھیجا مگر اس سے حضرت محمد کے امر بارے عہد لیا کہ اگر ان کی حیات میں آپ کی بعثت ہو جائے تو وہ اپنی قوم سمیت آپ پر ایمان لائیں گے اور آپ کی مدد کریں گے

(۱۰) اس کا کہنا: کہ آپ اپنی حقیقت کے ساتھ موجود تھے اور یہ آپ کا فرمان: (كُنْتُ نَبِيّاً وَ آدَمُ بَيْنَ الْمَاءِ وَالطِّيْنِ) بخلاف دیگر انبیاء کے، اسی طرح خاتم الاولیاء ولی تھے جبکہ آدم ابھی پانی اور مٹی کے درمیان تھے تو یہ واضح کذب اور ائمہ دین کے اجماع کے مخالف ہے اگر چہ اہل ضلال والحاد کا ایک گروہ اس کا قائل ہے تو اللہ تعالیٰ اشیاء کا عالم تھا اور ان کی تکوین سے پہلے ان کی تقدیر لکھی مگر یہ اپنے حقائق کے ساتھ اپنے معرضِ وجود میں آنے کے وقت ہی موجود ہوتی ہیں لہذا ہمارے نبی کی حقیقت بھی آپ کے عالم وجود میں آنے سے قبل موجود نہ تھی مگر اسی طرح جیسے آپ کے غیر کی حقیقت تھی، اس معنی میں کہ اللہ کو علم تھا اور یہ مقدر امر تھا لیکن آپ کی خبر و اسم کا ظہور آپ کے غیر سے اعظم اور اشہر تھا کہ یہ تورات و انجیل اور ان سے قبل بھی مکتوب تھا (بلکہ عرش کے پائے پر بھی) جیسا کہ احمد نے مسند میں حضرت عرباض بن ساریہ سے نقل کیا کہ نبی کریم نے فرمایا میں عند اللہ خاتم النبین کی حیثیت سے مکتوب تھا جب کہ آدم ابھی اپنی طینت میں منجدل تھے اور میں اس کے آغاز بارے تمہیں بتلاتا ہوں، یہ میرے جدِ امجد ابراہیم کی دعا اور بشارتِ عیسیٰ اور میری والدہ کا خواب، جب مجھے جنم دیا تو دیکھا کہ ان سے ایک نور نکلا ہے جس سے شام کے محلات روشن ہو گئے ہیں اسی طرح حضرت میسرہ الفجر کی روایت، کہتے ہیں میں نے عرض کی یا رسول اللہ آپ کب نبی تھے؟ ایک روایت میں ہے: آپ نبی کی حیثیت سے کب مکتوب ہوئے؟ فرمایا جب آدم ابھی روح و جسد کے درمیان تھے تو روایات میں یہی مذکورہ الفاظ وارد ہوئے ہیں! جہاں تک یہ الفاظ:: (كُنْتُ نَبِيّاً وَ آدَمُ بَيْنَ الْمَاءِ وَالطِّيْنِ) تو اس کی کوئی اصل نہیں، اس لفظ کے ساتھ کسی محدث نے نقل نہیں کیا اور یہ باطل ہے، حضرت آدم کبھی پانی اور مٹی کے درمیان نہ تھے کہ طین پانی اور مٹی ہوتی ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ جب اللہ

نے حضرت آدم کے جسد (یعنی ڈھانچہ) کو تخلیق کیا اس میں روح پھونکی جانے سے قبل تو تب نبی اکرم کی نبوت لکھی اور مقدر کی جیسا کہ صحیحین میں ابن مسعود سے روایت میں ہے کہ نبی کریم نے ہمیں بیان کیا اور آپ صادق و مصدوق ہیں کہ ہر انسان اپنی ماں کے بطن میں چالیس روز نطفہ کی شکل میں رہتا ہے پھر اس کی مثل علقہ ہو جاتا ہے پھر اسی کی مثل مضغہ بنتا ہے پھر چار باتوں کا حکم دے کر فرشتہ کو بھیجا جاتا ہے کہ اس کا رزق، عمل، اجل لکھ دو اور یہ کہ شقی ہوگا یا نیک پھر اس میں روح پھونکی جاتی ہے اور مروی ہے کہ ہمارے نبی پاک کا نام عرش کے پائے پر لکھ دیا گیا تھا اسی طرح جنت کی دہلیز پر تو یہ سب، کتابت اور تقدیر ہے، حقیقتِ وجود کا اس سے کیا تعلق؟ اس باب میں جو روایات بیان کی جاتی ہیں وہ سب اسی جنس سے ہیں مثلاً یہ کہ آپ عرش کے گرد تسبیح کرتے ہوئے نور یا ستارہ کی شکل میں آسمان میں طالع تھے ونحو ذلک! جیسا کہ اسے ابن عربی کے شاگرد ابن حمویہ نے ذکر کیا اور اس کا بعض ملاعمر نے وسیلۃ المتعبدین میں اور ابن سبعین اور اس جیسوں نے جو باتفاق اہل الحدیث موضوع اور جھوٹی روایات ذکر کرنے کے خوگر ہیں تو اس معنی میں جتنی روایات ذکر کی جاتی ہیں وہ سب جھوٹی ہیں، کثیر برس قبل ابن حمویہ کے اصحاب میں سے ایک محترم شیخ کی مجھ سے ملاقات ہوئی جنہیں ان کے شاگرد سلطان الاقطاب کا خطاب دیتے تھے ہم نے فصوص کی بابت مناظرہ کیا وہ اسے اور اس کے مصنف کو از حد قابلِ تعظیم قرار دیتے تھے، میں نے جب اس کے عیوب واضح کئے تو وہ حیران رہ گئے اور ان پر یہ بہت گراں گزرا اور اس قسم کی احادیث ذکر کرنے لگے تو میں نے ان پر واضح کیا کہ یہ سب جھوٹ ہیں

(۱۱) اس کا کہنا: کہ **خاتم الاولیاء** ولی تھے جب آدم بھی ......الخ آگے لکھا: تو خاتم الرسل کی اپنی ولایت کے لحاظ سے ختمِ ولایت کے ساتھ نسبت ایسے ہے جیسے اولیاء اور رسل کی آپ کے ساتھ نسبت......آخرِ کلام تک! تو اس میں دعوی کیا کہ تمام رسل علم باللہ کے معاملہ میں اس کے روزن سے آخذ ہیں جو اعلی العلوم ہے اور یہ وحدت الوجود کا علم، تو اس میں وہ سب پر مقدم ہے اور نبی اکرم فقط شفاعت کے بابت میں سیدِ اولادِ آدم ہیں اور آپ خاص اسی مقامِ خاص میں سیادت پر فائز ہیں تو یہ ایک بڑا دعوی ہے اور نبی اکرم پر کذب ہے کہ آپ صرف مقامِ شفاعت میں اولادِ بنی آدم کے سردار ہیں نہ کہ بقیہ مراتب میں، یہ تو الحاد اور افتراء ہے، میں تو کہا کرتا تھا اگر کوئی حضرت ابراہیم یا موسی یا عیسی کو ہمارے نبی رحمت سے افضل کہے تو یہ ایک عظیم مصیبت ہے چہ جائے کہ امتِ محمدیہ کا کوئی عامی شخص اپنے آپ کو حضرت محمد سے افضل قرار دے؟ اور تمام رسل سے افضل العلوم میں اور دعوی کرے کہ یہ سب اس کے روزن سے آخذ ہیں تو اس سے بڑھ کر الحاد اور زندیقت کیا ہوگی؟ یہ تو بنی آدم کے گمراہ ترین اور صراطِ مستقیم سے بعید ترین لوگوں میں سے ہے اگر چہ کئی کتابوں کا مصنف اور کثیر اشیاء کی اسے معرفت حاصل ہے اور فلاسفہ، متصوفہ، متکلمین اور متفقہہ (یعنی اپنے حسبِ زعم فقہاء) اور عوام الناس کے کئی گروہوں کے دلوں پر اس کی گرفت ہے لیکن اس طرح کی کلام اہلِ علم وایمان کے نزدیک اعظم گمراہی والی کلام میں سے ہے واللہ اعلم۔

واضح ہوا کہ یہ کلام کفر، رسل کی گستاخی اور توہین اور ان کی تنقیصِ شان بلکہ ان کا اور ان کی تعلیمات انکار ہے، مومنین پر

یہ امر مخفی نہیں، مجھے بعض فضلاء نے بیان کیا کہ اس نے شیخ ابراہیم جعبدی رحمہ اللہ سے سنا کہتے تھے میں نے ابن عربی کو دیکھا ہے، وہ ایک نجس بوڑھا تھا جو ہر اللہ کی نازل کردہ کتاب کی تکذیب کرتا اور ہر نبی جسے اللہ نے مبعوث کیا، کا انکار کرتا تھا ان کی بات سچ ہے یہ تو ابھی اس کے کفر کی بعض مثالیں ذکر کی ہیں اسی طرح ابومحمد بن عبدالسلام کا اس کی بابت تبصرہ گزرا ہے، ابھی تو اس کی کل تحریرات کی تحقیق نہیں ہوئی! حقیقت یہ ہے کہ اس کے نزدیک نہ رب ہے اور نہ عالم، جیسے الٰہی فلاسفہ کہتے ہیں جو واجب الوجود اور عالمِ ممکن کے قائل ہیں بلکہ اس کے نزدیک عالم کا وجود ہی اللہ کا وجود ہے اور یہ نیچری دہریوں کے قول کے موافق ہے جو مطلقاً ہی وجودِ صانع کے منکر ہیں اور وہ سوائے عالم کے کسی اور وجودِ واجب کے مقر نہیں جیسا کہ اللہ نے فرعون اور اس کے اتباع کے بارہ میں ذکر کیا، اس کا قول بھی قولِ فرعون کے مطابق ہے البتہ فرق یہ ہے کہ فرعون اللہ کا مقر نہ تھا جبکہ کم از کم یہ اللہ کے مقر تو ہیں البتہ اسے وجود کے ساتھ مفسر کرتے ہیں جس کا اقرار فرعون نے بھی کیا، تو یہ تو فرعون سے بھی اجہل اور اضل ہیں جبکہ فرعون ان سے اکفر تھا کیونکہ اس کے کفر میں عناد اور استکبار ہے جو ان کے کفر میں نہیں، جیسے قرآن نے کہا:

﴿وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا أَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا﴾ [النمل : **۱۴**] (اور بے انصافی اور غرور سے ان کا انکار کیا) اور حضرت موسیٰ نے اس سے کہا تھا:

﴿لَقَدْ عَلِمْتَ مَآ أَنْزَلَ هٰٓؤُلَآءِ إِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ بَصَآئِرَ﴾ [الإسراء: **۱۰۲**] (تم جانتے ہو کہ آسمانوں اور زمین کے رب کے سوا ان کو کسی نے نازل نہیں کیا سمجھانے کو) مصنف فصوص اور اس کے اتباع کا جماعِ امر (یعنی ہدف) ایمان کے تینوں اصول کا ہدم ہے یعنی: اللہ، اس کے رسل اور یومِ آخرت پر ایمان، جہاں تک ایمان باللہ تو ان کا زعم ہے کہ اللہ کا وجود وجودِ عالم ہے، اس کائنات کا صانع بجز عالم کے کوئی نہیں، جہاں تک رسول تو ان کا زعم ہے کہ وہ ان سے بڑھ کر اللہ بارے عالم ہیں اور کل رسل سے اور ان میں سے بعض اس علم باللہ کو جو کہ تعطیل اور وحدت الوجود ہے، اس کے روزن سے اخذ کرتے ہیں اور اللہ سے شریعت کے علم کے اخذ میں اس کے مساوی ہیں! جہاں تک یومِ آخرت پر ایمان تو اس نے کہا:

فَلَمْ يَبْقَ إِلَّا صَادِقَ الْوَعْدِ وَحْدَهٗ　　وَبِالْوَعِيْدِ الْحَقِّ عَيْنٌ تُعَايِنُ
وَ إِنْ دَخَلُوْا دَارَ الشَّقَاءِ فَإِنَّهُمْ　　عَلٰى لَذَّةٍ فِيْهَا نَعِيْمٌ يُبَايِنُ

(تو نہ باقی رہا مگر اکیلا سچے وعدے کرنے والا اور آنکھ وعیدِ حق کا معاینہ کرتی ہے اور اگر وہ دارِ شقاء (یعنی دوزخ) میں داخل ہوئے تو وہاں ایک نوع کی لذت سے ہمکنار ہوں گے) کسی پیش رو اہلِ ضلال کا قول نقل کیا کہ جہنم کی آگ اہلِ جہنم کے لئے ناری طبیعت بن جائے گی اور (بجائے متعذب ہونے کے) وہ اس کے ساتھ محظوظ ہوں گے، تب نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ کوئی اندیشہ اور نہ عذاب کیونکہ اب تو یہ مستعذَب (یعنی لذت آمیز) امر ہوگا، پھر امر و نہی کے ضمن میں اس کے نزدیک آمر، ناہی اور مامور و منہی

سب ایک ہیں (یعنی وحدت الوجود) اسی لئے اپنی سب سے بڑی اور مشہور کتاب فتوحاتِ مکیہ کے شروع میں یہ اشعار درج کئے:

اَلرَّبُّ حَقٌّ وَ الْعَبْدُ حَقٌّ   یَا لَیْتَ شِعْرِیْ مَنِ الْمُکَلَّفُ

اِنْ قُلْتَ عَبْدٌ فَذَاکَ رَبٌّ   اَوْ قُلْتَ رَبٌّ فَاَنّٰی یُکَلَّفُ

(گزرے ہیں) میں نے ایک جگہ اس کے قلم سے: (فَذَاکَ مَیِّتٌ) پڑھا ہے (یعنی فَذَاکَ رَبٌّ کی بجائے) یہ اس کے اصول پر مبنی ہے کہ اس کی رائے میں کائنات میں سوائے رب کے وجود کے کوئی عبد اور وجود نہیں لہٰذا وہ پوچھتا ہے کہ پھر مکلّف کون ہے؟ اس کے اس اصول کی بناء پر مکلِف اور مکلَف ایک ہے جیسا کہ ان کا مقول ہے: (اُرْسِلَ مِنْ نَفْسِہٖ) (یعنی خود اپنے آپ کو رسول بنا کر مبعوث کیا) اور جیسے ابن فارض نے اپنی ایک نظم میں کہا جس میں مذہب کا پرچار کیا اور اسے نظم السلوک کا نام دیا:

إِلَیَّ رَسُوْلاً کُنْتُ مِنِّیْ مُرْسَلاً   وَ ذَاتِیْ بِآیَاتِیِ عَلَیَّ اسْتَدَلَّت

(یعنی رسول بھی میں اور مرسِل بھی میں ہوں اور میری ذات نے اپنی آیات کے ساتھ خود پر ہی استدلال کیا ہے) اس کا مضمون وحدت الوجود کا نظریہ ہے اور یہی ابن عربی، ابن سبعین اور ان جیسوں کا مذہب ہے جیسے کہا:

لَهَا صَلاَتِیْ بِالْمَقَامِ اُقِیْمُهَا   وَاَشْهَدُ فِیْهَا اَنَّهَا لِیْ صُلَّتِ

کِلاَنَا مُصَلٍّ عَابِدٌ سَاجِدٌ إِلیٰ   حَقِیْقَةِ الْجَمْعِ فِیْ کُلِّ سَجْدَةٍ

وَ مَا کَانَ لِیْ صَلّٰی سِوَایَ فَلَمْ تَکُنْ   صَلاَتِیْ لِغَیْرِیْ فِیْ اَدَا کُلِّ رَکْعَةٍ

(مطلب یہ کہ میں خود ہی عابد اور خود ہی معبود، خود ہی ساجد اور خود ہی مسجود ہوں) حتیٰ کہ کہا:

وَمَا زِلْتُ اِیَّاهَا وَاِیَّایَ لَمْ تَزَلْ   وَلاَ فَرْقَ بَلْ ذَاتِیْ لِذَاتِیْ اَحَبَّتِ

(یعنی ازل سے میں وہ اور وہ میں ہوں، کوئی فرق نہیں بلکہ میری ذات نے اپنی ذات سے محبت کی ہے) اور اس کا مثل کثیر ہے! مجھے ہمارے ایک صوفی فقیہ صاحبِ ابوالحسن علی بن قرباص نے بیان کیا کہ وہ شیخ قطب الدین بن قسطلانی کے پاس گئے تو انہیں ایک کتاب کی تصنیف میں مشغول پایا، کہا یہ کیا ہے؟ کہنے لگے یہ ابن سبعین، ابن فارض، ابوالحسن جزلی اور عفیف تلمسانی کے رد میں ہے اور جمال الدین بن واصل اور شمس الدین اصفہانی سے بیان کیا کہ وہ ابن عربی کی کلام کا رد و انکار اور بطلان کیا کرتے تھے اور یہ کہ اصفہانی نے ان کے پاس اس کی کتب میں سے ایک کتاب دیکھی تو کہا اگر اس کی کتابیں اپنے پاس رکھتے ہو تو میرے پاس نہ آیا کرو، ابن واصل نے نقاحہ میں قسم کھا کر کہا کہ اس کی کلام کذب پر مبنی ہے، ایک عالم فاضل صاحب ابوبکر سالار نے شیخ تقی الدین ابن دقیق العید جو اپنے وقت کے شیخ تھے، کے حوالے سے ابومحمد ابن محمد السلام سے بیان کیا کہ ان سے جب وہ مصر آئے، ابن عربی کے بارہ میں پوچھا گیا تو کہا: (شَیْخُ سُوْءٍ کَذَّابٌ مَقْبُوْحٌ) (گزرا) جو کائنات کے قدیم ہونے کا قائل ہے

اور کسی بھی شرمگاہ کو حرام نہیں سمجھتا، تقی الدین کہا کرتے تھے: (هُوَ صاحِبُ خِيَالٍ واسِعٍ) (یعنی خیالی دنیا کا باسی) یہ بات کئی مصری فقہاء نے بیان کی جنہوں نے اسے ابن دقیق العید سے سنا، ابن بجیر نے مجھے رشید الدین سعید وغیرہ سے بیان کیا کہ ابن عربی جھوٹ بولنا حلال قرار دیتا تھا، ایک عالم و عارف کمال الدین مراغی نے مجھے بتلایا جو اپنے زمانہ کے شیخ تھے، کہ جب انہیں توحید بارے اس کی کلام پہنچی تو میں نے **عفیف تلمسانی سے ان حضرات کی بعض تحریریں پڑھیں تو انہیں کتاب و سنت کے مخالف پایا، جب اس کا ذکر اس سے کیا تو کہنے لگا قرآن میں توحید تو ہے ہی نہیں، وہ تو سارا شرک ہے،** جو قرآن کے پیچھے لگا وہ توحید تک پہنچ نہ سکے گا، کہتے ہیں میں نے اس سے کہا تمہارے ہاں زوجہ اور اجنبیہ اور بہن کے مابین کیا فرق ہے؟ کیا سب ایک جیسی ہیں؟ کہنے لگا ہمارے نزدیک کوئی فرق نہیں، یہ لوگ دراصل محجوب ہیں جو اسے حرام خیال کرتے ہیں، ہم نے ان سے کہا یہ تم پر حرام ہوں تو ہوں ہمارے لئے کوئی حرمت نہیں

مجھے مراغی نے بیان کیا کہ جب میں نے تلمسانی سے اس مذہب بارے بات کی اور اسے فصوص کی عبارتیں پڑھ کر سنائیں اور کہا ہمارے ہاں لوگ اسے بڑی تعظیم دیتے ہیں اور ہم اس کی معرفت کے مشتاق تھے تو جب اس نے ان عبارتوں کی تشریح کرنی شروع کی تو میں نے کہا یہ قرآن اور احادیث کے برخلاف ہے تو بولا یہ سوچ ان دروازے کے باہر پھینک دو اور ادھر صاف دل کے ساتھ آؤ تاکہ یہ توحید پاسکو! پھر اسے خیال ہوا کہ میں یہ باتیں لوگوں کو بتلاؤں گا تو (جھوٹ موٹ) آنسو بہانے لگا اور بولا: یہ باتیں جو مجھ سے سنی ہیں کسی سے نہ کرنا، نیز بیان کیا کہ ان کی ملاقات ابوالحسن کے تلمیذ ابوعباس شاذلی سے ہوئی تو تلمسانی بارے کہا یہ کفار ہیں، یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ صنعت ہی صانع ہے (یعنی سب کچھ خود بخود پیدا ہوا ہے)

کہتے ہیں میں نے ارادہ بنایا ہوا تھا کہ اکیلے میں اسے ملوں گا اور اس سے اس کا اخذ نہ کروں گا صرف اس سے خلوت کا ادب سیکھوں گا تو مجھے کہا تمہاری مثال اس شخص کی سی ہے جو شاہی اصطبل کے نگران کی وساطت سے سلطان کے تقرب کا خواہاں ہے تو اگر کسی کو یہ معمولی عہدے دار سلطان کا مقرب بنا سکتا ہوتا تو سلطان کے پاس اس کا حال کیا ہوگا؟ کہتے ہیں مجھے قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) تقی الدین ابن دقیق العید نے بتلایا کہ تاتاریوں کے مشرقی ممالک پر غلبہ کا سبب ان کے باسیوں کے ہاں فلسفہ کا ظہور اور شریعت کا ضعف تھا (یعنی عقیدہ کمزور پڑ چکا تھا) تو میں نے عرض کی آپ کے ملک میں یہ اتحاد کے قائل ہیں جو فلاسفہ کے مذہب سے بھی بدتر ہے؟ کہنے لگے کوئی عاقل یہ بات (یعنی اتحادِ ذات کی) نہیں کہہ سکتا بلکہ ہر عاقل پر ان کے نظریہ کی خرابی ظاہر ہے بخلاف فلسفیانہ نظریات کے کہ ان میں کچھ معقول باتیں بھی ہوتی ہیں اگرچہ وہ فاسد ہوں، ایک فاضل مصری فقیہ تاج الدین انباری نے مجھے بتلایا کہ انہوں نے شیخ ابراہیم جعبری سے سنا کہتے تھے میں نے ابن عربی کو دیکھا ہے داڑھی کو خضاب لگا تھا اور پلید شیخ تھا، ہر آسمانی کتاب اور ہر نبی کا انکار کرتا تھا، مجھے رشید الدین معلم نے بیان کیا کہ میں عالم شباب میں دمشق کے

لوگوں سے سنتا تھا کہ ابن عربی اور خسرو شاہی دونوں زندیق ہیں، ابراہیم جعبری سے بیان کیا کہ ابن فارض کی جان کنی کے عالم میں وہ اس کے پاس حاضر تھے کہ وہ یہ اشعار پڑھنے لگا:

اِنْ کَانَ مَنْزِلَتِیْ فِی الْحُبِّ عِنْدَکُمْ — مَا قَدْ لَقِیْتُ فَقَدْ ضَیَّعْتُ اَیَّامِیْ

اُمْنِیَّةٌ ظَفِرَتْ نَفْسِیْ بِهَا زَمَناً — اَلْیَوْمَ اَحْسَبُهَا اَضْغَاثَ اَحْلَامٍ

(اگر محبت میں آپ کے ہاں میرا مقام وہ ہے جو میں نے پایا تو میں نے وقت ہی ضائع کیا ہے، ایک زمانہ تک نفس اس کی آرزو کرتا رہا، آج میں اسے ایک خوابِ پریشاں خیال کرتا ہوں)

فقیہ فاضل تاج الدین زنباری (اوپر انباری لکھا ہے) نے ذکر کیا کہ انہوں نے جعبری کو کہتے سنا کہ میں نے خواب میں ابن عربی اور ابن فارض کو اس حال میں دیکھا کہ اندھے ہیں اور گرتے پڑتے جا رہے ہیں اور پکارتے ہیں راستہ کیسا ہے؟ راستہ کدھر ہے؟ شہاب الدین مزی نے شرف الدین بن شیخ نجم الدین بن حکیم عن ابیہ سے مجھے بیان کیا کہ میں دمشق آیا تو وہ دن ابن عربی کی وفات کا تھا تو اس کے جنازہ کا یوں مشاہدہ کیا گویا اس پر راکھ برس رہی ہو، میں بول اٹھا یہ اولیاء کے جنازوں سے مشابہت نہیں رکھتا، اپنے والد کے حوالہ سے شیخ اسماعیل کورانی کی بابت نقل کیا کہ وہ ابن عربی کو اور حریری کو شیطان کہا کرتے تھے، مجھے شہاب الدین نے قاضی شرف الدین بازیلی سے بیان کیا کہ ان کے والد انہیں ابن عربی، ابن فارض اور ابن سبعین کی کتابیں پڑھنے سے منع کرتے تھے۔

فصل

ان کی کلام اور نظریات کے مزید کفر کے بیان میں، اور یہ کئی وجوہ سے ہے:

(۱) ان کے عقیدہ کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے کوئی چیز پیدا نہیں کی اور نہ ابتداع کیا اور نہ تصویر بنائی کیونکہ ان کے مطابق کائنات بجز اس کے وجود کے کوئی وجود نہیں، تو یہ نہیں ہوسکتا کہ وہ اپنے وجودِ نفس کا خالق ہو یا اپنی ذات کا باریٔ ہو کیونکہ بدیہی بات ہے شیٔ خود اپنی خالق اور صانع نہیں ہوسکتی، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے کہا: (**اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَیْرِ شَیْءٍ اَمْ هُمُ الْخٰلِقُوْنَ**) (گزری) کیونکہ وہ یہ بات جانتے تھے کہ بغیر خالق کے وہ پیدا نہیں ہو گئے اور یہ بھی کہ شیٔ خود اپنی خالق نہیں ہوسکتی تو ان کے لئے یہ بات طے تھی کہ کوئی ان کا خالق ہے، ان ملحد فرعونی کفار کے نزدیک کائنات میں کوئی شیٔ ایسی نہیں جسے رب نے تخلیق یا اِبداع کیا ہو یا وہ اس کا باریٔ ہو، ماسوائے اس کی اپنی ذاتِ مقدسہ کے اور اس کی ذاتِ مقدسہ تو مخلوق نہیں ہوسکتی اور نہ مربوب اور مصنوع، یہ نظریہ تمام اہلِ ملل و آراء کے نزدیک ظاہر ترین کفر ہے لیکن مصنف فصوص کی رائے میں عالم میں صرف اسی ایک کا وجود ہے اور عدم میں ثابت اشیاء اس سے مستغنی ہیں اور اس کا وجود مخلوق نہیں ہوسکتا اور ذوات اس سے مستغنی ہیں لہٰذا اللہ نے کوئی شیٔ تخلیق نہیں کی

(۲) ان کے نزدیک اللہ رب العالمین نہیں اور نہ وہ مالک الملک ہے کیونکہ جہان میں صرف اسی ایک کا وجود ہے اور وہ اپنے آپ

کا رب اور مالک نہیں ہوسکتا، تناقض کے باوجود انہوں نے اس کفر یہ بات کی تصریح کی ہے، پھر کہا: وہ ملک الملک ہے اس امر پر بناء کرتے ہوئے کہ اس کا وجود اشیاء کی ذوات کا محتاج ہے اور اشیاء کی ذوات اس کے وجود کی محتاج ہیں تو اشیاء اس کے وجود کی مالک ہیں لہذا وہ ملک الملک ہے

(۳) ان کے ہاں اللہ کسی کا رازق نہیں اور نہ وہ کسی کو کوئی شئ دے سکتا ہے اور نہ کسی پر رحم، احسان، انعام کرسکتا اور علم، ہدایت اور قوتِ بیان دے سکتا ہے، فی الجملہ ان کے عقیدہ میں نہ کوئی اس سے خیر پا سکتا ہے اور نہ شر اور نہ نفع اور نہ ضرر، نہ عطا نہ منع، نہ ہدایت اور نہ گمراہی اور کائنات کی تمام اشیاء اس کا عینِ نفس اور وجودِ محض ہیں تو یہاں نہ کوئی غیر ہے جس کی طرف پہنچا جائے اور نہ کوئی ایسا اور جس کے ساتھ انتفاع حاصل ہو سکے، نہ یہاں کوئی مرزوق، منصور یا مہدی ہے! پھر مصنف فصوص کی رائے میں یہ ذوات عدم میں ثابت ہیں اور یہ ذوات ہی ہیں جو احسان یا اساءت کرتی ہیں اسی طرح نفع وضرر بھی اور یہی اس کے نزدیک تقدیر کا راز ہے، دیگر کی رائے میں یہاں اصلاً ہی اس کی ذات کے سوا کچھ ثابت نہیں بلکہ فاعل بھی وہی ہے اور مفعول بھی وہی، قاتل بھی وہی اور مقتول بھی وہی اور وہی مرزوق، مضروب اور مشتوم ہے! ناکح بھی وہی اور منکوح بھی وہی ہے، آکل بھی خود اور ماکول بھی خود ہے، ان لوگوں نے ان باتوں کی واضح طور سے تصریح کی ہے

(۴) ان کے نزدیک اللہ ہی راکع، ساجد، خاضع، عابد، صائم، بھوک محسوس کرنے والا، قیام کرنے والا اور نائم ہے، اسے امراض آن گھیرتی ہیں، دشمنوں کی دشمنی کا وہ شکار بنتا اور ابتلاء میں گرفتار ہوتا ہے تو تصریح کی کہ کرب جو نفوس کو پہنچتا ہے وہ درحقیقت اسے پہنچتا ہے اور جب کرب سے نجات ملتی ہے تو یہ نجات اسے ملتی ہے اسی لئے ان کے بعض۔ جو اللہ کی مخلوق میں سے بدترین کافر، منافق اور ملحد ہیں۔ نے مکروہ جانا کہ انسان بلاء پر صبر کرے کیونکہ ان کے نزدیک مصاب ومبتلا تو اللہ ہے، تصریح کی کہ وہ ہر نقص وعیب کے ساتھ موصوف ہے کہ کائنات میں کوئی اس کا غیر ہے ہی نہیں! مصنف فصوص لکھتا ہے: وہ عدم میں ثابت ہے، دیگر نے کہا سوائے وجودِ حق کے کوئی وجود ہی نہیں تو جو نقائص وعیوب اور دیگر سب کچھ ہے وجودِ حق ان کے ساتھ متصف ہے

(۵) ان کے نزدیک یہ لات، منات، عزی، ود، سواع، یعوق، نسر اور شمس وقمر اور دیگر کے پجاری دراصل اللہ کے عبادت گزار ہیں اور یہ متصور ہی نہیں کہ غیر اللہ کی پوجا ہو سکے، اس کی کئی مقامات پر تصریح کی ہے مثلاً فصوص میں (فَصُّ الْكَلِمَةِ النُّوحية) میں

﴿وَمَكَرُوا مَكْرًا كُبَّارًا﴾ [نوح : ۲۲] (اور وہ بڑی بڑی چالیں چلے) کی تشریح کرتے ہوئے لکھا: اس لئے کہ اللہ کی طرف دعوت مدعو کے ساتھ مکر ہے کیونکہ وہ تو ابتدا سے معدوم ہی نہیں کہ اس کی طرف دعوت دی جائے (أَدْعُوْا إِلَى اللّٰهِ) تو یہ عین مکر ہے (عَلٰى بَصِيْرَةٍ) تو اس میں ہے کہ امر سب کا سب اس کیلئے ہے تو انہوں (یعنی قوم نوح) نے بھی انہیں مکراً ہی جواب دیا جیسے انہوں نے دعوت مکراً دی تھی تو اپنے مکر میں کہا:

﴿وَقَالُوا لَا تَذَرُنَّ آلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَلَا سُوَاعًا وَلَا يَغُوثَ وَيَعُوقَ وَنَسْرًا﴾ [نوح : ۲۳] (اور کہنے لگے کہ اپنے معبودوں کو ہرگز نہ چھوڑنا اور وَدّ اور سواع اور یغوث اور یعوق اور نسر کو کبھی ترک نہ کرنا) کیونکہ اگر انہیں ترک کیا تو بقدر اپنے ترک کے وہ حق سے جہل اختیار کریں گے کیونکہ ہر معبود میں حق کیلئے ایک وجہ خاص ہے اسے جانتا ہے جو جانتا ہے اور محمدیین میں سے جو اس سے ناواقف ہے وہ ناواقف ہے ﴿وَقَضَىٰ رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ﴾ [الإسراء : ۲۳] (اور تمہارے رب نے ارشاد فرمایا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو) یعنی: (حَکَمَ) (تیرے رب کا فیصلہ ہے) تو عالم جانتا ہے کہ وہ کس کی عبادت کر رہا ہے اور وہ کس صورت میں ظاہر ہے حتی کہ عبادت کیا جائے اور یہ تفریق و کثرت صورتِ محسوسہ میں اعضاء کی مانند ہے یا جیسے صورتِ روحانیہ میں معنوی قویٰ ہوں تو معبود جو بھی ہو وہ دراصل اللہ ہی کی عبادت ہے تو ادنی وہ ہے جس میں الوہیت کا تخیل کیا جائے، اگر یہ تخیل نہ ہوتا تو کسی حجر و شجر کی عبادت نہ ہوتی، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے کہا: ﴿قُلْ سَمُّوهُمْ﴾ [الرعد: ۳۳] (ان سے کہو کہ ان کے نام تو لو) تو اگر وہ ان کے نام لیں تو انہیں حجر، شجر اور کوکب کہیں، اگر ان سے کہا جائے تم نے کس کی عبادت کی؟ تو کہیں گے ایک الٰہ کی، وہ یہ نہ کہتے تھے: (اَللّٰهُ وَلَا الإِلٰهُ) مگر اپنے حسبِ تخیل، بلکہ کہا: (هٰذَا مَجْلىً إِلٰهِيٌّ يَنْبَغِيْ تَعْظِيْمُهُ فَلَا يَقْتَصِرُ) (یعنی یہ الٰہی مجلیٰ ہے اس کی تعظیم ضروری ہے پس اقتصار نہ کرے) تو ادنیٰ صاحبِ تخیل کہے گا: ﴿مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَىٰ﴾ [الزمر: ۳] (ہم ان کو اس لئے پوجتے ہیں کہ ہم کو اللہ کا مقرب بنا دیں) جبکہ جو عالم ہے وہ کہے گا: ﴿فَإِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ فَلَهُ أَسْلِمُوا﴾ [الحج: ۳۴] (پس تمہارا معبود ایک ہی ہے اُسی کے فرمانبردار ہو جاؤ) جس شکل و مظہر میں بھی وہ ہو ﴿وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِينَ﴾ [الحج: ۳۴] (اور عاجزی کرنے والوں کو خوشخبری سنا دو) یعنی ان کی طبعیت و جبلت کی آگ بجھ چکی تو الٰہ کہا، طبیعت (نیچر) نہ کہا۔ اھ

فص (الهارونية) میں لکھتا ہے: حضرت ہارون نے حضرت موسیٰ سے کہا:

﴿إِنِّي خَشِيتُ أَنْ تَقُولَ فَرَّقْتَ بَيْنَ بَنِي إِسْرَائِيلَ﴾ [طه : ۹۴] (میں تو اس سے ڈرا کہ آپ یہ نہ کہیں کہ تم نے بنی اسرائیل میں تفرقہ ڈال دیا) یعنی تو مجھے ان کے تفرقہ کا سبب بنا دیں، تو بچھڑے کی پوجا نے ان میں تفرقہ کیا تو سامری کی اتباع و تقلید میں ان میں سے بعض نے اس کی پوجا کی جبکہ بعض اس کی پوجا سے متوقف رہے حتی کہ حضرت موسی کی واپسی ہو تو اس بابت ان سے پوچھیں، تو ہارون ڈرے کہ ان کے درمیان اس تفریق کو ان کی طرف منسوب نہ کیا جائے، حضرت موسی ہارون کی نسبت اس امر کے اعلم تھے کہ جانتے تھے کہ انہوں نے بچھڑے کی پوجا نہیں کی کیونکہ ان کے علم میں تھا کہ اللہ کا فیصلہ ہے کہ صرف اسی ہی کی عبادت ہوا کرے گی اور اللہ جس امر کا فیصلہ کرتا ہے وہی ہوتا ہے تو حضرت موسی کے حضرت ہارون پر عتاب کی وجہ اس (یعنی بچھڑے) کی پوجا کا انکار اور ان کی طرف سے اسے عدم برداشت کرنا تھا کیونکہ عارف ہر شئ میں حق کو دیکھتا ہے بلکہ اسے وہ ہر شئ

کی عین سمجھتا ہے تو حضرت موسیٰ حضرت ہارون کی علمی تربیت کر رہے تھے اگرچہ عمر میں ان سے چھوٹے تھے اسی لئے جب حضرت ہارون نے ان سے کہا جو کہا تو انہوں نے سامری سے کہا: **﴿فَمَا خَطْبُكَ يٰسَامِرِيُّ﴾ [طٰہٰ: ۹۵]** (اے سامری تمہارا کیا معاملہ ہے؟) یعنی تم نے بطورِ خاص بچھڑے ہی کا مجسمہ کیوں بنایا؟ اس کی کوئی خاص وجہ؟ تا آنکہ لکھا کہ حضرت ہارون کے پاس بالفعل ایسی قوت نہ تھی کہ اہلِ عجل پر ان کا زور چلتا جیسے اللہ کی طرف سے حضرت موسیٰ کو اس پر مسلط کیا گیا، وجود میں ظاہر ایک حکمت کی رو سے تاکہ بعد ازاں وہ صورت ختم ہو جائے تو وہ ختم نہ ہوئی مگر بعد اس کے کہ اپنے عابد کے نزدیک الوہیت کے ساتھ متلبس ہوئی، اسی لئے انواع میں سے کوئی نوع باقی نہیں مگر وہ عبادت کی گئی یا تو عبادتِ تألُّہ (یعنی معبود مان کر عبادت) یا عبادتِ تسخیر اور عقلمندوں کیلئے یہ ضروری ہے اور کائنات میں کسی شیٔ کی بھی عبادت نہیں کی جاتی مگر عابد کے نزدیک رفعت کے ساتھ تلبُّس اور اس کے دل میں درجہ کے ظہور کے بعد اسی لئے حق ہمارے لئے رفیع الدرجات کے ساتھ متسمی ہوا ہے، رفیع الدرجہ نہیں کہا تو ایک عین میں کثیر درجات ہوئے تو اس کا فیصلہ ہے کہ نہ عبادت کی جائے گی مگر اسی کی، کثیر ومختلف درجات میں، ہر درجہ کو الٰہی مجلی عطا کیا گیا ہے جس میں وہ عبادت کیا گیا اور اس ضمن میں انسان کا سب سے عظیم تر اور اعلیٰ مجلی ہوائے نفس ہے جیسا کہ کہا: (**﴿أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلٰهَهُ هَوَاهُ﴾** [الجاثیۃ: **۲۳**] (بھلا تم نے اس شخص کو دیکھا جس نے اپنی خواہش کو معبود بنا رکھا ہے) تو یہ اعظم معبود ہے کیونکہ کسی شیٔ کی عبادت نہیں کی جاتی مگر اسی کے ساتھ (اس کی بدولت) اور وہ عبادت نہیں کیا جاتا مگر اپنی ذات کے ساتھ، اس بارے میں کہتا ہوں:

وَحَقِّ الْهَوىٰ اِنَّ الْهَوىٰ سَبَبُ الْهَوىٰ　　　وَلَوْلَا الْهَوىٰ فِي الْقَلْبِ مَا عُبِدَ الْهَوىٰ

(حقِ ہویٰ [یعنی محبت] کی قسم! ہویٰ سببِ ہویٰ ہے اور اگر دل میں ہویٰ نہ ہو تو ہویٰ کی عبادت نہ ہو)

کیا دیکھتے نہیں اللہ کا اشیاء بارے علم کتنا اکمل ہے؟ کیسے وہ متمم ہوا اس کے حق میں جس نے اپنی ہوی کی عبادت کی اور اسے الٰہ بنایا، اللہ نے ایسے کے بارہ میں کہا: (**﴿وَأَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ﴾ [الجاثیۃ: ۲۳]** (اور باوجود جاننے کے اللہ نے اس کو گمراہ کر دیا) اور ضلالت حیرت ہے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب اس عابد کو دیکھا کہ اس نے عبادت نہیں کی مگر اپنی ہوائے نفس کی اس کی طاعت کے لئے انقیاد کے ساتھ ہر اس میں جس کا وہ اسے حکم دے، اشخاص میں سے اپنے کسی بھی عبد کی عبادت کے ساتھ حتی کہ اللہ کی عبادت بھی بذریعہ ہویٰ ہے اس لئے کہ اگر اس ضمن میں جناب مقدس اس کیلئے واقع نہ ہو تو ہویٰ کرے اور وہ اس چیز کی محبت کا ارادہ جس نے اللہ کی عبادت کی اور اسے اس کے غیر پر ترجیح نہ دیتا، اسی طرح ہر جس نے صورِ عالم میں سے کسی بھی صورت کی عبادت کی اور اسے الٰہ بنایا تو ایسا نہ کیا مگر ہویٰ کے ساتھ، تو ہر عابد اپنی ہوائے نفس کے تابع ہے پھر اس نے معبودات کو دیکھا کہ عابدین میں متنوع ہیں تو ہر کسی بھی شیٔ کا عابد اس کے سوا کا کافر ہے اور ادنیٰ شعور رکھنے والا بھی اتحادِ ہویٰ بلکہ احدیتِ ہویٰ کے پیشِ نظر ورطۂ حیرت میں ہوگا جیسا کہ ذکر ہوا کیونکہ ہر عابد میں وہ عینٌ واحدۃٌ ہے (**﴿فَأَضَلَّهُ اللّٰهُ﴾** یعنی (حَيَّرَهُ اللّٰهُ عَلٰى

عِـلْـمٍ) (یعنی اللہ نے علم پر اسے متحیر کر دیا) اس طور کہ عابد نے سوائے اپنی ہوائے نفس کے کسی کی عبادت نہ کی اور نہ کسی اور کی عبودیت کا طالب ہوا چاہے یہ امرِ مشروع کے مصادف ہوا یا نہیں! تو کامل عارف وہ ہے جو ہر معبود میں حق کی تجلی دیکھے جس کی وجہ سے اس کی عبادت کی جارہی ہے اسی لئے سب نے اسے الہ کا نام کیا ہے اسکے اسمِ خاص یعنی شجر، حجر، حیوان، انسان، کوکب یا ملک کے ہوتے ہوئے، یہ اس کی شخصیت کا نام ہے اور الوہیت ایک مرتبہ ہے، عابد اسکی نسبت تخیل کرتا ہے کہ وہ مرتبہِ معبودہ ہے جبکہ وہ درحقیقت اس عابد کی بصر کیلئے حق کی تجلی گاہ (مظہر) ہے جو کسی حجر و شجر وغیرہ کے ساتھ مختص اس مجلیٰ میں موجود معبود کی عبادت پر لگا ہوا ہے اسی لئے بعض اس کے مقال کی عدم معرفت رکھنے والوں نے از روئے جہالت کہا: **(مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَى)** (ابھی گزری) حالانکہ وہ انہیں آلہہ کا نام دیتے ہیں جیسا کہ کہا: **(أَجَعَلَ الْآلِهَةَ إِلَهًا وَاحِدًا إِنَّ هَذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ) [ص: ۵]** (کیا اس نے اتنے معبودوں کی جگہ ایک ہی معبود بنا دیا؟ یہ تو بڑی عجیب بات ہے) تو اس کا انکار نہ کیا بلکہ اس سے متعجب ہوئے کہ وہ کثرتِ صورت اور ان کے لئے الوہیت کی نسبت کے ساتھ واقف ہوئے تھے تو رسول آئے اور انہیں معروف ایک الہ کی طرف دعوت دی اور وہ ان کی اس گواہی کے ساتھ گواہ نہ ہوئے کہ اپنے ہاں وہ اس کا اثبات کرتے ہیں اور اپنے اس قول میں اس کا اعتقاد رکھتے ہیں: **(مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ الخ)** کیونکہ جانتے ہیں کہ یہ صورت (بظاہر) پتھر ہے اسی لئے اس قول کے ساتھ ان پر حجت قائم ہوئی: **(قُلْ سَمُّوهُمْ)** (گزری)

تو وہ ان کے وہی نام لیں گے جو وہ جانتے ہیں کہ یہ ان کے حقیقی اسماء ہیں مثلاً حجر و شجر وغیرہ لیکن جو اہلِ معرفت ہیں وہ حقیقت سے واقف ہیں اور وہ ظاہراً صورِ عالم میں سے کسی کو معبود بنا لینے کا انکار کریں گے کیونکہ علم میں ان کا مرتبہ انہیں مجبور کرتا ہے کہ ان پر وہی حکم لگائیں جو رسول نے لگایا ہے جس پر وہ ایمان لائے اور جس کی رو سے انہیں مومن کہا جاتا ہے تو یہ عبادِ وقت ہیں اپنے یہ جاننے کے باوجود کہ یہ لوگ ان صور کے اعیان کی عبادت نہیں کر رہے بلکہ اصل میں وہ اللہ کی عبادت کر رہے ہیں کہ یہ صورتیں اور اشیاء جس کی تجلی کا مظہر بنی ہیں اور اس تجلی کو اہلِ معرفت نے جان لیا ہے اور دیگر اس سے ناواقف رہے اور عارف کامل نبی ہو یا رسول یا ان سے وارث ہونے والوں نے اس راز کو پردے میں رہنے دیا، تو انہیں ان صور سے دور ہونے کا حکم دیا رسولِ وقت کی اتباع کے مدنظر جو ان سے رہ گئی اللہ کی اپنے ساتھ محبت کی طمع رکھتے ہوئے جیسا کہ کہا:

(قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ)[آل عمران: ۳۱] (کہہ دو اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو تو اللہ بھی تم سے محبت کرے گا) تو اس الہ کی طرف دعوت دی جس کا قصد کیا جاتا ہے اور وہ من حیث الجملہ معلوم ہے اور کوئی اس کا مشاہدہ نہیں کر سکتا اور نہ یہ آنکھیں اس کا ادراک کر سکتی ہیں بلکہ وہ اپنی صفتِ لطافت کی رو سے آنکھوں کا مدرک ہے اور اشیاء کے اعیان میں اپنے سرائت کرنے کی وجہ سے جیسا کہ یہ (صور و اشیاء) اپنے قوالب کے ماوراء اپنی ارواح کی بھی مدرک نہیں، تو وہ لطیف اور

خبیر ہے اور خبرۃ ذوق ہے اور ذوق تجلی اور تجلی صورتوں میں ہے لہذا ان سے چارہ نہیں اور اس سے بھی! تو لازم ہے کہ اس کی عبادت کرے جو اسے اپنی ہویٰ کے ساتھ دیکھتا ہے۔ اھ

تو ان لوگوں کے نظریات میں تدبر کرو یہ دنیا میں شرک کی تمام صورتوں کو قبول کر رہے ہیں اور ہر مخلوق کو اللہ کے برابر کرتے ہیں اور جائز سمجھتے ہیں کہ کسی بھی شئ کو معبود بنالیا جائے پھر اس پر قائل ہیں کہ ہم صرف اللہ کے ہی عابد ہیں تو ان کے نظریہ میں دو امور مجتمع ہیں: ہر شرک اور ہر انکار و تعطیل، ان کے اس ظن کے باوصف کہ وہ صرف اللہ کی عبادت کرتے ہیں اور معلوم ہے کہ یہ تمام مرسلین کے دین اور سب اہل کتاب کے دین اور تمام ملل کے خلاف ہے بلکہ مشرکین کے دین کے بھی برخلاف ہے اسی طرح اس فطرت کے جس پر اللہ نے اپنے بندوں کو پیدا کیا اور اس سب کے جسے وہ اپنے دلوں کے ساتھ سمجھتے ہیں اور اپنے نفوس میں پاتے ہیں، ان کا یہ عقیدہ فساد، تناقض، سفسطہ اور غایت درجہ کا انکارِ رب العالمین ہے اس لئے کہ معلوم بالاضطرار ہے کہ رسول مشرکین کے معبودوں کو غیر اللہ قرار دیتے رہے اور ایسوں کو وہ غیر اللہ کے پجاری کہتے رہے ہیں اور انہیں اللہ کے ساتھ شرک کے مرتکب قرار دیتے رہے تو انہوں نے ہمیشہ خلق کو اللہ وحدہ کی عبادت کی دعوت دی جس کا کوئی شریک نہیں اور یہی اللہ کا دین ہے جس کے ساتھ اس نے اپنی کتب نازل کیں اور جسے دے کر رسول بھیجے اور یہی اسلامِ عام ہے جس کے سوا کوئی اور دین اولین وآخرین سے وہ قبول نہ کرے گا اور نہ اس کے بلاغ کے بعد اس کے تارکین کی وہ مغفرت کرے گا جیسا کہ کہا:

(إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ)[النساء :۴۸] (اللہ تعالیٰ اس گناہ کو نہیں بخشے گا کہ کسی کو اس کا شریک بنایا جائے اور اس کے سوا اور گناہ جس کو چاہے معاف کر دے) یہ اہلِ جنت اور اہل نار اور سعداء و اشقیاء کے مابین فرق ہے جیسا کہ نبی اکرم کی ایک حدیث میں ہے کہ جس کی آخری کلام (لا إلٰهَ إلَّا اللّٰهُ) ہوئی اس کیلئے جنت واجب ہوئی اور فرمایا جو اس حال میں مرا کہ عقیدہ رکھتا تھا کہ اللہ کے سوا کوئی الہ نہیں اس کیلئے جنت واجب ہوئی اور فرمایا میں ایک ایسا کلمہ جانتا ہوں جسے کوئی شخص مرتے وقت نہ کہے گا مگر آسودگی اور طمانیت پائے گا اور یہ دین کا اصل الاصول ہے اور جیسے نبی پاک نے کہا: میں مامور ہوں کہ لوگوں سے جنگ کروں حتیٰ کہ گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی الہ نہیں اور میں اللہ کا رسول ہوں، اگر یہ کہہ دیں تو مجھ سے اپنے خون اور اموال بچالیں گے مگر ان کے حق کے ساتھ اور ان کا حساب اللہ پر ہے، اس کلمہِ لا الہ الا اللہ کے فضائل، حقائق اور دین میں اس کا مقام ایسا ہے جس کا واصفین وصف نہیں کر سکتے اور عارفین اس کی کلی معرفت نہیں کر سکتے، یہی کلی امر کی حقیقت ہے جیسا کہ فرمایا:

(وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ إِلَّا نُوْحِيْ إِلَيْهِ أَنَّهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدُوْنِ)[الأنبياء : ۲۵] (اور جو پیغمبر ہم نے تم سے پہلے بھیجے اُن کی طرف یہی وحی بھیجی کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں تو میری ہی عبادت کرو) تو خبر دی کہ وہ ہر رسول کی طرف ہر ماسوا اللہ سے الوہیت کی نفی اور اس کے صرف اس اکیلے کیلئے اثبات کی وحی بھیجتا تھا، ان ملحد مشرکین کا زعم ہے کہ ہر شئ اسی طرح

الوہیت کی مستحق ہے جیسے اللہ ہے جبکہ اللہ کا فرمان ہے:

﴿ وَسْـَٔلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَآ اَجَعَلْنَا مِنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ اٰلِهَةً يُّعْبَدُوْنَ﴾[الزخرف: ۴۵] (اور جو اپنے رسل ہم نے تم سے پہلے بھیجے ہیں ان سے دریافت کرلو کیا ہم نے الرحمٰن کے سوا اور معبود بنائے تھے کہ ان کی عبادت کی جائے) ان کا زعم ہے کہ ہر شئ معبود الہ ہے جبکہ اللہ نے خبر دی ہے کہ اس نے رحمٰن کے سوا کوئی آلہہ نہیں بنائے (اب ان کی مانیں یا اللہ کی؟) فرمایا:

﴿ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ﴾[النحل: ۳۶] (اور ہم نے ہر جماعت میں پیغمبر بھیجا کہ اللہ ہی کی عبادت کرو اور بتوں سے اجتناب کرو) تو اپنی عبادت کرنے اور طاغوت سے اجتناب کا حکم دیا، ان کے نزدیک تمام طواغیت میں اللہ موجود ہے یا وہی اللہ ہیں اور جو ان کی عبادت کرے وہ اصل میں اللہ کی عبادت کر رہا ہے، اللہ کا ارشاد ہے:

﴿يٰاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾[البقرۃ: ۲۱۔ ۲۲] (اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تمہیں اور تم سے پہلے لوگوں کو پیدا کیا تاکہ تم متقی بن جاؤ۔ جس نے تمہارے لئے زمین کو بچھونا اور آسمان کو چھت بنایا اور آسمان سے بارش برسا کر تمہارے کھانے کے لئے انواع و اقسام کے میوے پیدا کئے پس کسی کو اللہ کا ہمسر نہ بناؤ اور تم جانتے تو ہو)

تو ان آیات (یعنی کائنات کی اشیاء) کے خالق رب کی عبادت کا حکم دیا جبکہ ان ملعون ملحدوں کی نظر میں وہ ان آیات کا عین ہے، اللہ نے منع کیا ہے کہ لوگ اس کیلئے انداد بنائیں جبکہ ان کے نزدیک یہ متصور ہی نہیں کیونکہ انداد اس کا عین ہیں تو وہ خود اپنا ند کیسے ہوسکتا ہے؟ تو جو انداد کی پوجا کرتے ہیں وہ درحقیقت اس کے سوا کی عبادت نہیں کر رہے پھر ان ملاحدہ نے اس امر سے حجت پکڑی ہے کہ مشرکین اپنے معبودوں کو آلہہ کا نام دیتے ہیں جیسے کہا: ﴿اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا﴾ (ابھی گزری) اور اعتقاد رکھا کہ اس سے دلیل بنی کہ الوہیت ان کیلئے ثابت ہے جبکہ اللہ تعالیٰ نے متعدد مقامات میں اس حجت کا مشرکین پر رد کیا جیسے حضرت ہودؑ کی طرف سے ان کی قوم کے مشرکین سے خطاب کیا:

﴿اَتُجَادِلُوْنَنِيْ فِيْٓ اَسْمَآءٍ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ﴾[الأعراف: ۷۱] (کیا تم مجھ سے ایسے ناموں کے بارے میں جھگڑتے ہو جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لئے ہیں) الآیۃ، یہ ان کے اس قول کا رد تھا:

﴿اَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللّٰهَ وَحْدَهٗ وَنَذَرَ مَا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا﴾[الأعراف: ۷۰] (کیا تم ہمارے پاس اس لئے آئے ہو کہ ہم اکیلے اللہ ہی کی عبادت کرے اور جن کو ہمارے باپ دادا پوجتے چلے آئے ہیں اُن کو چھوڑ دیں؟) تو نبی کریم نے خبر دی کہ ان کا انہیں آلہہ معبودین کا تسمیہ ان کے اور ان کے آباء کی اختراع اور بتداع ہے، اللہ نے اس کیلئے کوئی حجت ودلیل نازل نہیں کی اور حکم صرف

اورصرف اللہ کیلئے ہے اوراس کا امر یہ ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کی جائے تو ان مشرکین کے قول کو کیونکر حجت بنایا جا سکتا ہے جن کے پاس کوئی حجت نہیں؟ اللہ تو ان کے قول کا ابطال کر رہا ہے جبکہ یہ ملحد قرار دیتے ہیں کہ بتوں کے پجاری درحقیقت اللہ کی عبادت کرتے ہیں پھر مشرکین نے رسول کا انکار کیا جب وہ اللہ وحدہ کی دعوت لے کر ان کے پاس آئے اور یہ کہ جن کی پوجا ان کے آباء کرتے رہے اسے ترک کر دیں اگر جیسے ان ملاحدہ کا زعم ہے کہ وہ اکیلے اللہ ہی کے عابد تھے تب پھر اس دعوت کا کیا مطلب؟ سورۃ یوسف میں ہے:

﴿يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ [یوسف: ۳۹-۴۰] (میرے جیل خانے کے رفیقو! بھلا کئی جدا جدا آقا اچھے یا اللہ یکتا و غالب؟۔ جن چیزوں کی تم اللہ کے سوا پرستش کرتے ہو وہ صرف نام ہی نام ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لئے ہیں اللہ نے ان کی کوئی سند نازل نہیں کی اللہ کے سوا کسی کی حکومت نہیں ہے اس نے ارشاد فرمایا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو یہی سیدھا دین ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے) اور کہا:

﴿اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى اِنْ هِيَ اِلَّآ اَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰى﴾ [والنجم: ١٩-٢٣] (بھلا تم لوگوں نے لات اور عزیٰ کو دیکھا؟۔ اور تیسرے منات کو۔ کیا تمہارے لئے تو بیٹے اور اللہ کے لئے بیٹیاں؟۔ یہ تقسیم تو بہت بے انصافی کی ہے۔ وہ تو صرف نام ہی نام ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے گھڑ لئے ہیں اللہ نے تو ان کی کوئی سند نازل نہیں کی یہ لوگ محض ظن اور خواہشاتِ نفس کے پیچھے چل رہے ہیں حالانکہ ان کے رب کی طرف سے ان کے پاس ہدایت آ چکی ہے)

یہ تین جن کا یہاں ذکر ہوا بڑے بت تھے جنہیں مشرکین نے ایک سے دوسرے مقامات پہ پہنچایا تو لات اہلِ مدینہ کے ساحلی علاقہ قدید کے سامنے تھا، عزیٰ عرفات سے قریب اور مناۃ اہلِ طائف کیلئے تھا اور یہی تین ان دنوں ارضِ حجاز کے شہر تھے تو اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ یہ اسماء جو ان مشرکین نے رکھ چھوڑے ہیں یہ انہی کی اختراع ہے، اس کی کوئی حقیقت نہیں تو وہ ایسے اسماء کی عبادت و پوجا میں لگے ہوئے ہیں جن کے لئے مسمیات نہیں اور نہ اللہ نے ان اسماء کی کوئی دلیل اتاری ہے تو یہ مشرکین کا زعمِ فاسد ہے جس کے پیچھے وہ لگے ہوئے ہیں اور اس نظریہ کا حق سے کوئی تعلق نہیں کہ یہ ایسے آلہہ ہیں جو نفع یا نقصان دے سکتے ہیں، یہ دراصل ہوائے نفس کے پجاری ہیں اور ان ملاحدہ کی نظر میں یہ جب ہوائے نفس کی عبادت کرتے ہیں تو درحقیقت اللہ کی عبادت کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد کے بعد افضل ترین انسان اور اپنے خلیل حضرت ابراہیم کی بابت بتلایا کہ اپنے والد سے کہا:

(اِذْ قَالَ لِاَبِیْهِ یٰۤاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا یَسْمَعُ وَلَا یُبْصِرُ وَلَا یُغْنِیْ عَنْكَ شَیْـًٔا یٰۤاَبَتِ اِنِّیْ قَدْ جَآءَنِیْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ یَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِیْۤ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِیًّا یٰۤاَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّیْطٰنَ اِنَّ الشَّیْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِیًّا یٰۤاَبَتِ اِنِّیْۤ اَخَافُ اَنْ یَّمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ فَتَكُوْنَ لِلشَّیْطٰنِ وَلِیًّا)[مریم : ۴۲-۴۵] (جب انہوں نے اپنے باپ سے کہا کہ ابا آپ ایسی چیزوں کو کیوں پوجتے ہیں جو نہ سنیں اور نہ دیکھیں اور نہ آپ کے کچھ کام آ سکیں۔ ابا جان مجھے ایسا علم ملا ہے جو آپ کو نہیں ملا تو میرے ساتھ ہو جائیے میں آپ کو سیدھی راہ پر چلا دوں گا۔ ابا جان شیطان کی پرستش نہ کیجئے بے شک شیطان اللہ کا نافرمان ہے۔ ابا جان مجھے ڈر لگتا ہے کہ آپ کو اللہ کا عذاب آ پکڑے تو آپ شیطان کے ساتھی ہو جائیں) تو اس کا انکار کیا کہ وہ بتوں کی عبادت کرتا ہے جو نہ سنتے اور نہ دیکھتے ہیں اور کسی کام کے نہیں، ان ملاحدہ کے زعم پر پھر یہ اللہ ہے جو نہ سنتا اور نہ دیکھ سکتا ہے اور کوئی کام بجا نہیں لا سکتا اور یہ وہی ہے جس نے اپنی عبادت سے منع کیا اور یہ وہی ہے جس نے اپنی عبادت کا حکم دیا، یہی بات ان کے احذق فاجر تلمسانی نے اپنی نظم میں کہی:

یَا عَاذِلِیْ اَنْتَ تَنْهَانِیْ وَ تَأمُرُنِیْ	وَالْوَجْدُ اَصْدَقُ نَهَّاءً وَ اَمَّار
فَإنْ اُطِعْكَ وَاَعْصِ الْوَجْدَ عُدْتُ عَمیً	عَنِ الْعِیَانِ إلیٰ اَوْهَامِ اَخْبَار
وَ عَیْنُ مَا اَنْتَ تَدْعُوْنِیْ إلَیْهِ اِذَا	حَقَّقْتَهٗ تَرَهُ الْمَنْهِیَّ یَا جَارِیْ

(اے میرے ملامت گر تو مجھے منع کرتا اور حکم دیتا ہے اور وجد زیادہ سچا منع کرنے اور حکم دینے والا ہے۔ پس اگر میں تیری اطاعت کروں اور وجد کی نافرمانی تو میں مشاہدہ سے اوہامِ اخبار کی طرف لوٹ آؤں اور جس چیز کی طرف تو مجھے دعوت دیتا ہے اگر غور کرو تو یہ عین وہی ہے جس سے تو مجھے منع کرتا ہے) حضرت ابراہیم نے اپنے والد سے یہ بھی کہا:

(یٰۤاَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّیْطٰنَ اِنَّ الشَّیْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِیًّا) جبکہ ان کے نزدیک شیطان بھی مجلی الہیٰ ہے لہذا قابلِ تعظیم ہے اور جو اس کی عبادت کرے گا وہ غیر اللہ کی عبادت نہ کرے گا اور شیطان رحمٰن کا غیر نہیں کہ ہم اس کی نافرمانی کریں جبکہ اللہ کا فرمان ہے:

(اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَیْكُمْ یٰبَنِیْۤ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّیْطٰنَ)(اَفَلَمْ تَكُوْنُوْا تَعْقِلُوْنَ) تک [یٰس : ۶۰-۶۲] (اے آدم کی اولاد! ہم نے تم سے کہہ نہیں دیا تھا کہ شیطان کو نہ پوجنا) تو انہیں شیطان کی عبادت سے منع کیا اور اللہ وحدہ کی عبادت کا حکم دیا جبکہ ان کے ہاں شیطان کی عبادت اللہ کی عبادت ہے اور چاہئے کہ نہ صرف شیطان بلکہ تمام موجودات کی عبادت کی جائے کیونکہ یہ عین اللہ ہیں، اللہ نے حضرت ابراہیم بارے بیان کیا کہ ستارہ دیکھ کر کہنے لگے: یہ میرا رب ہے اور جب وہ غروب ہوا تو کہا میں غروب ہونے والوں کو پسند نہیں کرتا (یعنی یہ رب کیسے ہو سکتا ہے جو خود کو غروب ہونے سے نہ بچا سکا) یہی چاند اور پھر سورج

بارے کہا اور آخر پکار اٹھے:

(یٰقَوْمِ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ--- مُهْتَدُوْنَ) تک **[الأنعام: ۷۹۔ ۸۱]** (میں نے سب سے یکسو ہو کر اپنے آپ کو اُسی ذات کی طرف متوجہ کیا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں) ایک جگہ یوں ارشادِ ربانی ہوا:

(اَفَرَءَیْتُمْ مَّا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمُ الْاَقْدَمُوْنَ فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّیْٓ اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ) [الشعراء: **۷۵۔ ۷۷]** (ابراہیم نے کہا کہ تم نے دیکھا کہ جن کو تم پوجتے رہے ہو؟ تم بھی اور تمہارے اگلے باپ دادا بھی۔ وہ میرے دشمن ہیں لیکن اللہ رب العالمین) اور کہا:

(قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِیْٓ اِبْرٰهِیْمَ --- وَحْدَهٗ) تک [الممتحنة: **۴**] (تمہارے لئے ابراہیم اور ان کے رفقاء میں عمدہ نمونہ ہے) اور فرمایا:

(وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِیْمُ لِاَبِیْهِ وَقَوْمِهٖٓ اِنَّنِیْ بَرَآءٌ مِّمَّا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا الَّذِیْ فَطَرَنِیْ) [الزخرف: **۲۶۔ ۲۷**] (اور جب ابراہیم نے اپنے باپ اور اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ جن چیزوں کو تم پوجتے ہو میں ان سے بیزار ہوں۔ ہاں جس نے مجھ کو پیدا کیا) اور کہا:

(اِذْ قَالَ لِاَبِیْهِ وَقَوْمِهٖ مَا تَعْبُدُوْنَ قَالُوْا نَعْبُدُ اَصْنَامًا فَنَظَلُّ لَهَا عٰكِفِیْنَ--- یَوْمَ الدِّیْنِ) تک [الشعراء: **۷۰۔**] (جب انہوں نے اپنے باپ اور اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ تم کس چیز کو پوجتے ہو؟) تو یہ حضرت خلیل ہیں جنہیں اللہ نے امام الائمہ بنایا، سب انبیاء و رسل اور تمام اہلِ ایمان انہی کے نقشِ قدم پہ مہتدی ہیں، تو انہوں نے کہا **(اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ الخ)** ملاحدہ کے نزدیک جسے انہوں نے اس کا شریک بنایا وہ عینِ حق ہے اس کا غیر نہیں تو ان سے پوچھا جائے اگر تمہاری بات درست ہے تو حضرت ابراہیم نے ان سے اعلانِ براءت کیوں کیا؟ تو ان کی اصل پر دو میں سے ایک امر لازم ہے یا تو بغیر تقیید اور اختصاص کے مظاہر میں سے ہر شئ میں اس کی عبادت کرے اور یہ ان کے نزدیک مکمل (عارف) کا حال ہے تب کسی شئ سے تبری نہ کرے اور یا پھر بعض مظاہر میں اس کی عبادت کرے اور بعض میں نہیں اور یہ ان کے مطابق ناقصوں کا فعل ہے! جہاں تک بعض موجودات سے تبری تو مصنف لکھتا ہے اگر قومِ نوح انہیں (یعنی ود، سواع اور یغوث وغیرہم) کا ترک کر دیتے تو اسی بقدر یہ حق کے تارک بنتے اور رسل نے بتوں سے تبری کیا ہے، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ کثیر حق کے تارک بنے اور اللہ سے بھی تبرؤ کیا جس کی طرف انہوں نے خلق کو دعوت دی، ان کے حسبِ زعم مشرکین مرسلین سے حال میں اچھے تھے کیونکہ انہوں نے بعض مظاہر میں اللہ کی عبادت کی اور سب سے انہوں نے اظہارِ براءت نہ کیا جبکہ رسل نے ایسا کیا تھا پھر حضرت ابراہیم کا قول: (وَجَّهْتُ وَجْهِیَ الخ) ان کے اصول پر باطل ٹھہرتا ہے کہ وہ فاطر نہیں ہے کیونکہ

سموات وارض اس کا غیر نہیں تو یہ لوگ اس فرمانِ خداوندی کا کتنا مصداق ہیں:

﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ﴾ الآیۃ[النساء : ۵۱] (بھلا تم نے اُن لوگوں کونہیں دیکھا جن کو کتاب سے حصہ دیا گیا ہے کہ بتوں اور شیطان کو مانتے ہیں) پھر حضرت ابراہیم کا قول:

﴿وَكَيْفَ اَخَافُ مَاۤ اَشْرَكْتُمْ وَلَا تَخَافُوْنَ اَنَّكُمْ اَشْرَكْتُمْ بِاللّٰهِ﴾ الآیۃ[الأنعام : ۸۱] (بھلا میں اُن چیزوں سے جن کو تم شریک بناتے ہو کیونکر ڈروں جب کہ تم اس سے نہیں ڈرتے کہ اللہ کے ساتھ شریک بناتے ہو) اور یہ اللہ کی حضرت ابراہیم کو ان کی قوم کے خلاف عطا کردہ حجت ہے کہ کہا میں کیوں خوف کھاؤں ان سے جن کی تم اللہ کے سوا عبادت کرتے ہو؟ اور اس کے سوا عبادت کی جانے والی مخلوقات! جبکہ ان کے مطابق یہ اس کے سوا معبود نہیں ہیں (بلکہ یہ عین اللہ ہیں) تو جو ان سے نہ ڈرا وہ گویا اللہ سے نہ ڈرا تو معنی یہ ہوا کہ رسل اللہ سے نہ ڈرتے تھے (والعیاذ باللہ) حضرت ابراہیم کا یہ قول: (**اَنَّكُمْ اَشْرَكْتُمْ بِاللّٰهِ الخ**) ان کے نزدیک صحیح نہیں کیونکہ انہوں نے اللہ کے ساتھ کسی شئ کو شریک نہ کیا تھا کیونکہ یہاں کوئی اس کا غیر ہے ہی نہیں کہ شرک کا سوال پیدا ہو بلکہ جس معبود کی انہوں نے عبادت کی وہ اللہ تھا، زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے بعض مظاہرِ کائنات میں اللہ کی عبادت کی، اس کا مطلب یہ نہیں کہ شرک کا سوال پیدا ہو بلکہ جس معبود کی انہوں نے عبادت کی وہ اللہ تھا، زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے اس کے غیر کو عبادت میں اس کا شریک ٹھہرایا، اللہ تعالیٰ کے فرمان:

﴿اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْۤا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ﴾[الأنعام :۸۲] (جو لوگ ایمان لائے اور اپنے ایمان کو ظلم سے مخلوط نہیں کیا اُن کیلئے امن ہے اور وہی ہدایت پانے والے ہیں) کی تفسیر میں صحیحین میں عبد اللہ بن مسعود سے وارد ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہ کرام پر یہ بڑی شاق گزری انہوں نے کہا ہم میں سے کون ہے جو اپنے نفس پر ظلم نہ کرتا ہو؟ اس پر نبی کریم نے فرمایا کیا تم نے ایک مردِ صالح کا یہ قول نہیں سنا: (**يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ﴾** [لقمٰن : **۱۳**] (اے بیٹے اللہ کے ساتھ شرک نہ کرنا شرک تو بڑا ظلم ہے) تو نبی کریم نے آگہی دی کہ شرک ظلمِ عظیم ہے اور امن اس کیلئے ہے جو اللہ پر ایمان لایا اور اپنے ایمان کے ساتھ شرک کو خلط نہ کیا، ان ملاحدہ کے زعم پر ان لوگوں کا ایمان ہی جنہوں نے اسے شرک کے ساتھ خلط کیا، کامل اور تام ایمان ہے، یہ ان کی نظر میں محقق عارف کا ایمان ہے کیونکہ جو اللہ کے ساتھ تمام مظاہر میں ایمان لایا اور ہر موجود میں اس کی عبادت کی وہ بنسبت دیگر کے اکمل ہے، ان کے نزدیک متصور نہیں کہ اللہ موجود ہو مگر مخلوق میں تو جس نے اصلاً ہی مخلوقات میں سے کسی شئ میں اس کی عبادت نہ کی اس نے فی الحقیقت اصلاً ہی اس کی عبادت نہ کی! جب وہ اطلاق کریں کہ وہ اس کا عابد ہے تو یہ ایسا لفظ ہے جس کیلئے کوئی معنی نہیں یعنی اگر اسے تخصیص کے ساتھ مفسر کریں تو تخصیص کے ساتھ اس معنی میں ہوگا کہ اس نے بعض مظاہر کو عبادت کے ساتھ مخصص کیا ہے اور یہ ان کی نظر میں نقص ہے

نہ کہ اس جہت سے جو اس نے اسے شریک بنایا اور عبادت کی بلکہ اس جہت سے کہ جو اس نے (مظاہر میں سے) ترک کیا تو ان کے نزدیک شرک میں نہ ظلم ہے اور نہ نقص مگر اس کی قلت کی جہت سے! وگرنہ شرک جتنا عام ہوگا اتنا ہی وہ افضل و اکمل ہوگا، اسی طرح حضرت خلیل کا اپنی قوم سے یہ کہنا:

(اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ) (ابھی گزری) ان کی نظر میں اس حق سے تبری ہے جو ان میں اور ان کے آلہہ میں ظاہر ہوا، اسی طرح ان کا کفر اور معادات ان کے نزدیک حق کا کفر اور اس کی معادات ہے پھر ان کا قول: **(حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ)** بے معنی کلام ہے کیونکہ وہ اللہ وحدہ پر ہی ایمان والے تھے کیونکہ ان کے نزدیک اللہ کا غیر متصور ہی نہیں، ان کی غایت یہ ہے کہ بعض مظاہر میں اللہ کی عبادت کی اور بعض مظاہر کا ترک کیا بغیر اس کا ان میں انکار کئے تو حضرت ابراہیم کے قصہ میں جس قدر لوگوں کے معبودوں کی ان کی طرف سے معادات ہے وہ ان کی نظر میں اللہ کیلئے معادات ہے کیونکہ غیر اللہ کبھی معبود نہیں رہا

تو یہ ان کی طرف سے اللہ کی آیات میں الحاد اور کلم کی ان کے مواضع سے تحریف اور اللہ پر کذب وافتراء ہے **(وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ)** [الإسراء : **۲۳**] (اور تمہارے رب نے ارشاد فرمایا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو) میں اہلِ اسلام کے ہاں بالا جماع **(قَضٰى)** بمعنی تقدیر وتکوین نہیں بلکہ ہر ذی عقل وشعور کے نزدیک حتی کہ کہا جائے اللہ نے جو مقدر کیا ہے وہ بالضرور واقع ہوتا ہے، یہ دراصل (اَمَــرَ) کے معنی میں ہے اور اللہ جس چیز کا حکم دیتا ہے بعض لوگ اسے مانتے اور بعض نہیں مانتے تو اس تحریف میں غور کرو، اسی طرح مصنف کا قول: (مَـاحَكَمَ اللّٰهُ بِشَيْءٍ إِلَّا وَقَعَ) (یعنی اللہ کسی چیز کا فیصلہ نہیں کرتا مگر وہ واقع ہوتی ہے) مجمل کلام ہے، حکم امرِ دینی کے معنی میں ہوتا ہے اور یہ شرعی احکام ہیں جیسے اس کا قول:

(يٰٓاَيُّهَاالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ) الآیۃ [المائدۃ : **۱**] (اے ایمان والو! اپنے اقراروں کو پورا کرو تمہارے لئے چار پائے جانور حلال کر دیئے گئے ہیں) اور: **(وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا)** [المائدۃ: ۵۰] (اور جو یقین رکھتے ہیں ان کیلئے اللہ سے اچھا فیصلہ کس کا ہے؟) اور: **(ذٰلِكُمْ حُكْمُ اللّٰهِ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ)** [الممتحنۃ:] حکم بالحق، بالتکوین اور بالفعل ہوتا ہے جیسے کہا:

(فَلَنْ اَبْرَحَ الْاَرْضَ حَتّٰى يَاْذَنَ لِيْٓ اَبِيْٓ اَوْ يَحْكُمَ اللّٰهُ لِيْ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ) [یوسف : ۸۰] (تو جب تک والد صاحب مجھے حکم نہ دیں میں تو اس جگہ سے ہلنے کا نہیں یا اللہ تعالیٰ میرے لئے کوئی اور تدبیر کرے اور وہ سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے) اور یہ آیت: **(قٰلَ رَبِّ احْكُمْ بِالْحَقِّ)[الأنبياء : ۱۱۲]** (کہا اے میرے رب! حق کے ساتھ فیصلہ کر دے) اسی لئے بعض سلف نے اسے (یعنی: وَقَضىٰ رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْا الخ کو) یوں پڑھا: **(وَ وَصّٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ**

اِیَّــــــــاہُ﴾ اسے ثعلب نے ابن عباس سے ذکر کیا اور لکھا کہ بعض مصاحف میں اسی طرح لکھا ہے اسی لئے سیاقِ کلام میں کہا:

﴿**وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا**﴾ اور اپنا امر اور وصایا پیش کیا تا آنکہ کہا:

﴿**ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ وَلَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰـهًا اٰخَرَ فَتُلْقٰى فِیْ جَهَنَّمَ مَلُوْمًا مَّدْحُوْرًا**﴾[الإسراء : **۳۹**] (یہ اُن میں سے ہیں جو اللہ نے دانائی کی باتیں تمہاری طرف وحی کی ہیں، اللہ کیساتھ کوئی اور معبود نہ بنانا کہ ملامت زدہ اور راندہ بنا کر جہنم میں ڈال دئے جاؤ گے) تو کلام کا اختتام بھی اسی انداز میں کیا جس کے ساتھ افتتاح کیا تھا، توحید کا امر دینے اور شرک سے نہی کے ساتھ تو یہ اخبار نہیں کہ ہر کوئی صرف اللہ کی ہی عبادت کرے گا اور یہ اللہ نے مقدر کر رکھا ہے اور یہ تکوینی حقیقت ہے، یہ کیونکر؟ جبکہ کہا:﴿**وَلَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰـهًا اٰخَرَ**﴾ جبکہ ان کا کہنا ہے کہ کائنات میں کوئی اس کا غیر ہے ہی نہیں کہ اسے (آخــر) کہا جائے تو جس بھی شیٔ کی بندے عبادت کریں وہ نفسِ الٰہ ہے کوئی اس کا غیر نہیں اور اللہ ہر عابد اور ہر معبود کا عین ہے، اسی طرح قولہ:

﴿**لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّیْ وَ عَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ**﴾[الممتحنة : **۱**] (مومنو اگر تم میری راہ میں لڑنے اور میری خوشنودی طلب کرنے کے لئے نکلے ہو تو میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست مت بناؤ کہ تم تو ان کو دوستی کے پیغام بھیجو) ان کے زعم میں یہاں اصلاً ہی کوئی اللہ کا عدو نہیں کیونکہ کوئی اس کا غیر اور سوا ہی نہیں کہ کسی کو اس کا عدو تصور کیا جائے یا ان ذوات کا عدو جن میں وہ ظاہر ہوا

(۶) ان کے نزدیک بندوں کو اللہ کی طرف دعوت دینا ان کے ساتھ مکر کرنا ہے جیسا کہ تصریح کی جب لکھا: بے شک دعوت الی اللہ مدعو کے ساتھ مکر ہے کیونکہ وہ ابتداء سے معدوم ہی نہیں کہ غایت تک دعوت دی جائے، نیز لکھا: **وَ بَشِّرِ الْمُخْبِتِيْنَ**[الحج: **۳۴**] (اور عاجزی کرنے والوں کو خوشخبری سنا دو) وہ لوگ جن کی نارِ طبیعت بجھ گئی تو الٰہ کہا اور طبیعت نہ کہا،﴿**وَقَدْ اَضَلُّوْا كَثِيْرًا**﴾[نوح: **۲۴**] (انہوں نے بہت لوگوں کو گمراہ کر دیا ہے) یعنی انہیں حیران کیا واحد کو وجوہ اور نسب میں متعدد کر کے (**وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِيْنَ**) [**نوح: ۲۴**] (اور تو نہ زیادہ کرنا بے انصافوں کو مگر بھٹکنے میں) وہ چنے ہوئے جو کتاب کے وارث بنائے گئے تو وہ تین میں سے اول ہیں تو مقتصد اور سابق پر انہیں مقدم کیا﴿**اِلَّا ضَلٰلًا**﴾ یعنی (إِلَّا حَيْـرَةً) محمدی میں ہے(یعنی دعائے محمدی):(زِدْنِـيْ فِيْكَ تَحَيُّراً) (میری حیرت کو اور زیادہ کر) (﴿**كُلَّمَآ اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيْهِ وَاِذَآ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا**﴾ [**البقرة: ۲۰**] (جب بجلی ان پر روشنی ڈالتی ہے تو اس میں چل پڑتے ہیں اور جب اندھیرا ہو جاتا ہے تو کھڑے کے کھڑے رہ جاتے ہیں) تو محیر کے لئے دَور (گردش) ہے اور حرکتِ دوریہ قطب کے گرد مسلسل ہے اور مستطیل طریق والا، مائل، مقصود سے خارج، اس میں جو ہے اس کا طالب، صاحبِ خیال اس کی طرف غایت ہے تو اس کیلئے (مِنْ) اور (إِلىٰ) اور (ما بينهما) ہے اور حرکتِ دوریہ والے کیلئے کوئی ابتدا نہیں کہ

اسے (من) لازم آئے اور کوئی غایت بھی نہیں کہ (إلی) کے ساتھ اس پر حکم لگایا جائے تو اس کیلئے اتم وجود ہے اور وہی جوامع الکلم دیا گیا ہے، ان کے بعض شعراء نے کہا:

مَا بَالُ عِيْسِكَ لَا يَقِرُّ قَرَارُهَا وَ اِلَامَ ضَلْلُكَ لَا يَنِىْ مُتَنَقِّلاً

فَلَسَوْفَ تَعْلَمُ اَنَّ سَيْرَكَ لَمْ يَكُنْ اِلَّا اِلَيْكَ اِذَا بَلَغْتَ الْمَنْزِلاَ

(ص: ۴۸ میں گزرے ہیں) تو ان کے نزدیک انسان خود ہی اپنے آپ کی غایت ہے اور وہ اپنے آپ کا معبود ہے اس کے وراء کوئی شئ نہیں جس کی وہ عبادت کرے یا اس کا قصد کرے یا اسے دعوت دے یا اس کی پکار پر لبیک کہے لہذا ان کے نظریات درحقیقت فرعون کے نظریات ہیں، میں ہمیشہ اپنے ملاقاتیوں سے یہ کہتا رہا کہ ان کا قول قولِ فرعون کی حقیقت ہے حتی کہ مجھے ثقہ عارفین میں سے ایک صاحب نے بیان کیا کہ ان کے بعض کبراء نے جب مجھے اپنے مذہب کی طرف دعوت دی اور اپنے نظریات کی حقیقت کی آ گہی دی تو میں نے اس کی سب باتیں سن کر کہا یہ تو فرعون کہتا رہا، بولا ہاں ہم فرعون کے نظریہ پر ہیں، یہ سن کر میں نے کہا الحمد للہ کہ انہوں نے اس کا اعتراف کرلیا تو جب فریقِ مخالف اقرار ہی کرلے تو اب کسی ثبوت کی کیا ضرورت رہی؟ اس نے (مذکورہ بالا تحریر میں) مستطیل طریق والے کو صاحبِ خیال قرار دیا اور متدیر وحائر حرکت کی تعریف کی حالانکہ قرآن صراطِ مستقیم کا حکم دیتا، اس کی تعریف کرتا اور اسے اختیار کرنے والوں کی ثناء وتوصیف کرتا ہے نہ کہ متدیر کی چنانچہ کہا: (**اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْم**) اور:

(وَ اَنَّ هٰذَا صِرَاطِىْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ)[الأنعام: ۱۵۳] (اور یہ کہ میرا سیدھا راستہ یہی ہے تو تم اسی پر چلنا اور دوسرے راستوں پر نہ چلنا) اور:

(وَلَوْ اَنَّهُمْ فَعَلُوْا مَا يُوْعَظُوْنَ بِهٖ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَشَدَّ تَثْبِيْتًا) الآیۃ **[النساء: ۶۶]** (اور اگر یہ اُس نصیحت پر کاربند ہوتے جو ان کو کی جاتی ہے تو ان کے حق میں بہتر اور زیادہ ثابت قدمی کا موجب ہوتا)، حضرات موسی وہارون بارے کہا:

وَ اٰتَيْنٰهُمَا الْكِتٰبَ الْمُسْتَبِيْنَ وَهَدَيْنٰهُمَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْم) [الصافات: **۱۱۷۔۱۱۸**] (اور ان دونوں کو واضح کتاب عنایت کی۔ اور ان کو سیدھا راستہ دکھایا) اور فرمایا:

(وَهٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيْمًا قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ)[الأنعام: **۱۲۶**] (اور یہی تمہارے رب کا سیدھا راستہ ہے جو لوگ غور کرنے والے ہیں ان کیلئے ہم نے اپنی آیتیں کھول کھول کر بیان کر دی ہیں) ابلیس کے قصہ میں ہے کہ اس نے کہا:

(وَلَقَدْ صَدَّقَ عَلَيْهِمْ اِبْلِيْسُ ظَنَّهٗ فَاتَّبَعُوْهُ اِلَّا فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ) [سبأ: **۲۰**] (اور شیطان نے ان کے بارے میں اپنا خیال سچ کر دکھایا کہ مومنوں کی ایک جماعت کے سوا وہ اس کے پیچھے چل پڑے) تو یہی ملحد اس آیت کریم کا مصداق بنے ہوئے ہیں، شیطان نے صراطِ مستقیم پر ان کا راستہ روک رکھا ہے حتی کہ اپنے رب کے منکر بنے اور عقیدہ رکھا کہ ان کے نفوس ہی

ان کے معبود اور الٰہ ہیں اللہ تعالیٰ نے خاتم الرسل کے حق میں فرمایا:

﴿ وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ صِرَاطِ اللّٰهِ﴾ الآیۃ[الشوریٰ: ۵۲۔ ۵۳] (اور بے شک تم سیدھا راستہ دکھاتے ہو۔ اللہ کا راستہ) نیز ارشاد ہوا:

﴿وَ رُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ﴾[یونس: ۳۰] (اور وہ اپنے سچے مالک کی طرف لوٹائے جائیں گے اور جو کچھ وہ بہتان باندھا کرتے تھے سب اُن سے جاتا رہے گا) اور فرمایا:

﴿ اِنَّ اِلَيْنَآ اِيَابَهُمْ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ﴾[الأعلی : ۲۵۔ ۲۶] (بے شک ان کو ہمارے پاس لوٹ کر آنا ہے۔ پھر ہم ہی کو ان سے حساب لینا ہے) اور کہا: ﴿اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا﴾[المائدۃ : ۱۰۵] (تم سب کو اللہ کی طرف لوٹ کر جانا ہے) اور: ﴿يٰٓاَيُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِيْهِ﴾[الانشقاق : ۶] (اے انسان! تو اپنے رب کی طرف خوب کوشش کرتا ہے سو اس سے جا ملے گا) جبکہ یہ باور کئے بیٹھے ہیں کہ ہر جگہ ایک ہی وجود ہے، اللہ ہر ایک کے اندر ہے وہ کسی اور کی طرف رد نہیں ہو رہا بلکہ اپنے آپ کی طرف، لوگوں نے ہمیں بیان کیا کہ ابن فارض پر جب عالمِ نزع طاری ہوا تو یہ دو شعر پڑھے:

إِنْ كَانَ مَنْزِلَتِيْ فِي الْحُبِّ عِنْدَكُمُ مَا قَدْ لَقِيْتُ فَقَدْ ضَيَّعْتُ أَيَّامِيْ

أُمْنِيَّةٌ ظَفَرَتْ نَفْسِيْ بِهَا زَمَناً وَالْيَوْمَ أَحْسَبُهَا أَضْغَاثَ أَحْلَامِ

(گزرے) کیونکہ وہ توھُّم کئے ہوئے تھا کہ وہی اللہ ہے اور کوئی اور مراد و مرجع ہے ہی نہیں جس کی طرف واپس جانا ہو تو اب جب دیکھا کہ فرشتے آچکے اور اس کے جسد سے اس کی روح نکال کر کہیں لے جانے کی فکر میں ہیں اور:

﴿وَ بَدَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مَا لَمْ يَكُوْنُوْا يَحْتَسِبُوْنَ﴾ [الزمر: ۴۷] (اور ان پر اللہ کی طرف سے وہ امر ظاہر ہو جائے گا جس کا ان کو خیال بھی نہ تھا) والی کیفیت ہے تو اس پر یہ حقیقت آشکار ہوئی کہ اس کے سب نظریات اور خیالات شیطان کی طرف سے اضغاث احلام تھے، مجھے ایک صاحب نے ایک ایسے شخص کے حوالے سے جسے میں جانتا ہوں اور اس کا ان حضرات سے میل جول ہے، فاجر تلمسانی بارے بیان کیا کہ وہ موت کے وقت سخت متغیر اور مضطرب ہوا، کہتے ہیں میں نے اسے عالم نزع میں پایا کہ آہیں بھرتا تھا، میں نے کہا کیا وجہ ہے؟ کہا موت کے ڈر سے، میں نے کہا سبحان اللہ تمہارے جیسا فوت سے خوف کھاتا ہے جبکہ تم فقیر کو خلوت میں داخل کر کے تین ایام میں اسے اللہ سے ملاتے تھے؟ تو اس نے کہا وہ سب کچھ زائل ہوا اور اب مجھ پر منکشف ہوا ہے کہ ان باتوں کی (یعنی جو ہم کرتے رہے) کوئی حقیقت نہیں

(۸) ان کے نزدیک ایسے اشخاص جنہوں نے الوہیت کا دعوی کیا مثلاً فرعون اور دجالِ منتظر یا جس بشر کی بابت دعوی کیا گیا اور وہ اولیاء اللہ میں سے نبی ہے مثلاً حضرت مسیحؑ یا غیرِ نبی مثلاً حضرت علیؓ یا وہ اولیاء اللہ میں سے نہیں جیسے حاکمِ مصر وغیرہم تو ان ملاحدہ

میں سے بعض کی نظر میں یہ سب دعوے درست ہیں، مصنف فصوص نے اس طرح کے دعوی کے درست ہونے کی تصریح کی ہے، یہ عموما **فرعون کی تعظیم کرتے ہیں** تو کفر میں ان کیلئے اس جیسا نہیں گزرا اور نہ آنے والوں میں کانے کذاب دجال کی مثل، یہ لوگ عام اہلِ اسلام کے سامنے منافقت کرتے ہوئے اور ایمان ظاہر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ حالتِ ایمان میں فوت ہوا تھا اور وہ جہنم میں نہ جائے گا اور کہتے ہیں قرآن میں کچھ ایسا نہیں جو ان کے دخولِ نار پر دال ہو، یہ تو وہ بات ہے جو وہ لوگوں کے سامنے کہتے ہیں جبکہ حقیقتِ امر میں فرعون ان کے نزدیک عارف باللہ بلکہ اللہ تھا، ان کے نزدیک کسی ایسی نار کا اصلاً ہی وجود نہیں جس میں الم ہو، آگے اس کا بیان ہوگا اور بدعات ہی اہلِ نفاق کی نشانی ہیں جبکہ سنن ایمان کی شعائر ہیں ! مصنف فص الحکمۃ جو کلمہ موسویہ بارے ہے، لکھتا ہے فرعون کا قول: (**وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ**) [الشعراء : **۲۳**] (فرعون نے کہا یہ رب العالمین کیا ہے؟) یہاں ایک سرّ کبیر ہے کہ اس نے بالفعل جواب دیا اسے جس نے حدِ ذات بارے سوال کیا تو اس نے حدِ ذات کو ان صورِ عالم کی طرف جن میں اس کا ظہور ہوا (عین مضاف) بنادیا، گویا اس کے سوال (**وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ**) کے جواب میں کہا: وہ جس میں وہ ظاہر ہوتا ہے، صورِ عالمین ہیں، علو سے اور وہ آسمان ہے اور پستی سے اور وہ زمین ہے (**اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ**) [الشعراء : **۲۴**] (یعنی اگر تم لوگ یقین کرو) یا وہ ان کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے! تو جب فرعون نے اپنے درباریوں سے کہا یہ تو مجنون ہے تو یہ اس معنی میں کہ اس سے اس چیز کا علم مستور ہے جس کے بارہ میں میں نے اس سے پوچھا ہے کیونکہ متصور ہی نہیں کہ وہ اصلاً اس کے عالم ہوں تو حضرت موسی نے بیان میں اضافہ کیا تا کہ فرعون علمِ الٰہی کے باب میں ان کا رتبہ جان لے کیونکہ جانتے تھے کہ فرعون یہ جانتا ہے، تو کہا: (**رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَيْنَهُمَا**) [الشعراء : **۲۸**] (مشرق اور مغرب اور جو کچھ ان دونوں میں ہے سب کا مالک) تو ظاہر و مستور دونوں کا اتیان کیا اور وہ ظاہر و باطن ہے (**وَمَا بَيْنَهُمَا**) اور یہ قولہ: (**وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ**) [البقرة: **۲۹**] (اور وہ ہر چیز سے باخبر ہے) (**اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ**) [الشعراء : **۲۸**] یعنی اگر تم اصحابِ تقیید ہو کیونکہ عقل تقیید ہے

اور اول جواب اہلِ ایقان کا جواب ہے اور وہ اہلِ کشف و وجود ہیں تو کہا: (**اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ**) یعنی اہلِ کشف و وجود، تو میں نے وہ تمہیں بتلا دیا ہے جس کا تم اپنے کشف اور وجود میں یقین کرو اور اگر تم اس صنف میں سے نہیں تب تمہارے لئے دوسرا جواب ہے، اگر تم اہلِ عقل و تقیید ہو اور تم نے حق کا حصر کیا ہے اس چیز میں جو تمہاری عقول کا عطیہ ہے تو یوں حضرت موسی نے دونوں وجہیں ذکر کر دیں تا کہ فرعون ان کا علم و فضل جان لے اور موسی کو علم ہو گیا کہ فرعون بھی اس حقیقت سے آگاہ ہے یا اب اسے جان لے گا کیونکہ اس نے ماہیت کے بارہ میں سوال کیا ہے تو جان لیا کہ اس کا سوال قدماء کی اصطلاح پر نہیں ہے اسی لئے یہ جواب دیا، اگر اس کے علاوہ کوئی اور بات ہوتی تو اس کے اس سوال کو خطا قرار دیتے تو جب حضرت موسی نے مسئول عنہ کو عینِ عالم قرار دیا تو فرعون نے انہیں اسی زبان میں مخاطب کیا اور باقی لوگ اسے نہیں سمجھ رہے تھے اور ان سے کہا:

﴿لَئِنِ اتَّخَذْتَ إِلَٰهًا غَيْرِي لَأَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُونِينَ﴾[الشعراء : ۲۹] (کہا کہ اگر تم نے میرے سوا کسی کو معبود بنایا تو میں تمہیں قید کر دوں گا) اور سجن میں سین حروفِ زوائد میں سے ہے تو معنی ہے: (لَأَسْتُرَنَّكَ) (میں ضرور تیرا ستر رکھوں گا) کیونکہ تم نے وہ جواب دیا ہے جس سے میری تائید کی ہے کہ میں اس طرح کی بات کہوں، اگر تم نے اشاراتی زبان میں کہا ہے تو تم نے اے فرعون اپنی مجھے وعید سے ناواقف رہے ہو اور عین واحد ہے تو تم نے کیونکر تفریق کر دی؟ تو فرعون کہتا ہے: میں نے عین کے مراتب کی تفریق کی ہے، عین متفرق نہیں اور نہ اپنی ذات میں منقسم ہے اور میرا مرتبہ اب اے موسیٰ تیری بابت بالفعل تحکم کا ہے جبکہ دیگر میں بالعین ہے اور میں رتبہ کے ساتھ تیرا غیر ہوں، اسی طرح کی (لایعنی) کلام کرتا رہا حتی کہ لکھا: جب فرعون منصبِ حکم میں صاحبِ وقت تھا اور وہ خلیفہ بالسیف تھا اور وہ عرفِ ناموسی میں جائز تھا تو اسی لئے کہا: ﴿أَنَا رَبُّكُمُ الْأَعْلَىٰ﴾[النازعات : ۲۴] (کہنے لگا کہ تمہارا ربِ اعلیٰ ہوں) یعنی اگر چہ سبھی کسی نہ کسی طور ارباب ہیں مگر میں (بادشاہِ وقت ہونے کی حیثیت سے) ربِ اعلیٰ ہوں کیونکہ مجھے تم پر تحکم کی قدرت دی گئی ہے اور جب جادوگروں کو اس کی اس بات کا صدق معلوم تھا تو اس کا انکار نہ کیا بلکہ وہ اس کے مقر ہوئے اور اس سے کہا: ﴿فَاقْضِ مَا أَنتَ قَاضٍ ۖ إِنَّمَا تَقْضِي هَٰذِهِ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا﴾[طٰہ : ۷۲] (تو آپ کو جو حکم دینا ہو دیدیجئے اور آپ حکم دے سکتے ہیں وہ صرف اسی دنیا کی زندگی میں) کیونکہ حکومت تمہارے پاس ہے لہذا اس کا (﴿أَنَا رَبُّكُمُ الْأَعْلَىٰ﴾ کہنا درست تھا اور اگر وہ عینِ حق تھا تو بصورتِ فرعون تھا تو (جادوگروں کے) ہاتھ پاؤں کاٹے گئے اور وہ عینِ حق کے ساتھ مصلوب کئے گئے باطل کی صورت میں ان مراتب کو پانے کیلئے جو نہ پائے جاسکتے مگر اس فعل کے ذریعہ کہ اسباب کی تعطیل کی کوئی سبیل نہیں کیونکہ اعیانِ ثابتہ ان کے مقتضی ہوئے تو یہ وجود میں ظاہر نہیں ہوتے مگر اس صورت کے ساتھ کہ جس پر وہ ثبوت میں ہیں کیونکہ ﴿لَا تَبْدِيلَ لِكَلِمَاتِ اللَّهِ﴾[یونس : ۶۴](اللہ کی باتیں بدلتی نہیں) اور اللہ کا کلمہ بجز اعیانِ موجودات کے کچھ اور نہیں۔

فصل

ان اعظم اصول میں سے جن پر ان اتحادیہ ملحدوں جو تحقیق وعرفان کے مدعی ہیں، کا اعتماد ہے یہ جسے وہ نبی اکرم سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا اللہ تھا اور کوئی شیٔ اس کے ساتھ نہ تھی اور وہ اب اسی (حالت) پہ ہے جس پر تھا، لیکن یہ اضافی (یعنی آخری) جملہ نبی اکرم پر کذب افتراء ہے، محدثین اس کے موضوع اور من گھڑت ہونے پر متفق ہیں، کسی کبیرہ وصغیر حدیث کے ذخیرہ میں یہ موجود نہیں اور نہ کسی ذی علم نے سند کے ساتھ اسے نقل کیا ہے، نہ صحیح نہ ضعیف اور نہ مجہول اسناد، صرف بعض جہمیہ کے متاخرین متکلمین نے پہلی مرتبہ اس کا ذکر کیا جن سے ان ملحدوں نے اسے نقل کر لیا اور یہ غایت درجہ کے تجہم یعنی تعطیل و الحاد میں ہیں، ان کے ہاں یہ مقولہ بھی متداول ہے: (كَانَ اللّٰهُ ولاَ مَكَان ولاَ زَمَان وَهُوَ الآن عَلىٰ مَا عَلَيْهِ كَانَ) (یعنی اللہ لا مکان اور لا زمان تھا اور اب اسی پر ہے جس پر تھا) تو اسی سے اخذ کرتے ہوئے یہ سابق الذکر مقولہ کہہ دیا اور ان میں سے اسلام

کے اَعلم یعنی ابن عربی نے اعتراف کیا ہے کہ یہ جملہ کلامِ نبوی میں سے نہیں چنانچہ اپنی کتاب (مَا لَا بُدَّ لِلْمُرِیْدِ مِنْهُ) (مرید کے لئے ضروری ہدایات) میں لکھتا ہے: اسی طرح سنت میں وارد ہے کہ (كَانَ اللّٰهُ وَلَا شَیْءَ مَعَهٗ) اورعلماء نے اس پر یہ اضافہ کیا: (وَهُوَ الآن عَلیٰ مَا عَلَیْهِ کَانَ) تو اس کی خلق سے اس کی طرف کوئی ایسا وصف راجع نہیں جس پر وہ نہ تھا اور نہ عالمِ موجود تو اس میں وجودِ عالم کے باوصف تنزیہہ کا اعتقاد رکھا گیا جو تم رکھتے ہو اور اس کے سوا نہ کوئی عالَم ہے اور نہ شیٔ، یہ جو اس نے کہا اسی کے اہلِ قبلہ کے کثیر متکلمین قائل ہیں، اگر اس پر یہ جملہ ثابت ہو تو اس کا قول دیگر اس کے اقوال کی جنس سے ہے لیکن یہ متناقض ہے اسی لئے اتحادیہ کے سرخیل فاجر تلمسانی ابن عربی کی ان تحاریر کا رد کرتا ہے جن میں وہ مسلمانوں کے قریب ہوتا ہے، اسی طرح مسلمان بھی اس کی ان تحاریر کا رد کرتے ہیں جن میں وہ اتحادیہ کے (نظریات کے) قریب ہوتا ہے! نبی اکرم سے اس ضمن میں جو حدیث منقول ہے اسے بخاری نے حضرت عمران بن حصین سے نقل کیا کہ آنجناب نے فرمایا: (كَانَ اللّٰهُ وَلَمْ يَكُنْ شَیْءٌ قَبْلَهٗ وَكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَاءِ وَكَتَبَ فِی الذِّكْرِ كُلَّ شَیْءٍ ثُمَّ خَلَقَ السَّمٰوَاتِ وَالأَرْضَ) (یہ حدیث گزری ہے) اور یہ الحادی اضافہ یعنی (وَهُوَ الآن عَلیٰ مَا عَلَیْهِ کَانَ) کے ساتھ جہمی متکلمین نے نفیِ صفات کا قصد کیا ہے، وہ صفات جن کے ساتھ اس نے اپنے آپ کا وصف کیا مثلاً اس کا عرش پر مستوی ہونا اور آسمانِ دنیا کی طرف اس کا نزول وغیرہ تو انہوں نے کہا: وہ ازل میں عرش پر مستوی نہ تھا اور اس کی اب بھی وہی حالت وہیئت ہے جو (ازل میں) تھی تو وہ عرش پر نہیں ہے کیونکہ ایسا کہنا تحول وتغیر کا مقتضی ہے، اہل سنت واثبات نے اس کے دو معروف جواب دئے ہیں:

۱۔ کہ متجد داس کے اور عرش کے مابین معیت کے بمنزلہ نسبت اور اضافت ہے، ابن عقیل نے انہیں احوال کا نام دیا اور نسب و اضافات (یعنی احوال و کیفیات) کے تجدد کے اس کے لئے اثبات پر روئے زمین کے تمام اہلِ اسلام وغیرہم کا اتفاق ہے کیونکہ یہ تغیر اور استحالت کو مقتضی نہیں

۲۔ یہ اگرچہ ایک سے دوسرے حال اور ایک سے دوسری شان کی طرف تحول کو مقتضی ہے جیسے قرآن نے کہا: (**كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِىْ شَاْنٍ**)[الرحمٰن: **۲۹**] (وہ ہر روز ایک شأن ـ حال ـ میں ہے) تو یہ اس کے آنے، نزول کرنے، حضرت موسیٰ سے کلام کرنے اور روزِ قیامت ایک خاص صورت میں نمودار ہونے وغیرہ جن کا ذکر نصوص میں آیا ہے، کی مثل ہے اسی کے اکثر اہل سنت و حدیث اور کثیر اہلِ کلام قائل ہیں اور یہی تمام فرقوں کو لازم ہے! ہم نے اس بابت اختلافِ آراء کا ذکر قاعدہ (اَلْفَرْقُ بَيْنَ الصِّفَاتِ وَالْمَخْلُوْقَات والصفاتِ الْفِعْلِیَّةِ) میں کیا ہے

جہاں تک جہمی اتحادیہ تو وہ قائل ہیں کہ اب وہ اسی حال وہیئت پر ہے جس پر تھا جب کوئی اس کا غیر نہ تھا یعنی ازل میں جب اس کے سوا کوئی شیٔ نہ تھی تو اس پر بناء کرتے ہوئے کہا: کائنات اس کا غیر اور سوا نہیں، بس وہ ہی وہ ہے، اس کے ساتھ کوئی

اورشئ نہیں، نہ ازلاً اور نہ ابداً بلکہ وہ عینِ موجودات اورنفسِ کائنات ہے، انہوں نے مخلوقات ومصنوعات کوعینِ خالق و باری اورعینِ مصدرقراردیاہے اوروہ ہمیشہ اسی جملہ(وَهُوَ الآن الخ) کا تکرار کرتے رہتے ہیں اور یہ ان کے نزدیک قل ھواللہ احداورآیۃ الکرسی سے اجل ہے کیونکہ اس میں اتحادِ ذات کی دلالت ہے جوان حضرات کا الحاد ہے اوروہ اسے نبی اکرم سے ثابت باور کرتے ہیں کہ یہ آپ کی کلام اورآپ کی معرفت کے اسرار میں سے ہے اورہم واضح کر چکے کہ یہ جملہ موضوع، من گھڑت اور نبی اکرم پر کذب و افتراء ہے، یہ صرف اہلِ تجہم سے ہی یہ منقول ومعروف ہےاور جو جملہ کتبِ حدیث میں ہے وہ بس اتنا ہے:(كَانَ اللّٰهُ وَلاَ شَيْءَ مَعَهُ وَكَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَاءِ كَتَبَ فِي الذِّكْرِ كُلَّ شَيْءٍ) یہ دراصل ارض وسماوات اورملائکہ اورجن وانس وغیرہ مخلوقات کے اس وقت وجود کی نفی کرتا ہے مگرعرش کے وجود کی نفی نہیں کرتا کیونکہ کہا: (وکان عرشه الخ) اسی لئے کثیرسلف وخلف سمجھتے ہیں کہ عرش (کا وجود) قلم ولوح پر مقدم ہے، ان کا اسی حدیث سے یہ استدلال ہے، آپ کے قول:(أَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰهُ الْقَلَمَ فَقَالَ لَهُ اُكْتُبْ... الخ) کواس آیتِ کریمہ میں مذکورخلق پر محمول کیا ہے:

(**وَهُوَالَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ وَّكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ[هود: ۷]** (اوروہی تو ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں بنایا ہے اور اس کا عرش پانی پر تھا) اور یہ ابورزین عقیلی کی مسانید وسنن میں موجود مشہور حدیث کی نظیر ہے، کہتے ہیں میں نے نبی اکرم سے پوچھا تخلیقِ کائنات سے قبل ہمارا رب کہاں تھا؟ فرمایا:(كَانَ فِيْ عَمَاءٍ مَا فَوْقَهُ هَوَاءٌ وَمَا تَحْتَهُ هَوَاءٌ ثُمَّ خَلَقَ عَرْشَهُ عَلَى الْمَاءِ) (وہ بادل میں تھا جواس کے اوپر وہ بھی ہوا اور جواس کے نیچے وہ بھی ہوا تھی پھراس نے اپنا عرش پانی پر پیدا کیا) تواس حدیث میں مذکورخلق میں یہ عماء داخل نہیں، ان کے بعض نے ذکرکیا کہ یہ(یعنی عماء) اس آیت میں مذکورسحاب ہے:

(**هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ)[البقرة: ۲۱۰]** (کیا یہ لوگ اسی بات کے منتظر ہیں کہ ان پر اللہ بادل کے سائبانوں میں آنازل ہو) اوراس بابت معروف آثار ہیں، ان کے اس مذکورہ مقولہ کا کتاب وسنت اوراجماع کے مخالف ہونا اوراس کا بطلان کئی وجوہ سے ظاہر ہے:

اول: اللہ نے قرآن میں کئی جگہ عموماوخصوصا خبردی ہے کہ وہ اپنے بندوں کے ساتھ ہے مثلااس کا یہ قول:(**هُوَالَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ)[الحديد: ۴]** (وہی ہے جس نے آسمانوں اورزمین کو چھ دن میں پیدا کیا پھرعرش پر جاٹھہرا) آگے کہا:(**وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ**) اوراس کا قول:(**اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ**)[النحل: **۱۲۸**] (بےشک نہیں کہ جو پرہیزگار ہیں اور جو احسان کرنے والے ہیں اللہ اُن کے ساتھ ہے) اور: (**وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ)[البقرة: ۲۴۹]** (اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے) دوجگہ، اور: (**اِنَّنِيْ**

﴿مَعَكُمَا أَسْمَعُ وَأَرٰى﴾[طٰهٰ: ۴۶] (میں تمہارے ساتھ ہوں سنتا اور دیکھتا ہوں) **﴿لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا﴾[التوبة :۴۰]** (اللہ ہمارے ساتھ ہے) **﴿وَقَالَ اللّٰهُ إِنِّيْ مَعَكُمْ﴾[المائدة :۱۲]** (اور اللہ نے فرمایا میں تمہارے ساتھ ہوں) **﴿إِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ﴾[الشعراء :۶۲]** (میرا رب میرے ساتھ ہے وہ مجھے راستہ سجھائے گا) نبی اکرم سفر پر روانہ ہوتے وقت یہ دعا فرماتے: (اَللّٰهُمَّ اَنْتَ الصَّاحِبُ فِي السَّفَرِ وَالْخَلِيْفَةُ فِي الْأَهْلِ اَللّٰهُمَّ اصْحَبْنَا فِيْ سَفَرِنَا وَاخْلُفْنَا فِيْ اَهْلِنَا) (اے اللہ تو ہی سفر میں ساتھی اور اہل میں جانشین ہے، اے اللہ تو ہمارے اس سفر میں ہمارا ساتھی بن اور ہمارے اہل میں نگہبان) تو اگر خلق عموما اور خصوصا اس کا غیر نہیں اور نہ وہ اس کے ساتھ ہیں بلکہ اس کے ساتھ کوئی شئ نہیں تو ممتنع ہے کہ (ان آثار سے مراد یہ ہو کہ) وہ اپنے نفس و ذات کے ساتھ ہے کیونکہ معیت دو اشیاء کی موجب ہے: ایک کا دوسرے کے ساتھ ہونا تو جب اللہ نے خبر دی کہ وہ ان کے ساتھ ہے تو ان کے اس قول: (هُوَ الآنَ عَلٰى مَا عَلَيْهِ كَانَ) کا بطلان ظاہر ہوا اور اس اعتقاد کا بھی کہ وہ عینِ مخلوقات ہے! نیز معیت طرفین سے ہوتی ہے کیونکہ اس کا معنی ہے: مقارنت اور مصاحبت تو جب دو میں سے ایک شئ دوسری کے ساتھ ہو تو ممتنع ہے کہ دوسری شئ اس کے ساتھ نہ ہو لہذا ممتنع ہے کہ اللہ اپنی خلق کے ساتھ ہو اور خلق کا اس کے ساتھ وجود نہ ہو اور ان کی اصلاً ہی کوئی حقیقت نہ ہو بلکہ وہ وہی ہوں (یعنی من تو شدم تو من شدی)

دوم: اللہ نے اپنی کتاب میں کہا: **﴿وَلَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ إِلٰهًا اٰخَرَ فَتُلْقٰى فِيْ جَهَنَّمَ مَلُوْمًا مَّدْحُوْرًا﴾[الإسراء : ۳۹]** (اور اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود نہ بنانا کہ ملامت زدہ اور راندہ بنا کر جہنم میں ڈال دیئے جاؤ گے) اور کہا:

﴿فَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ إِلٰهًا اٰخَرَ فَتَكُوْنَ مِنَ الْمُعَذَّبِيْنَ﴾ [الشعراء: **۲۱۳**] (پس اللہ کے سوا کسی اور معبود کو مت پکارنا ورنہ تمہیں عذاب دیا جائے گا) اور: (**وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ إِلٰهًا اٰخَرَ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ﴾** [القصص : **۸۸**] (اور اللہ کے ساتھ کسی اور کو معبود نہ پکارنا اُس کے سوا کوئی معبود نہیں اُس کی ذات کے سوا ہر چیز فنا ہونے والی ہے) تو آپ کو منع کیا کہ آپ اس کے ساتھ کوئی اور الہ بنائیں یا اسے پکاریں، اس سے منع نہیں کیا کہ اس کے ساتھ کسی مخلوق کا اثبات کریں یا کہیں: اس کے ساتھ کوئی عبد مملوک یا مربوب فقیر ہے یا کوئی بھی خلق میں سے جیسے کہ: (**لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ**) یہ نہیں کہا: **(لَا مَوْجُوْدَ إِلَّا هُوَ)** یا **(لَا هُوَ إِلَّا هُوَ)** یا **(لَا شَيْءَ مَعَهُ إِلَّا هُوَ)** اس معنی میں کہ وہ نفسِ موجودات اور ان کا عین ہے اور یہ جیسے کہا: (**وَإِلٰهُكُمْ إِلٰهٌ وَّاحِدٌ﴾[البقرة: ۱۶۳]** (اور تمہارا معبود ایک ہی ہے) تو الوہیت میں اپنی وحدانیت کا اثبات کیا، یہ نہیں کہا کہ موجودات واحد ہیں تو یہ توحید ہی جو کتاب اللہ میں ہے توحیدِ الوہیت ہے اور وہ یہ کہ اس کے ساتھ کسی اور الہ کو نہ پکاریں اور نہ ایسا بنائیں تو اس میں اور یہ تصور کرنے میں کتنا بُعد اور فرق ہے کہ وہ نفسِ وجود ہے، نیز آپ کو اس امر سے منع کرنا کہ اس کے ساتھ کوئی اور الہ بنائیں یا پکاریں، اس امر کی دلیل ہے کہ یہ ممکن ہے جیسے مشرکین نے کیا جو اللہ کے ساتھ اور آلہہ کو (بھی) پکارتے

تھے تو اگر یہ آلہہ وہی ہیں اور اس کے ساتھ اصلاً ہی کوئی شئ نہیں تو ممتنع ہو کہ اس کے ساتھ اور آلہہ کو پکارا جاس کے! تو یہ نصوص دال ہیں کہ اس کے ساتھ اشیاء ہیں مگر وہ آلہہ نہیں اور انہیں آلہہ باور کرنا روانہیں نیز ان ملاحدہ کے نزدیک جائز ہے کہ ہر شئ کی عبادت کی جائے اور ہر شئ کو (بطورِالہ) پکارا جائے کیونکہ ان کے نزدیک اس کے غیر کی عبادت متصوَر ہی نہیں کیونکہ کائنات میں بس وہ ہی وہ ہے لہذا جس کسی شئ کی بھی پوجا کی جائے گی وہ اسی کی عبادت باور ہوگی اور ایسا کرنا شرک نہ ہوگا تو یوں جس امر کو اللہ شرک قرار دیتا ہے اور اس کی بیخ کنی کیلئے انبیاء ورسل مبعوث کئے وہ ان کی نظر میں توحید ہے اور دنیا میں شرک متصوَر ہی نہیں

سوم: اللہ جب (ازل میں) تھا اور اس کے ساتھ کوئی شئ نہ تھی، نہ اس کے ساتھ سماء تھا اور نہ ارض اور نہ شمس وقمر اور نہ جن وانس اور نہ دواب وشجر اور نہ جنت وجہنم اور نہ پہاڑ اور سمندر اور ان کے تصور اور نظریہ کے مطابق وہ اب بھی اسی حالت پر ہے جس پر (ازل میں) تھا تو اس سے لازم ہے کہ جن اشیاء کا ہم نے ذکر کیا ان کا کہیں وجود نہ ہو اور ایسا سمجھنا مشاہدہ کیلئے ہٹ دھرمی اور قرآن وایمان کا انکار ہے

چہارم: اگر پہلے اس کے ساتھ کوئی شئ نہ تھی پھر اس نے ذکر میں ہر شئ لکھی جیسا کہ اس حدیث میں مذکور ہوا تو اگر اس کے بعد بھی اس کے ساتھ کوئی شئ نہیں ہے تو اس کتابت سے قبل کے اور بعد کے حال کے مابین کیا فرق ہوا؟ کیونکہ وہ ان فراعنہ ملاحدہ کے نزدیک اس کتابت ولوح کا بھی عین ہے۔

فصل

ان اتحادیہ جنہوں نے اللہ کے اسماء وآیات میں الحاد کیا، کے **ایک گروہ کا زعم ہے کہ فرعون مومن تھا** اور وہ آگ میں داخل نہ ہوگا اور ان کا دعوی ہے کہ قرآن میں ایسی کوئی شئ نہیں جس سے اس کا عذاب میں ہونا ثابت ہو بلکہ اس کے برعکس قرآن میں اس کی نفی ہے مثلا اللہ کا یہ قول: ﴿**اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ**﴾ [الغافر: ۴۶] (آل فرعون کو نہایت سخت عذاب میں داخل کرو) کہتے ہیں تو یہاں اس کی آل کا ذکر ہے نہ کہ خود اس کا، اور اللہ کا قول: ﴿**يَقْدُمُ قَوْمَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ**﴾ [هود: ۹۸] (وہ قیامت کی دن اپنی قوم کے آگے آگے چلے گا اور ان کو دوزخ میں جا اتارے گا) کہتے ہیں وہ انہیں جہنم میں لا وارد کرے گا، خود اس میں داخل نہ ہوگا، اس کی وجہ وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ اس نے کہہ دیا تھا میں بھی اسی الہ پر ایمان والا ہوں جس پر یہ بنی اسرائیل ایمان لائے ہوئے ہیں اور حضرت جبریل کا اس موقع پر اس کے منہ میں مٹی رکھ دینا اس کے دل کے ایمان کا رد کرنا نہ تھا، یہ کفر یہ قول ہے اور اس کا فساد ظاہر ہے اور یہ ہر مسلمان کو معلوم بالاضطرار ہے، میرے حسبِ علم ابن عربی سے پہلے کسی بھی اہلِ قبلہ بلکہ یہود ونصاری میں سے بھی کسی نے یہ بات نہیں کہی بلکہ تمام اہلِ ملل کا اتفاق ہے کہ فرعون کافر تھا اور یہ بات ہر خاص وعام کو اتنی واضح طور سے معلوم ہے کہ اس پر کوئی دلیل پیش کرنے کی بھی ضرورت نہیں کیونکہ فرعون کی مثل کسی نے اللہ کے ساتھ کفر اور اپنے آپ کے لئے دعوائے الوہیت وربوبیت نہیں کیا اسی لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں متعدد جگہ اس کا

قصہ بیان کیا، کفار میں اس سے بڑا کافر نہیں ہے، قرآن میں کئی جگہ اس کے کفر وعذاب کا تذکرہ ہے، ایک جگہ فرمایا:

﴿فَذٰنِكَ بُرْهَانٰنِ مِنْ رَّبِّكَ إِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ إِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ﴾ [القصص: ۳۲] (یہ دو دلیلیں تمہارے رب کی طرف سے ہیں فرعون اور اس کے درباریوں کے پاس کہ وہ نافرمان لوگ ہیں) تا آنکہ کہا:

﴿وَاَتْبَعْنٰهُمْ فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ هُمْ مِّنَ الْمَقْبُوْحِيْنَ﴾ [القصص: ۴۲] (اور اس دنیا میں ہم نے اُن کے پیچھے لعنت لگا دی اور وہ قیامت کے روز بھی بدحالوں میں ہوں گے) سورۃ غافر میں تفصیل سے اس کا قصہ ذکر کیا اور اس کے کفر اور آخرت میں عذاب میں ہونے پر تصریح کی اسے ظالم، فاسق، مقبوح اور ملعون قرار دیا حتی کہ واضح کیا کہ وہ (آخرت سے قبل) برزخ میں بھی عذاب میں گرفتار ہے جب کہا:

﴿وَحَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْٓءُ الْعَذَابِ اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ﴾ [الغافر: ۴۵۔ ۴۶] (اور فرعون والوں کو بُرے عذاب نے آ گھیرا۔ آگ کہ صبح وشام اس کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں اور جس روز قیامت برپا ہوگی فرعون والوں کو نہایت سخت عذاب میں داخل کرو) یہ آیت ان منجملہ آیات کے ہے جن سے علماء نے عالمِ برزخ میں عذاب کے اثبات پر استدلال کیا ہے، ان جاہلوں کو یہ شبہ اس وجہ سے پڑا کہ انہوں نے آیات میں (آل فرعون) دیکھا تو خیال کیا کہ فرعون ان میں شامل نہیں، یہ کلم کی ان کے مواضع سے تحریف ہے بلکہ علمائے قرآن ولغت کے نزدیک فرعون بلانزاع ان میں شامل ہے اور یہ کئی وجوہ سے واضح اور بین ہے:

(ا) کتاب وسنت میں جہاں بھی (آل) کا لفظ استعمال ہوا ہے تو جس شخص کی طرف مضاف کر کے اسے استعمال کیا ہے وہ شخص بھی ان میں داخل ہے مثلاً حضرت لوط کے واقعہ میں کہا: ﴿فَلَمَّا جَآءَ اٰلَ لُوْطِ ِۨ الْمُرْسَلُوْنَ قَالَ الخ﴾ [الحجر: ۶۱] (پھر جب فرشتے لوط کے گھر گئے) الآیۃ، اسی طرح قولہ:

﴿اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ حَاصِبًا اِلَّآ اٰلَ لُوْطٍ نَجَّيْنٰهُمْ بِسَحَرٍ﴾ [القمر: ۳۴] (ہم نے ان پر کنکر بھری ہوا چلائی مگر لوط کے آل کہ ہم نے ان کو پچھلی رات بچا لیا تھا) پھر آگے کہا:

﴿وَلَقَدْ جَآءَ اٰلَ فِرْعَوْنَ النُّذُرُ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا كُلِّهَا فَاَخَذْنٰهُمْ اَخْذَ عَزِيْزٍ مُّقْتَدِرٍ﴾ [القمر: ۴۱۔ ۴۲] (اور قومِ فرعون کے پاس بھی ڈرسنانے والے آئے۔ انہوں نے ہماری تمام نشانیوں کو جھٹلایا تو ہم نے ان کو اس طرح پکڑ لیا جس طرح ایک قوی اور غالب شخص پکڑ لیتا ہے) اور معلوم امر ہے کہ ان سب مواضع میں حضرت لوط داخل ہیں تو اسی طرح فرعون بھی ہے اسی سے نبی اکرم کا یہ فرمان ہے: (قُوْلُوْا اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلىٰ مُحَمَّدٍ وَعَلىٰ آلِ مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ عَلىٰ آلِ إِبْرَاهِيْمَ) اسی طرح قولہ: (كَمَا بَارَكْتَ عَلىٰ آلِ إبراهيم) تو حضرت ابراہیم بلاشبہ اس میں داخل ہیں اسی طرح حضرت حسن سے آپ کا کہنا

: (إِنَّ الصَّدَقَةَ لَا تَحِلُّ لآلِ مُحَمَّدٍ) (آلِ محمد کے لئے صدقہ [کھانا/استعمال کرنا] حلال نہیں) صحیح میں حضرت عبداللہ بن ابو اوفی سے مروی ہے کہ لوگ جب آپ کی خدمت میں صدقہ لے کر حاضر ہوتے تو آپ ان کیلئے دعا فرمایا کرتے تھے میرے والد صدقہ کے ساتھ حاضرِ خدمت ہوئے تو فرمایا: (اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلىٰ آلِ أَبِيْ أَوْفىٰ) ابواوفی صاحبِ صدقہ تھے، اسی کی نظیر (أهل البیت) کی ترکیب ہے تو آدمی خود بھی اپنے اہلِ بیت میں داخل ہے جیسے فرشتوں نے (حضرت ابراہیم کو دعا دیتے ہوئے) کہا تھا: **(رَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ)** [هود: ۷۳] (اے اہلِ بیت تم پر اللہ کی رحمت اور اس کی برکتیں ہوں) اور نبی اکرم کا حضرت سلمان فارسی بارے یہ قول: (سَلْمَانُ مِنَّا اَهْلِ الْبَيْتِ) (سلمان ہم اہلِ بیت میں سے ہے) اللہ تعالی کا فرمان: **(إِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ)** [الأحزاب: **۳۳**] (اے اہلِ بیت اللہ چاہتا ہے کہ تم سے رِجس دُور کر دے) یہ اس لئے کہ آدمی کی آل وہ ہوتی ہے جن کا وہ مآل ہو تو اس میں اس کا نفس بھی ہے اور اس کے اہلِ بیت بھی و جو اس کے زیرِ کفالت ہیں اور وہ خود بھی ان میں شامل ہے، تو اس سے واضح ہوا کہ جس آیت مبارکہ کو وہ اپنے لئے حجت سمجھتے ہیں وہ تو ان کے خلاف حجت ہے، اس کی مزید وضاحت اس طرح ہوتی ہے کہ پورے قصہ میں فرعون اور اس کی قوم بارے اخبار ہے، اللہ تعالی نے فرمایا:

(وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍۙ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَقَارُوْنَ فَقَالُوْا سٰحِرٌ كَذَّابٌ) [الغافر: **۲۳ ـ ۲۴**] (اور ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیاں اور دلیل روشن دے کر بھیجا۔ فرعون اور ہامان اور قارون کی طرف تو انہوں نے کہا کہ یہ تو جادوگر ہے جھوٹا) حتی کہ ذکر کیا **(قَالَ فِرْعَوْنُ مَاۤ اُرِيْكُمْ اِلَّا مَاۤ اَرٰى وَمَاۤ اَهْدِيْكُمْ اِلَّا سَبِيْلَ الرَّشَادِ)** [الغافر: **۲۹**] (فرعون نے کہا کہ میں تمہیں وہی بات سجھاتا ہوں جو مجھے سوجھی ہے اور وہی راہ بتاتا ہوں جس میں بھلائی ہے) اس آیت تک:

(وَقَالَ فِرْعَوْنُ يٰهَامٰنُ ابْنِ لِيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْۤ اَبْلُغُ الْاَسْبَابَۙ اَسْبَابَ السَّمٰوٰتِ فَاَطَّلِعَ اِلٰۤى اِلٰهِ مُوْسٰى) [الغافر: ۳۶ ـ ۳۷] (اور فرعون نے کہا کہ ہامان میرے لئے ایک محل بنوا تاکہ میں راستوں پر پہنچ جاؤں۔ یعنی آسمانوں کے رستوں پر پھر موسیٰ کے الٰہ کو دیکھ لوں) حتی کہ کہا:

(وَحَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْۤءُ الْعَذَابِۚ اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا) (کچھ قبل گزری) پھر کہا:

(قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْۤا اِنَّا كُلٌّ فِيْهَاۤ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ حَكَمَ بَيْنَ الْعِبَادِ) [الغافر: **۴۸**] (متکبرین کہیں گے بے شک ہم سب دوزخ میں ہیں اللہ بندوں میں فیصلہ کر چکا ہے) تو اپنے قول: **(اَدْخِلُوْۤا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ)** کے عقب میں آگ میں ان کی باہمی حجت بازی کا تذکرہ کیا اور ضعفاء اور متکبرین کا باہمی مکالمہ کا اور معلوم ہے کہ ان متکبرین کا سرغنہ فرعون تھا، اسی نے: **(اِسْتَخَفَّ قَوْمَهٗ فَاَطَاعُوْهُ)[الزخرف: ۵۴]** (اس نے اپنی قوم کی مت ماردی تو انہوں نے اس کی بات مان لی) کسی نے فرعون جیسا استکبار نہیں کیا، تو تمام قوم سے بڑھ کر وہ اس صفت و حکم کا حقدار ہے، دوسری جگہ بھی ان کے خلاف حجت ہے نہ کہ ان کے

حق میں اور یہ قولہ تعالیٰ:

﴿ يَقْدُمُ قَوْمَهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ وَبِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ ۝ فَاتَّبَعُوْۤا اَمْرَ فِرْعَوْنَ وَمَاۤ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِيْدٍ وَاُتْبِعُوْا فِيْ هٰذِهٖ لَعْنَةً وَّيَوْمَ الْقِيٰمَةِ بِئْسَ الرِّفْدُ الْمَرْفُوْدُ﴾[هود:۹۷-۹۹] (تو وہ فرعون ہی کے حکم پر چلے اور فرعون کا حکم درست نہیں تھا۔ وہ قیامت کی دن اپنی قوم کے آگے آگے چلے گا اور ان کو دوزخ میں جا اتارے گا اور جس مقام پر وہ اتارے جائیں گے وہ بُرا ہے۔ اور اس جہان میں بھی لعنت ان کے پیچھے لگا دی گئی اور قیامت کے دن بھی جو انعام ان کو ملا ہے بُرا ہے) تو خبر دی کہ وہ اپنی قوم کی قیادت کرتا ہوا جہنم میں وارد ہو جائے گا، (یَسُوْقُھُمْ) نہیں کہا (کہ انہیں ہانکے گا) اور سب کو معلوم ہے کہ آگے آگے آنے والا سب سے پہلے اس جگہ وارد ہوتا ہے جہاں اس کے بعد والے ہونے والے ہیں وگرنہ (یَقْدُمُ) کا کیا مطلب ہوا؟ وہ تو پھر سائق ہوتا (یعنی جو پیچھے رہ کر ہنکاتا ہے) اس کی مزید وضاحت اس قولہ تعالیٰ سے ملتی ہے: (**وَاَتْبَعْنٰهُمْ فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً**) تو معلوم ہوا کہ فرعون بھی اور اس کی قوم بھی وارِدِ جہنم ہوں گے اور وہ سبھی دنیا و آخرت میں لعنت کا شکار بنائے گئے ہیں اور قرینِ قیاس ہے کہ یہ فرعون کا دفاع کرنے والے بھی اسی کے ساتھ شامل ہوں گے کیونکہ آدمی اسی کے ساتھ ہوگا جن سے اسے محبت ہوگی جیسے کہا: (**وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاۤءُ بَعْضٍ**) **[الأنفال:۷۳]** (اور جو لوگ کافر ہیں ایک دوسرے کے رفیق ہیں) نیز قومِ حضرت یونسؑ کے ضمن میں ارشاد کیا:

﴿فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَاۤ اِيْمَانُهَاۤ اِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ﴾[يونس:۹۸] (پس کوئی بستی ایسی کیوں نہ ہوئی کہ ایمان لاتی تو اُس کا ایمان اُسے نفع دیتا ہاں یہ یونس کی قوم کہ جب ایمان لائی) گویا سابقہ اقوام میں سے صرف حضرت یونس کی قوم ہی ہے کہ جو ایمان لائے تو انہیں ان کے ایمان کا فائدہ ہوا (یعنی فرعون کے موت دیکھ کر ایمان لانے کا اسے کوئی فائدہ نہ ہوا) ارشادِ ربانی ہوا:

فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ وَكَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهٖ مُشْرِكِيْنَ فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ فِيْ عِبَادِهٖ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْكٰفِرُوْنَ) [الغافر:۸۵] (لیکن جب وہ ہمارا عذاب دیکھ چکے ان کے ایمان نے ان کو کچھ فائدہ نہ دیا، اللہ کی عادت ہے جو اس کے بندوں میں چلی آتی ہے اور وہاں کافر گھاٹے میں پڑ گئے) تو رسل کی تکذیب کرنے والی امم بارے خبر دی کہ عذاب آتا دیکھ کر وہ ایمان لے آئے لیکن اب دیر ہو چکی تھی لہذا انہیں ان کے ایمان کا فائدہ نہ ہوا اور یہی لوگوں بارے گزری اللہ کی سنت ہے اور یہ اس کے مطابق ہے جو اللہ نے فرعون کیلئے اپنے اس قول میں ذکر کیا:

(آٰلْئٰنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ) [یونس: ۹۱] (اب؟ حالانکہ پہلے نافرمانی کرتے رہے اور مفسد بنے رہے) تو یہ استفہامِ انکاری ہے تو انکار کیا کہ ان کا اب ایمان لانا نافع یا مقبول ہو تو جو اسے نافع و مقبول کہتا ہے وہ نصِ قرآنی کی مخالفت کرتا ہے اور اس سنت کی جو اقوام و ملل بارے اللہ کی ہے، اگر اس کا اس وقت ایمان مقبول ہوتا تو اس سے عذاب (یعنی غرق ہونا)

ٹل جاتا جیسے حضرت یونس کی قوم سے ٹل گیا تھا، ان کے بارہ میں ارشاد ہوا کہ ان سے عذاب ٹل گیا اور وہ بعدازاں ایک مدت تک جئے تو اِغراق اس کے کفر کی پاداش میں تھا، اگر وہ کافر نہیں تو اس عذاب کا کیونکر سزاوار ہوا؟ اس کے بعد اللہ کا یہ کہنا:

(فَالْيَوْمَ نُنَجِّيكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُونَ لِمَنْ خَلْفَكَ آيَةً)[یونس: ۹۲] (تو آج ہم تیرے بدن کو نکال لیں گے تاکہ تو پچھلوں کیلئے عبرت ہو اور بہت سے لوگ ہماری نشانیوں سے بے خبر ہیں) موجب ہے کہ وہ بعد والوں کیلئے نمونہِ عبرت ہو اگر وہ ایمان کی حالت میں مرا ہے تب عبرت کیسے ہوا؟ نیز نبی اکرم نے جب ابن مسعود سے کہا تھا جب انہوں نے آپ کو ابوجہل کے قتل ہو جانے کی خبر دی کہ یہ اس امت کا فرعون تھا تو یوں اپنے دور کے کفار کے سرغنہ کو قدیم دور کے کفار کے سرغنہ کے ساتھ تشبیہ دی، اس سے ثبوت ملا کہ وہ کفر کے غایت درجہ میں تھا اور جو حالتِ ایمان میں مرے اسے کفر کے ساتھ موصوف نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اسلام سابقہ سب گناہوں کو مٹا ڈالتا ہے مسند احمد، مسند اسحاق اور صحیح ابو حاتم میں حضرت عوف بن مالک عن ابن عمرو سے مروی ہے کہ نبی کریم نے تارکِ نماز بارے فرمایا وہ (روزِ قیامت) قارون، فرعون، ہامان اور ابی بن خلف کے ساتھ اٹھایا جائے گا۔

ابن تیمیہ سے ایک تحریر/عبارت کی بابت پوچھا گیا

جو ایک ثقہ شخص کے قلم سے لکھی ملی اور ان سے لوگوں کی ایک جماعت نے اسے نقل و ذکر کیا، ان ناقلین میں کئی ایسے ہیں جن کا ایک دینی تشخص و مقام ہے، اس تحریر میں لکھا ہے کہ بعض سلف نے کہا: بے شک اللہ نے اپنی ذات کو لطیف کیا تو اسے حق کا نام دیا اور اسے کثیف بنایا تو اسے خلق کا نام دیا (یعنی کائنات میں موجود ہر وجود اللہ کی ذاتِ کثیفہ ہے) شیخ نجم الدین ابن اسرائیل نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ حقیقۃً اشیاء میں ظاہر ہوا اور مجازاً ان کے ساتھ محتجب ہوا تو جو اہلِ حق وجمع میں سے ہے وہ ان کا بطور مظاہر اور مجالی مشاہدہ کرتا ہے اور جو اہلِ مجاز وفرق میں سے ہے وہ انہیں ستور اور حجب دیکھتا ہے، اپنی ایک نظم میں کہا:

لَقَدْ حَقَّ لِیْ رَفْضُ الْوُجُوْدِ وَ أَهْلِهٖ   وَقَدْ عَلِقَتْ كَفَّایَ جَمْعاً بِمَوْجِدِیْ

(وجود اور اہلِ وجود کا انکار کرنا مجھے زیب دیتا ہے، میرے دونوں ہاتھ میرے وجدان کے ساتھ لپٹی ہوئے ہیں) پھر ایک مدت بعد اس میں یہ تبدیلی کی: (لَقَدْ حَقَّ لِیْ عِشْقُ الْوُجُوْدِ وَ اَهْلِهٖ) (وجود اور اہلِ وجود سے عشق میرے لئے حق ہے) میں نے ان سے جب اس بارے پوچھا تو کہا: مقامِ ہدایت یہ ہے کہ بندہ اکوان کو حجب سمجھ کر ان کا رفض کرے پھر وہ انہیں مظاہر اور مجالی دیکھے تو تب اس کا عشق متحقق ہو جائے گا جیسے ایک شاعر نے کہا:

أُقَبِّلُ اَرْضاً سَارَ فِیْهَا جِمَالُهَا   فَكَیْفَ بِدَارٍ دَارَ فِیْهَا جَمَالُهَا

(میں اس سرزمین کو بوسہ دیتا ہوں جس میں اس کے اونٹ چلے تو اس دار کی کیا کیفیت ہو جس میں اس کا جمال چلا) (کہتے ہیں) کہ ابن عربی نے ابونواس کے یہ دو اشعار پڑھے:

رَقَّ الزُّجَاجُ وَ رَاقَتِ الْخَمْر وَ تَشَا كَلاَ فَتَشَابَهَ الأَمْر

فَكَأَنَّمَا خَمْرٌ وَلاَ قَدَحٌ وَ كَأَنَّمَا قَدَحٌ وَلاَ خَمْر

(جام رقیق [بلوری] تھا اور شراب بھی، دونوں باہم اتنا ملتے جلتے تھے کہ معاملہ مشتبہ ہوا، گویا شراب ہے جام نہیں اور گویا جام ہے شراب نہیں)اور کہا صورتِ عالم ملتبس ہوگئی ہے تو یہ بظاہر خلق مگر بباطن حق تعالیٰ ہے، ہمارے بعض سلف نے کہا:(عَيْنُ مَا تَرىٰ ذَاتُ لَا تَرىٰ وَذَاتُ لَا تَرىٰ عَيْنُ مَا تَرىٰ) (یہ عبارت گزری ہے) یہاں فقط اللہ ہی اللہ ہے باقی سب وہم ہے، قطب الدین ابن سبعین نے کہا:(رَبٌّ مَالِكٌ وَعَبْدٌ هَالِكٌ وانْتُمْ ذٰلِكَ، اَللّٰهُ فَقَطْ وَالْكَثْرَةُ وَهْمٌ) (رب مالک ہے اور بندہ فانی اور تم وہ ہو، [کائنات میں] فقط اللہ ہی اللہ ہے اور کثرت وہم ہے) محی الدین ابن عربی نے یہ اشعار کہے:

يَا صُوْرَةَ اِنْسٍ سِرُّهَا مَعْنَائِيْ مَا خَلْقُكَ لِلْأَمْرِ تَرَى لَوْلَائي

شِئْنَاكَ فَاَنْشَأْنَاكَ خَلْقاً بَشَراً لِتَشْهَدَنَا فِيْ اَكْمَلِ الأَشْيَاءِ

(اے انسانی صورت جس کا راز میرا معنی ہے، اگر میں نہ ہوتا تو تیرا خلقِ امر نہ دیکھتے، ہم نے تیری مشیت کی تو بشر کی خِلقت میں تیرا انشاء کیا تاکہ تو ہمیں کامل ترین شیٔ میں دیکھے) اس تحریر میں یہ بھی لکھا ہے کہ ایک شیخ کے بیٹے نے ان سے حج پر جانے کی اجازت مانگی تو کہنے لگے: (يَا بُنَيَّ طُفْ بِبَيْتٍ مَا فَارَقَهُ اللّٰهُ طَرْفَةَ عَيْنٍ)(اے بیٹے ایک ایسے گھر کا[اپنی طرف اشارہ ہے] طواف کرلو اللہ جس سے لمحہ بھر بھی جدا نہیں ہوا) کہتے ہیں رابعہ عدویہ (یعنی بصری) بارے کہا جاتا ہے کہ حج کرنے گئیں تو کہا: (هٰذَا الصَّنَمُ الْمَعْبُوْدُ فِي الأَرْضِ، وَاللّٰهِ مَا وَلَجَهُ اللّٰهُ وَلاَ خَلاَ مِنْهُ) (یہ زمین معبود صنم! بخدا اللہ نہ اس میں داخل ہوا اور نہ اس سے خالی ہوا) اس میں حلاج کے یہ اشعار بھی درج ہیں:

سُبْحَانَ مَنْ اَظْهَرَ نَاسُوْتَهٗ سِرُّ سَنَا لاهُوْتِه الثَّاقِبِ

ثُمَّ بَدَا مُسْتَتِراً ظَاهِراً فِيْ صُوْرَةِ الآكِلِ وَالشَّارِبِ

(پاک ہے جس نے انسانی طبیعت میں اپنی خداوندی کا چمکتا ہوا راز آشکار کیا پھر وہ ہر آکل اور شارب کی صورت میں ظاہر بھی ہے اور پوشیدہ بھی) یہ دو شعر بھی اسی کے ہیں:

عَقَدَ الْخَلاَئِقُ فِی الإِلٰهِ عَقَائِدَا وَاَنَا اعْتَقَدْتُ جَمِيْعَ مَا اعْتَقَدُوْهُ

(خلقِ خدا کے الٰہ بارے کئی اعتقادات ہیں اور میں ان کے ان سب اعتقادات کو مانتا ہوں) اور:

بَيْنِىْ وَ بَيْنَكَ اِنِّيٌّ تُزَاحِمُنِيْ فَارْفَعْ بِحَقِّكَ اِنِّيَتِيْ مِنَ الْبَيْنِ

(میرے اور تیرے درمیان انیت ہے جو میری مزاحم ہے تجھے تیرے حق کا واسطہ درمیان سے اس میری انیت کو اٹھا دو)

کہتے ہیں شہاب الدین سہروردی حلبی مقتول نے کہا کہ اسی انیت کے سبب جس کے رفع کی حلاج نے طلب کی تھی اغیار نے اس کا خون بہا دیا تھا، اسی لئے سلف نے کہا حلاج آدھا آدمی ہے اور یہ اس وجہ سے کہ اس کیلئے بالمعنی انیت مرفوع نہ ہوئی تھی تو اس کیلئے صورت رفع کی گئی، اس تحریر میں ابن عربی کا یہ شعر بھی ہے:

وَاللّٰهِ مَا هِيَ اِلَّا حَيْرَةٌ ظَهَرَتْ   وَبِيْ حَلَفْتُ وَإِنَّ الْمُقْسِمَ اللّٰهُ

(واللہ ہر سو حیرت کا ظہور ہے، میں نے خود اپنی قسم کھائی اور اور مقسم اللہ ہے)

اور اس میں لکھا ہے کہ حضرت عیسیٰ سے منقول ہے کہ کہا: بے شک اللہ تبارک وتعالی مشتاق ہوا کہ اپنی ذاتِ مقدسہ دیکھے تو اپنے نور سے حضرت آدم کو تخلیق کیا اور انہیں مثلِ آئینہ بنایا تھا کہ اس میں اپنی ذاتِ مقدسہ دیکھے اور میں وہ نور ہوں اور آدم آئینہ، ابن فارض نے اپنے قصیدہ سلوک میں کہا:

وَشَاهِدْ إِذَا اسْتَجْلَيْتَ نَفْسَكَ مَنْ تَرىٰ   بِغَيْرِ مِرَاءٍ فِي الْمِرْاَةِ الصَّقِيْلَة

اَ غَيْرُكَ فِيْهَا لَاحَ اَمْ اَنْتَ نَاظِرٌ   اِلَيْكَ بِهَا عِنْدَ انْعِكَاسِ الأَشِعَّة

(اگر تو صقیل آئینہ میں اپنے آپ کو دیکھے تو ذرا غور کرو کہ کسے دیکھ رہے ہو؟ کیا تمہارا غیر اس میں عیاں ہے یا شعاعوں کے انعکاس کے وقت خود ہی کو دیکھ رہے ہو؟) کہتے ہیں کہ ابن اسرائیل نے کہا: امر دو طرح کے ہیں ایک بالواسطہ امر اور دوم بلا واسطہ امر تو جو بالوسائط امر ہے اسے رد کرتا ہے وہ جن کی بابت اللہ کی مشیت ہوتی ہے اور قبول کرتے ہیں وہ جن کی بابت اللہ کی مشیت یہی ہوتی ہے اور جو امر بلا واسطہ ہے اس کا رد کرنا ممکن نہیں اور یہ جو اللہ نے فرمایا:

﴿اِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَیْءٍ اِذَآ اَرَدْنٰهُ اَنْ نَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ﴾[النحل: ۴۰] (جب ہم کسی چیز کا ارادہ کرتے ہیں تو ہماری بات یہی ہے کہ اُس کو کہہ دیتے ہیں کہ ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے) یہ سن کر ایک درویش نے ان سے کہا اللہ نے حضرت آدم سے بلا واسطہ کہا تھا اس درخت کے قریب نہ جانا مگر وہ چلے گئے اور اس کا پھل کھایا، کہنے لگے تم نے ٹھیک کہا اور یہ اسلئے کہ آدم انسانِ کامل تھے اسی لئے ہمارے شیخ علی حریری نے کہا کہ آدم اللہ تعالی کے صفی ہیں ان کی توحید ظاہراً اور باطناً تھی، حضرت آدم سے اللہ کا یہ کہنا: اس درخت کے قریب نہ جاؤ، ظاہری جبکہ اس کا باطنی امر تھا کہ کھاؤ تو انہوں نے کھایا، یہی قرآن نے ذکر کیا، جبکہ ابلیس کی توحید صرف ظاہری تھی تو اسے حضرت آدم کو سجدہ کا حکم ملا مگر انہیں جب غیر خیال کیا تو سجدہ نہ کیا، اس پر اللہ تعالی نے اس پر متغیر ہوا اور کہا یہاں سے نکل جاؤ! ایک شخص نے میرے شیخ سے کہا: اے سیدی حسن جب اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول (حضرت محمد) سے کہہ دیا: **﴿لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ﴾[آل عمران :۱۲۸]** (اس کام میں تمہارا کچھ اختیار نہیں) تو ہما شما کس کھیت کی مولی ہیں؟ تو انہوں نے کہا معاملہ وہ نہیں جو تم کہہ یا سمجھ رہے ہو، اللہ کا آپ سے کہنا: (لَيْسَ لَكَ الخ) نبی اکرم کیلئے عینِ اثبات ہے، اور یہ

جیسے کہا: ﴿وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ﴾ [الأنفال : ۱۷] (اور جس وقت تم نے کنکریاں پھینکی تھیں تو وہ تم نے نہیں پھینکی تھیں بلکہ اللہ نے پھینکی تھیں) اور کہا: ﴿إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللَّهَ يَدُ اللَّهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ﴾ [الفتح : ۱۰] (جولوگ تم سے بیعت کرتے ہیں وہ اللہ سے بیعت کرتے ہیں اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے) اس ضمن میں اوحد الدین کرمانی کا ایک شعر ہے:

مَا غِبْتَ عَنِ الْقَلْبِ وَلَا عَنْ عَيْنِيْ مَا بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَنَا مِنْ بَيْنٍ

(تم میرے دل سے اور میری آنکھ سے غائب ہی نہیں ہو [لہذا] ہمارے تمہارے درمیان کوئی جدائی نہیں) ایک اور نے کہا:

لَا تَحْسَبْ بِالصَّلَاةِ وَالصَّوْمِ تَنَالُ قُرْباً وَ دُنُوّاً مِنْ جَمَالٍ وَجَلَالٍ

فَارِقْ ظُلَمَ الطَّبْعِ وَكُنْ مُتَّحِداً بِاللّٰهِ وَ إِلَّا كُلُّ دَعْوَاكَ مُحَال

(یہ نہ سمجھو کہ نماز روزے کے ذریعہ جمال وجلال کا قرب پالو گے، طبع کے ظلم سے چھٹکارا پالو اور اللہ کے اتحادِ ذات کرلو وگرنہ تمہارا ہر دعویٰ محال ہے) حلاج نے کہا:

إِذَا بَلَغَ الصَّبُّ الْكَمَالَ مِنَ الْهَوىٰ وَغَابَ عَنِ الْمَذْكُورِ فِيْ سَطْوَةِ الذِّكْر

يُشَاهِدُ حَقّاً حِيْنَ يَشْهَدُهُ الْهَوىٰ بِأَنَّ صَلَاةَ الْعَارِفِيْنَ مِنَ الْكُفْر

(عاشق جب محبت کے کمال تک پہنچ جائے اور قوتِ ذکر سے اپنے مذکور ہی کو بھول جائے۔ تو ایسے عالم میں اس کا مشاہدہ یہ ہے کہ اہلِ معرفت کی نماز [فقط] کفر کا ترک ہے) نجم ابن اسرائیل کے اشعار ہیں:

اَلْكَوْنُ يُنَادِيْكَ اَلَا تَسْمَعُنِيْ مَنْ اَلَّفَ اَشْتَاتِيْ وَ مَنْ فَرَّقَنِيْ

اُنْظُرْ لِتَرَانِيْ مَنْظَراً مُعْتَبَراً مَا فِيَّ سِوىٰ وُجُوْدِ مَنْ اَوْجَدَنِيْ

(کائنات تجھے صدا دے رہی ہے کیا مجھے سن نہیں رہے؟ کس نے میرے اجزائے پریشاں کو جوڑا اور کس نے مجھے [پھر] توڑا، مجھے عبرت کی نگاہ سے دیکھو، مجھ میں سوائے اس کے وجود کے کچھ نہیں جو مجھے وجود میں لایا) اور کہا:

ذَرَّاتُ وُجُوْدِ الْكَوْنِ لِلْحَقِّ شُهُوْدٌ اَنْ لَيْسَ لِمَوْجُوْدٍ سِوَى الْحَقِّ وُجُوْدٌ

وَالْكَوْنُ وَ اِنْ تَكَثَّرَتْ عُدَّتُهٗ مِنْهُ وَ اِلىٰ عُلَاهُ يَبْدُوْ وَيَعُوْدُ

(وجودِ کائنات کے ذرات [وجودِ] حق کے لئے گواہ ہیں کہ موجودات کے لئے سوائے حق کے وجود نہیں، کائنات میں گننے لگو تو کثیر اشیاء ہیں لیکن سب اسی سے ظاہر اور اسی کی طرف عائد ہیں) اور کہا:

بَرِئْتُ اِلَيْكَ مِنْ قَوْلِيْ وَ فِعْلِيْ وَ مِنْ ذَاتِيْ بَرَاءَةَ مُسْتَقِيْلٍ

وَ مَا اَنَا فِیْ طِرَازِ الْکَوْنِ شَیْءٌ لِأَنِّیَ مِثْلُ ظِلِّ مُسْتَحِیْلٖ

(میں تیری طرف اپنے قول وفعل سے براءت کا اظہار کرتا ہوں اور اپنی ذات سے بھی، میں طرازِ کائنات میں کوئی شئ نہیں ہوں کہ میں تو متبدل سایہ ہوں) عفیف تلمسانی نے کہا:

اَحِنُّ اِلَیْهِ وَهُوَ قَلْبِیْ وَهَلْ یُریٰ سِوَایَ اَخُوْ وَجْدٍ یَحِنُّ لِقَلْبِهٖ

وَ یُحْجَبُ طَرْفِیْ عَنْهُ اِذْ هُوَ نَاظِرِیْ وَ مَا بُعْدَهٗ اِلَّا لِاِفْرَاطِ قُرْبِهٖ

(میں اس کی طرف کھنچا جاتا ہوں اور وہ میرا دل ہے سوائے ایک عاشق کے کون اپنے ہی دل کا مشتاق ہوتا ہے، میری نظر اس سے محجوب ہے جبکہ وہ میرا ناظر ہے اور اس کا بُعد نہیں مگر اس کے افراطِ قرب کی وجہ سے) بعض سلف کا قول ہے کہ توحید کی کوئی زبان نہیں اور ساری زبانیں ہی اس کی زبان ہیں نیز توحید کا عارف صرف ایک ہے اور (اللہ کو) واحد سے عبارت کرنا صحیح نہیں اور یہ اس وجہ سے کہ اس سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا مگر اس کے غیر کے ساتھ اور جس نے غیر کا اثبات کیا وہ موحد نہیں! کہتے ہیں میں نے الشیخ محمد بن بشر نواوی کو کہتے سنا کہ ہمارے شیخ سید علی حریری جامع نوی میں تشریف لائے، شیخ محمد کہتے ہیں تو میں ان کے پاس آیا ان کے آگے زمین کو بوسہ دیا اور بیٹھ گیا تو کہا اے بیٹے میں ایک مدت تک محبت کے ساتھ ٹھہرا رہا تو اسے غیر مقصود پایا کیونکہ محبت نہیں ہوتی مگر غیر سے غیر کیلئے اور غیر تو یہاں ہے ہی نہیں پھر میں توحید کے ساتھ ایک مدت تک ٹھہرا رہا تو اسے بھی اسی طرح پایا کیونکہ توحید نہیں ہوتی مگر عبد سے رب کیلئے، اگر لوگ انصاف سے کام لیں تو نہ یہاں کسی کو عبد دیکھیں اور نہ معبود، اس رسالہ میں یہ بھی ہے: الشیخ نجم ابن اسرائیل نے مجھے رازداری سے بتلایا کہ انہوں نے شیخ علی حریری سے ان کی وفات والے برس سنا کہنے لگے اے نجم: میں نے اپنے اندرون منہ کے بالائی حصہ کو سماوات سے اوپر اور نچلے حصہ کو تحت الثریٰ دیکھا ہے اور میری زبان نے ایک ایسا لفظ نطق کیا ہے اگر وہ تم مجھ سے سن لیتے تو میرے خون کا ایک قطرہ زمین تک نہ پہنچے، اس کے ایک عرصہ بعد ایک شخص نے سید حسن سے کہا اے سیدی حسن اللہ نے ایسے بندے سے کم عقل پیدا نہیں کیا جو ادعاء کرے کہ وہ فرعون ونمرود اور ان خبیثوں کی مانند الہ ہے! تو وہ بولے یہ بات یا تو اللہ کی خلق میں سے اجہل ترین شخص کہہ سکتا ہے یا پھر اعرف ترین شخص! میں نے وہ کچھ ذکر کیا جو نجم نے شیخ سے نقل کیا ہے، اسی رسالہ میں بعض سلف کا یہ مقولہ بھی مذکور ہے: (مَنْ کَانَ عَیْنَ الْحِجَابِ عَلٰی نَفْسِهٖ فَلَا حِجَابَ وَلَا مَحْجُوْبَ) (جو خود اپنے نفس پر عینِ حجاب ہے تو نہ کوئی حجاب ہے اور نہ کوئی محجوب)

تو حضرات علماء سے گزارش ہے کہ ان اقوال کی وضاحت فرمائیں، کیا یہ حق ہیں یا باطل؟ اور ان کے معانی کی کیونکر معرفت ہو؟ اور کیسے واضح ہو کہ یہ حق ہیں یا باطل اور کیا ان کا انکار کرنا واجب ہے یا اقرار اور تسلیم کرنا؟ اور ان کے مطالب کا اعتقاد رکھنے والے کی بابت کیا حکم ہے جو یا تو ان کی حقیقت کی معرفت کے ساتھ یا ان کے قائل کیلئے مجمل تسلیم کے ساتھ اعتقاد رکھتا ہے

اور کیا ان الفاظ کے متکلمین صحیح معنی کا ارادہ کرتے ہیں جو عقل اور نقل کے موافق ہے؟ اور کیا وہ الفاظ جن میں ہمیں اِشکال لگے، کی تاویل اور اس معنی پر محمول کرنا ممکن ہے اور کیا ان کے معنی کا بیان اور کشفِ مقصود و مغزا واجب ہے اگر ایسے لوگ موجود ہوں جو ان پر ایمان رکھتے ہیں مگر ان کی حقیقت کے آشنا نہیں؟ یا ان سے سکوت مناسب ہے اور کہ لوگوں سے تعرُّض نہ کیا جائے اور وہ ان کی تعظیم کرتے رہیں اور ان کا اعتقاد رکھیں ان کے معانی کو جانے بغیر؟

اس سب کی وضاحت کریں اللہ آپ کو جزا دے۔

جواب:

یہ مذکورہ اقوال دو باطل اصول پر مشتمل ہیں جو مسلمانوں، یہودیوں اور عیسائیوں کے دین کے مخالف ہیں پھر معقول و منقول کے بھی مخالف ہیں، ان میں سے ایک حلول اور اتحاد اور جو اس کے مقارب (مصطلحات) ہیں جیسے وحدت الوجود کا قول جیسا کہ یہ حضرات کہتے ہیں کہ وجود واحد ہے پس خالق کا وجودِ واجب ہی مخلوق کیلئے وجودِ ممکن ہے جیسے اہلِ وحدت مثلا ابن عربی اور اس کے شاگرد قونوی، ابن سبعین اور ابن فارض جو قصیدہ تائیہ نظم السلوک کا ناظم ہے اور عامر بصری سیواسی جس کا بھی ابن فارض کے قصیدہ جیسا قصیدہ ہے اور تلمسانی جس نے مواقف النفر ی کی شرح تالیف کی اور انہی کے طریقہ پر اس کی کتاب شرح الاسماء الحسنی ہے اور سعید فرغانی جس نے ابن فارض کے قصیدہ کی شرح لکھی اور ششتری مؤلف الأزجال جو ابن سبعین کا شاگرد ہے اور عبداللہ بلیانی اور مصری متصوف ابن ابوالمنصو رمولف(فَكُّ الأَزْرَارِ عَنْ أَعْنَاقِ الأَسْرَارِ) وغیرہم اسی کے قائل ہیں پھر ان میں سے بعض ایسے ہیں جو وجود اور ثبوت کے مابین فرق کرتے ہیں جیسے ابن عربی نے کہا اور زعم کیا کہ اعیان عدم میں ثابت ہیں اور اپنے فی نفسہ وہ اللہ تعالی سے مستغنی ہیں اور وجودِ حق ہی ان کا وجود ہے اور خالق اعیان کا محتاج ہے اور ان کے ذریعہ ہی اس کے وجود کا ظہور ہے اور یہ اپنے وجود کے حصول میں خالق کی محتاج ہیں جو کہ ان کا نفسِ وجود ہے اور اس کا قول ان حضرات کے قول کا مرکب ہے جو قائل ہیں کہ معدوم شئ ہے

اور ان حضرات کے قول سے جو کہتے ہیں وجودِ خالق ہی وجودِ مخلوق ہے اور کہتے ہیں مخلوق وجود اور خالق وجود ایک شئ ہے جیسا کہ ایک دیگر مقام پر اس کی تفصیل بیان کی ہے، ان میں سے بعض نے اطلاق اور تعیین کے مابین فرق کیا جیسا کہ قونوی ونحوہ قائل ہیں تو یہ کہتے ہیں واجب مطلق بلا شرطِ وجود ہے اور یہ مطلقا موجود نہیں مگر اذہان میں نہ کہ اعیان میں تو جو اذہان میں کلی ہے وہ اعیان میں نہ ہوگا مگر معین ہی اور اگر کہا جائے مطلق معین کا جزو ہے تو لازم ہے کہ خالق کا وجود مخلوق کے وجود کا جزو ہو اور جز وکل کی ابداع و تخلیق نہیں کر سکتا لہذا خالق کا کوئی وجود نہیں، ان میں سے بعض نے کہا باری تعالی بشرطِ اطلاق وجودِ مطلق ہے جیسے ابن سینا اور اس کے اتباع نے کہا تو اس کا قول خرابی کے لحاظ سے اشد ہے، مطلق بشرطِ اطلاق صرف اذہان میں ہوتا ہے نہ کہ اعیان میں تو ان لوگوں کا قول

ان حضرات کی طرف سے موافقت کے ساتھ جنہیں تعطیل لازم ہے ان لوگوں کے قول سے برا ہے جو اہلِ حلول واتحاد سے مشابہ ہیں
اور کچھ اور ہیں جو واجب وجود اور ممکن وجود کو مادہ اور صورت کے بمنزلہ قرار دیتے ہیں جو بات فلاسفہ نے کہی یا اس سے قریب، جیسے ابن سبعین اور اس جیسوں نے کہا، ان حضرات کے اقوال میں تناقض اور فساد ہے اور یہ وحدت الوجود حلول یا اتحاد سے خارج نہیں اور یہ حلولِ مطلق، وحدتِ مطلقہ اور اتحادِ مطلق کے قائل ہیں بخلاف ان کے جو قائل بالمعین ہیں مثلاً عیسائی اور شیعہ کے غالی لوگ جو حضرت علی یا حاکمِ وقت یا جو حلاج یا جو یونس قینینی یا دیگر کی الوہیت کے قائل ہیں تو یہ حضرات کبھی تو خاص اور مقید حلول کی بات کرتے ہیں اور دیگر اطلاق اور تعمیم کی، اسی لئے یہ کہتے ہیں کہ ان کی خطا بس یہ ہے کہ بعض مظاہر پر اقتصار کر لیا، یہ حضرات شرک اور بت پرستی کے مطلقاً جواز کے قائل ہیں اطلاق اور تعمیم کی وجہ پر، بلا شبہ ان حضرات کے اقوال میں ایسا کفر اور ضلال ہے جو یہود ونصاریٰ کے کفر سے اعظم ہے، یہ مذہب کثیر متأخرین کے ہاں رائج ہوا، جہمیہ کے کئی طوائف بھی اس کے قائل تھے، ابن عربی کی فصوص الحکم وغیرہ میں تحریرات اور ابن سبعین، ششتری، ابن فارض اور عامر بصری کی نظمیں نیز عفیف تلمسانی، عبداللہ بلیانی، صدر قونوی کا کلام اور ابن اسرائیل کے ہاں کثیر اشعار انہی نظریات پر مشتمل ہیں! دیگر کثیر لوگوں کی کلام میں جو اس طرح کے افکار موجود ہیں وہ بھی اسی حلول، اتحاد اور وحدت الوجود کے مذہب پر مبنی ہیں، کثیر اہلِ سلوک جو اس مذہب کا اعتقاد نہیں رکھتے وہ بھی ابن فارض وغیرہ کے اشعار سنتے ہیں اور نہیں جانتے کہ اس کا مقصود یہ مذہب تھا تو یوں اس باب میں کثیر اشتباہ اور ضلال کا وقوع ہوا جس سے کثیر حضرات ورطہ حیرت میں ہوئے، ان حضرات کی گمراہی کی اصل یہ ہے کہ انہیں اللہ کی اپنی مخلوقات سے مباینت اور اس کے ان سے علو ہونے کی معرفت نہیں، انہیں علم ہوا کہ وہ موجود ہے تو خیال کیا کہ اس کا وجود ان کے وجود سے خارج نہیں اس شخص کے بمنزلہ جو سورج کی شعاع دیکھے تو گمان کرے کہ یہ خود سورج ہے! جب جہمیہ کا ظہور ہوا جو اللہ تعالی کی اپنی مخلوقات سے مباینت اور علو کے منکر تھے **تو اس ضمن میں چار اقوال سامنے آئے:**

(۱) سلف اور ائمہ کا، جو قائل ہیں کہ اللہ تعالیٰ سماوات کے اوپر اپنے عرش پر مستوی ہے اور اپنی خلق سے بائن (جدا اور الگ) ہے جیسا کہ اس پر کتاب وسنت اور سلفِ امت کے اجماع کی دلالت ہے اور جیسا کہ صریح معقول کے ساتھ جو صحیح منقول کے موافق ہے، مباینت اور علو معلوم ہے اور جیسا کہ اس پر اللہ نے اپنی خلق کو فطر کیا ہے ان کی طرف سے اس کے اقرار اور ان کے اللہ سبحانہ کے قصد کے مدِ نظر

(۲) دوسرا قول جہمیہ کے اصحابِ تعطیل ونفی کا ہے، یہ قائل ہیں کہ اللہ نہ عالَم کے اندر داخل ہے اور نہ اس سے خارج، نہ عالم سے مباین (یعنی علیحدہ) ہے اور نہ اس کے لئے مُحایث (یعنی رو برو) تو یہ حضرات دو باہم متقابل وصفوں کی نفی کرتے ہیں جن میں سے کسی ایک سے کوئی موجود خالی نہیں جیسا کہ یہی اکثر معتزلہ اور دیگر سے ان کے موافقین کا قول ہے

(۳) یہ جہمیہ کے حلولیہ کا ہے جو کہتے ہیں وہ اپنی ذات کے ساتھ ہر جگہ میں ہے جیسا کہ یہ بات حسین نجار کے اتباع نجاریہ اور دیگر

جہمیہ نے کہی، یہ حلول واتحاد کے قائل ہیں، جہمیہ کے اکثر عابد وزاہد اور صوفیوں اور عامۃ الناس کا یہی عقیدہ تھا جبکہ ان کے نظار (یعنی محققین) اور متکلمین میں سے اکثر نفی اور تعطیل کا نظریہ رکھتے ہیں جیسا کہ کہا گیا جہمیہ کے متکلمین کسی شئ کی بھی عبادت نہیں کرتے جبکہ جہمیہ کے متصوفہ ہر شئ کو ہی معبود مانتے ہیں اور یہ اسلئے کہ عبادت طلب وقصد اورارادہ ومحبت کو متضمن ہے اور یہ معدوم سے متعلق نہیں، دل موجود کا طالب ہوتا ہے تو اگر یہ ما فوق العالم کی طلب نہ کرے تو اس کا طالب ہوگا جو اس کے اندر ہے، جہاں تک کلام، علم اور نظر (و بحث) تو وہ موجود اور معدوم تو جب اہلِ کلام ونظر رب تعالی کو صفاتِ سلب ونفی کے ساتھ متصف کرتے ہیں جن کے ساتھ نہیں موصوف کیا جاتا مگر معدوم کو تو مجردعلم وکلام معبودِ مذکور کے عدم کا منافی نہ تھا بخلاف قصد، ارادہ اور عبادت کے تو یہ عدمِ معبود کے منافی ہے اسی لئے تم ان کے کسی کو نظر وبحث کے وقت پاؤ گے کہ وہ نفی کی طرف اور عبادت وتصوف کے وقت حلول کی طرف مائل ہے، اگر اس سے کہا یہ اس کے منافی ہے تو کہے گا: یہ میری عقل ونظر اور وہ میرے ذوق ومعرفت کا مقتضا ہے اور معلوم امر ہے کہ ذوق ووجدان اگر عقل ونظر کے موافق نہ ہوں تو دونوں یا ان میں سے ایک کا فساد لازمی امر ہے

(۴) یہ ان حضرات کا جو قائل ہیں کہ اللہ اپنی ذات کے ساتھ عالم کے اوپر ہے اور وہ اپنی ذات کے ساتھ ہر جگہ میں ہے، یہ اہلِ کلام وتصوف کے ایک گروہ کا نظریہ ہے جیسے ابو معاذ اور اس کے امثال، اشعری نے مقالات میں یہی نظریہ کئی گروہوں سے ذکر کیا ہے، سالمیہ جیسے ابو طالب مکی اور اس کے اتباع جیسے ابوالحکم بن برجان اور اس کے امثال، کی کلام میں اسی کے نحو اشارات موجود ہیں جیسا کہ ان کی کلام میں ایسی چیزیں بھی پائی جاتی ہیں جو اس کے مناقص ہیں

فی الجملہ حلول اور اس کے جو مناسب ہے، کا قول ہی کثیر متاخرین صوفیاء نے اختیار کیا اسی لئے ائمہِ قوم اس سے حذر کرتے تھے جیسے جنید (بغدادی) نے جب ان سے توحید بارے سوال ہوا، تو کہا: توحید قِدم سے حدوث کا اِفراد (یعنی الگ کرنا) ہے تو بیان کیا کہ توحید یہ ہے کہ قدیم اور محدث کے درمیان تمییز (اور تفریق) کی جائے، ابن عربی نے اس کا انکار ورد کیا اور دعوی کیا کہ جنید اور ان جیسوں کو مرتے دم تک توحید کی معرفت نصیب نہ ہوئی کہ انہوں نے رب اور عبد کے درمیان فرق کا اثبات کیا، یہ بات اس نے اپنے اس دعوی کی بناء پر کہی کہ توحید میں رب اور عبد کے درمیان فرق نہیں اور زعم کیا کہ قدیم ومحدث کے مابین تمییز نہیں کرتا مگر وہ جو نہ قدیم ہو اور نہ محدث ! یہ جہل ہے کیونکہ اس امر کی معرفت کہ یہ وہ نہیں اور اس کے اور اس کے مابین تمییز اس امر کی محتاج نہیں کہ عارف اور دو اشیاء کے مابین ممیّز دونوں میں سے ایک شئ نہ ہو (یعنی کوئی تیسری شئ ہو) بلکہ ہر انسان جانتا ہے کہ وہ دوسرا انسان نہیں حالانکہ وہ ان دو میں سے ایک ہے تو اس بات کا کیونکر وہ عالم نہ ہو سکے کہ وہ اپنے رب کا غیر ہے

ان کا دوسرا (باطل) اصول گناہوں، ترکِ مامور اور فعلِ محظور پر تقدیر کو بطورِ عذر پیش کرنا تو تقدیر کے ساتھ ایمان واجب ہے مگر اسے اللہ کے کسی امر ونہی اور وعد ووعید کی مخالفت میں بطورِ عذر پیش کرنا جائز نہیں ! تقدیر بارے گمراہ نظریہ رکھنے

والے حضرات تین اصناف پر ہیں:

ایک: جو امر و نہی اور وعید کو مانتے اور تقدیر کی تکذیب کرتے ہیں اور ان کا زعم ہے کہ ایسے حوادث بھی ہیں جنہیں اللہ نے (ابھی) تخلیق نہیں کیا، یہ معتزلہ اور ان جیسوں کا موقف ہے

دوم: ایسے لوگ جو قضاء وقدر کو مانتے ہیں، وہ اہل سنت والجماعت کی موافقت کرتے ہیں اس امر پر کہ جو اللہ چاہے وہی ہوتا اور جو اس کی مشیت نہ ہو وہ نہیں ہوتا اور وہ ہر شئ کا خالق، رب اور مالک ہے لیکن اس کی انہوں نے امر و نہی کے ساتھ معارضت کی اور اسے وہ حقیقت کا نام دیتے ہیں اور اسے شریعت کا معارض ٹھہراتے ہیں

سوم: وہ حضرات جو قائل ہیں کہ مشاہدِ قدر ملامت وعقاب کی نفی کرتا ہے اور عارف کے نزدیک یہ اور یہ برابر ہیں اور وہ اس میں تضاد بیانی کا شکار اور شرع وعقل اور ذوق ووجدان کے مخالف ہیں وہ اپنے ساتھ احسان کرنے والے اور اپنے پر ظلم کرنے والے کے درمیان تسویہ نہیں کرتے اور نہ عالم وجاہل، قادر وعاجز، طیب وخبیث اور عادل وظالم کے درمیان بلکہ ان کے مابین تفرقہ کرتے ہیں نیز اپنی اہواء اور اغراض کے بموجب بھی تفرقہ کرتے ہیں نہ کہ امر و نہی کے بموجب اور نہ وہ تقدیر کے ساتھ ٹھہرتے ہیں اور نہ امر کے ساتھ

بلکہ جیسا کہ بعض علماء نے کہا: (اَنْتَ عِنْدَ الطَّاعَةِ قَدْرِیُ وَعِنْدَ الْمَعْصِیَّةِ جَبْرِیُ) (تو طاعت کے وقت میری قدر اور معصیت کے وقت میرا جبر ہے؟) جو مذہب بھی نفس کی خواہش کے موافق ہوا سے اختیار کرو، کوئی ایسا نہیں جو ترکِ واجب اور فعلِ محرم میں تقدیر کے ساتھ حجت پکڑتا ہو مگر وہ متضاد باتیں کرے گا وہ اسے اپنی ہوائے نفس کے خلاف حجت نہ بنائے گا بلکہ اسے ایذاء دینے والے کا معادی بنے گا خواہ وہ حق پر ہو، اور اسے پسند کرے گا جو اس کی ذاتی اغراض پر اس سے موافقت کرے اگرچہ وہ اللہ کا دشمن ہو تو یوں اس کا حب وبغض اور موالات ومعادات اس کی ہویٰ وغرض اور ذوقِ نفس ووجدان کے بحسب اور تابع ہے نہ کہ اللہ کے امر و نہی کے کیونکہ اس کیلئے ممکن ہی نہیں ہے کہ ہر ایک کیلئے وہ تقدیر کو دلیل بنا پائے کہ یہ ایسے فساد کو مستلزم ہوگا جس کی اصلاح نہ ہو سکے گی اور ایسا شر درپیش ہوگا جس میں کوئی خیر نہیں کہ اگر ہر ایک کیلئے تقدیر کے ساتھ حجت پکڑنا جائز ہو تو کسی ظالم، سرکش اور زیادتی کرنے والے کو سزا نہ ملے اور نہ کوئی مظلوم ظالم سے اپنا حق لے سکے اور ہر کوئی شتر بے مہار بن کر جو چاہے کرتا پھرے! نہ اسے کسی کی باز پرس کا ڈر ہو اور نہ اخروی پکڑ کا اور یوں نظامِ عالم بگاڑ کی اس انتہاء پر ہو جائے جس کا تصور بھی ممکن نہیں اور معلوم بالضرورت ہے کہ افعال دو انواع میں منقسم ہیں:

(۱) بندوں کیلئے نافع

(۲) ان کیلئے ضار

اللہ نے رسل کو اسی لئے مبعوث کیا تا کہ وہ معروف کا حکم دیں اور منکر سے روکیں اور طیبات کو ان کیلئے حلال کریں

اور خبائث کو حرام تو جو اللہ کی شرع و دین کی اتباع نہ کرے وہ اس کی ضد اہواء اور بدعات کا تابعدار بنے گا اور اس ضمن میں تقدیر کو بطورِ عذر پیش کرنا جدل بالباطل کے زمرہ میں آئے گا تا کہ اس کے ساتھ حق کا رد اور اسے لازم آئے گا کہ ہر مجرم کو تقدیر کی اس دلیل کی رو سے معذور قرار دے، اگر کہے میں تقدیر کو صرف اس شخص کا عذر مانوں گا جو اس کا شاہد ہو اور جانتا ہو کہ اللہ اس کے فعل کا خالق اور اس کا محرک ہے نہ کہ ان کیلئے جو اس شہود سے غائب ہوں یا جو اہلِ جحود میں سے ہوں تو اسے کہا جائے گا تقدیر تو اس کے شہود اور اس کے جحود دونوں پر لاگو ہے تو اگر یہ فرق کا موجب ہے تو دونوں کیلئے ہے کہ تقدیر دونوں کو شامل ہے، تو تم نے بعض کو محمود اور بعض کو مذموم بنا ڈالا حالانکہ دونوں پر تقدیر یکساں طور سے لاگو ہوئی ہے اور یہ فرق کی طرف رجوع اور امر و نہی کے ساتھ اعتصام ہے اور تب تم نے اپنے ہی اصول کو توڑ ڈالا اور اس ضمن میں تضاد کا شکار بنے اور اسی طرح ہر وہ بھی جو تمہارے اس نظریہ پر ہو! پھر اس اصل کے فساد اور تناقض کے ساتھ ساتھ یہ باطل نظریہ اور گمراہ کرنے والی بدعت ہے تو کون اور ہے جس نے ایمان بالقدر اور اس کے شہود کو واجبات کے ترک اور محظورات کے فعل میں عذر بنا ڈالا؟ بلکہ تقدیر پر ایمان حسنات میں سے ایک حسنہ ہے اور یہ سیآت کے دفاع کے ضمن میں قائم نہیں ہوتی مثلاً اگر کسی مشرک نے اللہ کے ساتھ شرک کیا اور اس کے رسول کی تکذیب کی اور کہا یہی اس کی تقدیر ہے تو یہ کہنا اس کی تعذیب سے مانع اور اس کی تکذیب کیلئے ساتر اور غافر نہ ہوگا، اللہ نے خود کہا ہے کہ میں مشرک کو کسی صورت معاف نہ کروں گا؟ چاہے وہ تقدیر کا مقر اور اسے پیشِ نظر رکھنے والا ہو یا پھر اس کا منکر یا اس سے غافل ہو، ابلیس نے کہا تھا:

(بِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَلَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ) [الحجر : **۳۹**] (کہا اے رب جس طرح تو نے مجھے رائندہِ درگاہ کیا ہے میں بھی زمین میں لوگوں کیلئے آراستہ کر دکھاؤں گا اور سب کو بہکاؤں گا) تو وہ بھی انکار پر مصر ہوا اور تقدیر کا سہارا لیا تو اس سے اس کے کفر و عذاب میں اضافہ ہی ہوا بجائے اس کے کہ اسے معذور مانا جائے! جہاں تک حضرت آدم علیہ السلام تو انہوں نے (کوتاہی ہو جانے پر تقدیر کا سہارا نہیں لیا بلکہ) کہا:

(رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ) [الأعراف :۲۳] (کہا اے ہمارے رب ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور اگر تو ہمیں نہیں بخشے گا اور ہم پر رحم نہیں کرے گا تو ہم خسارہ پانے والوں میں سے ہو جائیں گے) اللہ نے فرمایا:

(فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ)[البقرة : **۳۷**] (تو آدم نے اپنے رب سے کچھ کلمات سیکھے تو اس نے ان کا قصور معاف کر دیا بے شک وہ معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے) تو جس نے استغفار و توبہ کی وہ سعید اور جس نے اصرار جاری رکھا اور تقدیر کا سہارا لیا اور اسے بطورِ عذر پیش کیا وہ ابلیس و شقی ہوا، اللہ نے ابلیس سے کہا:

(لَاَمْلَـَٔنَّ جَهَنَّمَ مِنْكُمْ اَجْمَعِيْنَ) [الأعراف :۱۸] (فرمایا کہ نکل جا یہاں سے پاجی مردود جو لوگ ان میں سے تیری

پیروی کریں گے میں تم سب سے جہنم کو بھر دوں گا) یہ ایسا مقام ہے کہ کثیر حقائق میں غور وخوض کے مدعی حضرات کے قدم بھی لڑکھڑا گئے، وہ اپنے ذوق ووجدان اور ذاتی اغراض اور نفسانی خواہشات اور ذہن میں وارد خیالات کو حقائق کا نام دیتے اور امر کی مخالفت میں تقدیر کا سہارا لیتے ہیں اور یوں وہ ان مشرکین کے ہمسر بنے جنہوں نے اپنی رسومات کو دین قرار دے ڈالا، اللہ نے اسے مشروع نہیں کیا اور انہوں نے بھی اللہ کے امر کی مخالفت پر تقدیر کا سہارا لیا، تقدیر کی وجہ سے گمراہی کا شکار بننے والوں کی تیسری صنف وہ حضرات ہیں جنہوں نے رب سے اس کے قضاء وقدر اور امر ونہی کے درمیان جمع میں مخاصمت کی ہے جیسا کہ وہ اس کا ذکر ابلیس کی زبان پر کرتے ہیں، یہ اللہ سے مخاصمت کرنے والے اور اس کے اعداء ہیں، جہاں تک اہلِ ایمان تو ان کا قضاء وقدر اور امر ونہی پر ایمان ہے، وہ مامور بہ کو بجالاتے اور محظور کا ترک کرتے اور مقدور پر صبر کرتے ہیں جیسا کہ ارشادِ ربانی ہوا:

﴿إِنَّهُ مَنْ يَتَّقِ وَيَصْبِرْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ﴾ [یوسف: ۹۰] (جو شخص اللہ سے ڈرتا اور صبر کرتا ہے تو اللہ نیکوکاروں کا اجر ضائع نہیں کرتا) تو تقویٰ فعلِ مامور اور ترکِ محظور کا نام ہے اور صبر یہ ہے کہ مقدور پر صبر کیا جائے، یہ جب انہیں زمین پر یا ان کے انفس میں کوئی مصیبت اور پریشانی لاحق ہوتی ہے تو جانتے ہیں کہ یہ سب مکتوب ومقدر تھا اور مصائب وحوادث انہیں پہنچنا مقدر ہے جو ٹل نہیں سکتے اور جو تقدیر میں نہیں وہ انہیں گرفت میں نہیں لے سکتے تو یوں وہ تسلیم ورضا کا پیکر بنے ہوتے ہیں ہاں اللہ کا جب حکم آجائے تو خیرات میں مسارعت کرتے اور طاعات میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے اور رغباً اور رہباً اللہ کو پکارتے ہیں، اس کے محارم سے اجتناب اور اس کی حدوں کی حفاظت کرتے ہیں اور اگر کوتاہی ہو جائے تو ندامت کے اشک بہانے میں سستی یا تاخیر نہیں کرتے اور جانتے ہیں کہ درِ توبہ ہمیشہ وا ہے اور وہ اس روش میں اپنے نبی کی اقتداء کرتے ہیں جو ایک صحیح حدیث میں فرماتے ہیں: اے لوگو اپنے رب کے سامنے توبہ کرو! پس اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے میں روزانہ سو دفعہ۔ایک روایت میں ہے ستر سے زائد مرتبہ۔اللہ سے استغفار اور توبہ کرتا ہوں، آخری سورۃ جو آپ پر نازل ہوئی وہ سورۃ النصر ہے:

﴿إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ إِنَّهُ كَانَ تَوَّابًا﴾ [النصر: ۱-۳] (جب اللہ کی مدد آ پہنچی اور فتح ہوئی۔اور تم نے دیکھ لیا کہ لوگ فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہو رہے ہیں۔پس اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کرو اور اس سے مغفرت مانگو بے شک وہ معاف کرنے والا ہے) جب یہ دونوں اصول جان لئے ہیں تو انہی پر اس استفتاء کا جواب مبنی ہے اور اس سے اس مذکورہ بالا رسالہ کی عبارت کے اندر مخفی ضلالات کی پہچان ہو گی، تو قائل کا کہنا کہ اللہ تعالی کی ذات لطیف ہوئی تو اس کا نام اس نے حق رکھا اور (دوسری طرف) کثیف ہوئی تو اس کا نام اس نے خلق رکھا (یعنی مخلوق اللہ کا وجودِ کثیف ہے) تو یہ اہلِ وحدت وحلول اور اتحادیہ کا قول ونظریہ ہے اور یہ باطل ہے تو لطیف ہی اگر کثیف ہے تو (اس کا مطلب ہوا کہ) حق ہی خلق ہے اور نہ تلطیف اور نہ تکثیف ہے اور اگر لطیف کثیف سے دیگر ہے تو

حق اور خلق کے مابین فرق ثابت ہوا تو ایک حق ہے اور دوسری خلق اور حق خلق نہ ہوگا، تو متصور نہیں کہ ذاتِ حق کسی طور خلق ہو جیسا کہ یہ بھی متصور نہیں کہ خلق کسی بھی طور ذاتِ خالق ہو سکے

اسی طرح دوسرے کا قول کہ حقیقۃً ان میں ظاہر ہوا اور مجازاً ان سے محتجب ہوا تو اگر ظاہر غیرِ مظاہر ہے تو رب اور عبد کے درمیان فرق ثابت ہوا اور اگر دوئی نہیں تب پھر ظہور اور احتجاب بھی متصور نہیں، پھر اس کا قول کہ جو اہلِ حق سے ہے تو وہ انہیں مظاہر اور مجالی دیکھے گا اور جو اہلِ فرق سے ہے وہ انہیں ستور اور حجب دیکھے گا تو یہ ایسی کلام ہے جس کا بعض بعض کا متضاد ہے کیونکہ اگر وجود واحد ہے تو شاہدَین ایک دوسرے کا غیر کیونکر ہوں گے اور شاہد غیرِ مشہود نہ ہو، اسی لئے بعض مشائخ نے جب کہا: جو کہتا ہے کائنات میں سوا اللہ ہے تو وہ جھوٹا ہے تو ایک صاحب نے کہا: جھوٹا کون ہے؟ اس پر اس سے کوئی بات نہ بن پڑی، مطلب یہ کہ جب سوائے واجب بنفسہ کے کوئی موجود نہیں تو اس کا مطلب ہوا وہی جھوٹ بولتا، ظلم کرتا، کھاتا اور پیتا ہے اور اس کی ان لوگوں کے اکابرین تصریح کرتے ہیں جیسا کہ مصنفِ فصوص وغیرہ نے کہا کہ وہ تمام صفاتِ ذم کے ساتھ موصوف ہے اور وہی ہے جو بیمار پڑتا، مضروب بنتا اور مصائب و آلام کا شکار ہوتا ہے اور وہ مصائب و نقائص کے ساتھ متصف ہے جیسا کہ مدح و ذم کی صفات کے ساتھ بھی موصوف ہے، لکھتا ہے، پس بنفسہ (العلیٰ) وہ ہے جس کیلئے سب ثبوتی اور سلبی صفات ہوں چاہے عقلاً، شرعاً اور عرفاً یہ صفات محمود ہوں یا مذموم، اور کہا: کیا دیکھتے نہیں کہ حق محدث صفات کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے اور اس کی خود اس نے خبر دی ہے اور صفاتِ نقص اور صفاتِ ذم کے ساتھ، کیا مخلوق کو نہیں دیکھتے کہ وہ صفاتِ خالق کے ساتھ ظاہر ہوتی ہے اور یہ سب صفات اس کیلئے حق ہیں جیسے مخلوق کی صفات خالق کیلئے حق ہیں، اور قائل کا قول: (لَقَدْ حَقَّ لِیْ عِشْقُ الْوُجُوْدِ وَأَهْلِهٖ) مقتضی ہے کہ اسے ابلیس فرعون، ہامان اور ہر کافر کے ساتھ عشق ہو نیز کتوں، سوروں اور بول و براز اور گندگی کے ساتھ بھی حالانکہ یہ عقلاً و شرعاً باطل ہے تو وہ اس نظریہ میں جھوٹا اور تضاد بیانی میں واقع ہے، اگر اسے کوئی موذی ایذا یا شدید الم پہنچائے تو اس سے وہ بغض و معادات کرے گا بلکہ اس سے بدلہ لینے کی پوری کوشش کرے گا لہذا ہر موجود سے آدمی کا عشق کرنا عقلاً محال اور شرعاً محرم ہے اور رہا بعض کا یہ قول: (عَیْنُ مَا تَریٰ ذَاتُ لَا تَریٰ وَ ذَاتُ لَا تَریٰ عَیْنُ مَا تَریٰ) یہ ابن سبعین کا مقولہ ہے جو اکابر اہلِ شرک والحاد اور سحر واتحاد میں سے تھا اور ان کے افاضل، اذکیاء اور فلسفہ وتصوف کے بڑے علماء میں سے، اسی طرح ابن عربی کا قول: (ظَاهِرُهٗ خَلْقُهٗ وَ بَاطِنُهٗ حَقُّهٗ) (اس کا ظاہر اس کی خلق اور اس کا باطن اس کا حق ہے) یہ اہل حلول کا قول ہے اور یہ تضاد بیانی ہے

ایک طرف تو وہ وحدت کا قائل ہے جس کی رو سے کون میں دو وجود نہیں کہ ایک باطن اور دوسرا ظاہر ہو اور وجود اور عین کے درمیان تفریق کی کوئی حقیقت نہیں بلکہ یہ اہلِ کذب و مین کے اقوال میں سے ہے: ابن سبعین نے یہ بھی کہا: (رَبٌّ مَالِكٌ وَ عَبْدٌ هَالِكٌ وَاَنْتُمْ ذٰلِكَ اللّٰهُ فَقَطْ وَالْكَثْرَةُ وَهْمٌ) تو یہ اس فاسد اصل کے موافق ہے کہ وجودِ مخلوق ہی وجودِ خالق ہے

تو اس نے عبد کو مالک کہا یعنی اس کا کوئی (ذاتی) وجود نہیں تو سوائے وجودِ رب کے کچھ باقی نہیں، اس کا نظریہ ہے کہ (لَا مَوْجُوْدَ إِلَّا اللّٰهُ) (کوئی موجود نہیں مگر اللہ) اسی لئے وہ اور اس کے اصحاب اپنے ذکر میں بجائے مسلمانوں کی طرح (لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ) کہنے کے (لَيْسَ إِلَّا اللّٰهُ) (نہیں مگر اللہ) کہتے ہیں! شیخ قطب الدین بن قسطلانی انہیں لیسیہ کا نام دیتے تھے اور کہتے تھے ان سے بچو، اور اس کا کہنا: (اَلْكَثْرَةُ وَهْمٌ) یہ تناقض ہے کہ اس کا قول وھم کو مقتضی ہے تو اگر متوھم ہی وہم ہے تو اس کا مطلب ہے اللہ وہم ہوا؟ اور اگر متوہم غیرِ وہم ہے تو تعددِ وجود ثابت ہوا، نیز اگر متوہم اللہ ہے تو اس نے اللہ کو باطل وہم کے ساتھ موصوف کیا اور یہ کفر ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے قول: (اَلْوُجُوْدُ وَاحِدٌ) کے مناقض ہے، اور اگر متوھم اس کا غیر ہے تو اس نے غیر اللہ کا اثبات کر دیا اور یہ اس کے نظریہ کے مناقض ہے پھر جب اس نے غیر کا اثبات کیا تو کثرت لازم ہوئی تو پھر کثرت وہم کیونکر ہوئی؟ بلکہ یہ تو حق ہوئی، ابن عربی سے منقولہ دونوں اشعار باہم متناقض ہونے کے ساتھ ساتھ اسی اصل ونظریہ پر مبنی ہیں تو اس کا کہنا: (يَا صُوْرَةَ إِنْسٍ سِرُّهَا مَعْنَائِيْ) بلسانِ حق خطاب ہے جو انسانی صورت سے مخاطب ہو کر کہتا ہے اسے صورتِ انس، یعنی وہ صورت ہے اور میں اس کا معنی ہوں اور یہ مقتضی ہے کہ معنی صورت کا غیر ہو اور یہ تعدد اور معنی وصورت کے مابین تفریق کو مقتضی ہے تو اگر وجودِ معنی ہی وجودِ صورت ہے جیسا سے اس کی اس نے تصریح کی ہے تب تعدُّد نہیں اور اگر اس کا وجود اس کے وجود کا غیر ہے تو یہ تناقض ہے، اسی طرح اس کا قول: (مَا خَلْقُكَ لِلْأَمْرِ تَرىٰ لَوْلَائِيْ) مجمل کلام ہے، ممکن ہے کہ اس کے ساتھ صحیح معنی مراد لیا جائے یعنی اگر خالق نہ ہوتا تو مکلفین کا کوئی وجود نہ ہوتا اور نہ اللہ کے امر کی خلق ہوتی لیکن چونکہ معلوم امر ہے کہ وہ اس کا قائل نہ تھا لہذا اس سے اس کی مراد وحدت، حلول اور اتحادِ ذات کا نظریہ ہے اسی لئے کہا:

شِئْنَاكَ فَأَنْشَأْنَاكَ خَلْقاً بَشَراً   كَيْ تَشْهَدُنَا فِيْ أَكْمَلِ الأَشْيَاءِ

(ہم نے تیری [بابت] مشیت کی تو تجھے بشر پیدا کر دیا تا کہ تم ہمارا اکمل ترین شکل میں مشاہدہ کرو) تو بیان کیا کہ بندے اکمل الاشیاء یعنی انسانی صورت میں اس کا مشاہدہ کر رہے ہیں لیکن وہ اپنی اس کلام میں تضاد کا شکار ہے کہ وہ حلول پر راضی نہیں اور دو موجود کا اثبات کرتا ہے اس طور کہ ان میں سے ایک کا دوسرے میں حلول ہے بلکہ اس کے نزدیک وجودِ حال عین وجودِ محل ہے البتہ وہ ثبوت اور وجود کے مابین حلول کا قائل ہے تو وجودِ حق کا ممکنات کے ثبوت میں اور ان ثبوت کا اس کے وجود میں حلول ہوا ہے اور نفس الامر میں اس کلام کی کوئی حقیقت نہیں کہ اس کے اور اس کے درمیان کوئی فرق نہیں لیکن فی نفسہ اس کا نظریہ متناقض ثابت ہوا

جہاں تک یہ قصہ کہ کسی نے والد سے حج پر جانے۔۔۔۔۔الخ تو یہ کہنا مسلمانوں کے ہاں بالا جماع کفر ہے! بیت اللہ کے طواف کا اللہ اور اس کے رسول نے حکم دیا ہے اور انبیاء وصالحین کا طواف کرنا بالا جماع حرام ہے اور جس نے اس کے جواز کا اعتقاد رکھا وہ کافر ہے چاہے کسی کے بدن کا طواف کیا جائے یا اس کی قبر کا، اس کا قول: (مَا فَارَقَهُ اللّٰهُ طَرْفَةَ عَيْنٍ قَطُّ) (یعنی اللہ لمحہ بھر بھی اس سے جدا نہیں ہوا) تو اگر اس سے اس کی مراد مطلق اور عام حلول ہے تب تو یہ اپنے بطلان کے باوصف کفر ہے

کیونکہ تب طائف اور مطوف بہ کے درمیان کوئی فرق نہیں تو اس کا طواف کرنا برعکس سے اولی نہ ہوگا بلکہ یہ تو مستلزم ہے کہ کتوں، سوروں، کفار، نجاسات، گندگیوں اور ہر خبیث وملعون کا طواف کیا جائے کیونکہ حلول اور اتحادِ عام اس سب کو متناول ہے، ایک دفعہ ان کے شیخ شیرازی نے اپنے شیخ تلمسانی سے کہا۔ جس کا گزر ایک خارش زدہ کتے کی میت سے ہوا۔ یہ بھی اللہ کی ذات سے ہے تو بولا: (وَ ثَمَّ خَارِجٌ عَنْهُ؟) (یہاں کچھ اس سے خارج ہے؟) تلمسانی ایک شخص کے ہمراہ تھا کہ کتے سے ان کا گزر ہوا، ساتھی نے اسے پاؤں سے ٹھوکر لگائی تو تلمسانی نے کہا اسے ٹھوکر نہ مارو کیونکہ یہ اس سے ہے: (فَإِنَّهُ مِنْهُ) تو یہ عقل ودین میں اعظم کفر و کذب ہونے کے ساتھ ساتھ تناقض بھی ہے کیونکہ (ان کے نظریہ کے مطابق) راکض (یعنی دوڑنے والا) اور مرکوض (جہاں دوڑ رہا ہے) واحد ہیں اسی طرح ناہی اور منہی بھی تو کوئی کسی سے امر ونہی میں اولیٰ نہیں اور نہ وحدت کے ساتھ تعدد متصور ہے اور اگر مظاہر اور مجالی کہیں تو پوچھا جائے اگر ان کیلئے ظاہر ومتجلی کے وجود سے الگ وجود ہے تو تعدد ثابت ہوا اور وحدت کا نظریہ باطل ہوا اور اگر دونوں کے درمیان دوئی نہیں تب ظاہر ومُظہر اور متجلی ومتجلیٰ فیہ کے مابین کوئی فرق نہ رہا، اگر اس کی اپنے قول: (مَا فَارَقَهُ اللّٰهُ الخ) سے مراد حلولِ خاص ہے جیسے نصاریٰ حضرت مسیحؑ بارے یہ عقیدہ رکھتے ہیں تو لازم ہوا کہ یہ حلول اس کے لئے اس کی تخلیق سے ثابت ہو جیسے نصاریٰ نے حضرت مسیح کے ضمن میں یہ کہا، تب یہ اس کیلئے اس کی معرفت، عبادت، تحقیق اور عرفان کے ساتھ حاصل نہ ہوا

اور تب اس کے اور دیگر انسانوں کے درمیان کوئی فرق نہ ہوا، یہ کیونکر ہو کہ اس کے لئے تو حلول ثابت ہے دوسروں کیلئے نہیں؟ اور یہ نصاریٰ کے قول سے بھی بدتر ہے کہ انہوں نے تو حضرت مسیح بارے یہ ادعاء کیا کیونکہ ان کی پیدائش بغیر باپ کے ہوئی تھی اور یہ شیوخ نفسِ تخلیق میں افضل نہ ہوئے بلکہ عبادت، معرفت اور تحقیق وتوحید کے ساتھ، اور یہ ایسا امر ہے جو ان کیلئے عدم حاصل ہونے کے بعد حاصل ہوا تو اگر یہ حلول کا سبب ہے تو واجب ہے کہ ان میں (اللہ کی ذات کا) حلول حادث ہو، نہ کہ ان کی خلق کے مقارن! تب ان کا قول کہ رب ان کے ابدان یا قلوب سے لحظہ بھر بھی جدا نہیں ہوا دونوں تقدیروں پر باطل کلام ہے

اور جو رابعہ بصریہ بارے ذکر کیا کہ کعبہ کی بابت مذکورہ بات کہی تو یہ ان پر کذب وافتراء ہے، یہ کہنے والا کافر ہے، اسے توبہ کا کہا جائے اگر نہ کرے تو قتل کا حقدار ہے، مسلمان بیت اللہ کی عبادت نہیں کرتے وہ تو اس بیت کے رب کی عبادت اور طواف کرتے ہیں اور اس کی طرف رخ کر کے نماز ادا کرتے ہیں، دوسری کلام جو ان کی طرف منسوب کی کہ: (وَاللّٰهِ مَا وَلَجَهُ اللّٰهُ الخ) یہ بھی غلط اور جھوٹا انتساب ہے، حلولیہ کے مذہب پر اس معنی میں بیت اللہ اور دیگر بیوت میں کوئی فرق نہیں تو اس کا کیا امتیاز ہے کہ اس کا طواف کیا جاتا اور اس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی جاتی ہے؟ اور اسی کا حج کیا جاتا ہے؟ قائل کا کہنا: (مَا وَلَجَ اللّٰهُ فِيهِ) صحیح کلام ہے لیکن اس کا قول: (مَا خَلاَ مِنْهُ) تو اگر اس سے اس کی مراد یہ ہے کہ اس کی ذات اس میں حلول کئے ہوئے ہے یا جو اس کے مشابہ بات ہو، تو یہ باطل اور اس کے قول: (مَا وَلَجَ الخ) کے مناقض ہے، اور اگر مراد یہ ہے کہ اتحاد ہمیشہ سے

اس کے ساتھ ہے اور اس کیلئے ولوج متجد نہیں اور وہ ہمیشہ سے اس میں غیرِ حالّ ہے تو یہ اپنے کفر و باطل ہونے کے ساتھ ساتھ اس امر کا موجب ہے کہ بیت اللہ کا دیگر مساجد و معابد سے کوئی امتیاز اور وجہِ فوقیت نہ ہو کہ ان کے نزدیک تمام موجودات اسی طرح ہیں ! جہاں تک حلاج کی طرف منسوب یہ دو اشعار:

سُبُحَانَ مَنُ اَظُهَرَ نَاسُوُتَهٗ سِرُّ سَنَا لاهُوُتِه الثَّاقِبِ

ثُمَّ بَدَا مُسُتَتِراً ظَاهِراً فِیُ صُوُرَةِ الآكِلِ وَالشَّارِبِ

(گزرے ہیں) تو ان میں اس نے حلولِ خاص کا بیان کیا ہے جیسے نصاری حضرت مسیح کے ضمن میں عقیدہ رکھتے ہیں، ابوعبداللہ ابن خفیف شیرازی۔ حلاج کے امر کی حقیقت پر مطلع ہونے سے قبل۔ ان کا دفاع کیا کرتے تھے، ایک مرتبہ انہیں یہ دو اشعار سنائے گئے تو کہنے لگے اللہ انہیں نظم کرنے والے پر لعنت کرے، اسی طرح یہ شعر:

عَقَدَ الُخَلاَئِقُ فِی الإِلٰهِ عَقَائِدَا وَاَنَا اعُتَقَدُتُ جَمِیُعَ مَا اعُتَقَدُوُهُ

(گزرا ہے) تو یہ ابن عربی کے حوالے سے معروف ہے، ممکن ہے اصل میں یہ بھی حلاج کا ہو اور اس نے اس کا حوالہ دیا ہو تو حلاج کی طرف اسے منسوب کرنا بھی درست ہے تو یہ باطل اور متناقض کلام ہے، اعتقاد میں نقیضین کے درمیان جمع کرنا غایت درجہ کا فساد ہے، یہ دونوں قضیے سلب اور ایجاب کی رو سے باہم متناقض ہیں اس طور کہ ایک کی تصدیق کرنے اور ماننے سے دوسرے کی تکذیب لازم آتی ہے، کسی طور دونوں کو اکٹھے ماننا ممکن نہیں

یہ حضرات زعم کرتے ہیں کہ ان کے ہاں کشف کے ذریعہ وہ کچھ ثابت ہوتا ہے جو صریح عقل کے مناقض ہو تو یوں یہ نقیضین اور ضدین کے مابین جمع کے قائل ہیں اور ان کے طریقہ کا سالک معقول و منقول کی مخالفت کا قائل ہوتا ہے اور بلاشبہ یہ ان سرفہرست فاسد نظریات میں سے ہے جو اہلِ سفسطہ نے اختیار کئے اور معلوم امر ہے کہ انبیاء علیہم السلام اولیاء سے اعظم و افضل ہیں اور وہ ایسی چیزیں لے کر آئے کہ عقول ان کی معرفت سے عاجز رہیں مگر ایسی چیزیں اور باتیں نہیں لائے کہ عقول ان کے بطلان سے واقف ہوں، وہ محارات العقول (یعنی عقول کو حیران کرنے والے امور) کی خبریں تو دیتے رہے مگر محالات العقول کی نہیں جبکہ یہ ملحد دعوی کرتے ہیں کہ محالات العقول صحیح ہیں اور نقیضین کے مابین جمع کرنا بھی صحیح ہے اور جو بات صریحِ معقول کے مخالف ہو وہ بھی صحیح ہے، بلاشبہ یہ لوگ خیالات و اوہام کے کارندے ہیں، یہ اپنے ذہن میں کئی امور کا تخیل و توھم کرتے ہیں تو انہیں خارج میں ثابت سمجھتے ہیں حالانکہ یہ صرف ان کے ذہنی خیالات اور سوچیں ہیں اور باطل خیال میں وہ کچھ متصور کر لیتے ہیں جس کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی اسی لئے کہتے ہیں ارضِ حقیقت ہی ارضِ خیال ہے جیسے ابن عربی وغیرہ نے کہا اسی لئے یہ اس حکایت کا ذکر کرتے ہیں جسے ابن فارض کے قصیدہ کے شارح سعید فرغانی نے نقل کیا، جہاں تک اس کا قول:

بِیۡنِیۡ وَ بَیۡنَکَ اِنِّیٌّ تُزَاحِمُنِیۡ فَارۡفَعۡ بِحَقِّکَ اِنِّیَتِیۡ مِنَ الۡبَیۡنِ

(گزرا ہے) تو یہ کلام تین معانی کے ساتھ مفسر کی جاتی ہے: ایک جو ملحد نے تفسیر کی، دوسری جو زندیق نے کی اور تیسری جو صدیق نے کی، تو اول: کہ اس سے مراد اس کی انیت کے ثبوت کے رفع کی طلب ہے حتی کہ کہا جائے اس کا وجود ہی وجودِ حق اور اس کی انیت انیتِ حق ہے تو یہ نہ کیا جائے کہ وہ اللہ کا غیر اور اس کا ماسوا ہے اسی لئے ان ملاحدہ کے سلف نے کہا حلاج آدھا آدمی تھا اور یہ اس لئے کہ (ان کے خیال میں) اس کی انیت بالمعنی رفع نہ ہوئی تھی تو اس کیلئے صورتِ مرفوع ہوئی، کہتے ہیں جب ثبوت میں اس کی انیت مرفوع نہ ہوئی اس کے حقیقتِ شہود میں صورت مرفوع ہوئی تو وہ قتل کیا گیا، یہ قول کفر و الحاد ہونے کے ساتھ ساتھ تناقض کا شاہکار بھی ہے، اس کا بعض بعض کا نقض کرتا ہے تو اس کا قول: (بَیۡنِیۡ وَ بَیۡنَکَ اِنِّیٌّ تُزَاحِمُنِیۡ) اس کے غیر سے خطاب اور اس کے اور رب کے مابین انیت کا ثبوت ہے اور یہ تین امور کا اثبات ہے اسی لئے وہ کہتا ہے: (فَارۡفَعۡ بِحَقِّکَ اِنِّیَتِیۡ مِنَ الۡبَیۡنِ) تو اپنے غیر سے طلب کرتا ہے کہ اس کی انیت کا رفع کر دے اور یہ تین امور کا اثبات ہے اور یہ معنائے باطل فنائے فاسد ہے اور یہ وجودِ سویٰ سے فناء ہے تو اس میں رفعِ انیت کی طلب ہے اور یہ فنا کی طلب ہے اور **فنا کی تین اقسام ہیں:**

(۱) وجودِ سویٰ سے فنا (۲) شہودِ سویٰ سے فنا (۳) اور عبادتِ سویٰ سے فنا

تو اول ملحدین اہلِ وحدت کا فنا ہے جیسا کہ اس کے ساتھ حلاج کی کلام کو مفسر کیا اور وہ یہ کہ وجودِ کائنات کو ایک وجود قرار دیا جائے، اور جو ثانی ہے۔ اور وہ شہود السوی سے فنا۔ تو یہ ہے جو کثیر سالکین کیلئے عارض ہوتا ہے جیسا کہ ابو یزید و امثالہ بارے بیان کیا جاتا ہے اور یہ مقامِ اصطلام ہے وہ یہ کہ اپنے موجود کے ساتھ اپنے وجود، اپنے معبود کے ساتھ اپنی عبادت، اپنے مشہود کے ساتھ اپنے شہود اور اپنے مذکور کے ساتھ اپنے ذکر سے غائب ہو جائے تو ہر وہ شئ فنا ہو جائے جو (پہلے) نہ تھی اور وہی باقی رہے جو ازل سے ہے اور یہ جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک شخص کا کوئی محبوب تھا تو اس محبوب نے اپنے آپ کو پانی میں پھینک دیا تو اس محبّ نے بھی اس کے پیچھے چھلانگ لگا دی، اس نے کہا میں تو اس میں گرا لیکن تم کیوں کود پڑے؟ تو وہ بولا: (غِبۡتُ بِکَ عَنِّیۡ فَظَنَنۡتُ اَنَّکَ اِنِّیۡ) (یعنی میں تیرے ساتھ اپنے آپ سے غائب ہوا تو گمان کیا کہ تُو میں ہوں) تو یہ اس کا حال ہے جو مخلوقات میں سے کسی شئ کے شہود سے عاجز رہا جبکہ اس کا دل وجودِ خالق کا شاہد ہوا اور یہ معاملہ سالکین کے ایک گروہ کو پیش آتا ہے، بعض لوگ اسے سلوک جبکہ بعض اس حال کو غایتِ سلوک قرار دیتے ہیں، ان کے ہاں غایتِ سلوک توحیدِ ربوبیت میں فنا ہو جانا ہے تو وہ مامور اور محظور اور محبوب اور مکروہ کے درمیان تفریق نہیں کرتے اور یہ ایک عظیم غلطی ہے جس کا شکار وہ شہودِ قدر اور احکامِ ربوبیت کا سہارا لے کر شرع، امر و نہی اور اللہ وحدہ کی عبادت اور اس کے رسول کی اطاعت کے شہود کے ضمن بنے تو جس نے اس اعتبار سے رفعِ انیت کی طلب کی وہ اس پر قابلِ تعریف نہیں البتہ کبھی وہ اس میں معذور باور ہوسکتا ہے

جہاں تک تیسری نوع اور وہ عبادتِ سویٰ سے فنا تو یہ انبیاء اوران کے اتباع کا حال ہے اور وہ یہ کہ اللہ کی عبادت کے ساتھ اس کے ماسوا کی عبادت، اس کی محبت کے ساتھ ہر ماسوا کی محبت، اس کی خشیت کے ساتھ ہر ماسوا کی خشیت اوراس کی طاعت اوراس پر توکل کے ساتھ ہر ماسوا کی طاعت اور توکل سے فنا ہوا جائے تو یہ اللہ وحدہ لاشریک لہ کی توحید کی تحقیق اور یہی حنیفیت ملتِ ابراہیمی ہے، اس میں یہ بھی داخل ہے کہ اللہ کی طاعت کے ساتھ اپنی ہوائے نفس کی اتباع سے فنا ہو تو نہ محبت اور بغض کرے مگر اللہ کیلئے، نہ عطا کرے اور روکے مگر اللہ کیلئے تو یہ دینی اور شرعی فنا ہے جس کے ساتھ اللہ نے اپنے رسل کو مبعوث کیا اوراسی کے ساتھ اپنی کتب کو نازل کیا، جس نے کہا: (فَارْفَعْ بِحَقِّكَ إِنِّيَتِيْ مِنَ الْبَيْنِ) اس معنی میں کہ وہ اپنے نفس کا رفع کرے کہ نہ اپنی خواہشات کا غلام بنے اور نہ اپنے نفس، حول اور قوت پر توکل کرے بلکہ اس کا سارا عمل اللہ کیلئے ہو نہ کہ ذاتی اغراض ومقاصد کیلئے اور اللہ کی حول و قوت کے ساتھ! جیسے کہا: (إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ) [الفاتحة: ۴] (اے اللہ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں) تو یہ حق اور محمود کلام ہے اور یہ جیسا کہ ابو یزید سے منقول ہے کہ کہا مجھے خواب میں رب العزت کا دیدار ہوا تو میں نے عرض کی: (خُــدَائِـــیْ) (اے میرے خدا) تیری طرف پہنچنے کا کیا طریق ہے؟ فرمایا: اپنے نفس کو ترک کر اور آ جاؤ، یعنی اپنی خواہشات کی اتباع اور اپنے آپ پر اعتماد ترک کرو تب تمہارا عمل اللہ کیلئے اور تمہاری استعانت اللہ کے ساتھ ہوگی جیسا کہ ارشاد کیا: (فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ) [هود: ۱۲۳] (تو اسی کی عبادت کرو اوراسی پر بھروسا رکھو) ابن عربی سے منقول قول: (وَبِیْ حَلَفْتُ وإِنَّ الْمُقْسِمَ اللّٰهُ) بھی اس کی کجروی اور افک سے ہے، اس نے اپنے نفس کو اپنی قسم کھانے والا اور حالف کو اللہ بتلایا ہے، تو وہی حالف اور وہی محلوف ہے جیسا کہ یہ لوگ کہتے ہیں، اس نے اپنی طرف سے اپنی طرف: (مِنْ نَفْسِهٖ إِلٰى نَفْسِهٖ بِنَفْسِهٖ) رسول بھیجا اپنے نفس کے ساتھ تو وہی مرسِل اور وہی مرسَل الیہ ہے اور جیسے ابن فارض نے اپنے قصیدہ سلوک میں کہا:

لَهَا صَلَوَاتِیْ بِالْمَقَامِ أُقِيْمُهَا ... وَاَشْهَدُ فِيْهَا اَنَّهَا لِیْ صُلَّتِ

كِلاَنَا مُصَلٍّ وَاحِدٌ سَاجِدٌ اِلیٰ ... حَقِيْقَتِهٖ بِالْجَمْعِ فِیْ كُلِّ سَجْدَةٖ

وَمَا كَانَ بِیْ صَلّٰى سِوَایَ وَلَمْ تَكُنْ ... صَلاَتِیْ لِغَيْرِیْ فِیْ اَدَا كُلِّ رَكْعَةٖ

(مقام۔ابراہیم۔ یہ پڑھی نمازیں اسی۔نفس۔ کے لئے ہیں، میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ میرے لئے پڑھی گئی ہیں۔ ہم دونوں ایک ہی نمازی ہیں، خود ہی ساجد اور خود ہی مسجود ہیں، ہمارا ہر سجدہ خود ہی کو ہے کسی غیر کو نہیں) حتیٰ کہ کہا:

وَمَا زِلْتُ اِيَّاهَا وَاِيَّایَ لَمْ تَزَلْ ... وَلاَ فَرْقَ بَلْ ذَاتِیْ لِذَاتِیْ اَحَبَّتِ

وَقَدْ رُفِعَتْ تَاءُ الْمُخَاطَبِ بَيْنَنَا ... وَفِیْ رَفْعِهَا عَنْ فُرْقَةِ الْفَرْقِ رِفْعَتِیْ

فَإِنْ دَعَوْتُ كُنْتُ الْمُجِيْبَ وَإِنْ اَكُنْ ... مُنَادِیْ اَجَابَتْ مَنْ دَعَانِیْ وَلَبَّتِ

اِلَیَّ رَسُوْلاً کُنْتُ مِنِّیْ مُرْسَلاً وَ ذَاتِیْ بِآیَاتِیْ عَلَیَّ اسْتَدَلَّتِ

(یعنی میں وہ ہوں اور وہ میں، کوئی فرق نہیں بلکہ میری ذات ہی محبّ اور میری ذات ہی محبوب ہے۔ ہمارے درمیان تائے خطاب رفع کر لی گئی ہے [یعنی من تو شدم تو من شدی] اور اس رفع میں فرق کی فرقت سے میری رفعت ہے۔ داعی بھی خود ہوں اور مدعو بھی خود۔ اپنی طرف رسول بھیجنے والا خود ہی مرسَل ہوں اور میری ذات نے اپنی آیات کے ساتھ مجھ پر ہی استدلال کیا ہے [پنجابی میں ایسی باتوں کو بَونگیاں مارنا کہا جاتا ہے])

اور جو قول حضرت عیسی کے حوالے سے ذکر کیا وہ آپ کی طرف جھوٹی نسبت ہے، یہ ملحد و کاذب اور من گھڑت کلام ہے کسی مسلم اور نصرانی نے اسے نقل نہیں کیا، یہ نصاریٰ کے عقائد سے موافق نہیں، یہ اپنے کفریہ اور الحادی ہونے کے باوصف باہم متناقض بھی ہے کیونکہ اس کا مفہوم ہے کہ اللہ اپنے آپ کو دیکھ رہا اور اپنی کلام سن رہا ہے جبکہ نبی اکرم ۔اور آپ اللہ کے عبدِ مخلوق ہیں۔ نے اپنے صحابہ سے کہا: میں تمہیں اپنی پشت کی جانب سے (بھی) دیکھتا ہوں جیسا کہ آگے (یعنی آنکھوں) سے دیکھتا ہوں تو اگر مخلوق میں سے بعض کے پاس یہ صلاحیت ہے اور یہ خود اپنے آپ کی رؤیت سے ابلغ ہے تو خالق تعالی کیونکر اپنے آپ کو نہیں دیکھ سکتا؟ نیز اس کا اپنی رؤیتِ نفس کی طرف شوق حتی کہ اسے پورا کرنے کیلئے حضرت آدم کی تخلیق کی، مقتضی ہے کہ ازل میں (یعنی تخلیقِ آدم سے پیشتر) وہ رؤیتِ نفس پر قادر نہ تھا تا آنکہ حضرت آدم کی تخلیق کی پھر یہ شوق اگر قدیم تھا تو چاہئے تھا کہ اسے ازل میں پورا کرتا اور اگر یہ محدَث ہے تو اس کے حدوث کا مقتضی کوئی سبب ہونا ضروری ہے حالانکہ کہا جا سکتا ہے شوق ہونا بھی ایک صفتِ نقص ہے لہذا یہ اللہ تعالیٰ کے حق میں ثابت نہیں اور یہ جو مروی کیا جاتا ہے: (طَالَ شَوْقُ الأَبْرَارِ إِلیٰ لِقَائِیْ وَاَنَا إِلیٰ لِقَائِهِمْ اَشْوَقُ) (یعنی ابرار کا میری ملاقات کا شوق طویل ہوا اور میں ان سے ملاقات کا ان سے زیادہ شائق ہوں) تو یہ ضعیف حدیث ہے

رہا اس کا قول: تو اپنے نور سے آدم کو پیدا کیا اور اسے مثلِ آئینہ بنایا اور میں وہ نور ہوں اور آدم آئینہ! تو یہ مقتضی ہے کہ آدم کی تخلیق حضرت مسیح سے ہوئی ہو اور یہ امرِ واقع کے بر خلاف ہے کیونکہ حضرت آدم حضرت مسیح سے قبل پیدا کئے گئے اور مسیح حضرت مریم سے اور وہ حضرت آدم کی ذریت سے ہیں تو آدم کیونکر اپنی ذریت سے مخلوق ہو سکتے ہیں؟ اور اگر کہا جائے مسیح اللہ کا نور ہیں تو یہ قول اگر چہ نصاری کے قول کی جنس سے ہے مگر اس سے بدتر ہے کیونکہ وہ کہتے ہیں مسیح ہی وہ ناسوت ہے اور لاہوت جو کلمہ ہے جو ابن کا جوہر ہے اور وہ کہتے ہیں لاہوت اور ناسوت کا باہمی اتحاد تب سے متحد ہے جب حضرت مسیح کا بدن پیدا کیا گیا، وہ یہ نہیں کہتے کہ آدم مسیح سے مخلوق ہیں کیونکہ مسیح ان کے نزدیک لاہوت و ناسوت دونوں کا اسم ہے اور ممتنع ہے کہ آدم ان سے مخلوق ہوں! نیز وہ نہیں کہتے کہ آدم لاہوت المسیح سے مخلوق ہیں، نیز قائل کا کہنا: کہ آدم اللہ کے نور سے پیدا کئے گئے ہیں جو کہ مسیح ہے تو اگر اس سے اس کی مراد وہ نور جو اللہ کی صفت ہے تو یہ وہ مسیح نہیں جو قائم بنفسہ ہیں کہ ممتنع ہے کہ قائم بنفسہ اپنے غیر کیلئے صفت ہو

اوراگراس نور سے اس کی مراد اس سے منفصل نور ہے تو معلوم امر ہے کہ تخلیقِ آدم سے قبل حضرت مسیح موجوداور منفصل شئ نہ تھے تو ہر تقدیر پر ممتنع ہے کہ آدم اللہ کے نور سے جو کہ حضرت مسیح ہیں، پیدا کئے گئے ہوں نیز اگر آدم آئینہ کی مثل تھے جس میں حق تعالی اپنی ذاتِ مقدسہ دیکھتا تھا تو لازم ہے کہ آدم میں ظاہر اس کی مثالِ ذات ہو نہ کہ حضرت آدم اس کی ذات ہوں اور نہ اس کی ذات کی مثال اوراس کی ذات کی مانند، تب اگراس سے مراد یہ ہے کہ حضرت آدم کو اللہ کی معرفت حاصل تھی تو وہ آدم میں اپنی ذات کی علمی مثال دیکھتا تھا تو رب تعالیٰ اپنے آپ کا عارف ہے تو اگر مثالِ علمی کی رؤیت ممکن ہو تو اس کے مطابق قائم بذاتہ علم کیلئے اس کی رؤیت اس علم کی رؤیت سے اولی ہے جو حضرت آدم کے ساتھ قائم ہے اور اگر مراد یہ ہو کہ خود حضرت آدم اللہ کیلئے مثال ہیں تب آدم وہ آئینہ نہیں ہو سکتے بلکہ وہ اس مثال (عکس) کی مانند ہوں گے جو اس آئینہ میں دکھائی دیتا ہے نیز اس نور کے ساتھ حضرت مسیح کی تخصیص ان نصاری کا قول ہے جو آپ کو خاص کرتے ہیں کہ آپ اللہ ہیں یا اللہ کا ابن ہیں اوران اتحادیہ نے اس قولِ نصاری کے ساتھ اپنا عمومِ اتحاد کا قول منضم کیا ہے جب انہوں نے غیرِ مسیح میں وہ کچھ کیا جو نصاریٰ حضرت مسیح میں کرتے ہیں، جہاں تک ابن فارض کا قول:

وَشَاهِدٍ إِذَا اسْتَجْلَيْتَ ذَاتَكَ مَنْ تَرىٰ   بِغَيْرِ مِرَاءٍ فِي الْمِرْأَةِ الصَّقِيْلَة

اَ غَيْرُكَ فِيْهَا لَاحَ أَمْ أَنْتَ نَاظِرٌ   إِلَيْكَ بِهَا عِنْدَ انْعِكَاسِ الأَشِعَّة

(ص: ۱۶۳ گزرے ہیں) تو یہ فاسد تمثیل ہے اور یہ اس وجہ سے کہ آئینہ دیکھنے والا اپنے نفس کا عکس دیکھتا ہے تو وہ اپنے نفس کو آئینہ کے واسطہ سے دیکھتا ہے، بلا واسطہ نہیں تو ان کا وحدت الوجود کا نظریہ باطل ہوا، بالفرض اگر یہ صحیح ہے تب یہ اس کے لئے مطابق نہیں تو اس کے بعد ان کی طرف سے حضرت آدم یا مسیح کے نحو کی ان کے قول بالعموم کے مناقض ہے! حضرت مسیح ونحوہ کو وہ حضرات خاص کرتے ہیں جو اتحادِ خاص (نہ کہ عام) کے قائل ہیں مثلا نصاری اور غالی شیعہ اور جاہل نساک (یعنی عابد) ونحوہم

نیز اگر بالفرض انسان آئینہ میں اپنا نفس دیکھتا ہے تو آئینہ اس کے نفس سے ایک خارج شئ ہے تو وہ (اپنے غیر میں) اپنا نفس یا مثالِ نفس دیکھتا ہے جبکہ ان کے نزدیک کائنات میں کوئی غیر اور سوا ہے ہی نہیں! تو یہاں ظاہر کے مغایر کوئی مظہر نہیں اور نہ ناظر کے مغایر کوئی آئینہ، اور یہ قائل ہیں کہ اکوان حق کے مظاہر ہیں تو اگر کہیں: مظاہر ظاہر کا غیر ہیں تب تعدُد لازم آئے گا اور وحدت باطل ہوگی اور اگر کہیں مظاہر ہی ظاہر ہے تب شئ خود اپنے میں ظاہر نہیں ہوسکتی اور نہ کسی شئ میں کسی اور شئ کی تجلی ہوئی (کیونکہ دوئی کا ان کے مطابق کوئی وجود نہیں) اور یوں اس کا قول: (وشاهد إذا الخ) متناقض کلام بنی کیونکہ یہاں مخاطِب، مخاطَب اور آئینہ ہے جس میں ذات مستجلی ہے تو یہ تین اعیان ہوئے تو اگر وجود واحد بالعین ہے تو یہ کلام باطل ہوئی تو یوں ہر کلمہ جو وہ کہتے ہیں ان کے اصل ونظریہ کا نقض ہی کرتا ہے۔

فصل

اور جو اس نے ابن اسرائیل کی کلام سے ذکر کیا کہ دو طرح کا امر ہے : ایک بالواسطہ اور دوسرا بلا واسطہ۔۔۔الخ تو اس کا مضمون یہ ہے کہ بالواسطہ امر دینی اور شرعی امر ہے جبکہ بلا واسطہ امر قدری اور کونی ہے تو یہ باطل کلام ہے، امرِ دینی کبھی بالواسطہ اور کبھی بلا واسطہ ہوتا ہے، اللہ نے حضرت موسیٰ سے کلام کی اور انہیں بلا واسطہ امر دیا اسی طرح شبِ معراج نبی اکرم کی نسبت بھی ہوا اور اسی طرح حضرت آدم کے ساتھ اور ان تینوں انبیائے کرام کو دئے گئے یہ اوامر دینی و شرعی تھے، کونی امر کی بابت بھی اس کا قول کہ یہ بلا واسطہ ہوتا ہے خطا ہے بلکہ اللہ نے اشیاء میں سے بعض کو بعض کے ساتھ تخلیق کیا ہے، امرِ تکوین خطاب نہیں جسے مکون مخلوق سنے کہ یہ ممتنع ہے، اسی لئے کہا گیا ہے کہ اگر یہ اس کے وجود کے بعد اس کیلئے خطاب ہے تب وہ کلمہِ کن کے ساتھ مکون نہ ہوا بلکہ قبل از خطاب اس کی تکوین ہوئی اور اگر یہ خطاب اس کے وجود میں آنے سے قبل تھا تب معدوم کو کیونکر خطاب کیا جا سکتا ہے؟ اس کے جواب میں کہا گیا کہ یہ معلوم کیلئے خطاب تھا کیونکہ اللہ کے دائرہِ علم میں اس کا وجود تھا اگر چہ وہ عین میں معدوم تھا اور جو درویش نے کہا تو بلاشبہ یہ اعتراض بنتا ہے، اور جو اپنے شیخ سے نقل کیا کہ حضرت آدم کی توحید ظاہراً اور باطناً تھی تو اس کا قول: (لا تَقْرَبْ) ظاہراً تھا جبکہ کھانے کا اس کا حکم باطناً تھا تو کہا جائے اگر اس کے کہنے کہ اللہ نے باطناً حضرت آدم سے (كُلْ) کہا تھا، سے اس کی مراد یہ ہے کہ فی الباطن اس کا انہیں حکم دینا امرِ تشریع و دین تھا تو یہ کذب و کفر ہے اور اگر مراد یہ ہے کہ اسے خلق کیا، مقدر کیا اور مکون کیا تو یہ حضرت آدم اور دیگر سب مخلوقات کے درمیان قدر مشترک ہے جیسے کہا:

﴿إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ﴾ [يس : ۸۲] (اس کی شان یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس سے کہتا ہے ہو جاؤ تو وہ ہو جاتی ہے) اگر کہا جائے کہ حضرت آدم کونی و قدری امر کے شاہد ہوئے اور وہ اللہ کے اوامر کے امتثال کے ساتھ اس کے مطیع تھے جیسے یہ کہتے ہیں کہ عارفِ شاہد سے ملامت ساقط ہو جاتی ہے تو دینِ اسلام کی بنیادی اور سب کو معلوم امور میں سے اس کا بطلان ظاہر ہے اور یہ بالاتفاق اعتقاد رکھنا کفر ہے تو کہا جائے امرِ کونی وجودِ مکون سے قبل موجود ہوتا ہے جسے کوئی عبد نہیں سن سکتا اور اس کی بجا آوری اس کیلئے مقدور نہیں بلکہ یہ رب تعالیٰ ہے جو اپنی مشیت اور قدرت کے ساتھ تخلیقِ مکون کرتا ہے اور کوئی خلق و تکوین میں اس کا شریک نہیں ہے اور عبد اگر چہ اس کی مشیت و قدرت کے بموجب ہی فاعل ہوتا ہے اور اللہ اس سب کا خالق ہے تو اللہ کی عبد کیلئے تکوین عبد کیلئے خارج میں موجود ایسا امر نہیں کہ جس کی بجا آوری اس کے لئے ممکن ہو، اسی طرح جو بھی اس کے احوال و اعمال میں سے اس نے خلق کیا اسے اپنی مشیت اور قدرت کے ساتھ تخلیق کیا ہے: (**إِنَّمَا أَمْرُهُ الخ**) تو تمام مکونات اس امر میں داخل ہیں

حضرت آدم کا شجرِ ممنوع سے کھانا اور دیگر حوادث اسی کے تحت ہیں دخولِ آدم کی طرح، تو اکلِ آدم بھی حضرت آدم کی طرح اسی امر کے تحت داخل ہے تو قائل کا کہنا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم سے فی الباطن (كُلْ) کہا اس کی مثل ہے کہ کہے اس نے کافر سے

کہا: (اُکْفُرْ) (کفر کر) اور فاسق سے کہا: (اِفْسِقْ) (فسق کر) حالانکہ اللہ فحشاء کا حکم نہیں دیتا اور نہ وہ فساد اور بندوں کیلئے کفر کو پسند کرتا ہے اور نہ اس کی جانب سے کفار، فساق اور عصاۃ کے لئے فعلِ کفر و فسوق اور عصیان کا کسی باطنی خطاب کا وجود ہے، اگر چہ یہ سب اس کی مشیت، قدرت، خلق اور اس کے امرِ کونی کے ساتھ واقع ہیں تو امرِ کونی بندے کیلئے یہ امر نہیں کہ وہ یہ امر بجالائے بلکہ یہ بندوں میں اس فعل کیلئے تکوینی امر ہے یا بندوں کے اس حال پر ہونے کیلئے تکوینی امر ہے تو اللہ سبحانہ نے انسان کو ہلوع (بے صبرا) پیدا کیا ہے:

﴿وَإِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوعًا﴾ [المعارج: **۲۱**] (اور جب اس آسائش حاصل ہوتی ہے تو بخیل بن جاتا ہے) اسی نے مسلمانوں کو مسلمان بنایا ہے جیسے حضرت خلیل نے کہا:

﴿رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِن ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ﴾ [البقرۃ: ۱۲۸] (اے رب ہم دونوں کو اپنا فرمانبردار بنائے رکھ اور ہماری اولاد میں سے بھی ایک گروہ کو اپنا مطیع بنالینا) تو اس نے بندوں کو ان احوال پر کیا ہے جن پر ان کی تخلیق کی اور ان کیلئے اس کا یہ امر تکوینی امر ہے بایں معنی کہ ان سے کہا ایسے ہو جاؤ تو وہ ایسے ہوگئے جیسے اس نے جمادات سے کہا: (کُنْ) تو وہ ہوگئے تو امرِ تکوینی کے ضمن میں جمادات اور حیوانات کے مابین فرق نہیں اور یہ امرِ تکوینی اس بات کا محتاج نہیں کہ مامور کو اس کا علم ہو اور نہ اس کے ارادہ اور قدرت کا، لیکن بندہ کبھی جان سکتا ہے جو اس کے احوال میں جاری تقدیر ہے جیسا کہ اپنے غیر کے احوال میں جاری تقدیر بارے جان لیتا ہے اور اس بابت اس کا یہ جاننا لازمی نہیں کہ اللہ نے فی الباطن اسے یہ امر دیا تھا بخلاف اس کے کہ جو فی الظاہر اسے امر دیا بلکہ اسے باطناً اور ظاہراً اطاعت کا امر دیا ہے اور معصیت سے منع کیا ہے اور ظاہرا و باطناً مقدر کیا ہے کہ جو اس سے طاعت اور معصیت کے افعال صادر ہونے ہیں

اور تقدیر میں ابن آدم کیلئے کوئی حجت اور عذر نہیں بلکہ تقدیر پر ایمان لایا جائے گا لیکن اس کا سہارا نہ پکڑا جائے گا اور ایسا کرنے والا عقل و دین میں فساد والا اور متناقض ہے کہ اگر تقدیر حجت اور عذر بن سکتی ہوتی تو لازم آتا کہ کوئی بھی قابلِ ملامت نہ ٹھہرے (حتی کہ ابلیس بھی) اور نہ اس سے کسی طرح کا بدلہ لیا جائے اور نہ کسی کو سزا دی جائے! تب تقدیر کا عذر پیش کرنے والے کو لازم آئے کہ اگر اسے کوئی جان و مال اور عزت و حرمت کے باب میں ظلم و زیادتی کا نشانہ بنائے کہ وہ ظالم سے نہ بدلہ لے، نہ اس پر ناراض ہو اور نہ اس کی ذم کرے اور یہ فطری لحاظ سے ممتنع ہے، کسی کیلئے ایسا کرنا ممکن نہیں تو یہ از روئے فطرت ممتنع اور از روئے شرع حرام ہے، اگر تقدیر حجت و عذر بن سکتی ہوتی تو ابلیس ملامت و عقوبت کا سزاوار نہ کیا جاتا اور نہ فرعون، قومِ نوح، عاد اور ثمود وغیرہم کفار، اور نہ کفار سے جہاد جائز ہوتا اور نہ حدود کی اقامت روا ہوتی اور نہ چور کا ہاتھ کاٹنا، زانی کو کوڑے مارنا اور رجم کرنا، قاتل سے قصاص لینا اور کسی بھی مجرم کو سزا دینا جائز ہوتا (بلکہ ہر ایک کو شتر بے مہار چھوڑ دیا جاتا کہ جو چاہے کرتا پھرے) تقدیر کا سہارا لینا خلق کی فطرت اور عقول میں باطل ہے، امم میں سے کوئی امت بھی یہ موقف نہیں رکھتی اور نہ عقلاء میں سے کسی کی یہ رائے

ہے اور نہ اس پر کوئی دنیوی اور اخروی مصلحت کا مدار ہے اور کسی دو کیلئے ممکن نہیں کہ وہ ایک ساعت بھی باہم مل جل کر رہ سکیں اگر ایک دوسرے کے ساتھ معاشرت میں کسی اصول وضابطہ کا التزام نہ کریں، شریعت زمین میں اللہ کا نور اور بندوں کے درمیان اس کا عدل ہے البتہ شرائع متنوع ہیں، کبھی یہ اللہ کی جانب سے منزل ہوتی ہیں جنہیں رسل لے کر آئے اور کبھی ایسی نہیں ہوتیں! پھر ان کی منزلت وہیئت متبدل اور متغیر رہی ہے جیسے اہل کتاب نے اپنی شرائع میں تحریف کر دی اور کبھی نہیں اور کبھی ان میں کچھ نسخ داخل ہوتا رہا اور کبھی نہیں! جہاں تک تقدیر تو اس کا سہارا وہ لیتا ہے جو اپنی خواہشات کا غلام ہے کہ جب کسی حرام فعل کا ارتکاب مجرد اپنی خواہش، ذوق اور وجدان کے ساتھ کرے بغیر اس کے کہ اس کی مصلحت اور خوبی کا علم ہو تو تقدیر کا سہارا لیتا ہے جیسے مشرکین نے کہا:

(سَيَقُولُ الَّذِينَ أَشْرَكُوا لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا أَشْرَكْنَا وَلَا آبَاؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ كَذَٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ حَتَّىٰ ذَاقُوا بَأْسَنَا قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوهُ لَنَا إِنْ تَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ أَنْتُمْ إِلَّا تَخْرُصُونَ قُلْ فَلِلَّهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ فَلَوْ شَاءَ لَهَدَاكُمْ أَجْمَعِينَ) [الأعراف: ۱۴۹-۱۵۰] (جولوگ شرک کرتے ہیں وہ کہیں گے کہ اگر اللہ چاہتا تو ہم شرک نہ کرتے اور نہ ہمارے باپ دادا کرتے اور نہ ہم کسی چیز کو حرام ٹھہراتے اسی طرح ان لوگوں نے تکذیب کی تھی جو ان سے پہلے تھے یہاں تک کہ ہمارے عذاب کا مزہ چکھ کر رہے۔ کہہ دو کہ کیا تمہارے پاس کوئی سند ہے تو اُسے ہمارے سامنے نکالو، تم محض خیال کے پیچھے چلتے اور اٹکل کے تیر چلاتے ہو۔ کہہ دو کہ اللہ ہی کی حجت غالب ہے اگر وہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت دے دیتا)

تو واضح کیا کہ ان کے پاس کوئی دینی علم نہیں جس کی بنیاد پر یہ عذر پیش کریں، وہ تو ظن کی پیروی کرتے ہیں اور یہ مشرکین کسی اور سے یہ عذر قبول نہ کریں مثلاً اگر کوئی کعبہ میں بگاڑ کرے یا ابراہیم خلیل اللہ کو برا بھلا کہے یا ان کے دین میں طعن کرے تو یہ اس کے درپے آزار ہوں گے اور اسے تقدیر کا قطعاً سہارا نہ لینے دیں گے اسی لئے تو نبی کریم کے لائے ہوئے دین کی مخالفت کی حالانکہ یہ بھی مقدر امر ہی تھا تو اگر تقدیر کی حجت لینا روا ہوتا تو یہ نبی کریم اور آپ کے صحابہ کیلئے حجت ہوتی کیونکہ کائنات میں جو کچھ بھی ہو وہ مقدر ہے تو یوں محق اور مبطل تقدیر کے ساتھ احتجاج کرنے میں باہم مشترک ہیں اگر ایسا کرنا صحیح ہو لیکن وہ اس امر پر تعمد کرتے تھے جسے وہ اپنے دین کی جنس سے خیال کرتے اور وہ اس باب میں ظن کی پیروی کرتے تھے بغیر کسی علم کے

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب حضرت آدم علیہ السلام سے کہا کیوں آپ نے ہمیں اور اپنے آپ کو جنت سے نکلوا دیا ؟ تو وہ بولے تم ایسے امر پر مجھے ملامت کیوں کرتے ہو جسے اللہ نے میری تخلیق سے چالیس سال پیشتر ہی میرے لئے مقدر کر دیا تھا؟ تو آدم موسیٰ پر غالب آئے، آدم علیہ السلام نے یہ کہہ کر منہی عنہ فعل کے ارتکاب پر تقدیر کا سہارا نہیں لیا اور نہ حضرت موسیٰ نے یہ کیا بلکہ عام مسلمان بھی یہ نہیں کرتے، دراصل حضرت آدم نے اس فعل سے توبہ کر لی اور اللہ نے اسے قبول کر کے انہیں چن لیا اور ہدایت دی اور موسیٰ کو خوب علم تھا کہ وہ کسی نبی کے ایسے فعل پر ملامت نہیں کر سکتے جس کی توبہ ہو چکی تھی اور آدم جانتے تھے کہ

تقدیر کا سہارا لینا حجت نہیں وگرنہ توبہ نہ کرتے اور نہ جنت سے نکالے جانے کا ماجرا پیش آتا، اگر یہ حجت ہوسکتی تو ابلیس وغیرہ کیلئے بھی ہوتی اسی طرح حضرت موسیٰ جانتے تھے کہ اگر ایسا ہوتو فرعون کو غرق ہونے کی سزا نہ ملتی اور نہ بنی اسرائیل کے بعض افراد صعقہ (یعنی بے ہوشی، کوہِ طور پر جب اللہ نے تجلی ڈالی تو سب حاضرین کے ہوش وحواس ساتھ چھوڑ گئے تھے) کا شکار بنتے پھر ایک موقع پر کہا تھا: (**رَبِّ إِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي فَاغْفِرْ لِي**) [القصص: **۱۶**] (بولے اے رب! میں نے اپنے آپ پر ظلم کیا تو مجھے بخش دے تو اللہ نے ان کو بخش دیا) اور: (**أَنْتَ وَلِيُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَأَنْتَ خَيْرُ الْغَافِرِينَ**)[الأعراف:۱۵۵] (تو ہی ہمارا کارساز ہے تو ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم فرما اور تو سب سے بہتر بخشنے والا ہے) یہ ایک وسیع باب ہے! حضرت موسیٰ کی انہیں یہ ملامت اس مصیبت کی وجہ سے تھی جو انہیں اس وجہ سے لاحق ہوئی کہ آدمؑ نے شجرِ ممنوعہ کا پھل کھالیا اسی لئے کہا کیوں آپ نے خود کو اور ہمیں جنت سے نکلوا دیا؟ اس مصیبت کی وجہ سے لوم جو انسان کو لاحق ہوا الگ نوع اور اگر اس گناہ کی وجہ سے جو اللہ کا حق ہو، ایک دیگر نوع ہے تو اگر کوئی ایسا فعل کرے کہ جس کی وجہ سے فقیر ہو جائے حتیٰ کہ اس کی اولاد متاثر ہوئی تو وہ اس فقر کے سبب جو انہیں لاحق ہوا اسے ملامت کرنے لگیں تو یہ لوم اس لوم کی مانند نہیں کہ اگر مثلا وہ کسی گناہ کا ارتکاب کرتا اور بندہ مامور ہے کہ مقدور پر صبر کرے اور اگر گناہ کرے تو استغفار کرے (نہ کہ تقدیر کا سہارا لے) جیسے کہا:

(**فَاصْبِرْ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ**)[غافر: **۵۵**] (پس صبر کرو بے شک اللہ کا وعدہ سچا ہے اور اپنے گناہوں کی معافی مانگو اور صبح وشام اپنے رب کی تعریف کے ساتھ تسبیح کرتے رہو) اور کہا: (**مَا أَصَابَ مِنْ مُصِيبَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ وَمَنْ يُؤْمِنْ بِاللَّهِ يَهْدِ قَلْبَهُ**)[التغابن: **۱۱**] (کوئی مصیبت نازل نہیں ہوتی مگر اللہ کے حکم سے اور جو شخص اللہ پر ایمان لاتا ہے وہ اس کے دل کو ہدایت دیتا ہے اور اللہ ہر چیز سے باخبر ہے)

سلف کی ایک جماعت نے اس کی تفسیر میں کہا یہ وہ آدمی جسے مصیبت پہنچی تو جانا کہ یہ اللہ کی طرف سے (آزمائش) ہے تو تسلیم ورضا کا پیکر بنا تو جو ترکِ مامور پر تقدیر کا سہارا لے اور امرِ مقدر کے حصول وحدوث پر جزع اور فزع کرے اس نے ایمان و دین کی ہدایت کے برعکس کیا اور ملحدوں اور منافقوں کے حزب سے ہوا، یہی تقدیر کا سہارا لینے والوں کا حال ہے تو ان میں سے اگر کسی کو کوئی مصیبت پہنچے تو بہت جزع کرتا اور قلیل صبر والا بنتا ہے، اب وہ تقدیر کے سامنے سرِ تسلیم خم نہیں کرتا مگر جب گناہ کرے تو اسے تقدیر یاد آجاتی ہے تو مامور کا فعل نہیں کرتا، محظور کا ترک نہیں کرتا اور مقدور پر صبر کا دامن نہیں تھامتا لیکن دعوی کرتا ہے کہ وہ اللہ کے متقی کبار اولیاء اور موحدین ومحققین ائمہ میں سے ہے! یہ تو اللہ کے ملحد اعداء اور شیطان لعین کے حزب سے ہے اور وہ جس طریق کا سالک ہوا پھرتا ہے وہ خیر، دین اور ایمان سے بہت دور کا راستہ ہے، ان میں ایسے افراد پاؤ گے کہ جب انہیں قدرت ہوتو نہایت ظالم اور زیادتی کرنے والے ہوتے ہیں اور مغلوب ہوں تو ذلیل ترین لوگ بنتے ہیں، لوگوں نے یہی ان کا تجربہ کیا اور اسی پر انہیں گامزن پایا ہے

جبکہ مومن کی شان یہ ہے کہ قدرت ملے تو عدل واحسان سے کام لیتا ہے اور اگر مقہور ومغلوب ہو تو صبر کرتا اور اللہ سے اس کے اجر کی امیدیں باندھتا ہے جیسے کعب بن زہیر نے اپنی اس نظم میں کہا جسے آنجناب کے سامنے پڑھا تھا، جس کا مطلع (بَانَتْ سُعَاد الخ) ہے تو ایک شعر میں اہلِ ایمان کی صفت بیان کرتے ہوئے کہا:

لَیْسُوْا مَفَارِیْحَ اِنْ نَالَتْ رِمَاحُهُمْ　　　یَوْماً　وَلَیْسُوْا مَجَازِیْعاً　اِذَا نِیْلُوْا

(یعنی خوشی ملے تو اتراتے نہیں اور اگر نقصان ہو تو جزع فزع نہیں کرتے) ایک عربی سے نبی کریمؐ کا وصف کرنے کو کہا گیا تو کہا: (رَاَیْتُہٗ یَغْلِبُ فَلاَ یَبْطِرُ وَ یُغْلَبُ فَلاَ یَضْجَرُ) (میں نے آپ کو جب غالب دیکھا تو تکبر نہ کرتے تھے اور جب مغلوب دیکھا تو) قرآن نے کہا:

(قَالُوٓا ءَ اِنَّكَ لَاَنْتَ یُوْسُفُ قَالَ اَنَا یُوْسُفُ وَهٰذَآ اَخِیْ قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَیْنَا اِنَّهٗ مَنْ یَّتَّقِ وَیَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ) [یوسف : ۹۰] (وہ بولے کیا تمہی یوسف ہو؟ انہوں نے کہا کہ ہاں میں ہی یوسف ہوں اور یہ میرا بھائی ہے اللہ نے ہم پر بڑا احسان کیا ہے جو شخص اللہ سے ڈرتا اور صبر کرتا ہے تو اللہ نیکوکاروں کا اجر ضائع نہیں کرتا) اور فرمایا:

(وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا یَضُرُّكُمْ كَیْدُهُمْ شَیْئًا)[آل عمران: ۱۲۰] (اور اگر تم صبر اور کنارا کشی کرتے رہو گے تو اُن کا فریب تمہیں کچھ بھی نقصان نہ پہنچا سکے گا) اور:

(بَلٰٓی اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَیَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا یُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِیْنَ وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰی لَكُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِیْزِ الْحَكِیْمِ)[آل عمران:۱۲۵۔۱۲۶] (ہاں اگر تم دل کو مضبوط رکھو اور ڈرتے رہو اور کافر تم پر جوش کے ساتھ دفعۃً حملہ کر دیں تو اللہ پانچ ہزار فرشتے جن پر نشان ہوں گے تمہاری مدد کو بھیجے گا۔ اور اس مدد کو تو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے بشارت بنایا کہ تمہارے دلوں کو اس سے تسلی حاصل ہو ورنہ مدد تو اللہ ہی کی ہے جو غالب (اور) حکمت والا ہے) اور: **(وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ)** [آل عمران:۱۸۶] (اور اگر تم صبر اور پرہیزگاری کرتے رہو گے تو یہ بڑی ہمت کے کام ہیں)

تو ان چاروں مواضع میں صبر وتقویٰ کا ذکر کیا تو اس میں مقدور پر صبر کرنا بھی داخل ہے جبکہ تقویٰ میں فعلِ مامور اور ترکِ محظور ہے، جسے ان دونوں باتوں کی توفیق ملی اس کیلئے خیر جمع کی گئی بخلاف اس کا برعکس کرنے والے کے تو وہ اللہ سے نہیں ڈرتا بلکہ اپنی خواہش کا غلام بن کر اور تقدیر کا سہارا لے کر اس کی طاعت کا ترک کرتا ہے لیکن جب کسی آزمائش یا مصیبت میں ہو تب وہ تقدیر کی طرف نہیں دیکھتا، تو یہ اشقیاء کا حال ہے جیسا کہ بعض علماء نے کہا تم طاعت کے وقت قدری اور معصیت کے وقت جبری بن جاتے ہو؟ دراصل جو مذہب جب تمہاری خواہشِ نفس کے مطابق ہو وہی تم اختیار کرتے ہو، مطلب یہ کہ تم نے جب اطاعت کی تو اپنے نفس کو اپنی طاعت کا

خالق بناڈالا اوراسے اللہ کا فضل نہ سمجھا جس نے تجھے اطاعت کی توفیق دی ہے اور جب نافرمانی کی تو یہ اعتراف نہ کیا کہ تم نے گناہ کمایا ہے بلکہ اپنے نفس کو اس شخص کے بمنزلہ باور کرایا جسے اس کی مرضی کے خلاف کسی کام پر مجبور کیا جائے یا وہ محرک جس کیلئے نہ ارادہ ہے، نہ قدرت اور نہ علم اور یہ دونوں روش غلط اور خطا ہیں، ابو طالب مکی نے سہل بن عبداللہ تشتری کا قول نقل کیا کہ اگر بندہ کوئی نیکی کرے تو کہے: اے رب میں نے یہ نیکی کا کام کیا ہے تو رب اسے کہتا ہے: اسے میں نے تمہارے لئے آسان کیا اور اس پر تمہاری اعانت کی اور اگر کہے: اے میرے رب! یہ تیری ہی توفیق اور اعانت سے ہوا ہے تو اللہ تعالی فرماتا ہے: تو نے اسے کیا اور تجھے اس کا اجر ملے گا اور جب برائی کرے پھر کہے: اے رب تو نے اس پر مجھے قدرت دی تھی تو رب فرماتا ہے تو نے اسے کمایا اور تجھی پر اس کا وِزر ہے اور اگر کہے: اے رب مجھ سے اس گناہ کا ارتکاب ہوا ہے اور میں توبہ کرتا ہوں تو اللہ تعالیٰ کہتا ہے میں نے تجھے اس کی قدرت دی اور اب میں تجھے اس کی معافی دیتا ہوں، یہ ایک مبسوط بحث ہے ایک دیگر مقام پر اس کا بسط ہوگا

مشائخ اور صوفیہ کی طرف اپنی نسبت کرنے والے کثیر لوگوں کے ہاں فقط شہودِ قدر کثیر ہوا ہے بغیر امر و نہی کے شہود اور ترکِ مامور اور فعلِ محظور میں اس کی طرف استناد کے اور یہ اعظم گمراہی ہے اور جس نے اس قول کا تو طرد کیا مگر اس کے لوازم کا التزام نہ کیا وہ یہود و نصاریٰ اور مشرکین سے بڑا کافر ہے لیکن اس میں داخل اکثر لوگ متضاد موقف کے حامل ہیں اور ان کا قول مطرود (یعنی عام ضابطہ) نہیں، اس قائل کا قول بھی اسی باب سے متعلق ہے تو اس کا یہ کہنا کہ حضرت آدم کو کھانے کا باطنی حکم ملا تھا تبھی کھایا اور ابلیس کی توحید ظاہر اٹھی تو اسے حضرت آدم کو سجدہ کرنے کا حکم دیا، اس نے جب انہیں غیر دیکھا تو سجدہ نہ کیا تو اللہ نے اس کا معاملہ متغیر کر دیا اور کہا یہاں سے نکل جاؤ، تو یہ اپنے میں موجود الحاد ہونے کے ساتھ ساتھ حضرت آدم اور ابلیس بارے کذب بیانی ہے، حضرت آدم نے اعتراف کیا کہ ان سے خطا سرزد ہوئی ہے اور وہ اپنی جان پر ظلم کما بیٹھے ہیں اور پھر اس سے توبہ کی، یہ نہیں کہا کہ اللہ نے مجھ پر ظلم کیا ہے اور نہ یہ کہا کہ یہ تو اللہ کا مجھے باطنی حکم تھا، فرمایا:

﴿فَتَلَقّٰۤى اٰدَمُ مِنۡ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيۡهِ‌ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيۡمُ﴾ (گزری ہے) اور کہا:

﴿قَالَا رَبَّنَا ظَلَمۡنَاۤ اَنۡفُسَنَا وَاِنۡ لَّمۡ تَغۡفِرۡ لَنَا وَتَرۡحَمۡنَا لَنَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡخٰسِرِيۡنَ﴾ (گزری ہے) جبکہ ابلیس مصر رہا اور تقدیر کا سہارا لیا جب کہا: **﴿رَبِّ بِمَاۤ اَغۡوَيۡتَنِىۡ لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمۡ فِى الۡاَرۡضِ وَلَاُغۡوِيَنَّهُمۡ اَجۡمَعِيۡنَ﴾** (گزری ہے) جہاں تک اس کا یہ کہنا کہ ابلیس نے جب حضرت آدم کو غیر (اللہ) دیکھا تو سجدہ نہ کیا تو یہ بات تقدیر کا سہارا لینے سے بھی بدتر ہے، یہ تو ملحد اہلِ وحدت کا قول ہے اور یہ ابلیس پر بھی کذب بیانی ہے، وہ اس لئے سجدہ کرنے سے ممتنع نہ ہوا تھا کہ آدم اللہ کا غیر ہیں بلکہ کہا:

﴿اَنَا خَيۡرٌ مِّنۡهُ‌ ۚ خَلَقۡتَنِىۡ مِنۡ نَّارٍ وَّخَلَقۡتَهٗ مِنۡ طِيۡنٍ﴾ [الأعراف: ۱۲] (میں اس سے افضل ہوں کیونکہ مجھے تو نے آگ سے پیدا کیا ہے اور اسے مٹی سے بنایا ہے) اور فرشتوں کو حضرت آدم کو سجدہ کرنے کا اس لئے حکم نہیں دیا کہ وہ غیر نہ تھے بلکہ ملائکہ

اورآدم کے مابین مغایرت ثابت ومعروف ہے اورفرشتے اورآدم معترف تھے کہ اللہ ان کا غیر ہے اور وہ اس کیلئے مغایر ہیں اسی لئے وہی دعا کی جو بندہ اپنے رب سے کرتا ہے تو آدم نے کہا:(**رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا**) اورفرشتوں نے عرض کی:

(**سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ**)[البقرة : **۳۲**] (جتنا علم تو نے ہمیں بخشا ہے اس کے سوا ہمیں کچھ معلوم نہیں بے شک تو دانا حکمت والا ہے) اور کہا:

(**رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا فَاغْفِرْ لِلَّذِيْنَ تَابُوْا وَاتَّبَعُوْا سَبِيْلَكَ وَقِهِمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ**) [الغافر: **۷**] (اے ہمارے رب! تیری رحمت اور تیرا علم ہر چیز پر احاطہ کئے ہوئے ہے تو جن لوگوں نے توبہ کی اور تیرے رستے پر چلے ان کو بخش دے اور دوزخ کے عذاب سے بچا لے) اللہ نے فرمایا:(**قُلْ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَاْمُرُوْٓنِّيْٓ اَعْبُدُ اَيُّهَا الْجٰهِلُوْنَ**) [الزمر: **۶۴**] (کہہ دو کہ اے نادانو! تم مجھ سے یہ کہتے ہو کہ میں غیر اللہ کی پرستش کرنے لگوں؟) اور:

(**اَغَيْرَ اللّٰهِ اَتَّخِذُ وَلِيًّا فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ**) [الأنعام : ۱۴] (کیا میں اللہ کو چھوڑ کر کسی اور کو مددگار بناؤں؟ کہ آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے اور وہی کھانا دیتا ہے اور خود کسی سے کھانا نہیں لیتا) اور کہا:

(**اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا**) [الأنعام: ۱۱۴] (کیا میں اللہ کے سوا اور منصف تلاش کروں حالانکہ اُس نے تمہاری طرف مفصل کتاب بھیجی ہے) اگر کائنات میں اللہ کے غیر کا وجود نہ ہوتا تو مشرکین انہیں غیر اللہ کی عبادت کا نہ کہتے اور نہ غیر اللہ کو ولی اور ثالث بنانا ممکن ہوتا تب وہ رد و انکار کے مستحق نہ ہوتے تو جب اس کا ان پر رد اور انکار کیا تو اس سے ثبوتِ غیر پر دلالت ملی جس کی عبادت کرنا اور جسے ولی اور ثالث ماننا ممکن ہے اور جس نے یہ کیا وہ اللہ کے ساتھ شرک کا مرتکب ہے جیسے کہا:

(**فَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَكُوْنَ مِنَ الْمُعَذَّبِيْنَ**) [الشعراء: **۲۱۳**] (پس اللہ کے سوا کسی اور معبود کو مت پکارنا ورنہ تمہیں عذاب دیا جائے گا) اور کہا:

(**لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَقْعُدَ مَذْمُوْمًا مَّخْذُوْلًا**)[الإسراء : **۲۲**] (اور اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود نہ بنانا کہ ملامتیں سن کر اور بے کس ہو کر بیٹھے رہ جاؤ گے) اور اس جیسی آیات! جہاں تک قائل کا یہ کہنا کہ اللہ تعالی کا قول:(**لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ**) (ترجمہ آگے ہے) نبی اکرم کیلئے عین اثبات ہے اس کے اس فرمان کی طرح:(**وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى**) (گزری) اور:(**اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ**) (گزری) تو یہ اہلِ وحدت واتحاد کے نظریہ پر مبنی ہے، اس نے (لَيْسَ لَكَ الخ) کا معنی یہ کیا ہے کہ آپ کا فعل اللہ کا فعل ہے عدم مغایرت (کا اپنا نظریہ) مدِ نظر رکھتے ہوئے اور یہ کئی وجوہ سے عظیم گمراہی ہے:

(۱) کہ قولہ (لَيْسَ لَكَ الخ) اللہ کے اس فرمان کے سیاق میں نازل ہوا ہے: (**لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِينَ كَفَرُوٓا أَوْ يَكْبِتَهُمْ فَيَنقَلِبُوا خَآئِبِينَ لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ أَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَإِنَّهُمْ ظَٰلِمُونَ**)[**آل عمران: ۱۲۷۔ ۱۲۸**] (اس لئے کہ کافروں کی ایک جماعت کو ہلاک یا انہیں ذلیل ومغلوب کردے کہ ناکام واپس جائیں۔ اس کام میں تمہارا کچھ اختیار نہیں یا تو اللہ اُن کے حال پر مہربانی کرے یا اُنہیں عذاب دے کہ یہ ظالم لوگ ہیں) اور صحیح کی روایت میں ہے کہ نبی اکرم کفار کی ایک قوم کے خلاف بددعا کرتے تھے یا قنوت میں ان پر لعنت کرتے تھے تو جب اللہ نے یہ آیت نازل کی تو ایسا کرنا ترک کر دیا، تو اس سے معلوم ہوا کہ اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ کیلئے امر (یعنی امرِ تکوینی) کا اِفراد ہے اور اس کے کسی غیر کیلئے یہ امر نہیں بلکہ کفار کا قطع صرف اللہ کی مشیت پر مبنی ہے وہ چاہے گا تو انہیں ہزیمت ملے گی اور وہ خسارہ کے ساتھ منقلب ہوں گے اور چاہے تو انہیں توبہ کی توفیق دیدے اور چاہے تو عذاب دے اور یہ جیسے ایک دوسری آیت میں کہا:

(**قُل لَّآ أَمْلِكُ لِنَفْسِي نَفْعًا وَلَا ضَرًّا إِلَّا مَا شَآءَ ٱللَّهُ وَلَوْ كُنتُ أَعْلَمُ ٱلْغَيْبَ لَٱسْتَكْثَرْتُ مِنَ ٱلْخَيْرِ وَمَا مَسَّنِيَ ٱلسُّوٓءُ**)[الأعراف: ۱۸۸] (کہہ دو کہ میں اپنے فائدے اور نقصان کا کچھ بھی اختیار نہیں رکھتا مگر جو اللہ چاہے اور اگر میں غیب کی باتیں جانتا ہوتا تو بہت سے فائدے جمع کر لیتا اور مجھے کوئی تکلیف نہ پہنچتی میں تو مومنوں کو ڈر اور خوشخبری سنانے والا ہوں) اور اسی کا نحو یہ قولہ تعالی ہے:

(**يَقُولُونَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ ٱلْأَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هَٰهُنَا قُل لَّوْ كُنتُمْ فِي بُيُوتِكُمْ لَبَرَزَ ٱلَّذِينَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ ٱلْقَتْلُ إِلَىٰ مَضَاجِعِهِمْ وَلِيَبْتَلِيَ ٱللَّهُ مَا فِي صُدُورِكُمْ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِي قُلُوبِكُمْ**)[آل عمران: ۱۵۴] (کہتے تھے ہمارے بس کی بات ہوتی تو ہم یہاں قتل ہی نہ کئے، کہہ دو کہ اگر تم اپنے گھروں میں بھی ہوتے تو جن کی تقدیر میں مارا جانا لکھا تھا وہ اپنی اپنی قتل گاہوں کی طرف ضرور نکل آتے، اس سے غرض یہ تھی کہ اللہ تعالی تمہارے سینوں کی باتوں کو آزمائے اور جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اُس کو خالص اور صاف کر دے)

(۲) اللہ تعالیٰ کے قول: (**وَمَا رَمَيْتَ** الخ) سے مراد یہ نہیں کہ فعلِ عبد فعلِ اللہ ہوا جیسے اہلِ مغالطہ کے ایک گروہ نے ظن کیا کہ اگر مطلب یہ ہوتا تو یہ ہر ایک کی بابت کہا جاتا حتی کہ پیدل چلنے والے کیلئے کہا جاتا: یہ تم نہیں چلے جب چلے بلکہ اللہ پیدل چلا ہے۔۔ علی ھذا القیاس، اور یہ مستلزم ہے کہ کافر کی نسبت بھی کہا جائے: یہ تم نہیں جس نے کفر کیا بلکہ۔۔۔اور کاذب کی بابت بھی یہی، اور جو اس کا قائل ہو وہ کافر، ملحد اور عقل و دین سے خارج ہے بلکہ آیت کا معنی و مفہوم یہ ہے کہ نبی اکرم نے بدر کے دن کفار پر مٹھی بھر کنکریاں پھینکیں تو آپ کی قدرت اور بس میں نہ تھا کہ ان سب کو یہ لگیں تو آپ نے جب ان کی طرف اسے اچھالا تو ساتھ ہی کہا: (شَاهَتِ الْوُجُوهُ) (چہرے مسخ ہو جائیں) اور آپ کے بس میں نہ تھا کہ اس کی زد میں سب کافر آجائیں تو اس حقیقت سے پردہ اٹھایا اور کہا یہ اللہ

ہے جس نے اپنی قدرت کے ساتھ اسے ان سب تک پہنچا دیا تو جس رمی کا آپ ؐ کیلئے اثبات کیا یہ وہ رمی نہیں جس کی آپ ؐ سے نفی کی کہ یہ جمع بین نقیضین کو مستلزم ہے بلکہ آپ سے اللہ نے ایصال (یعنی کفار کے ہر فرد تک پہنچانے) کی نفی کی ہے اور کنکریاں پھینکنے کا اثبات کیا ہے اسی طرح جب آپ نے تیر چھوڑا تو اللہ نے خرقِ عادت کرتے ہوئے (یعنی بطورِ معجزہ) دشمن تک اسے پہنچایا تو یہ اسی کی قدرت کا کرشمہ تھا

(۳) اگر فرض کیا جائے کہ آیتِ ہذا کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کے افعال کا خالق ہے تو یہ صحیح معنی ہے، حضرت ابراہیم نے اپنی دعا میں کہا تھا: **﴿رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ﴾** (گزری) تو گویا یہ اللہ ہے جس نے مسلمان کو مسلمان بنایا ہے، ارشاد ہوا:

﴿ إِنَّ الْإِنسَانَ خُلِقَ هَلُوعًا إِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوعًا وَإِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوعًا﴾ [المعارج : **۱۹۔۲۱**] (بے شک نہیں کہ انسان کم حوصلہ پیدا ہوا ہے۔ جب اسے تکلیف پہنچتی ہے تو گھبرا اٹھتا ہے۔ اور جب آسائش حاصل ہوتی ہے تو بخیل بن جاتا ہے) تو یہ سب کام بھی اللہ ہی کے فعل سے ہیں مگر اس میں یہ نہیں کہ اب اللہ ہی یہ عبد ہے اور نہ یہ کہ وجودِ خالق وجودِ مخلوق ہے اور نہ یہ کہ اللہ نے بندوں میں حلول کیا ہے تو یہ کہنا کہ اللہ بندوں کے افعال کا خالق ہے، حق ہے اور حلول یا وحدت الوجود کا نظریہ باطل ہے، یہ حضرات توحیدِ ربوبیت کے قول سے حلول و اتحاد کے قول کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں جو عین ضلال و الحاد ہے

(۴) کہ قولہ تعالیٰ: **﴿إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللَّهَ﴾** [الفتح : **۱۰**] (جو لوگ تم سے بیعت کرتے ہیں وہ اللہ سے بیعت کرتے ہیں) سے یہ مراد نہیں کہ آنجناب اب اللہ ہوئے! بلکہ مراد یہ کہ آپ اللہ کے رسول اور اس کے امر و نہی کے مبلغ ہیں تو جس نے آپ کی بیعت کی اس نے اللہ کی بیعت کی جیسے ایک آیت میں کہا: جس نے آپ کی طاعت کی اس نے اللہ کی طاعت کی، تو اس سے رسول کا اللہ ہونا مراد نہیں بلکہ رسول نے اسی چیز کا امر دیا جس کا اللہ نے امر دیا ہے، ایک حدیث میں فرمایا جس نے میری اطاعت کی اس نے (گویا) اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میرے مقرر کردہ کسی امیر کی اطاعت کی اس نے (گویا) میری اطاعت کی اور یہی بات نافرمانی بارے فرمائی اور جو ظن کرتا ہے کہ **﴿إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ﴾** الخ) کا معنی یہ ہے کہ نبی کا فعل (فی الحقیقت) اللہ کا فعل ہے یا مراد یہ کہ اللہ نے آپ کی ذات میں حلول کیا ہے یا دیگر فاسد نظریات تو اس شخص نے اپنے جہل و ضلال بلکہ کفر و الحاد کے ساتھ ساتھ رسول سے ان کی خاصیت کو سلب کیا اور انہیں ان کے غیر کی مثل بنایا کیونکہ اگر مراد یہ لی جائے کہ اللہ آپ کے فعل کا فاعل ہے تو یہ (اس کے نظریہ کی رو سے) آپ اور تمام خلق کے درمیان قدرِ مشترک ہے تو گویا جس نے ابوجہل سے بیعت کی اس نے اللہ کی بیعت کی اور جس نے مسیلمہ کذاب کی بیعت کی اس نے اللہ کی بیعت کی اسی طرح دیگر کفار کے قائدین تو اس تقدیر پر مبایع بھی خود اللہ ہے تو گویا اللہ نے اللہ کی بیعت کی؟ کیونکہ اللہ اس کا بھی اور اس کا بھی خالق ہے

اسی طرح اگر اہلِ حلول و وحدت اور اہلِ اتحاد کے مذہب کی رو سے کہا جائے تو یہ ان کے نزدیک ان سب میں عام ہے تو یوں مبایِع اور مبایَع دونوں اللہ بنے اور یہ بات ان حلولی اتحادیوں کے کثیر شیوخ کہتے ہیں حتی کہ ان میں سے کسی کو جب

دشمن سے لڑائی کرنے کا حکم دیا گیا تو گویا ہوا: کیا میں اللہ سے لڑوں؟ اور اس کی مجھ میں قدرت نہیں ہے، اس طرح کی کلام ہم نے ان کے شیوخ سے سنی ہے اور متعدد مرتبہ اس کا فساد، ضلال اور بطلان واضح کیا ہے! جہاں تک حلولِ خاص تو یہ ان حضرات کا قول نہیں بلکہ یہ نصاری اور غالیوں میں سے ان کے موافقین کا ہے اور یہ بھی باطل ہے اللہ تعالیٰ نے آنجناب سے فرمایا:

(لَیْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ) [آل عمران:]اور کہا: **(وَ اَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُاللّٰهِ یَدْعُوْهُ)** [الجن:]اور: **(سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا)** [الإسراء:]اور: **(وَاِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا)** [البقرة:] اور:

(لَقَدْ رَضِیَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ یُبَایِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِیْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِیْنَةَ عَلَیْهِمْ وَ اَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِیْبًا وَّمَغَانِمَ كَثِیْرَةً یَّاْخُذُوْنَهَا وَكَانَ اللّٰهُ عَزِیْزًا حَكِیْمًا) [الفتح: **۱۸-۱۹**] (جب مومن تم سے درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے تو اللہ ان سے خوش ہوا اور جو ان کے دلوں میں تھا وہ اس نے معلوم کرلیا تو ان پر تسلی نازل فرمائی اور انہیں جلد فتح عنایت کی۔ اور بہت سی غنیمتیں جو انہوں نے حاصل کیں اور اللہ غالب حکمت والا ہے) تو اس آیت نے قولہ: **(اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَكَ الخ)** تبیین کی اسی لئے کہا: **(یَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ)** (ان کے ہاتھ کے اوپر اللہ کا ہاتھ ہے) اور سب کو معلوم ہے کہ نبی اکرم کا دستِ مبارک صحابہ کرام کے ہاتھوں میں تھا، وہ آپ سے مصافحہ کرتے اور بیعت کرتے ہوئے اس پر اپنے ہاتھ رکھتے تھے تو اس سے معلوم ہوا کہ **(یَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ)** نبی اکرم کا ہاتھ نہیں لیکن رسول چونکہ اللہ کے عبد اور اس کے رسول ہیں تو اللہ کے حکم اور اس کی طرف سے ان سے بیعت لی اور عہد و پیمان لئے تو اس طرح یہ بیعت اللہ کی بیعت قرار پائی کیونکہ اسی کے حکم سے عمل میں آئی ہے، کیا دیکھتے نہیں ہر جو کسی شخص کو اپنا نمائندہ مقرر کرے جو کسی سے اس کی جانب سے کوئی سودا طے کرے تو یہ اسی کا سودا قرار پاتا ہے؟ اسی طرح جو کسی سے معاہدہ یا مذاکرات کے لئے اپنا کوئی وکیل مقرر کرے تو یہ اسی سے معاہدہ باور ہوگا، اسی طرح نکاح کرانے میں اور دیگر کئی معروف معاملات میں، قرآن نے کہا:

(اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ) [التوبة: **۱۱۱**] (اللہ نے مومنوں سے اُن کی جانیں اور اُن کے مال خرید لئے ہیں عوض میں اُن کیلئے جنت ہے) الآیۃ۔ اور آیت کے آخر میں کہا: **(وَمَنْ اَوْفٰی بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَیْعِكُمُ الَّذِیْ بَایَعْتُمْ بِهٖ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ)** (اور اللہ سے زیادہ وعدہ پورا کرنے والا کون ہے، تو جو سودا تم نے اُس سے کیا ہے اس سے خوش رہو اور یہی بڑی کامیابی ہے) تو واضح ہوا کہ اس درویش کا قول صحیح ہے اور اللہ نے جب اپنے نبی سے کہہ دیا: **(لَیْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ)** تو ہما وشما کس درجہ میں ہیں؟ اور صحیح کی ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا: (لَا تُطْرُوْنِیْ كَمَا اَطَرَتِ النَّصَارٰی الْمَسِیْحَ بْنَ مَرْیَمَ) (یعنی میری شان بیان کرنے میں اُس طرح مبالغہ آرائی نہ کرو جیسے عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ بارے کی) میں تو عبد ہوں تو کہو: (عَبْدُ اللّٰهِ وَرَسُوْلُهٗ) جہاں تک یہ شعر:

مَا غِبْتَ عَنِ الْقَلْبِ وَلاَ عَنْ عَيْنِيْ مَا بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَنَا مِنْ بَيْنٍ

(گزرا) تو یہ بھی انہی حضرات کے فاسد نظریات پر مبنی ہے اور یہ باطل اور متناقض ہے کہ اس کا مبنی یہ ہے کہ وہ اللہ کو اپنی آنکھ سے دیکھتا ہے جبکہ صحیح کی ایک روایت میں ہے نبی اکرم نے فرمایا جان لو تم میں سے کوئی اپنے رب کو ہرگز نہیں دیکھ سکتا حتی کہ فوت ہو، اور ائمہ مسلمین متفق ہیں کہ اس دنیا میں کوئی مومن اپنی ان آنکھوں سے اللہ کو نہیں دیکھ سکتا، صرف نبی اکرم کے اللہ کو (واقعہ معراج میں) دیکھنے کی بابت ان کے ہاں اختلافِ اقوال ہے (اور وہ اس دنیا کا واقعہ نہیں) جمہور کا یہی موقف ہے کہ دنیا میں آپ نے اپنی آنکھ سے اللہ کو نہیں دیکھا اسی پر نبی کریم، صحابہ کرام اور ائمہ سے صحیح و ثابت آثار دلالت کرتے ہیں ابن عباس، احمد اور ان کے امثال سے ثابت نہیں کہ کہا ہو کہ حضرت محمد نے اپنی اسی آنکھ سے اللہ کا دیدار کیا ہے بلکہ ثابت یا تو مطلق رؤیت کا قول ہے (یعنی یہ کہے بغیر کہ اس آنکھ سے دیکھا) یا دل کے ساتھ مقید کر کے، واقعہ معراج کی ثابت روایات میں سے کسی میں مذکور نہیں کہ آپ نے اپنی اسی آنکھ کے ساتھ اللہ کو دیکھا ہے، آپ کا قول: (اَتَانِي الْبَارِحَةَ رَبِّيْ فِيْ اَحْسَنِ صُوْرَةٍ) (رات میرے پاس میرا رب نہایت حسین صورت میں آیا [یعنی خواب میں]) اسے ترمذی وغیرہ نے نقل کیا تو یہ مدینہ میں خواب کی بات تھی، یہی مفسراً مذکور ہے اسی طرح ام طفیل اور ابن عباس وغیرہما کی روایات جن میں آپ کی رؤیتِ رب کا اثبات ہے تو یہ سب مدنی زندگی سے متعلقہ ہیں جیسا بعض احادیث میں اس کا مفسراً ذکر ہے اور واقعہ معراج مکی زندگی میں پیش آیا تھا جیسے کہا: **(سُبْحَانَ الَّذِيْ أَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلاً مِنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ)** [الإسراء: ۱] (پاک ہے وہ ذات جو ایک رات اپنے بندے کو مسجدِ حرام سے لے گیا) ہم نے ایک جگہ اس بارے مفصل بحث کی ہے، نصِ قرآنی سے ثابت ہے کہ حضرت موسیٰ کو جواب ملا: (**لَنْ تَرَانِيْ**) [الأعراف: ۱۴۳] (تم مجھے ہرگز نہ دیکھ سکو گے) اور اللہ کی رؤیت آسمان سے کتاب نازل کرنے سے اعظم ہے جیسے کہا:

(يَسْـَٔلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰٓى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَقَالُوْٓا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً) [النساء: ۱۵۳] (اہلِ کتاب تم سے درخواست کرتے ہیں کہ تم اُن پر ایک کتاب آسمان سے اتار لاؤ تو یہ موسیٰ سے اس سے بھی بڑی بڑی درخواستیں کر چکے ہیں، کہتے تھے ہمیں اللہ کو ظاہر دکھا دو) تو جس نے کہا کہ لوگوں میں سے کسی نے اللہ کو دیکھا ہے اس نے زعم کیا کہ وہ درجہ میں حضرت موسیٰ بن عمران سے بڑا ہے اور اس کا دعوی اس کے دعوی سے بڑا ہے جس نے ادعاء کیا کہ اللہ نے آسمان سے اس پر کتاب نازل کی ہے، اللہ تعالیٰ کی رؤیت کے ضمن میں لوگ تین اقوال پر ہیں:

(۱) صحابہ، تابعین اور ائمہ دین کا موقف ہے کہ اللہ تعالیٰ کو آخرت میں ظاہر باہر آنکھوں کے ساتھ دیکھا جائے گا اور کوئی دنیا میں ان (جاگتی) آنکھوں سے اللہ کو نہیں دیکھ سکتا، البتہ خواب میں یہ ممکن ہے اور دلوں کو ان کے مناسبِ حال مکاشفات اور مشاہدات

حاصل ہوتے ہیں ! کئی لوگ ایسے ہیں جن کا مشاہدۂ قلبی بڑا قوی ہوتا ہے حتی کہ وہ خیال کرتے ہیں کہ اپنی آنکھ کے ساتھ دیکھا ہے اور یہ غلط ہے، دلوں کے مشاہدات بندے کے ایمان کے بحسب حاصل ہوتے ہیں اور اس کی معرفت صورتِ مثالیہ میں ہے جیسا کہ ایک جگہ اس کی تفصیلی بحث کی ہے

(۲) جہمیہ نفاۃ (یعنی صفاتِ باری تعالی کی نفی کرنے والے) کا قول کہ اللہ کو نہ دنیا میں دیکھا جانا ممکن ہے اور نہ آخرت میں

(۳) بعض کا قول کہ اللہ کو دنیا و آخرت دونوں میں دیکھنا ممکن ہے، جہمیہ کے حلولیہ نفی اور اثبات کے درمیان جمع کرتے اور کہتے ہیں کہ اسے دنیا و آخرت میں دیکھا بھی جا سکتا ہے اور نہیں بھی دیکھا جا سکتا، یہ ابن عربی نے اپنی کتاب فصوص میں اور اس جیسوں نے ذکر کیا اس لئے کہ کائنات میں ساری (یعنی سرایت کئے ہوئے) وجودِ مطلق کو دیکھنا ناممکن ہے اور یہ ان کے نزدیک وجودِ حق ہے پھر جس نے اثباتِ ذات کیا وہ کہتا ہے کہ وہ اس میں متجلیاً (یعنی تجلی ڈالتا ہوا) اسے دیکھتا ہے اور جس نے مطلق اور معین کے مابین تفرقہ کیا وہ قائل ہے کہ انسان رب کو کسی صورت کے ساتھ مقیداً دیکھ سکتا ہے، ان حضرات کا قول دو امور کے درمیان دائر ہے: ایک اللہ کی رؤیت کا انکار اور دوم مخلوقات کی رؤیت کا اثبات اور یہ مخلوق کو خالق میں یا خالق کو مخلوق میں حلول شدہ قرار دیتے ہیں وگرنہ خارج میں ثابت اعیان اور ان کے وجود کے درمیان تفریق ان حضرات کا قول ہے جن کے نزدیک معدوم خارج میں ایک شیٔ ہے اور یہ باطل قول ہے، اس کے ساتھ یہ بات بھی ضم کی جائے کہ انہوں نے عین وجودِ مخلوق کو وجودِ خالق قرار دے ڈالا، جہاں تک مطلق اور معین کے مابین تفریق حالانکہ مطلق خارج میں مطلق نہیں ہوتا، تو یہ مقتضی ہے کہ رب معدوم ہو اور یہ رب کا جحود اور اس کی تعطیل ہے، اگر وہ اسے خارج میں ثابت کریں تو اسے موجودات کا ایک جزو خیال کریں گے تو یوں خالق مخلوق کا جزو یا مخلوق کے ساتھ قائم عرض ہوا، اور اس سب کا فساد و بطلان معلوم بالضرورۃ ہے، اس کی تفصیل ایک جگہ ذکر کی ہے

جہاں تک اس کا تناقض تو قولہ: (مَا غِبْتَ عَنِ الْقَلْبِ الخ) مغایرت کو مقتضی ہے اور یہ کہ مخاطِب غیرِ مخاطَب ہے اور مخاطب کیلئے عین و قلب ہے جن سے مخاطب غائب نہیں ہوتا بلکہ قلب و عین اس کا مشاہدہ کرتے ہیں جبکہ شاہد مشہود کا غیر ہوتا ہے! قولہ: (مَا بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَنَا مِنْ بَيْنٍ) میں ضمیرِ متکلم اور ضمیرِ مخاطَب استعمال کی ہے اور یہ دوئی کا اثبات ہے، اگر کہیں یہ مظاہر اور مجالی ہیں تو کہا جائے گا اگر مظاہر و مجالی غیرِ ظاہر و متجلی ہیں تو دوئی ثابت اور وحدت کا نظریہ باطل ہوا، اور اگر وہ وہی ہے تب تعدد باطل ہوا (پھر الگ الگ ضمیریں کیوں ذکر کیں؟) تو دونوں کے درمیان جمع کرنا تناقض ہے، قائل کا قول:

فَارِقْ ظُلَمَ الطَّبْعِ وَ كُنْ مُتَّحِداً بِاللّٰهِ وَإِلَّا فَكُلُّ دَعْوَاكَ مُحَالُ

(گزرا) تو اگر اس کے مراد اتحادِ مطلق ہے تو مفارِق ہی مفارَق ہوا اور وہی طبع اور ظلمِ طبع ہے اور وہی اس کے اس قول: (وَ كُنْ مُتَّحِداً بِاللّٰهِ) کا مخاطَب ہے اور اس کے قول: (كُلُّ دَعْوَاكَ الخ) کا اور اس میں جو تناقض ہے وہ مخفی نہیں، اور اگر مراد مقید

اتحاد ہے تو یہ ممتنع ہے کیونکہ خالق اور مخلوق اگر باہم متحد ہیں (یعنی اتحادِ ذات) تو اگر اتحاد کے بعد وہ دو ہیں جیسے قبل از اتحاد تھے تو یہ تو تعدد ہے نہ کہ اتحاد اور اگر دونوں کسی تیسری شئ میں بدل گئے ہیں جیسے پانی اور دودھ اور آگ اور لوہا (مثلا) یکجا ہو جاتے ہیں۔ اور اسی کے نحو کا نصاری اتحاد میں اپنے قول کے ساتھ اثبات کرتے ہیں۔ تو اس سے لازم آتا ہے کہ خالق متغیر ہوا اور استحالت کا شکار ہوا اور اس کی حقیقت تبدیل ہوئی جیسے ان سب کا معاملہ ہوتا ہے جو دیگر کے ساتھ متحد (اور مخلوط) ہوتے ہیں، تب استحالت لازم امر ہے اور یہ اللہ تعالیٰ پر ممتنع ہے اور وہ اس سے منزہ ہے اس لئے کہ استحالت اس چیز کے عدم کو مقتضی ہے جو موجود ہو اور رب تعالیٰ واجب الوجود ہے اپنی ذات اور اپنے لئے لازم صفات کے ساتھ اور اس میں سے کسی شئ پر عدم ممتنع ہے اور اس لئے کہ رب تعالیٰ کی یہ صفات صفاتِ کمال ہیں تو ان میں سے کسی کا عدم نقص ہے اور اللہ ہر طرح کے نقص سے پاک ہے اور اسلئے کہ مخلوق کا خالق کے ساتھ اتحاد مقتضی ہے کہ عبد (بھی) قدیم صفات کے ساتھ متصف ہو جو رب تعالیٰ کی ذات کا خاصہ اور اس کیلئے لازم ہیں اور یہ محدث اور مخلوق عبد کی نسبت ممتنع ہے کیونکہ اسے حدوث، افتقار اور ذل لازم ہے اور رب تعالیٰ کو قدامت اور استغناء لازم ہے اور وہ سبحانہ وتعالیٰ قدیم، غنی اور عزیز بنفسہ ہے، اس کی نسبت اس سب کا نقیض مستحیل ہے تو ایک کا دوسرے کے ساتھ اتحادِ ذات مقتضی ہے کہ رب اپنی صفات کی نقیض مثلا حدوث، فقر اور ذل کے ساتھ متصف ہو، اسی طرح بندہ اپنی صفات کے نقیض مثلا قِدم، غنیٰ ذاتی اور عزِ ذاتی کے ساتھ متصف ہو اور یہ سب ممتنع ہے، اسی لئے جنید (بغدادی) سے جب توحید بارے پوچھا گیا تو کہا: توحید حدوث کا قِدم سے اِفراد ہے! تو بیان کیا کہ محدَث کی قدیم سے تمییز ضروری ہے لہذا ائمہِ دین کا اتفاق ہے کہ خالق اپنی مخلوقات سے بائن (یعنی جدا) ہے اس کی مخلوقات میں اس کی ذات سے کوئی شئ نہیں اور نہ اس میں اس کی مخلوقات سے کوئی شئ ہے بلکہ رب رب اور عبد عبد ہے:

﴿ **اِنْ كُلُّ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّاۤ اٰتِی الرَّحْمٰنِ عَبْدًا لَقَدْ اَحْصٰىهُمْ وَعَدَّهُمْ عَدًّا وَكُلُّهُمْ اٰتِیْهِ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ فَرْدًا﴾** [مریم: ۹۳-۹۶] (سبھی جو آسمانوں اور زمین میں ہیں سب اللہ کے روبرو بندے ہو کر آئیں گے۔ اس نے ان کو گھیر رکھا اور شمار کر رکھا ہے۔ اور سب قیامت کے دن اکیلے اکیلے اس کے روبرو ہوں گے)

اگر اس شعر کے ساتھ متکلم نے اتحادِ وصفی مراد لیا ہے اور وہ یہ کہ بندہ وہی کچھ پسند کرے جو اللہ کو ہے اور ہر وہ ناپسند کرے جو اسے ہے، اللہ کو راضی کرنے والے امور پر راضی ہو اور اس کی ناراضی کا سبب بننے والے امور کو مبغوض رکھے اور وہی حکم دے جو اللہ کے اوامر ہیں اور ان سے منع کرے جو اس کے نواہی ہیں اور اہل اللہ سے موالات اور اللہ کے دشمنوں سے معادات رکھے اور اللہ ہی کی خاطر اس کی پسند اور ناپسند ہو اور اللہ ہی کیلئے عطاء ومنع ہو تب تو وہ اپنے رب تعالیٰ کیلئے موافق ہوگا، یہ مراد لینا حق ہے اور یہ ایمان کی حقیقت اور کمال ہے جیسے بخاری کی حضرت ابو ہریرہ سے نقل کردہ حدیث میں ہے کہ نبی اکرم نے فرمایا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: جس نے میرے کسی ولی سے دشمنی کی اس نے میرے ساتھ اعلانِ جنگ کیا اور میرا بندہ اپنے ذمہ فرائض کی ادائیگی کے ساتھ تقرب کی مثل

میری طرف کسی اور شئ کے ساتھ متقرب نہیں ہوتا اور وہ نوافل کے ساتھ مسلسل میرے تقرب کا جویا رہتا ہے حتی کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں ! تو یوں عبد کا اثبات کیا جو فرائض اور پھر نوافل کے ذریعہ اس کے تقریب کا خواہاں ہے جبکہ ان حضرات کے نظریہ کے مطابق تقرب سے قبل اور بعد وہ عینِ عبد اور عینِ دیگر مخلوقات ہے ! مذکورہ بالا حدیث میں یہ بھی ہے کہ بندہ مسلسل میرے تقرب کا جویا رہتا ہے حتی کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں اور جب ایسا ہو جائے تو رب بندے کا کان بن جاتا ہے جس کے ساتھ وہ سنتا ہے، اس کی آنکھ بن جاتا ہے جس کے ساتھ دیکھتا ہے، اس کا ہاتھ بن جاتا ہے جس کے ساتھ وہ پکڑتا ہے اور اس کا قدم بن جاتا ہے جس کے ساتھ چلتا ہے، اور یہ حضرات انہی چار اعضاء کے ساتھ تخصیص نہیں کرتے، ان کے نزدیک تو وہ اس کا پیٹ اور زانو وغیرہ بھی ہے، حدیث ایک مقید حال کے ساتھ مخصوص ہے جبکہ یہ اطلاق اور تعمیم کے قائل ہیں تو کہاں یہ روایت اور کہاں ان کا عقیدہ اور نظریہ، ان کی حجت ایک اور صحیح حدیث بھی ہو سکتی ہے جس میں ہے کہ اللہ روزِ قیامت لوگوں کیلئے متجلی ہوگا پھر ان کے پاس اس صورت سے دیگر صورت میں آئے گا جس میں اسے پہلی مرتبہ دیکھا ہوگا تو کہے گا میں تمہارا رب ہوں، وہ کہیں گے ہم اللہ کے ساتھ تجھ سے پناہ حاصل کرتے ہیں ہم یہی بیٹھے ہیں حتی کہ ہمارا رب ہمارے پاس آئے، جب وہ آئے گا تو ہم اسے پہچان لیں گے ! پھر وہ اس صورت میں ان کے پاس آئے گا جس میں اسے پہلی مرتبہ دیکھا تھا تو کہے گا میں تمہارا رب ہوں تو وہ کہیں گے ہاں تو ہی ہمارا رب ہے، تو اسے یہ حضرات اپنے اس نظریہ کی دلیل باور کرتے ہیں کہ اسے دنیا میں ہر صورت میں دیکھا جاتا ہے بلکہ وہ ہر صورت ہے، یہ حدیث فی الحقیقت ان کے خلاف حجت ہے کیونکہ ان کے نزدیک دنیا وآخرت میں فرق نہیں مگر اس میں ہے کہ جب ایک اور صورت میں رب تعالیٰ آئے گا تو لوگ انکار کریں گے اور کہیں گے تجھ سے اللہ کی پناہ ! ہم تو یہیں ہیں حتی کہ ہمارا رب آئے

جبکہ یہ ملحد کہتے ہیں کہ عارف اسے ہر صورت میں پہچان سکتا ہے اور جنہوں نے روزِ قیامت انکار کیا یہ ان کا جہل اور قصورِ معرفت ہے حالانکہ پہلی صورت میں اس کا انکار کرنے والوں میں انبیاء اور مومنین ہوں گے اور اللہ نے ان کے اس انکار کی تعریف کی ہے کیونکہ ایک غیرِ صورت میں اس کا آنا بطورِ آزمائش ہوگا تاکہ جس رب کی انہوں نے عبادت کی ہے اس کے غیر کی اب وہ اتباع نہ کریں اسی لئے حدیث میں یہ بھی ہے:(وَهُوَ يَسْأَلُهُمْ وَ يُثَبِّتُهُمْ وقَدْ نَادَى الْمُنَادِيْ لِيَتَّبِعْ كُلُّ قَوْمٍ مَا كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ) (وہ اہلِ ایمان کو ثابت قدم رکھے گا، ایک منادی ندا دے گا کہ ہر قوم اس کے ساتھ ہولے جس کی وہ [دنیا میں] عبادت کیا کرتے تھے) پھر ان ملحدوں سے پوچھا جائے اگر تمہارے نزدیک وہ ہر صورت میں ظاہر ہے تو اس کا مطلب ہوا کہ وہی منکِر اور وہی منکَر ہے جیسے ان میں سے بعض نے دوسرے سے کہا: جس نے تمہیں کہا کائنات میں اللہ کا سوا ہے وہ کاذب ہے تو وہ بولا:(فَمَنْ هُوَ الَّذِيْ كَذَب ؟) (تو جھوٹ بولنے والا کون ہے؟) ابن عربی نے ذکر کیا کہ وہ خلوت میں اپنے ایک مرید کے ہاں گیا اور اسے قضائے حاجت محسوس ہو رہی تھی تو کہا:(مَا أُبْصِرُ غَيْرَهٗ أَبُوْلُ عَلَيْهِ) (نقلِ کفر کفر نہ باشد] میں اس کا غیر دیکھ ہی نہیں رہا کہ جس پر

بول کروں) تو اس کے شیخ نے کہا جو تمہارے پیٹ سے نکل رہا ہے وہ کس سے ہے؟ وہ بولا آپ نے تو میری آنکھیں کھول دیں، ان کے دوشیوخ تلمسانی اور شیرازی کا ایک مردار کتے سے گزر ہوا تو شیرازی بولا کیا یہ بھی اس کی ذات سے ہے؟ تلمسانی نے کہا کیا کائنات میں اس سے خارج کوئی شیٔ ہے؟

تلمسانی نے بیت المقدس کے ایک عابد وزاہد شیخ کو گمراہ کیا جسے ابو یعقوب مغربی مبتلیٰ کہا جاتا ہے حتی کہ وہ کہنا شروع ہوا: وجود واحد ہے اور وہ اللہ ہے اور میں واحد کو نہیں دیکھتا اور میں اللہ کو نہیں دیکھتا اور کہتا: کتاب وسنت ثنویۃ الوجود (تعددِ وجود) کی ناطق ہیں جبکہ وجود واحد ہے اس میں دوئی نہیں، وہ اس کلام کو بطورِ تسبیح اور ورد کے کہتا رہتا تھا، جہاں تک یہ اشعار:

اِذَا بَلَغَ الصَّبُّ الْكَمَالَ مِنَ الْهَوىٰ وَغَابَ عَنِ الْمَذْكُوْرِ فِيْ سَطْوَةِ الذِّكْر

فَشَاهَدَ حَقًّا حِيْنَ يَشْهَدُهُ الْهَوىٰ بِاَنَّ صَلاَةَ الْعَارِفِيْنَ مِنَ الْكُفْر

(ص: ۱۶۴ میں گزرے ہیں) تو یہ اپنے کفریہ ہونے کے ساتھ ساتھ جاہل کی کلام ہے، اسے ادراک نہیں کہ کیا کہہ رہا ہے، فناء اور غیب یہ ہے کہ مذکور کے ساتھ ذکر سے اور معروف کے ساتھ ہدایت سے اور معبود کے ساتھ عبادت سے غائب ہو جائے حتی کہ جو نہیں تھا وہ فانی ہو اور جو ازل سے ہے وہی باقی رہے اور یہ مقامِ فناء ہے جو کثیر سالکین کیلئے عارض ہوتا ہے، ان کے مطابقِ حقیقت کمالِ شہود سے عجز کے سبب بخلاف شرعی فناء کے تو اس کا مضمون یہ ہے کہ اپنی عبادت کے ساتھ اس کے ماسوا کی عبادت سے اور اس کی محبت کے ساتھ اس کے ماسوا کی محبت اور اس کی خشیت کے ساتھ اس کے ماسوا کی خشیت اور اس کی طاعت کے ساتھ اس کے ماسوا کی طاعت سے فنا ہو جائے، یہی توحید اور ایمان کی تحقیق ہے

جہاں تک فناء کی تیسری نوع اور یہ وجودِ ماسویٰ سے فناء اس طور کہ وجودِ خالق دیکھے! تو یہ ان ملحدوں کا قول ہے جو اپنے آپ کو اہلِ وحدت کہتے ہیں، یہاں مقصود یہ واضح کرنا ہے کہ اس کا قول: (يَغِيْبُ عَنِ الْمَذْكُوْرِ) ایک جاہلانہ بات ہے، یہ اصلاً ہی محمود نہیں بلکہ محمود یہ ہے کہ مذکور کے ساتھ ذکر سے غائب ہو جائے، سطوات الذکر میں مذکور سے غائب نہ ہوالا یہ کہ اس کا ارادہ ہو کہ مذکور سے وہ غائب ہو تو مخلوق کا شاہد بنے اور اس امر کا کہ خالق وہی ہے اور وہ وجودِ کائنات کو ایک وجود باور کرے اور اس طرح کے فاسد مشاہدات تو یہ اہلِ الحاد کا شہود ہے نہ کہ موحدین کا، بخدا جو الحادی شہود کا شاہد ہو وہ عارفین کی نماز کو کفر نہیں کہہ سکتا، جہاں تک قائل کا یہ کہنا:

اَلْكَوْنُ يُنَادِيْكَ اَمَا تَسْمَعُنِيْ مَنْ اَلَّفَ أَشْتَاتِيْ وَ مَنْ فَرَّقَنِيْ

اُنْظُرْ لِتَرَانِيْ مَنْظَراً مُعْتَبَراً مَا فِيَّ سِوىٰ وُجُوْدِ مَنْ اَوْجَدَنِيْ

(ص: میں ۱۶۴ گزرے ہیں) تو یہ بھی انہی ملاحدہ کے اقوال میں سے ہے اور ان کے اقوال باہم متناقض، کفریہ اور عقل ودین کے لحاظ سے باطل ہیں کیونکہ اگر کون میں سوائے موجد کے کسی کا وجود نہیں تو وہی وجود منادی کون ہوا اور وہی مخاطَب منادیٰ اور وہی اشتاتِ مولفہ

اورمفرقہ اور وہی مخاطب جسے کہا گیا: (اُنظُرْ) (یعنی وہی موجداورخود ہی ایجاد) تو اس سب کا معنی یہ ہوا کہ قدیم اورازلی واجب الوجود نے اپنے آپ کو ایجاد کیا اوراسے مفرَق اوراسے ہی مولف کیا تو یہ جمع بین نقیضین ہے کیونکہ واجب بنفسہ مفعول ومصنوع نہیں ہوتا اورواحد شئ خالق اورخود ہی مخلوق نہیں ہوتی اور نہ بیک وقت قدیم ومحدَث اورواجب الوجود اورممکن الوجود ہوتا ہے کہ یہ تصور کرنا نقیضین کے مابین جمع کرنا ہے، واجب الوجود وہ ہوتا ہے جس کی ذات عدم قبول نہ کرے جبکہ ممکن الوجود جس کی ذات قابلِ عدم ہو، تو ممتنع ہے کہ ایک شئ بیک وقت قابلِ عدم اورغیر قابلِ عدم ہو! قدیم وہ ہے جس کے وجود کیلئے اول نہیں اورمحدث وہ جس کے وجود کیلئے اول نہیں تو ایک شئ کا بیک وقت قدیم اورمحدَث ہونا محال ہے

اگراس قول کے ساتھ ان کی مراد ہرکس وناکس کو معلوم نہ ہوتی تو معنی یہ بھی کیا جانا ممکن تھا کہ (مَا فِيَّ سِوىٰ الوُجُوْدِ الَّذِيْ خَلَقَہٗ مَنْ اَوْجَدَنِيْ) (یعنی مجھ میں سوائے اس وجود کے کچھ نہیں جسے اس نے تخلیق کیا جو مجھے وجود میں لایا ہے) اورتب وجود کی اللہ کی طرف اضافت اضافتِ مِلک ہوتی لیکن معلوم ہے کہ اس کی یہ مراد نہیں اوراس لئے کہ یہ عبارت اس معنی میں استعمال نہیں کی جاتی اوردراصل اللہ کے وجود سے اس کا وجودِ ذات مراد ہوتا ہے نہ کہ اس کی مخلوقات کا وجود، اسی طرح قائل کے یہ اشعار:

ذَاتُ وُجُوْدِ الْكَوْنِ لِلْخَلْقِ شُهُوْدٌ　　　اَنْ لَيْسَ لِمَوْجُوْدٍ سِوَى الْخَلْقِ وُجُوْدٌ

(کون کا خلق کے لئے وجود اس بات کی گواہی ہے کہ موجود کے لئے سوائے خلق کے وجود نہیں)

تو اس کے ساتھ اس کی مراد یہ ہے کہ وجودِ کون نفس وجودِ حق ہے اور یہ اہلِ وحدت کا قول ہے وگرنہ اگر اس کی مراد یہ ہو کہ مخلوقات میں سے ہرموجود کا وجود حق تعالی (کی خلق) سے ہے، کسی موجود کا وجود اس کے اپنے نفس سے نہیں (یعنی خود اپنی ایجاد وخلق) بلکہ اس کے رب کی طرف سے ہے اوراشیاء اپنے آپ کے اعتبار سے سوائے عدم کے کسی اورکی مستحق نہیں اوران کیلئے ان کے وجود کا حصول اشیاء کے خالق اورباریٔ کی طرف سے ہوا ہے تو یہ ہمہ دم اس کی محتاج ہیں اورایک لحظہ بھی یہ اس سے مستغنی نہیں ہوسکتیں، نہ دنیا میں اورنہ آخرت میں تو یہ معنی صحیح ہوتا اوراسی پر پہلوں اورپچھلوں میں سے اہلِ عقل ودین ہیں، وحدت الوجود کے قائلین کا قول باہم متضاد ہے اسی لئے وہ ایک بات اورپھراس کا نقیض کہتے ہیں وگرنہ اس کا قول: (منہ و الاعلاہ يُبْدِئُ وَ يُعِيْدُ) وحدت کے ان کے نظریہ سے متصادم ہے، اگر ہرسو وہی ایک ہے تو کون بادی، عائد منہ اورمعاد الیہ ہے؟ اوراس کے قول:

وَمَا اَنَا فِيْ طِرَازِ الْكَوْنِ شَيْءٌ　　　لِأَنِّي مِثْلُ ظِلٍّ مُسْتَحِيْلٍ

(گزرا) بھی وحدت کے منافی ہے اس لئے کہ سایہ صاحبِ سایہ کا مغایر ہوتا ہے تو جب مخلوق کو اس نے سایہ سے تشبیہ دی ہے، تو دوئی ثابت ہوئی جیسے شعاع سے تشبیہ کی صورت میں بھی کیونکہ سورج کی شعاع اس کی ٹکیہ کا غیر ہے، اسی طرح چراغ کی ضوء وغیرہ سے تشبیہ کی صورت میں بھی! نصاریٰ بھی حلول اوراتحاد کے ضمن میں یہی تشبیہ دیتے ہیں، میں نے ان کے ایک صاحب

سے کہا جو مجھ سے ملنے اوراس بابت مناظرہ کرنے آیا: جب تم لوگ مخلوق کو سورج اور آگ کی شعاع سے تشبیہہ دیتے ہو اور خالق کو آگ اور سورج سے تب اس میں مسیحؑ اوران کے غیر میں کیا فرق رہا؟ کیونکہ اس کی رو سے ہر ماسوا اللہ شعاع اور ضوء کے بمنزلہ ہے تو پھر مسیح، ابراہیم اور موسیٰ کے مابین کیا فرق رہا؟ بلکہ ان کے اور دیگر سب مخلوقات کے درمیان کیا فرق ہوا؟ میں بار بار اس سے یہی کہتا رہا حتی کہ حاضرین نے اچھی طرح اس نکتہ کو سمجھ لیا اور اس پر اور حاضرین پر واضح ہوا کہ ان کا نظریہ باطل ہے، اس کی کوئی حقیقت نہیں اور جس امر کا انہوں نے حضرت مسیح کیلئے اثبات کیا ہے یا تو وہ ہر ایک کے حق میں ممتنع ہے اور یا پھر ان کے اور دیگر کے درمیان مشترک قدر ہے اور دونوں تقدیروں پر حضرت مسیحؑ کی اس کے ساتھ تخصیص باطل ہے! میں نے اسے کہا کوئی بھی معجزہ جو حضرت مسیح لے کر آئے حضرت موسیٰ اس سے بھی اعظم معجزہ لائے ہیں اگر ان کے ہاتھ پر مردے زندہ ہوئے ہیں تو جو مردے حضرت موسیٰ کے ہاتھ پر اللہ نے زندہ کئے ان کی تعداد کہیں زیادہ ہے، جیسے وہ جنہوں نے کہا تھا:

﴿لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ﴾[البقرة :۵۵] (جب تک ہم اللہ تعالیٰ کو سامنے نہ دیکھ لیں گے تم پر ایمان نہ لائیں گے تو تم کو بجلی نے آ پکڑا) پھر ان کی موت کے بعد (حضرت موسیٰ کی دعا سے) اللہ نے انہیں زندہ کر دیا جیسے قرآن نے کہا: (**ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ**)[البقرة : **۵۶**] (پھر موت آ جانے کے بعد ہم نے تمہیں از سرِ نو زندہ کر دیا تا کہ شکر گزار بنو) اور جیسے وہ شخص جوان کے کہنے پر گائے کے مس سے زندہ ہوا، مردے زندہ ہونے کا معجزہ کئی اور انبیاء کو بھی عطا ہوا اور نصاریٰ اس کا اعتراف کرتے ہیں، اور عصا کا اژدھا بن جانا تو مردے کو زندہ کرنے سے بھی بڑا معجزہ ہے کیونکہ میت حیات کا محل تھی تو حیات اس محل کی طرف واپس کی گئی جس میں حیات تھی لیکن خشک لکڑی کو ذی حیات بنا دینا جو لاٹھیوں اور رسیوں کو نگل لے تو یہ قدرت میں ابلغ اور اَندر (یعنی زیادہ ندرت والا) ہے، اللہ تعالیٰ روزِ قیامت مردے زندہ کرے گا، وہ لکڑیوں کو سانپ اور اژدھے نہ بنائے گا، جہاں تک آسمان سے دستر خوان نازل کرنا تو حضرت موسیٰ اور ان کی قوم پر روزانہ من وسلویٰ اتارا جاتا تھا اور ان کی خاطر پتھر سے پانی پھوٹتا تھا جو اس سے بھی اعظم بات ہے اور اس طرح کی باتیں میں نے اس کے سامنے ذکر کیں جن سے واضح ہوا کہ حضرت مسیح کی اتحادِ ذات کے ساتھ تخصیص اور ان کیلئے دعوائے الوہیت بلا وجہ اور بے سبب ہے! سب جو ان کی بابت ذکر کیا جاتا ہے وہ یا تو ان کے اور دیگر مخلوقات کے مابین مشترک ہے اور یا ان کے اور دیگر رسل وانبیاء کے مابین، پھر بعض رسل مثلاً حضرات ابراہیم وموسیٰ اس ضمن میں ان سے اکمل ہو سکتے ہیں

جہاں تک بغیر والد کے عورت کے بطن سے ان کی پیدائش تو حضرت حواء کی بغیر والد اور والدہ، مرد سے تخلیق اس سے زیادہ تعجب انگیز ہے، حضرت عیسیٰ کم از کم عورت کے بطن سے پیدا کئے گئے اور یہ معتاد ہے بخلاف مرد کی پسلی سے پیدائش کے تو یہ نہ کبھی نہ دیکھا نہ سنا لہٰذا قطعیت سے واضح ہوا کہ حضرت مسیح کی تخصیص کرنا باطل ہے اور جو وہ ان کی نسبت ادعاء کرتے ہیں اگر یہ ممکن ہے

تب ان کیلئے اس کے ساتھ اختصاص نہیں اور اگر ممتنع ہے تب اس کیلئے ان میں اور ان کے غیر میں کوئی وجود نہیں، اسی لئے ان اتحادیہ نے کہا نصاریٰ دراصل تخصیص کرنے کی وجہ سے کافر ہوئے ! یہ کہنا بھی باطل ہے کیونکہ اتحاد میں عموم اور خصوص ہے، یہاں مقصود یہ ہے کہ اتحادیہ کا کسی کو ظلِ مستحیل سے تشبیہہ دینا ان کے نظریہ وحدت سے متصادم ہے، اسی طرح ایک کے یہ اشعار:

اَحِنُّ اِلَیۡهِ وَهُوَ قَلۡبِیۡ وَ هَلۡ یُریٰ سِوَایَ اَخُوۡ وَجۡدٍ یَحِنُّ لِقَلۡبِهٖ

وَیُحۡجَبُ طَرۡفِیۡ عَنۡهُ اِذۡ هُوَ نَاظِرِیۡ وَمَا بُعۡدُهٗ اِلَّا لِاِفۡرَاطِ قُرۡبِهٖ

(گزرے ہیں) یہ اس کے اس کے ساتھ کفر والحاد کے قصد کے باوصف باہم متضاد کلام ہے کیونکہ کسی شئ کا خود اپنی طرف حنین تناقض ہے اسی لئے کہا: (وهل یری سوای الخ) اورقولہ: (ومَا بُعۡدُهٗ الخ) بھی متناقض ہے کیونکہ وحدت والوں کے نزدیک نہ قرب ہے اور نہ بعد کیونکہ یہ دوئی کو مقتضی ہے کہ ایک کا دوسرے سے قرب (یا بعد) ہو جبکہ واحد کا اپنی ذات سے نہ قرب ہوتا ہے اور نہ بعد

جہاں تک قائل کا یہ قول کہ توحید کی کوئی زبان نہیں اور تمام زبانیں ہی اس کی زبان ہیں تو یہ بھی اہلِ وحدت کا قول ہے اور یہ اپنے کفریہ ہونے کے ساتھ ساتھ باہم متناقض بھی ہے کیونکہ دینِ اسلام میں معلوم بالاضطرار ہے کہ لسانِ شرک کیلئے توحید کی زبان نہ ہوگی اور مشرکین کے اقوال جنہوں نے کہا تھا:

﴿وَ قَالُوۡا لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمۡ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا وَّلَا یَغُوۡثَ وَیَعُوۡقَ وَنَسۡرًا﴾[نوح : **۲۳**] (اور کہنے لگے کہ اپنے معبودوں کو ہرگز نہ چھوڑنا اور وَدّ اور سواع اور یغوث اور یعوق اور نسر کو کبھی ترک نہ کرنا) اور کہا:

﴿حَرِّقُوۡهُ وَانۡصُرُوۡۤا اٰلِهَتَكُمۡ﴾[الأنبياء : **۶۸**] (اس کو جلا دو اور اپنے معبودوں کی مدد کرو) اور اس قبیل کے اقوال توحید کی بولی اور زبان نہیں ہوسکتے ! جہاں تک اس قول کا ان کے اصل سے متناقض ہونا تو وجود اگر واحد ہے تو تعدد کا اثبات تناقض ہوا تو جب ایک قائل کہے: وجود واحد ہے اور دوسرا کہے: واحد نہیں بلکہ متعدد ہے تو یہ دونوں باہم متناقض ہوئے لہذا ممتنع ہے کہ ان میں سے ایک وہی دوسرا ہو اور جب قائل کہے: تمام زبانیں ہی توحید کی زباں ہیں تو گویا اس نے اپنے قول:(اَلأَلۡسِنَةُ کُلُّهَا) کے ساتھ تعدُّد کی تصریح کر دی اور یہ مقتضی ہے کہ یہ زبان وہ دوسری زبان نہ ہو تو یوں تعدد ثابت اور وحدت کا نظریہ باطل ہوا

تو ان کی اور دیگر ان جیسوں کی کلام ان کے اصول اور نظریہ سے متصادم ہے کہ یہ اثباتِ تعدد کی طرف مضطر ہیں تو اگر کہیں وجود واحد ہے اس معنی میں کہ موجودات مسمی الوجود میں مشترک ہیں تو یہ صحیح ہے لیکن مسمی الواحد میں مشترک موجودات میں سے ایک کے وجود میں دوسرے کا وجود نہیں ہوسکتا، بلکہ یہ کلی اسمِ عام میں اشتراک ہے ان اسماء میں اشتراک کی مثل جنہیں نحوی اسمِ جنس کا نام دیتے ہیں اور منطقی انہیں جنس، نوع، فصل، خاصہ اور عرضِ عام میں تقسیم کرتے ہیں تو ان اسماء میں اشتراک اعیان کے ایک دوسرے سے تبایُن کو مستلزم ہے اور مشترکین میں سے ہر کوئی ایک دوسرے سے جدا وجود رکھتا ہے اور اس سے بھی معلوم ہوا

کہ وجودِحق وجودِمخلوقات سے جدا ہے ! جب فلک کا وجود (مثلا) ذرہ اور مچھر کے وجود سے جدا ہے تو وجودِحق کا دیگر موجودات سے تباین اس سے بڑی حقیقت ہے کہ جو ہر مخلوق کے وجود کا دوسری مخلوق کے وجود سے تباین ہے ! تو اس سے اور دیگر ادلہ سے اس کے قول کا بطلان ہوتا ہے جو کہتا ہے: توحید کا عارف نہیں مگر واحد اور توحید سے عبارت کرنا صحیح نہیں، اس لئے کہ یہ تعبیر نہ ہوگی مگر غیر کے ساتھ اور جس نے غیر ثابت کیا اس کا توحید سے کوئی تعلق نہیں تو یہ کلام اپنے کفر کے باوصف متناقض ہے کیونکہ اس کا کہنا کہ توحید کا عارف واحد ہے، مقتضی ہے کہ یہاں کوئی واحد ایسا ہے جو توحید کا عارف ہے اور کوئی ایسا ہے جو اس کا عارف نہیں تو یہ عارف اور غیر عارف کے مابین تفریق اور دوئی کا اثبات ہے جو نظریہ وحدت سے متصادم ہے پھر اس کا اس کے بعد کہنا: جس نے غیر کو ثابت الخ بھی اس کے مناقض ہے، اس کا کہنا کہ توحید سے تعبیر کرنا صحیح نہیں مسلمانوں کے بالاجماع کفر ہے، اللہ نے تو خود اپنی توحید کو بیان اور تعبیر کیا اور اس کے رسول نے اس کی توحید سے تعبیر اور اسے بیان کیا اور قرآن توحید کے ذکر سے بھرا پڑا ہے بلکہ اللہ نے رسل کی بعثت اور کتب کا انزال توحید کے ذکر و بیان کے لئے ہی تو کیا، فرمایا:

(وَسْـَٔلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَاۤ اَجَعَلْنَا مِنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ اٰلِهَةً يُّعْبَدُوْنَ) [الزخرف: **۴۵**] (اور جو اپنے رسل ہم نے تم سے پہلے بھیجے ہیں ان سے دریافت کرلو کیا ہم نے الرحمٰن کے سوا اَور معبود بنائے تھے کہ ان کی عبادت کی جائے؟) اور فرمایا:

(وَمَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْۤ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ) [الأنبياء: **۲۵**] (اور جو پیغمبر ہم نے تم سے پہلے بھیجے اُن کی طرف یہی وحی بھیجی کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں تو میری ہی عبادت کرو) اگر اس کا کہنا درست ہو تو کوئی توحید کا ناطق نہ ہوتا، بلکہ توحید کا نطق افضل ترین نطق ہے جیسے نبی اکرم نے فرمایا: (اَفْضَلُ الذِّكْرِ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَ اَفْضَلُ الدُّعَاءِ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ) اور فرمایا جس کی آخری کلام لا الہ الا اللہ ہوئی تو جنت میں داخل ہوا لیکن جس توحید کی طرف یہ ملحد اشارہ کرتے ہیں یعنی وحدت الوجود وہ فی ذاتہ ممتنع امر ہے خارج میں اس کا تحقُّق متصور نہیں کیونکہ وحدتِ عینیہ شخصیہ دو متعدد اشیاء میں ہونا ممتنع ہے لیکن وجودِ نوع وجود میں واحد ہے بایں معنی کہ اسمِ موجود ایک عام اسم ہے جو ہر موجود کو متناول ہے جیسے جسم انسان اور نحو ہما کا اسم ہر جسم اور ہر انسان کو متناوِل ہے اور یہ جسم وہ جسم نہیں اسی طرح یہ انسان وہ انسان نہیں اور یہ وجود بھی وہ وجود نہیں !

جہاں تک اس کا قول: کہ توحید سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا مگر غیر کے ساتھ تو اولاً اس سے کہا جائے توحید سے تعبیر کلام کے ساتھ ہوئی اور اللہ اپنی توحید کا بیان اپنی کلام کے ساتھ کرتا ہے تو اللہ کی کلام، اس کا علم، اس کی قدرت اور اس کی دیگر صفات پر سلف کے نزدیک لفظ (اللہ) کا اطلاق نہیں کیا جائے گا اور نہ انہیں غیر اللہ کہا جائے گا کیونکہ غیر کے لفظ کے ساتھ کبھی اس کا مباین مراد ہوتا ہے اور اللہ کی صفات اللہ سے جدا اور مباین نہیں اسی طرح کبھی اس سے مراد وہ ہوتا ہے جو بطورِ خاص وہ نہیں اور اللہ کی صفت (إِيَّـــاهُ) نہیں ہے تو دونوں

میں سے ایک اصطلاح میں کہا جائے گا کہ یہ اس کا غیر ہے جبکہ دوسری اصطلاح کی رو سے غیر نہ کہا جائے گا لہٰذا ان دونوں میں سے ایک کا اطلاق بغیر بیانِ مراد کے ساتھ مقرون کئے نہ کیا جائے گا تا کہ کسی بدعتی کو موقع نہ ملے کہ کہے: اگر اللہ کی صفت اس کا غیر ہے تو ہر جو غیر اللہ ہے وہ مخلوق ہے تو اسے وسیلہ بنا کر وہ کہے کہ اللہ کا علم، اس کی قدرت اور اس کی کلام اس کے ساتھ قائم صفات نہیں بلکہ یہ فی غیرہ مخلوق ہیں تو یوں اس میں صفاتِ خالق کی تعطیل اور اس کے کمال کا جحد ہوگا جو عظیم ترین الحاد ہے اور یہ جہمیہ کا موقف تھا جس کی وجہ سے سلف اور ائمہ نے ان کی مطلق تکفیر کی اگر چہ کسی ایک کا تعین کر کے اسے کافر قرار نہ کیا جائے گا مگر اتمام اور قیامِ حجت کے بعد جس کا تارک اور منکر کافر ہو جائے نیز ان ملاحدہ سے کہا جائے اگر وجود میں کسی بھی طور اس کا غیر نہیں تب لازم ہے کہ خلق کی کلام، ان کا اکل وشرب، ان کا نکاح وزنا، ان کا کفر وشرک اور ان کے سب قبیح وغیر قبیح افعال نفس وجودِ اللہ ہوں اور معلوم امر ہے جس نے اسے اللہ کیلئے صفت کیا وہ کفر وگمراہی میں سب سے آگے ہوگا تو جس نے کہا یہ سب عین وجودِ خدا ہے وہ اکفر اور اضل ہے کیونکہ صفات واعراض قائم بنفسہ وجود کا عین نہیں ہو سکتیں، ان ملاحدہ کے ائمہ ابن عربی جیسوں نے کہا:

وَكُلُّ كَلَامٍ فِي الْوُجُوْدِ كَلَامُهٗ   سَوَاءٌ عَلَيْنَا نَثْرُهٗ وَ نِظَامُهٗ

(گزرا) تو یہ مخلوق کی کلام۔ جو اگر چہ کفر وکذب وغیرہ ہو۔ کو اللہ کی کلام قرار دیتے ہیں، جہاں تک یہ ملحد تو یہ ان سے بھی آگے بڑھ گیا اور اس نے خلق کی کلام اور ان کی عبادت کو اس کا نفسِ وجود باور کیا، اس نے اس کی کلام قرار نہیں دیا بلکہ نفی کی کہ یہ اس کی کلام ہوتا کہ یوں اس کے غیر کا اثبات نہ کرے جبکہ کتاب، سنت، اجماع اور ضروری عقلی علوم کی رو سے غیر اللہ کا اثبات معلوم ہے اور اس کے سوا جو کچھ ہے وہ مخلوق اور اس کا غیر ہے، نہ وہ اللہ ہے اور نہ اس کی صفات میں سے کوئی صفت، اسی لئے اللہ نے اپنے غیر کی عبادت کرنے والے کا انکار کیا، اگر یہاں اس کا غیر ہی نہیں تب یہ انکار چہ معنی دارد؟ فرمایا:

﴿قُلْ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَاْمُرُوْٓنِّیْٓ اَعْبُدُ اَيُّهَا الْجٰهِلُوْنَ﴾[الغافر: ۶۴] (کہہ دو کہ اے نادانو! تم مجھ سے یہ کہتے ہو کہ میں غیر اللہ کی پرستش کرنے لگوں؟) اور:

﴿قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَتَّخِذُ وَلِيًّا فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ﴾[الأنعام: ۱۴] (کہو کیا میں اللہ کو چھوڑ کر کسی اور کو مددگار بناؤں؟ کہ آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے)

﴿هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللّٰهِ يَرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ﴾[الفاطر: ۳] (کیا اللہ کے سوا کوئی اور خالق ہے جو تمہیں آسمان اور زمین سے رزق دے) اور:

﴿اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِیْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا﴾[الأعراف: ۱۱۴] (کیا میں اللہ کے سوا اور منصف تلاش کروں حالانکہ اُس نے تمہاری طرف مفصل کتاب بھیجی ہے) اسی طرح قائل کا قول: میں نے محبت کو غیر مقصود پایا ہے

کیونکہ یہ نہ ہوگی مگر غیر سے غیر کیلئے اور یہاں غیر ہے ہی نہیں اور میں نے توحید کو بھی غیر مقصود پایا ہے کیونکہ توحید نہیں ہوتی مگر عبد (کی جانب) سے رب کیلئے اور اگر لوگ انصاف سے کام لیں تو نہ کسی کو عبد دیکھیں اور نہ کوئی معبود، تو یہ ایسی کلام ہے جس میں کفر، الحاد اور تناقض کا ہونا مخفی امر نہیں تو اللہ کی کتاب، اس کے رسول کی سنت اور اہل اسلام کے اجماع نے اللہ کی اپنے مومن بندوں سے محبت کا اثبات کیا ہے جیسے قرآن نے کہا:

﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ﴾[البقرة:۱۶۵] (جو ایمان والے ہیں وہ تو اللہ ہی سے سب سے زیادہ محبت کرتے ہیں) اور: **﴿يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ﴾ [المائدة:۵۴]** (جن سے وہ محبت کرے گا اور وہ اس سے محبت کرتے ہوں گے) **﴿اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾ [التوبة: ۲۴]** (تمہیں اللہ اور اس کے رسول سے زیادہ محبوب ہوں) **﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ﴾ [التوبة:۴]** (اللہ پرہیزگاروں سے محبت کرتا ہے) **﴿يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ [البقرة: ۱۹۵]** (اللہ تعالیٰ نیکی کرنے والوں سے محبت کرتا ہے) **﴿يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ﴾ [البقرة:۲۲۲]** (اللہ تعالیٰ توبہ قبول کرنے والوں اور پاک صاف رہنے والوں سے محبت کرتا ہے) **﴿يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ﴾ [المائدة: ۴۲]** (اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے)

اور نبی اکرم نے فرمایا: تین صفات ہیں جو جس کسی میں ہوں وہ ایمان کی حلاوت پالے گا: ایک، جسے اللہ ورسول ہر ماسوا سے محبوب ہوں اور دوم جو کسی سے اللہ کی خاطر محبت کرے اور سوم جو مرتد ہونا برا سمجھے، امت کے سلف اور ائمہ کا اللہ کی اپنے مومن بندوں سے محبت اور ان کی اس سے کے اثبات پر اجماع ہے اور یہی امام الحنفاء حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے دین کی اصل ہے، اسلام میں اس نظریہ کا اولین پرچار کرنے والا جعد بن درہم تھا چنانچہ اس پاداش میں (امیرِ عراق) خالد بن عبداللہ قسری نے واسط میں عید الاضحیٰ کے روز اس کا سر قلم کیا اور کہا اے لوگو تم اپنی قربانیاں ذبح کرو اللہ انہیں قبول کرے میں تو جعد کی قربانی کرنے والا ہوں کیونکہ اس کا دعوی ہے کہ اللہ نے حضرت ابراہیم کو خلیل نہیں بنایا اور نہ اس نے حضرت موسی سے کلام کی ہے پھر منبر سے اترا اور اسے قتل کیا، اس کا کہنا کہ محبت غیر سے غیر کیلئے ہوتی ہے اور غیر یہاں ہے نہیں، ہر وجہ سے باطل کلام ہے، یہ کہنا کہ محبت غیر سے غیر کیلئے ہوتی ہے، درست نہیں انسان اپنے آپ سے محبت کرتا ہے اور وہ اپنے آپ کیلئے غیر نہیں اور اللہ اپنے آپ سے محبت کرتا ہے اسی طرح اس کا کہنا کہ یہاں غیر ہے ہی نہیں، بھی باطل کلام ہے! مخلوق خالق کا غیر ہے اور مومنین اللہ کا غیر ہیں اور وہ اس سے محبت کرتے ہیں لہذا یہ دعوی باطل ہے تو اس حجت کے دونوں مقدمے باطل ہیں لہذا یہ دعوی باطل ہے، تو غیر بھی موجود ہے اور محبت محبّ سے اس کے اپنے نفس کیلئے بھی ہوتی ہے اسی لئے کثیر اتحادیہ اس قول میں اس کے مناقض ہیں اور ابن فارض کا قول اختیار کرتے ہیں اسی طرح اس کا قول کہ توحید نہیں ہوتی مگر عبد سے رب کیلئے اور اگر لوگ انصاف کی بات کہیں تو نہ عابد

دیکھیں اور نہ معبود، تو یہ دونوں مقدمے باطل ہیں تو توحید اللہ کی جانب سے اپنے نفس کیلئے ہے وہ اپنے نفس کو بذاتِ خود واحد قرار دیتا ہے جیسا کہ کہا: (**شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ**)[**آل عمران :١٨**] (اللہ تو اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اُس کے سوا کوئی معبود نہیں) قرآن اللہ کے خود اپنی توحید کے بیان سے بھرا ہوا ہے جیسے یہ آیات :

(**وَ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ**) [**البقرة : ١٦٣**] (اور تمہارا معبود ایک ہی ہے) (**وَقَالَ اللّٰهُ لَا تَتَّخِذُوْۤا اِلٰهَیْنِ اثْنَیْنِ**)[**النحل: ٥١**] (اور اللہ نے فرمایا ہے کہ دو، دو معبود نہ بناؤ)(**فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ**)[**محمد : ١٩**] (پس جان رکھو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں) وغیرہ! جہاں تک دوسرا مقدمہ تو اس کا قول : کہ اگر لوگ انصاف ۔۔۔۔۔ الخ تو یہ غایت درجہ کی کفریہ اورالحادی کلام ہونے کے ساتھ ساتھ باہم متناقض بھی ہے، اگر یہاں نہ کوئی عابد ہے اور نہ معبود بلکہ کل واحد ہے تو یہ کن سے کہہ رہا ہے کہ اگر وہ انصاف سے کام لیں، تو اگر یہ (یعنی جنہیں کہتا ہے : انصاف سے کام لیں) اللہ ہیں تو اس کا مطلب ہے اللہ منصف مزاج نہیں اور اگر یہ غیر اللہ ہیں تو غیر کا اثبات ہوا پھر اگر اپنے کفر پر اس کی تفسیر کریں اور کہیں یہ اللہ ہے جو انصاف سے کام نہیں لے رہا اور وہ کھاتا، پیتا اور کفر کا ارتکاب کرتا ہے جیسا کہ ان کے کثیر لوگ کہتے ہیں جیسے ان کے بعض نے اپنے شیخ سے کہا :(اَلْـفَقِیْرُ اِذَا صَحَّ اَکَـلَ بِاللّٰهِ) (فقیر جب صحیح ہو تو اللہ کی وساطت سے کھاتا ہے) تو اس نے جواباً کہا: (اَلْفَقِیْرُ اِذَا صَـحَّ اَکَـلَ الـلّٰـهُ) (فقیر جب صحیح ہو تو اللہ کھاتا ہے) ان کے شیوخ ابن عربی وغیرہ نے تصریح کی ہے کہ اللہ کو بھوک اور پیاس لگتی ہے اور دیگر سب انسانی عوارض بھی مثلاً نکاح کرنا، بیمار پڑنا اور بول وبراز وغیرہ، اور وہ ہر نقص وعیب کے ساتھ متصف ہے اس لئے کہ ان کی نظر میں یہی کمال ہے جیسے اس نے فصوص میں لکھا: پس بنفسہ علو والا وہ ہے جس کیلئے ایسا کمال ہو جو غایت درجہ میں ہو، تمام وجودی امور اور عدمی نسبتیں چاہے یہ عرفاً، عقلاً اور شرعاً محمود ہوں یا مذموم اور یہ خاص طور پر مسمی اللہ کے لئے ہے اور کہا: کیا تم دیکھتے نہیں حق کو کہ وہ محدثات کی صفات کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے اور اس کی خود اس نے خبر دی ہے اور نقص وذم کی صفات کے ساتھ بھی، کیا مخلوق کو نہیں دیکھتے کہ وہ خالق کی صفات کے ساتھ ظاہر ہوتی ہے تو یہ سب اول تا آخر عبد کی صفات ہیں جیسے عبد کی صفات اول تا آخر اللہ تعالی کی صفات ہیں

اس طرح کی کلام کرنے والا تضاد بیانی کر رہا ہے، اسے کہا جائے تم اپنے آپ میں کامل ہو جو نہ عابد کو دیکھتا ہے اور نہ معبود کو؟ ہم تمہارے ساتھ تمہارے مذہب کے بموجب معاملہ کرتے ہیں تو (ہمیں اجازت دو کہ) تمہاری چھینٹی لگائیں، تمہیں زخمی کریں اور بھوکا پیاسا رکھیں، اگر اس پر یہ چیخ و پکار اور شکوہ وشکایت کرے تو اسے کہا جائے یہاں کوئی غیر (اللہ) تو ہے ہی نہیں اور نہ عابد ومعبود تو تمہارے ساتھ یہ کاروائی تمہارے غیر نے نہیں کی بلکہ ضارب ہی مضروب اور شاتم مشتوم اور عابد معبود ہے، اگر یہ کہے میں تو اپنے آپ سے شکوہ وشکایت کرر ہا ہوں تو اسے کہا جائے پھر کہو تم اپنے آپ کی عبادت کرتے ہو، اگر یہ ظالم ومظلوم کا

اثبات کرے اور دونوں واحد ہیں تو اسے کہا جائے پھر عابد اور معبود کا بھی اثبات کرو، وہ دونوں بھی تو (تمہارے نظریہ کے مطابق) واحد ہیں! پھر اسے کہا جائے یہ جو مار رہا اور ہنس رہا ہے یہ خود ہی مضروب ہے اور خود ہی رو رہا ہے اور یہ جو سیر ہے اور پیٹ بھرا ہے یہی بھوکا اور پیاسا ہے، اگر کہے یہ اس کا غیر ہے تو اس نے مغایرت ثابت کر دی اور اگر اس کے اور اس کے مابین مغایرت ثابت کر دی ہے تو عابد اور معبود کے درمیان اس کا اثبات اولی ہے لیکن اگر کہے دونوں ایک ہیں تو اس کے ساتھ سوفسطائی معاملہ کیا جائے کیونکہ یہ قول قبیح ترین سفسطہ سے ہے تو کہا جائے اگر یہ وہی ہے تو ہم تجھے مارتے اور قتل کرتے ہیں اور (جس کا مطلب ہوگا کہ) شئ نے خود اپنے آپ کو مارا اور قتل کیا ہے

انسان کبھی اپنے آپ پر گناہوں کے ارتکاب ساتھ ظلم کرتا ہے پھر کہتا ہے: (رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا الخ) کیونکہ اس کے نفس نے اسے سوء کا امر دیا اور نفس امارۃ بالسوء بھی ہوتا ہے لیکن اس کے امر کی جہت اس کے فعل کی جہت نہیں بلکہ ایک نوعِ تعدُّ دضروری ہے، یا ذات میں اور یا صفات میں اور ہر ایک کو بالحس و بالاضطرار معلوم ہے کہ یہ جس نے اس پر ظلم کیا ہے وہی (یعنی مظلوم) نہیں اور نہ یہ اس شخص کے بمنزلہ ہے جس نے خود پر ظلم کیا ہے، اگر مخلوقین میں یہ ہے تو خالق کی مخلوق سے مباینت اس کی اس سے مباینت سے اعظم اور نمایاں ہے، اللہ تعالیٰ ان ظالموں کے نظریات و اقوال سے بہت بلند ہے، اگر یہ نظریات والے (ہمارے دور میں) کثیر اور ہر سو موجود نہ ہوتے اور کثیر لوگ انہیں اسلام کے مشائخ اور اہلِ توحید و تحقیق اور صاحبانِ طریقت اور سادات مانتے اور انہیں انبیاء و مرسلین پر بھی فوقیت دیتے ہیں اور دین کا مرجع باور کرتے ہیں، ہمیں ان نظریات کا رد کرنے اور اس سلسلہ میں طول بیانی سے کام لینے کی ضرورت نہ تھی اور نہ اس شد و مد سے ان کی گمراہی کا ایضاح کرتے لیکن معلوم ہے کہ عقول اگر خراب ہو جائیں تو ان کی گمراہی کی کوئی معقول حد نہیں ہوتی تو پاکی اس اللہ کی جس نے بنی نوعِ انسان کے درمیان تفریق کی، ان میں سے ایک ایسا بنایا جو افضل العالمین ہے اور ایک ایسا بھی جو شیاطین سے بھی بدتر ہے لیکن ان لوگوں کی انبیاء اور اولیاء کے ساتھ تشبیہ دینا ایسے ہے جیسے مسیلمہ کذاب کو سید الانام کے ساتھ تشبیہ دی جائے اور ان کے برابر کا گردانا جائے اور یہ حرکت ان کے خلاف جہاد کو واجب کرتی ہے کیونکہ ان کی وجہ سے دین و دنیا کی خرابی اور فساد ہے

یہاں مقصود ان کے اقوال کا رد اور ہدایت کی گمراہی سے تمییز ہے جہاں تک ان نظریات کے قائلین کی توبہ کا معاملہ اور اسلام پر موت واقع ہونا تو یہ معاملہ رب العالمین پر چھوڑا جائے، وہی اپنے بندوں کی توبہ قبول کرنا اور سیآت سے درگزر کرتا ہے اور ممکنات سے ہے کہ ان اقوال و نظریات والوں کی توبہ قبول فرمالے کہ اللہ تعالیٰ غافر الذنب، قابل التوب، شدید العقاب اور ذو الطّول (یعنی دسترس والا) ہے، یہ گناہ اگرچہ عظیم اور یہ کفر بہت غلیظ و جسیم ہے مگر توبہ کرنے سے سب کی تلافی اور ہدم ہو جاتا ہے، اللہ تعالیٰ پر گراں نہیں کہ کسی بھی گناہ سے توبہ کرنے والے کی توبہ قبول کرے بلکہ وہ تو مشرکوں کی توبہ بھی قبول فرماتا ہے جیسے کہا:

﴿قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ﴾[الزمر : ۵۳] (کہہ دو کہ اے میرے بندو! جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہونا اللہ تو سب گناہوں کو بخش دیتا ہے وہ تو بخشنے والا مہربان ہے) یہ آیت عام ومطلق ہے کیونکہ (سب) تائبین کیلئے ہے!

جہاں تک اللہ کا یہ فرمان:

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ﴾[النساء :۴۸] (اللہ تعالیٰ اس گناہ کو نہیں بخشے گا کہ کسی کو اس کا شریک بنایا جائے اور اس کے سوا اور گناہ جس کو چاہے معاف کر دے) تو یہ مقید اور خاص ہے کیونکہ یہ ان کے حق میں ہے جنہیں (موت سے قبل) توبہ نصیب نہ ہوئی تو ان کا شرک معاف نہ کیا جائے گا جبکہ دیگر ذنوب وجرائم کی معافی اس کی مشیت پر معلق ہے جہاں تک اس شخص کا قصہ جس نے کہا: (إِنَّهُ الْتَقَمَ الْعَالَمَ كُلَّهُ) (اس نے کل عالم کو نگل کیا) اس نے یہ کہنے کا ارادہ کیا کہ میں حق ہوں اور اس کی بہن جس کے بارہ میں کہا گیا ہے کہ الوہیت کا دعوی یا تو اللہ کی مخلوق کا اجہل ترین کرے گا یا پھر اعرف ترین، تو یہ بھی اسی باب سے ہے اسی طرح وہ درویش جس نے کہا تھا اللہ نے اس سے کم عقل پیدا ہی نہیں کیا جو دعوی کرے کہ میں الٰہ ہوں مثلا فرعون اور نمرود اور ان جیسے، تو یہ درست اور ناطق بالصواب ہے جبکہ یہ ملحدین فرعون اور اس کے امثال کو قابلِ تعظیم ٹھہراتے ہیں، **مجھے شیخ بہاء الدین عبد السید رحمہ اللہ جو یہودیوں کے قاضی تھے پھر اسلام لائے اور بڑے اچھے مسلمان بنے، نے بیان کیا** کہ ایک دفعہ ان کی ان ملحدوں کے شیوخ میں سے ایک شیرازی سے ملاقات ہوئی، اس نے مجھ سے کہا آپ ہمارا عقیدہ قبول کر لیں (یعنی وحدت الوجود) کہتے ہیں اس کے بارہ میں بہت چکنی چپڑی باتیں کیں جس پر میں نے اس کی کجروی اور گمراہی کا بیان کیا اور کہا آپ لوگوں کے اقوال فرعون کے قول کی جنس سے ہیں، اس پر وہ بولا میرے شیخ حسن شیرازی نے جب مجھے اس عقیدہ کی دعوت دی تھی تو میں نے بھی انہیں یہی کہا تھا جس پر انہوں نے کہا ہاں ہم فرعون کے قول اور نظریہ پر ہیں! یہ تب کا واقعہ ہے جب ابھی عبد السید نے اسلام قبول نہ کیا تھا، کہتے ہیں میں نے کہا میں حضرت موسی کو چھوڑ کر فرعون کی طرف جانے والا نہیں، بولا کیوں؟ کہا کیونکہ موسی نے فرعون کو غرق کیا تھا، اس پر وہ لاجواب ہوا، تو یوں عبد السید نے ان نظریات کے مقابلہ میں اسی الٰہی مدد کے ساتھ حجت پکڑی جو اللہ نے فرعون کے خلاف حضرت موسی کو عطا کی تھی، میں نے عبد السید سے پوچھا کیا آپ کے سامنے بھی شیرازی نے اقرار کیا کہ وہ فرعون کے قول پر ہے؟ کہا ہاں، میں نے کہا جب فریقِ مخالف نے اقرار ہی کر لیا ہے تو اب اس پر دلائل دینے کی کیا ضرورت ہے؟

میں یہی تو واضح کرنا چاہتا تھا کہ ان حضرات کے وہی عقائد ونظریات ہیں جو فرعون کے تھے مگر اس اقرار سے مقصود حاصل ہوا تو یہ اور ان جیسے اقوال عظیم ترین باطل اور ضلال ہیں لہذا ان کا انکار واجب ہے تو اس منکر کا رد وانکار جس نے کثیر مسلمانوں کو گمراہ اور متاثر کیا ہے، یہود ونصاری کے عقائد کے رد سے اولی ہے کیونکہ ان کے عقائد سے مسلمان گمراہ تو نہیں ہوتے

بالخصوص ان کے اقوال یہود ونصاریٰ اورفرعون کے اقوال سے بدتر ہیں جوان اقوال وعبادات کامعنی جان کر یہی اعتقاد رکھے وہ منافقین میں سے ہوگا جن سے اللہ نے اپنے اس فرمان میں جہاد کاحکم دیا:

(يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ)[التوبة : ۷۳] (اے نبی کافروں اورمنافقوں سےلڑواور ان پرسختی کرو) نفاق اگر بڑاہوتو منافق اہلِ کتاب کے کفار سےبھی بدتر ہوگا اوراس کا ٹھکانہ جہنم کا درکِ اسفل ہے، ان اقوال کیلئے کوئی وجہِ جوازنہیں، اگر بالفرض ان میں سے بعض لغوی لحاظ سےصحیح معنی کےمحتمل ہیں توان پراسی صورت محمول کیا جائے گا اگران کے قائل کامقصود غیرمعروف ہوجبکہ ان حضرات کامقصود ومنشا تو معروف ہے جیسے یہود ونصاری اور رافضیوں کے عقائدمعروف ہیں، ان نظریات میں ان کی کتب اورنظمیں ہیں اورکلام کا بعض بعض کا مفسر ہوتاہے، ان کامقصود بالضرورت معلوم ہے لہذا اس بابت جاہل ہی بحث کرے گا اوراس کی بات پرتوجہ دینے کی ضرورت نہیں، ان کی نسبت حسنِ ظن رکھنے والوں کیلئے ان کے اقوال و عبارات کے معانی ومفاہیم اچھی طرح بیان کر دینے چاہئیں تا کہ ان کی گمراہی کا خدشہ نہ رہے کیونکہ ان کا ضرر ان زہروں کے ضررسےبھی شدیدتر ہےجنہیں بغیر ان کی حقیقت جانے کھایا جائے، یہ ان غداروں اور چوروں سےبھی بدتر ہیں جنہوں نے نیکی اور پارسائی کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے، اُن کےضرر کی غایت انسان کی موت یا اس کے مال کا ضیاع ہے دنیا میں آنے والی یہ مصیبت کبھی آخرت میں مصاب پر رحمت کا سبب بن سکتی ہے جبکہ یہ حضرات لوگوں کواللہ کے انبیاء اوراولیاء کے برتنوں میں کفر والحاد کی شراب پلاتے ہیں، بظاہر اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والوں کا لباس پہناتے ہیں مگر فی الباطن وہ اللہ اوراس کے رسول سے جنگ کرنے والے ہیں، یہ اللہ کےمحقق اولیاء کے الفاظ کےقوالب میں کفار اورمنافقین کی کلام پیش کرتے ہیں لوگ ان کے پاس یہ مقصد لےکر جاتے ہیں کہ ایمان ویقین کی دولت پا کراللہ کے ولی بن سکیں مگر وہ منافق اوراللہ کے دشمن بن کرلوٹتے ہیں، میں نے ایک دفعہ ان کی مثال ان حضرات سے دی تھی جو کچھ لوگوں کو حج کرانے کا دکھاوا دےکرقبرص لے گئے تھے کہ تا کہ ان کی وہاں مدد کریں، ایک صاحب نے جوان کے حلقہ میں شامل تھے پھراس پران کی گمراہی منکشف ہوئی، مجھ سے کہا تھا اگر یہ ہمیں قبرص لے جانے میں کامیاب ہوجاتے توہمیں عیسائی بنادیتے مگر یہاں رہ کرتو یہ ہمیں عیسائیوں سےبھی بدتر بنادیتے ہیں، واقعی بات یہی ہے! میں نےکئی ایسے حضرات کودیکھا اورسنا ہے جوانہیں اللہ کے اولیاء خیال کرتے تھےاوران کی باتوں کومحققین عارفانِ حقیقت کی باتیں باورکرتے تھے، بعض انہی جیسے بن گئے اوراسی راہِ الحاد وکفراور گمراہی کےطریق کواختیار کرلیا اوربعض نادانستگی میں بغیر سمجھے ان کےہمنوا بنے اوران کی باتوں کی سمجھے بغیر تصدیق کی اورسچا مانا، یہ ان میں سےنسبۃً اچھے ہیں کیونکہ ان کے بمنزلہ ہیں جواللہ ورسول کے اعداء کی تعظیم کرتے ہیں یہ جانے بغیر کہ یہ اللہ ورسول کے اعداء ہیں، یہ اہلِ کتاب اورمشرکین کی دوستی کا دم بھرتے ہیں یہ خیال کرتے ہوئے کہ وہ اہلِ ایمان اوراولوالالباب ہیں، ان جہال کےسبب ڈھیروں شرمسلمانوں پر داخل ہوا اورایسی آفت مچی ہےجس کے نقصانات

سے رب العالمین ہی آگاہ ہے! آپ کے استفتاء کے جواب میں اس بیان کو کافی سمجھتا ہوں، واللہ اعلم بالصواب۔

استفتاء

کیا فرماتے ہیں حضرات علمائے کرام اور ائمہ دین اور مفتیانِ شرعِ متین اس کلام بارے جس پر (ابن عربی کی) کتاب فصوص الحکم اور اس جیسی کتب مشتمل ہیں مثلا یہ اعتقاد کہ رب اور عبد ایک ہی شیٔ ہے، دونوں میں سرِ موفرق نہیں اور کائنات کوئی غیر اللہ نہیں جیسے بعض کا یہ شعر: (اَنَا وَهُوَ وَاحِدٌ مَا مَعَنَا شَيْءٌ) (میں اور وہ واحد ہیں ہمارے ساتھ کوئی اور شیٔ نہیں) اور جیسے بعض کا قول: (اَنَا مَنْ اَهْوىٰ وَمَنْ اَهْوىٰ اَنَا) (یعنی: من تو شدم تو من شدی) اور: (إذا كُنْتُ لَيْلىٰ وَلَيْلىٰ اَنَا) (یعنی: رانجھا رانجھا کردی میں آپے رانجھا ہوئی) اور یہ قول: اگر لوگ حق کی معرفت کرلیں تو نہ عابد کو دیکھیں اور نہ معبود کو، ان اقوال کی حقیقت نہ اللہ کی کتاب میں ہے اور نہ سنتِ رسول میں اور نہ خلفائے راشدین اور سلف صالحین کی کلام میں، ان کے قائل کا دعوی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا محبّ ہے جبکہ اللہ کا فرمان ہے:

﴿قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ﴾[آل عمران :۳۱] (کہہ دو کہ اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو اللہ بھی تمہیں دوست رکھے گا) اللہ تعالیٰ نے متعدد مقامات میں خیر الخلق (یعنی حضرت محمدؐ) کا ذکر عبودیت کے ساتھ کیا ہے چنانچہ ایک جگہ کہا:

﴿فَأَوْحَىٰ إِلَىٰ عَبْدِهِ مَا أَوْحَىٰ﴾[النجم : **۱۰**] (تو اللہ نے اپنے بندے کی طرف وحی کی جو کی) اسی طرح حضرت عیسیٰ کے بارہ میں کہا: **﴿إِنْ هُوَ إِلَّا عَبْدٌ أَنْعَمْنَا عَلَيْهِ﴾**[الزخرف : **۵۹**] (وہ تو ہمارے ایسے بندے تھے جن پر ہم نے فضل کیا) اور فرمایا:

﴿لَنْ يَسْتَنْكِفَ الْمَسِيحُ أَنْ يَكُونَ عَبْدًا لِلَّهِ وَلَا الْمَلَائِكَةُ الْمُقَرَّبُونَ﴾[النساء :۱۷۲] (مسیح اس بات سے عار نہیں رکھتے کہ اللہ کے بندے ہوں اور نہ مقرب فرشتے) ہم نصاریٰ کو اس وجہ سے کافر قرار دیتے ہیں کہ انہوں نے حضرت عیسیٰ کی بابت انہوں نے ان جیسا قول کہا تو ان حضرات بارے کیا کہیں جو یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ (اللہ) کبھی فی نفسہ اور کبھی حسین صورتوں میں اور کبھی عورتوں اور مُردان (یعنی بے ریش نوجوان لڑکوں) میں ظاہر ہوتا ہے اور کہتے ہیں کہ اس اعتقاد کیلئے ایک سرِ خفی اور باطن حق ہے اور یہ ان حقائق میں سے ہے جن پر صرف خلق کے خواص ہی مطلع ہوتے ہیں، آیا واقعی ان اقوال کیلئے کوئی سرِ خفی ہے کہ اللہ، یومِ آخرت اور اس کی کتب اور رسل پر ایمان رکھنے والے شخص کیلئے واجب ہے کہ ان کے ساتھ تمسک کرے اور ان کے حقائق تک پہنچنے کی کوشش کرے جیسا کہ ان حضرات کا زعم ہے؟ یا ان کا باطن ان کے ظاہر کی طرح ہے؟ اور یہ اعتقادِ مذکور ہی اللہ اور اس کے رسول اور ان کی لائی ہوئی شریعت پر ایمان کی حقیقت ہے؟ یا یہ عینِ کفر ہے؟ اور کیا مسلمان پر واجب ہے کہ وہ اس ضمن میں علمائے اسلام کے قول کی اتباع کرے جو انبیاء و مرسلین کے وارث ہیں یا ان بے راہ رووں اور گمراہوں کے قول کے ساتھ کھڑا ہو؟ اگر کوئی اس کا ترک کرے جس پر ائمہِ اسلام کا اجماع ہے اور ان

مذکورین کی موافقت کرے تو روزِ جزا اس کی نسبت اللہ کا حکم کیا ہوگا؟ ہمیں اس بارے فتوی دیں اور عنداللہ ماجور ہوں۔

شیخ الاسلام کا جواب

بسم اللہ، الحمدللہ رب العالمین! کتاب فصوص الحکم کے مندرجات باطناً اور ظاہراً کفریہ ہیں، اس کا باطن اس کے ظاہر سے بھی اقبح ہے، ان نظریات کو اہلِ وحدت، اہلِ حلول اور اہلِ اتحاد کا مذہب کہا جاتا ہے جبکہ یہ خود اپنے آپ کو محققین کہتے ہیں، ان کی دو انواع ہیں: ایک جو مطلقاً اس کے قائل ہیں اور یہ ابن عربی مصنفِ فصوص الحکم اور اس کے امثال ابن سبعین، ابن فارض، قونوی، ششتری اور تلمسانی وغیرہم کا مذہب ہے، یہ قائل ہیں کہ وجود واحد ہے اور یہ کہ وجودِ مخلوق وجودِ خالق ہے، یہ دو موجودَین کا اثبات نہیں کرتے کہ ان میں سے ایک خالق اور دوسرا مخلوق ہو بلکہ قائل ہیں کہ خالق ہی مخلوق اور مخلوق ہی خالق ہے اور کہتے ہیں اصنام کا وجود اللہ کا وجود ہے اور اصنام پرست اللہ کی ہی پوجا کر رہے ہیں اور کہتے ہیں حق ان تمام اوصافِ نقص وذم کے ساتھ متصف ہے جن کے ساتھ مخلوقات متصف ہیں، ان کے نزدیک بچھڑے کی پوجا کرنے والوں نے اللہ کی پوجا کی تھی اور حضرت موسیٰؑ نے ہارونؑ پر اس لئے ناراضی کا اظہار کیا تھا کہ انہوں نے بچھڑے کی پوجا کی وجہ سے ان پر تنقید کی تھی (آگے وہی باتیں کیں جو سابقہ صفحات میں گزری ہیں)

دوسری نوع وہ جو کسی معین میں حلول واتحاد کے قائل ہیں جیسے نصاری جنہوں نے یہ بات حضرت مسیحؑ بارے کہی اور غالی شیعہ جو یہی بات حضرت علی بن ابو طالب اور کئی دیگر اہلِ بیت بارے کہتے ہیں اور حاکمیہ جو حاکم اور حلاجیہ جو حلاج اور یونسیہ جو یونس بارے یہی کہتے ہیں اور ان جیسے لوگ جو بعض بشر کی الوہیت کا اعتقاد رکھتے ہیں، اسی طرح حلول اور اتحادِ ذات کا، یہ حضرات اسے ہر شئ میں مطلق نہیں کرتے جبکہ نوعِ اول والے اطلاق کے قائل ہیں، وہ کہتے ہیں نصاری اس وجہ سے کافر ہوئے کہ انہوں نے حضرت مسیح کے ساتھ اس (یعنی حلول اور اتحاد) کی تخصیص کر دی، ان حضرات کے اقوال نصاری کے اقوال سے بھی بدتر ہیں پھر یہ باہم متناقض ہیں اسی جنس سے جو نصاری کے اقوال میں ہے اسی لئے کبھی یہ حلول، کبھی اتحاد اور کبھی وحدتِ وجود کی بات کرتے ہیں، یہ فی نفسہٖ متناقض مذہب ہے اور یہ کم فہم لوگوں پر التباس کا موجب بنتے ہیں، ہر مسلمان کا ظاہراً اور باطناً اس مذہب کے کفریہ ہونے پر اجماع ہے، جو ان کی حقیقت سے آگاہ ہونے اور دینِ اسلام کی معرفت کے بعد ان کے کافر ہونے میں شک کرے وہ بھی کافر ہے عین اس شخص کی طرح جو یہودیوں، عیسائیوں اور بت پرستوں کے کفر میں شک کرے لیکن یہ ایک اور شئ کے ساتھ بھی تشبیہہ دیتے ہیں اور یہ جو بعض عارفین کیلئے مقامِ فنا وجمع واصطلام اور حالتِ سکر (یعنی جب شدتِ وجد سے ہوش وحواس ساتھ نہیں ہوتے) میں عارض ہوتا ہے! کبھی ان میں سے کسی پر غلبہِ وجد وذکر کی قوت کے باعث ایسا حال طاری ہوتا ہے جس میں وہ اپنے آپ اور گرد وپیش سے بے خبر ہو جاتا ہے تب وہ اپنے معبود کے ساتھ اپنی عبادت، اپنے معروف کے ساتھ اپنی معرفت، اپنے مذکور کے ساتھ اپنے ذکر اور اپنے موجود کے ساتھ اپنے وجود سے غائب (اور غافل) ہو جاتا ہے، کبھی یہ حالت کسی

مخلوق کے عاشق کی بھی ہو جاتی ہے جیسا کہ ذکر کیا جاتا ہے کہ ایک شخص کسی کا عاشق تھا، اس کے معشوق نے دریا میں چھلانگ لگائی تو یہ بھی اس کے پیچھے کود گیا، وہ بولا میں تو اتفاقاً گر گیا تمہیں کس نے گرایا؟ اس نے کہا: (غِبْتُ بِكَ عَنِّي فَظَنَنْتُ اَنَّكَ اِنِّيْ) (یہ عبارت بھی گزری، آگے شراب کی صراحی بارے دو شعر نقل کئے جو پہلے بھی گزرے ہیں) یہ حالت کثیر سالکین کی پر طاری ہوتی ہے، لازم نہیں کہ ہر سالک پر طاری ہو اور نہ یہ محمود غایت ہے بلکہ ظاہراً اور باطناً توحید کے ساتھ عقل وفہم اور علم کا ثابت رہنا جیسے ہمارے نبی پاک اور صحابہ کرام کا حال تھا جو اس سے اکمل اور اتم ہے (یعنی ان میں سے کبھی کسی کو حال نہیں پڑا) وہ حالت جسے یہ لوگ مقامِ فنا کا نام دیتے ہیں تین اقسام میں منقسم ہے:

اول: کہ اللہ کی عبادت کے ساتھ اس کے ماسوا کی عبادت سے فنا ہو جائے اور اس کے خوف، اس سے امید، اس پر توکل اور اس کی محبت کے ساتھ ہر ماسوا سے امید باندھنے، خوف کھانے، توکل اور محبت کرنے سے، یہی توحید واخلاص کی حقیقت ہے جس کے ساتھ اللہ نے رسل مبعوث کئے اور کتب نازل کیں اور یہی کلمہِ لا الہ الا اللہ کی تحقیق ہے کہ یہ اس کے دل سے غیر اللہ کیلئے ہر طرح کا تألّہ ختم اور فنا کر ڈالتا ہے اور مطلقاً اس کا کوئی اثر باقی نہیں رہتا اور جو جتنا اس توحید میں اکمل ہوگا اسی حساب سے اللہ کے ہاں افضل ہوگا

دوم: کہ ماسوا اللہ کے شہود سے فنا ہو جائے، اسے کثیر صوفیہ حالتِ اصطلام، فنا اور جمع کا نام دیتے ہیں اس میں دل کے اللہ پر متوجہ ہونے کی جہت سے فضیلت ہے اسی طرح اس کے امر کیلئیا س پر جو کہ وہ ہے عدم شہود کی جہت سے نقص بھی ہے تو اس نے جب گواہی دی کہ اللہ ہر شئ کا رب، ملیک اور خالق ہے اور وہی معبود ہے، اس کے سوا کوئی الہ نہیں جس نے رسل بھیجے اور کتب نازل کی ہوں اور اپنی اور اپنے رسل کی طاعت کا حکم دیا ہو اور اپنی اور اپنے رسل کی معصیت سے منع کیا ہو تو یہ اس کے اسماء، صفات اور خلقی و امری احکام کا شاہد بنا تو معرفت وشہود اور ایمان وتحقیق میں یہ اتم ہوگا اس امر سے کہ ایک معنی کے شہود کے ساتھ دوسرے معنی کے شہود سے فنا ہو اور تفرّق فی الجمع اور کثرت فی الوحدت کا شہود اور یہی صحیح اور مطابق شہود ہے لیکن کبھی انسان پر یہ حالت وارد ہوتی ہے کہ وہ اس سے اور اس کے شہود سے عاجز رہ جاتا ہے تو ایسا شخص بوجہ اپنے عجز کے معذور ہے نہ کہ نقص وجہل پر محمود

سوم: وجودِ سویٰ سے فنا، اور یہ اہلِ وحدت کے ملاحدہ کا قول ہے ان میں مصنفِ فصوص اور اس کے اتباع ہیں جو قائل ہیں کہ وجودِ خالق ہی وجودِ مخلوق ہے اور کائنات میں غیر کا کوئی وجود نہیں اور نہ فی نفس الامر سویٰ ہے، یہ قول یہود ونصاریٰ کے اقوال سے اعظم کفر والا ہے نیز اللہ کی ولایت یہ ہے کہ جو اسے پسند ہے اسے پسند اور جو ناپسند ہے اسے ناپسند کیا جائے اسی کی رضا میں بندے کی رضا ہو اور جن باتوں سے وہ ناراض ہوتا ہے ان کی وجہ سے یہ بھی ہو، وہی حکم دے جو وہ دیتا اور جن سے وہ منع کرتا ہے یہ بھی کرے اور اس کے اولیاء سے موالات کرے اور دشمنوں سے معادات جیسا کہ بخاری میں حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جس نے میرے کسی ولی سے بغض کیا اس نے مجھے دعوتِ جنگ دی (آگے تقرّب کی سعی کرنے کی بات

کی جو پہلے اسی حدیث کے حوالے سے گزری ہے) پھر فرمایا ایک وقت آتا ہے کہ میں اس کے کان، آنکھ وغیرہ بن جاتا ہوں اس کے بعد جب مجھ سے مانگے تو عطا کروں گا، پناہ کا طالب بنے تو وہ دوں گا اور مجھے کسی شیٔ بارے ایسا تردد نہیں ہوتا جو اپنے مومن بندے کی روح قبض کرتے ہوئے ہوتا ہے، وہ مرنا ناگوار سمجھتا ہے اور مجھے اس کی یہ ناگواری بری لگتی ہے اور اس کے بغیر چارا نہیں، تو یہ اصح حدیث ہے جو اولیاء اللہ بارے مروی ہے، ملحد اتحادیہ اس کے ساتھ بالخصوص اس کی عبارت :(کُنْتُ سَمْعَهٗ وَ بَصَرَهٗ وَ يَدَهٗ وَ رِجْلَهٗ الخ) کے ساتھ اپنے نظریہ وحدت الوجود پر حجت پکڑتے ہیں حالانکہ یہ کئی وجوہ سے ان کے خلاف حجت ہے (ان وجوہ کا ذکر گزرا) تو اللہ تعالیٰ نے بندے کو یہ مقام مذکورہ اقدامات اٹھانے کے بعد دیا لیکن ان کے نزدیک ان امور سے قبل اور بعد معاملہ یکساں ہے اور ان کے نزدیک اللہ حقیقۃً یہ اعضاء اور دیگر بن گیا، عالمِ وجود میں کوئی تعدد نہیں اور نہ کثرت ہے پھر اس کے ساتھ ساتھ وہ مراتب، مَجالی اور مَظاہر کا اثبات کرتے ہیں تو اگر ان کا وجود مانیں تو یہ ان کے نظریہ (وحدت الوجود) سے متصادم ہے اور اگر انہیں عدم میں ثابت تسلیم کریں جیسے ابن عربی نے لکھا، یا انہیں معینات باور کریں اور مطلق کو حق تو اپنے اس نظریہ کی بناء ان حضرات کے قول پر رکھیں گے جو کہتے ہیں معدوم بھی شیٔ ہے اور جو قائل ہیں کہ کلیات خارج میں زائد از معینات ثابت ہیں، اول معتزلہ کے ایک گروہ کا قول ہے، ابن عربی نے بھی یہی کہا اور ثانی فلاسفہ کی ایک جماعت کا قول ہے، ابن عربی کے تلمیذ قونوی بھی اسی کا قائل ہے، عقلاء کے نزدیک دونوں قول باطل ہیں، تلمسانی جو ان دونوں سے زیادہ حاذق تھا، نے ماوراء الوجود کسی شیٔ کا اثبات نہیں کیا جیسا کہ کہا گیا:

وَ مَا الْبَحْرُ إِلَّا الْمَوْجُ لَا شَیْءَ غَيْرُهٗ وَ اِنْ فَرَّقَتْهُ كَثْرَةُ الْمُتَعَدِّدِ

(گزرا) لیکن معتزلہ اور فلاسفہ کے یہ گمراہ یہ نہیں کہتے کہ مخلوق کا وجود ہی وجودِ خالق ہے جیسے ان ملحدوں نے کہا، اسی لئے یہ ایک جہت سے حلول کی بات کرتے ہیں تمام ذوات میں وجود کے ہونے کی وجہ سے یا بالعکس اور دوسری جہت سے اتحاد کی، ان کے قول کی حقیقت نظریہِ وحدت الوجود ہے! حدیثِ ہذا حق ہے جیسا کہ نبی اکرم نے بیان کیا تو اللہ کا ولی اللہ کیلئے اپنی کمالِ محبت و طاعت کی وجہ سے اپنی تمام حسیات اور تمام قوائے ادراک کو اللہ کے لئے اور اللہ کے ساتھ کر دیتا ہے اور اس کا سارا عمل اللہ کیلئے اور اس کے ساتھ ہو جاتا ہے، وہی بات اپنی ساعتوں میں ڈالتا ہے جو اللہ کو پسند ہو، وہی بات نوکِ زبان پر لاتا ہے جو حق کے مطابق ہو، وہی دیکھتا اور کرتا ہے جو اللہ کی مرضی کے مطابق ہو اور اس کی سمع و بصر میں ایسا نور پیدا ہو جاتا ہے جس کے ساتھ وہ حق اور باطل کے مابین پرکھ کرتا ہے، اس کا کوئی کام منشائے ربانی کے بغیر نہیں ہوتا جیسے متفق علیہ حدیث کی ایک دعائے نبوی میں یہ الفاظ مذکور ہیں:(اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ فِیْ قَلْبِیْ نُوْراً وَفِیْ بَصَرِیْ نُوْراً وَفِیْ سَمْعِیْ نُوْراً وَ عَنْ يَّمِيْنِیْ نُوْراً وَعَنْ يَّسَارِیْ نُوْراً وَ فَوْقِیْ نُوْراً وَ تَحْتِیْ نُوْراً وَاَمَامِیْ نُوْراً وَخَلْفِیْ نُوْراً وَاجْعَلْ لِیْ نُوْراً) تو ولی اللہ میں اللہ کیلئے اتم درجہ کی

موافقت ہوتی ہے جس کے ساتھ محبوب ومکروہ اور مامور ومنہی ونحوہ متحد ہو جاتے ہیں (یعنی یہ اتحادِ ذات نہیں بلکہ اتحادِ میلان ہے) تو جو حق کا محبوب ہے وہ اس کا بھی ہے اور جو حق کا عدو ہے وہ اس کا بھی ہے بلکہ یہ صفت وحالت کسی دومخلوق کے مابین کامل باہمی محبت کے نتیجہ میں بھی ہو جاتی ہے حتی کہ ایک کو تکلیف ہو تو دوسرا بھی اسے محسوس کرتا ہے اور ایک ملتذ ہو تو دوسرا بھی ہوتا ہے اسی لئے ایک حدیث میں ہے نبی اکرم نے فرمایا اہلِ ایمان کی باہمی مودت اور یگانگت کی مثال جسدِ واحد کی سی ہے کہ اگر اس کے کسی ایک عضو کو کوئی تکلیف پہنچے تو پورا جسم بخار اور بیداری کے ساتھ اسے محسوس کرتا ہے اسی لئے فردِ مومن کو خوشی ہوتی ہے جب کسی اور مومن کو خوشی ملے اسی طرح اس کا عکس اور جس کی کیفیت یہ نہ ہو وہ مومن نہیں تو اہلِ ایمان کے درمیان اتحاد ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ ایک کی ذات بعینہ دوسرے کی ذات بن گئی یا حلول ہو گیا بلکہ یہ ان کی باہمی یگانگت اور توافق ہے اللہ اور اس کے رسول پر ایمان والا ہونے کی شکل میں اور جو ایمان کی شاخیں ہیں مثلاً اللہ ورسول سے محبت اور ان امور سے جو اللہ ورسول کو محبوب ہیں

اگر یہ مومنین کے درمیان معقول ہے تو عبد اگر اپنے رب کے موافق ہو جائے اور اس کی منشاء کے خلاف کوئی کام نہ کرے اور اس کا امر ونہی اس کا بھی امر ونہی ہو تو ان کے مابین اتحادِ ذات یا حلول کی بات کیوں کریں؟ حدیث کا یہ صحیح مفہوم سمجھ لینے کے بعد ان کے باطل نظریات کی فہم تم پر آسان ہو گی اور ان سوالوں کا جواب بھی قابلِ فہم ہو گا، ان حضرات کی ایک عادت یہ بھی ہے کہ بعض مشائخ کی کلام سے کچھ مجمل اور مشتبہ جملے لے کر انہیں اپنے حسبِ منشا فاسد معانی پر محمول کرتے ہیں، یہی کام نصاریٰ نے اپنے انبیاء سے منقولات میں کیا کہ محکم کو چھوڑ کر متشابہات کی پیروی کی تو قائل کا قول کہ رب اور عبد ایک شئ ہے، دونوں کے درمیان فرق نہیں صریح کفر ہے بالخصوص اگر اس میں ہر مخلوق عبد شامل ہو لیکن اگر اس کی مراد صرف اللہ کے مومن بندے اور اس کے متقی اولیاء ہیں جو اس سے اور وہ ان سے محبت کرتا ہے اور یہ اس کی اپنے افعال واعمال میں کامل موافقت کرتے اور اس کی مرضی کے بغیر کچھ بھی نہیں کرتے جس کے سبب اللہ ان سے اور یہ اللہ سے راضی ہو گئے! جب یہ کیفیت اور معاملہ ہوا تو حق تعالیٰ ان کی رضا پر راضی ہوا اور ان کے غضب پر ناراض کہ یہ طرفین سے متلازم ہے تو ان میں سے افضل ترین فرد کی بابت بھی یہ نہ کہا جائے گا کہ اللہ نے اس میں حلول کیا یا ان کی ذوات باہم متحد ہوئیں اور اب دونوں میں دوئی نہیں، صرف افضل الخلق (یعنی حضرت محمدؐ) کے بارہ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ

﴿ إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللَّهَ يَدُ اللَّهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ﴾[الفتح: ١٠] (جو لوگ تم سے بیعت کرتے ہیں وہ اللہ سے بیعت کرتے ہیں اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے) اور:

﴿مَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ﴾[النساء:٨٠] (جو شخص رسول کی فرمانبرداری کرے گا تو بے شک اُس نے اللہ کی فرمانبرداری کی) اور:

﴿وَاللَّهُ وَرَسُولُهُ أَحَقُّ أَنْ يُرْضُوهُ﴾[التوبہ:٦٢] (اللہ اور اس کے پیغمبر زیادہ مستحق ہیں کہ یہ انہیں خوش کریں) اور:

﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ لَعَنَہُمُ اللّٰہُ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ﴾[الأحزاب : ۵۷] (جولوگ اللہ اوراس کے پیغمبر کو رنج پہنچاتے ہیں ان پر اللہ دنیا اور آخرت میں لعنت کرتا ہے) اوراس جیسی آیات (اور یہ اسی معنی میں جو پہلے بیان ہوا) جہاں تک دیگر بندے تو اللہ ان کا خالق، مالک اور رب ہے اسی طرح وہ ان کی قدرت اورافعال کا بھی خالق ہے پھر ان کے جو افعال اس کی محبت اور رضا کے موافق ہوں تو وہ ان کے فاعلین کا محبّ اوران کی تکریم کرنے والا ہو جاتا ہے اور جو اس کی ناراضی کا سبب بننے والے ہوں ان کے فاعلین کا وہ مبغض اوران کے لئے مہین بنتا ہے

بندوں کے افعال اللہ کے لئے مفعول ومخلوق ہیں، یہ اس کے لئے صفت نہیں اور نہ اس کی ذات کے ساتھ قائم فعل اور قولہ تعالیٰ: ﴿وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی﴾ [الأنفال : ۱۷] (اورجس وقت تم نے کنکریاں پھینکی تھیں تو وہ تم نے نہیں پھینکی تھیں بلکہ اللہ نے پھینکی تھیں) کا معنی یہ ہے: کہ مٹھی بھران کنکریوں کو جسے آپ نے چھوڑا ہدف تک آپ نے نہیں بلکہ اللہ نے پہنچایا، دراصل نبی اکرم نے مشرکین کی طرف مٹھی بھرکنکریاں اٹھا کر پھینکیں اور کہا تھا: (شَاهَتِ الْوُجُوْهُ) تو اللہ نے تمام مشرکین کے چہروں اورآنکھوں تک انہیں پہنچا دیا، نبی اکرم میں یہ قدرت نہ تھی کہ ان سب کی آنکھوں اور چہروں تک اسے پہنچاتے بلکہ آپ کا کام انہیں ان کی طرف پھینک دینا تھا اگلا کام یعنی ان تک پہنچانا اللہ کا تھا تو اللہ نے اپنے نبی کیلئے مبدا یعنی پھینکنے کا اثبات کیا:(﴿اِذْ رَمَیْتَ﴾) اوراس منتہا کی آپ سے نفی کی جب کہا:(﴿وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی﴾ تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ مثبت عینِ منفی ہوا کہ یہ تناقض ہے اوراللہ تعالیٰ ۔حالانکہ وہ بندوں کے افعال کا خالق ہے۔خود کا اس شخص کا سا وصف نہیں کرتا جس کے ساتھ یہ افعال قائم ہوں تو وہ اپنے آپ کو غازی، روزہ دار، آکل اور شارب نہیں کہتا، قائل کا کہنا کہ کائنات میں کوئی غیر نہیں ! تو اگر اس کی وہی مراد ہے جو اہلِ وحدت یہ جملہ بول کر مراد لیتے ہیں یعنی کائنات میں سوائے اللہ کے (وجود کے) کوئی غیر موجود نہیں تو یہ کفرِ صریح ہے کیونکہ اگر غیر کا وجود نہیں تو قرآن میں اس کا ذکر نہ کرتا (آگے وہی آیات نقل کیں جن کا ذکر گزرا جن میں غیر کا لفظ مستعمل ہے) پھر حضرت ابراہیم نے اس آیت میں کن سے براءت کا اعلان کیا:

﴿اِنَّنِیْ بَرَآءٌ مِّمَّا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا الَّذِیْ فَطَرَنِیْ فَاِنَّہٗ سَیَہْدِیْنِ﴾ [الزخرف: ۲۶-۲۷](جن چیزوں کو تم پوجتے ہو میں ان سے بیزار ہوں۔ہاں جس نے مجھ کو پیدا کیا وہی مجھے سیدھا راستہ دکھائے گا) یہ ملحد لوگ شروع شروع میں صفات کی نفی کرتے اور پوچھتے تھے: قرآن اللہ ہے یا اس کا غیر؟ اگر کہا جاتا اللہ کا غیر ہے تو کہتے پھر غیر اللہ مخلوق ہوتا ہے(اسی سے فتنہ خلقِ قرآن ظاہر ہوا اورعباسی بادشاہ مامون بھی اس کا قائل ہوا اوراس نے علماء کواس آزمائش میں ڈالا اورقرآن کو غیر مخلوق کہنے پر اکابر امت پر سختی کی جس کی لپیٹ میں امام احمد بن حنبل بھی آئے) پھر آخر الامر میں کہنے لگے غیر اللہ کا کائنات میں کوئی وجود نہیں یا یہ کہا: (اَلْعَالَمُ لَا هُوَ اللّٰهُ وَلَا هُوَ غَیْرُهُ) (یعنی کائنات نہ اللہ ہے اور نہ اس کا غیر) اور کہنے لگے:

وَكُلُّ كَلاَمٍ فِي الْوُجُوْدِ كَلاَمُهٗ سَوَاءٌ عَلَيْنَا نَثْرُهٗ وَ نِظَامُهٗ

(گزرا) اہلِ سنت نے صفات کا اثبات کیا اوران پر لفظِ غیر کے عدم اطلاق کا انکار کیا، وہ مخلوقات پر لفظِ غیر کا اطلاق نہیں کرتے، میں نے ان کے مشائخ سے اس تناقض کا ذاتی مشاہدہ کیا ہے، وہ صریح گمراہی میں ہیں، جہاں تک شاعر کا یہ کہنا: (اَنَا مَنْ اَهْوىٰ وَ مَنْ اَهْوىٰ اَنَا) اور: (اِذَا كُنْتُ لَيْلىٰ وَلَيْلىٰ اَنَا) تو اس سے شاعر کی مراد وصفی اتحاد ہے جو دو محبت کرنے والوں کا ایک دوسرے کے ساتھ ہوتا ہے کہ اسے بھی وہی کچھ عزیز ہوتا ہے جو دوسرے کو ہے اور وہ کچھ ناپسند جو اسے ہے اور ایک اسی طرح کی باتیں کرتا ہے جو دوسرا کرتا ہے اور وہی کچھ کرتا ہے جو وہ کرتا ہے اور یہ تشابُہ اور تماثُل ہے نہ کہ عین کا عین کے ساتھ اتحاد، یعنی وہ اپنے محبوب میں اس قدر مستغرق ہو چکا ہوتا ہے حتی کہ اس کے ساتھ اپنی ذات کی رؤیت سے فنا میں ہوا، جیسے کسی نے کہا: (غِبْتُ بِكَ عَنِّيْ فَظَنَنْتُ اَنَّكَ اِنِّيْ) تو یا غلط اور حالتِ فنا میں مستغرق ہے یا تماثل وتشابہ اور مطلوب مرہوب کا اتحاد مراد لیا ہے نہ کہ اتحادِ ذات کہ اگر یہ مراد لیتا جو کہہ رہا ہے اس کا شعور رکھتے ہوئے تو وہ کاذب اور مفتری ہے لہذا افتراء کی شرعی سزا کا حقدار ہے

جہاں تک قائل کا یہ کہنا کہ اگر لوگ حق کی بات کہیں تو یہاں نہ کسی کو عابد دیکھیں اور نہ کوئی معبود تو یہ اتحادی ملحدوں کے اقوال کی جنس سے ہے جو رب اور عبد کے مابین تفرقہ نہیں کرتے، ان کے نظریات کا بیان ہو چکا، یہ ضلال اور غی کا شکار ہیں، اپنے بطون وفروج میں شہواتِ غی جمع کر رکھی ہیں اور فتنوں کی گھمن گھیریوں میں پھنسے پڑے ہیں، ایک حدیث میں ہے آنجناب نے فرمایا مجھے سب سے زیادہ ڈر ان شہواتِ غی سے ہے جو تمہارے بطون اور فروج میں ہوں گی حتی کہ معاملہ یہاں تک پہنچ جائے گا کہ امرد (یعنی بے ریش نوجوان) لڑکوں سے عشق ہونے لگے گا اور دعوی یہ ہوگا کہ ان میں اللہ تعالیٰ متجلی ہے (جیسے مادھو لال حسین نے ایک ہندو لڑکے مادھو سے کیا) حتی کہ گرجا گھر میں راہب کہیں گے کہ یہ جمال کے مظاہر ہیں اور اسے بوسہ دے کر کہیں گے تم اللہ ہو، تو یوں اللہ نے ان پر ایسی پھٹکار ڈالی ہے کہ اپنے مفعول کو اپنا الٰہ کہتے ہیں اور وہ جو کہتے ہیں کہ ان کے اقوال کیلئے ایک سرِ خفی اور باطنی حق ہے اور یہ حقائق میں سے ہیں جن پر صرف خواص لوگ ہی مطلع ہو سکتے ہیں تو یہ یا تو اہلِ الحاد ومحال زندیقوں میں سے ہیں یا پھر اہلِ جہل وضلال میں سے تو زندیق تو واجب القتل ہے اور جاہل کو اگر حقیقتِ امر سے آگاہ کر دیا جائے اور پھر بھی اتمامِ حجت کے بعد وہ اپنے باطل اعتقاد پر قائم رہے تو وہ بھی واجب القتل ہوگا، ان کے اقوال کا اگر کوئی سرِ خفی ہے بھی تو وہ ان کے ظاہر سے بھی بڑھ کر کفر والحاد ہے، ان کے نظریات میں ایسا غموض، ابہام اور خفاء ہے کہ عوام الناس ان کی فہم سے قاصر ہیں اسی لئے ہم عام مسلمانوں کو دیکھتے ہیں کہ ابن فارض وغیرہ کے قصائد سن کر حالتِ وجد میں آجاتے اور انہیں تعظیم وشان والے (اور معرفت کی باتیں) خیال کرتے ہیں یہ ظن کرتے ہوئے کہ یہ اہلِ توحید ومعرفت کی کلام ہے اور وہ اپنے قاصر فہم کی وجہ سے اسے سمجھ نہیں پا رہے، کئی (ثقہ قسم کے بزرگ اور) علم ودین کی مشہور شخصیات بھی ان کی کلام سن کر ان کی حقیقت سمجھ نہیں پاتے پھر ان کا ردعمل دو طرح کا ہوتا ہے: یا

تو توقف کرتے ہیں یا اپنے الفاظ میں ان کی ایسی تعبیر کرتے ہیں جس کا ان کی اصل مراد ومفہوم سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اور یا پھر بغیر حقیقت جانے مجمل انکار کرتے ہیں

ان کے شیوخ جب اپنے سامعین میں ایسے لوگوں کو پاتے ہیں جو ان کے اقوال کی حقیقت نہیں سمجھتے تو ایسوں سے انہیں طمع ہوتی ہے اور کہتے ہیں دیگر تو علمائے رسوم اور ظاہر پرست وظاہر بین ہیں، انہیں وہ اہلِ قشر (قشر چھلکے کو کہتے ہیں، مراد سطحی لوگ) کا نام بھی دیتے ہیں اور مدعی ہیں کہ ہمارا علم کشف ومشاہدہ پر مبنی ہے اور اسے سمجھنے کیلئے کئی شروط ہیں، ان کے ہاں ایک ترکیب عموماً یہ مستعمل ہوتی ہے: (لَيْسَ هٰذَا عُشَّكَ فَادْرِجْ مِنْهُ) (لفظی ترجمہ: یہ تمہارا گھونسلہ نہیں، چل نکل بھاگ) تو اس طرح کی مبہم باتیں کر کے جاہلوں کو اپنی طرف مائل کرتے اور ان کے شوق کو بڑھاوا دیتے ہیں (آج بھی ان کے یہی حیلے ہیں) اور کہتے ہیں وہ جاہل ہیں جو ہمارے اقوال کی حقیقت تک نہیں پہنچ سکتے، اگر اپنے نظریات کے کسی عارف کو دیکھیں تو کہتے ہیں یہ ہمی میں سے ہے اور اسے کبار عارفین میں سے قرار دیتے ہیں، اگر وہ ان پر انکار وتکفیر کرے تو کہتے ہیں یہ مراتب اور مجالی کی تکمیل کیلئے وصفِ انکار کے ساتھ قائم ہے! یہی بات وہ انبیاء اور بت پرستی سے ان کی نہی بارے کہتے ہیں، اس اسلوب وروش کا میں نے بچشمِ خود ملاحظہ کیا ہے اور اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ان کی گمراہی عظیم، افک کبیر اور تلبیس شدید ہے اور ہم اللہ کی مدد سے ہی ان کے فتنوں اور پھندوں سے اپنے آپ کو اور لوگوں کو محفوظ رکھ سکتے ہیں۔

فصل

اولین وآخرین اہلِ علم وایمان کے نزدیک بھی ایک اتحاد اور حلول ہے جو حق ہے، اہل سنت والجماعت اور تمام طوائف کے اہلِ معرفت ویقین کے نزدیک **کتاب وسنت کی رہنمائی میں حلول کی حقیقت یہ ہے** کہ جو کسی شیٔ کا علم حاصل کرتا ہے تو لازم ہے کہ اس کے دل میں اس کا کوئی اثر اور وصف ہو اور علم کے بعد اس کی حالت قبل از علم حالت سے مختلف ہونی چاہئے حتی کہ علم علو وسفول کے بمنزلہ محض ایک نسبت ہو کیونکہ مستعلی (یعنی علو کا متلاشی) جب (اپنے مقام سے) متنزل ہو تو اس کا علو زائل ہو جاتا ہے اور سافل (ادنی اور نیچ) جب معتلی (یعنی بڑا بنتا) ہو تو اس کا سفول ختم ہو جاتا ہے اور علم کو زوال نہیں بلکہ ہر حال میں اس کا اثر باقی رہتا ہے، اگر کسی شیٔ بارے علم ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی محبت بھی دل میں موجزن ہو یا کوئی امید بندھی ہو یا اس سے خوف ہو تو ان احوال کا علم وشعور کے ماوراء اپنا ایک اثر اور وصف ہوگا اگر چہ کبھی یہ دونوں باہم متلازم ہوتے ہیں، یہ معانی فی الاصل ہر مدرِک اور مدرَک، محِب اور محبوب اور ذاکر و مذکور میں مشترک ہیں چاہے یہ علی وجہ العبادت ہو جیسے اللہ وحدہ لاشریک کی عبادت اور اس سے ایسی محبت وعقیدت رکھتے ہیں جو اللہ سے ہونی چاہئے یا پھر علی غیر وجہ العبادت جیسے دوست احباب کی باہمی محبت یا عورتوں اور اوطان اور دیگراَکوان سے دلبستگی تو مومن وہ ہے جو اپنے قلب وجوارح کے ساتھ اللہ پر ایمان لایا اور یہ ایمان اس کے علمِ قلب اور حالِ قلب کے درمیان دل کی تصدیق اور خضوع کو جمع کرتا ہے

اسی طرح اس کے ہمراہ زبان کا نطق اور جوارح کا عمل بھی ہوتا ہے، اگر چہ اصلِ ایمان وہی ہے جو دل میں ہے یا دل اور زبان پر ہے تو ضروری ہے کہ دل میں اللہ کی تصدیق اور اس کے لئے تسلیم کا معاملہ ہو اور یہ اس کے دل کا قول وعمل ہے اور یہ اللہ کا اقرار، علم وعمل اور ادراکِ حرکت، تصدیقِ اسلام اور معرفتِ محبت سے قبل ہوں گی اگر چہ یہ باہم متلازم ہیں لیکن دل کا علم اس کے عمل کا موجب ہے جب تک کوئی راجح معارض نہ پایا جائے اور اس کا عمل اس کی تصدیق کو مستلزم ہے کیونکہ شعور بنا کوئی محبت اور ارادی حرکت نہیں ہوتی

اسی طرح اگر شعور وادراک صحیح نہج پہ نہ ہوں تو حرکت ومحبت میں خرابی اور بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے، عمر بن عبد العزیز کا قول ہے جس نے بغیر علم اللہ کی عبادت کی وہ اصلاح سے زیادہ بگاڑ کا شکار ہوسکتا ہے! جہاں تک بالباطن والظاہر عملِ صالح تو یہ نہ ہوگا مگر علم کے بعد ہی، اسی لئے اللہ اور اس کے رسول نے اللہ کی عبادت اور اس کی طرف انابت اور اس کیلئے دین کو خالص کر دینے کا حکم دیا ہے تو یہ ایسے اسماء ہیں جو علم وعمل کو منتظم کرتے ہیں، دل کے علم اور اس کے حال میں زبان کا نطق اور جوارح کا عمل بھی داخل ہے کیونکہ صحیح فروع کا وجود وجودِ اصول کیلئے مستلزم ہوتا ہے اور یہ ایسی بات ہے جو ہر ایک پر ظاہر ہے، یہاں اس پر تفصیل سے بات کرنا غرض نہیں، مقصود اس حقیقت کو واشگاف کرنا ہے کہ مومن کیلئے لازم ہے کہ اس کے دل میں اللہ کی معرفت اور محبت ہو جس کی رو سے اس کے دل میں معروف محبوب کی نسبت سے ایسے اثرات ہوں جو بعض وجوہ سے حلول سے مشابہ ہوں، اس کا مطلب یہ نہ ہوگا کہ محبوب معروف کی ذات کا حلول ہوا ہے لیکن مراد اس پر ایمان اور اس کے اسماء وصفات کی معرفت ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ﴾ [النور : **۳۵**] (اس کے نور کے مثال ایسی ہے گویا ایک طاق ہے) ابی بن کعب نے کہا یعنی مومن کے دل میں اس کے نور کی مثال (وہ جو اس آیت میں ذکر کی) تو یہ وہ انوار ہیں جو اہلِ ایمان کے قلوب میں پیدا ہوتے ہیں! قولہ تعالیٰ: (**وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ﴾[المائدۃ :۵]** (اور جو شخص ایمان سے منکر ہو اس کے عمل ضائع ہو گئے) کی تفسیر میں کہا گیا ہے کہ یہ اس کا کفر کرنا، تو جس نے اس اقرار جو کہ اللہ، اس کے ملائکہ، رسل اور کتب کا اقرار اور اس کیلئے اسلام لانا ہے، کا انکار کیا جو واجبات کے ایجاب، محرمات کی تحریم اور مباحات کی اباحت کے اعتقاد اور ان کیلئے انقیاد کو متضمن ہے تو وہ کافر ہوا کیونکہ کتب نازل کرنے اور رسول مبعوث کرنے سے مقصود ہمارے لئے ایمان کا حصول ہے تو جس نے اس کا انکار کیا وہ کافر ہوا، اسے کبھی مثل اور مثال کہتے ہیں کیونکہ کہا جا سکتا ہے: بے شک علم عالم میں معلوم کی مثال (یعنی پرتو) ہے، اسی طرح محبت کا معاملہ ہے تو اس ضمن میں محبّ میں محبوب کی تمثیل ہوتی ہے (یعنی اس کا عکس اور پرتو)

پھر بعض لوگ مدعی ہیں کہ ہر علم اور ہر محبت میں یہ مثال ہے جیسا کہ بعض اہلِ فلسفہ نے یہ کہا جبکہ بعض نے اس مثال میں سے علم وحب کی کسی نوع میں کسی شیٔ کے حصول کا انکار کیا، تحقیق یہ ہے کہ کبھی بعض عالمین اور محبین کیلئے تمثل وتخیل حاصل ہو جاتا ہے حتی کہ وہ محبوب کی صورت کا تخیل کرتا ہے اور کبھی حسی تخیل حاصل نہیں ہوتا اور یہ اصلاً ہی حقیقت کی جنس سے نہیں، دراصل

جب علم معلوم کے مطابق اور اس کے موافق ہو اس طور کہ بالکل بھی باہمی مخالفت اور تخالف نہ ہو تو مطابق اور مطابق لہ اور موافق اور موافق لہ کے مابین ایک نوع کا تناسب اور تشابہ حاصل ہوتا ہے اور انواعِ تمثیل میں سے کوئی نوع کسی شئ کیلئے بطورِ مثل تبھی بیان کی جاتی ہے جب بعض وجوہ سے دونوں میں مشارکت ہو اور یہاں قطعاً ایک طرح کا اشتراک اور مشابہت ہے، اللہ تعالی کے فرمان: (**لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ**) [الشوریٰ: ۱۱] (اس جیسی کوئی چیز نہیں) اور: (**وَلَهُ الْمَثَلُ الْأَعْلَى فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ**) [الروم: **۲۷**] (اور آسمانوں اور زمین میں اُس کی شان بہت بلند ہے) بارے کہا گیا ہے کہ وہ یہ ہے، ایک حدیث (قدسی) میں ہے: (مَا وَسِعَنِيْ اَرْضِيْ وَلَا سَمَائِيْ وَسِعَنِيْ قَلْبُ عَبْدِي الْمُؤْمِنِ الْمُتَّقِي التَّقِيِّ الْوِدَاعِ اللَّيِّنِ) (یعنی میں اپنے ارض وسماء میں تو سما نہ سکا لیکن اپنے متقی، صلح جو اور نرم خو مومن کے دل میں سما گیا) کہا جاتا ہے: (اَلْقَلْبُ بَيْتُ الرَّبِّ) (یعنی: رب دلاں وچ رہنداں) اور یہی بندوں کا اپنے رب اور اس کے ساتھ ایمان سے حظ ونصیب ہے جیسے بعض سلف سے منقول ہے کہ کہا: جب تم میں سے کوئی یہ جاننا چاہے کہ اللہ کے ہاں اس کا مرتبہ ومقام کیا ہے تو دیکھے اس کے دل میں اللہ کا مرتبہ ومقام کیا ہے کہ اللہ بندے کو اپنے نفس میں وہی مقام دیتا ہے جو وہ اپنے دل میں اسے دیتا ہے، یہ بات ایوب بن عبد اللہ بن خالد بن صفوان عن جابر بن عبد اللہ سے بطور مرفوع حدیث کے مروی ہے جسے ابویعلی موصلی نے اور ابن ابوالدنیا نے کتاب الذکر میں نقل کیا، اسی لئے حضرت یعقوب کے بیٹوں نے کہا تھا:

(**نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا**) [البقرۃ: ۱۳۳] (ہم آپ کے معبود اور آپ کے دادا ابراہیم اور اسماعیل اور اسحٰق کے معبود کی عبادت کریں گے جو معبود یکتا ہے) کیونکہ اللہ کی الوہیت دلوں میں متفاوت ہوتی ہے جو کچھ میں زیادہ اور کچھ میں کم ہوتی ہے اور لوگ اس ضمن میں متفاوت ہیں کہ اس کی حدود واطراف منضبط نہیں حتی کہ صحیح میں نبی اکرم سے دو اشخاص کے حق میں فرمان ثابت ہے کہ ایک کے بارہ میں فرمایا یہ اس دوسرے کی مثل زمین بندوں سے بھری ہوئی ہو، سے بہتر ہے، اور یہ ایک عظیم تباین اور فرق ہے جس کا مثل تمام ذی حیات میں حاصل نہیں، اسی معنی کی طرف اشارہ کیا جس نے کہا تھا کہ ابوبکر اپنے نماز وروزوں کی وجہ سے تم سب سے بہتر وافضل نہیں بنے بلکہ ایک شئ کے باعث جو ان کے دل میں قرار پکڑ چکی ہے اور یہ یقین وایمان کی دولت، اسی سے آپ کا یہ فرمان ہے کہ میرا ساری امت کے مقابلہ میں وزن کیا گیا تو میں بھاری پڑا پھر ابوبکر کا امت کے مقابلہ میں وزن کیا گیا تو وہ بھی بھاری پڑے پھر عمر کا امت کے مقابلہ میں وزن ہوا تو وہ بھی ان سب سے بھاری پڑے پھر ترازو اٹھا لیا گیا (یہ ایک خواب تھا جو آپ نے دیکھا) حضرت صدیق اکبر نے آپ کا فرمان نقل کیا کہ اللہ سے یقین و عافیت کی طلب کیا کرو کہ یقین کے بعد عافیت سے بہتر کسی کو کچھ عطا نہیں کیا گیا، اسے ترمذی اور نسائی نے (الیوم واللیلۃ) میں اور ابن ماجہ نے نقل کیا، رقبہ بن مصقلہ نے شعبی سے کہا تھا: اللہ آپ کو دولتِ یقین عطا کرے کہ جس کے بغیر دل سکون نہیں پکڑتے اور نہ دین میں بجز اس کے کچھ معتمد علیہ ہے، امام احمد کی کتاب الزہد میں منقول ہے کہ حضرت موسی نے ایک دفعہ بارگاہِ خداوندی میں

عرض کی اے رب میں تجھے کہاں پاؤں؟ فرمایا اے موسیٰ ان دلوں کے پاس جو میری خاطر شکستہ ہوئے، میں ہر روز ایک بالشت بھر ان سے قریب ہوتا ہوں اور اگر ایسا نہ ہوتو ان کے دل جل جائیں، کبھی اس معنی کو توسعاً ان الفاظ سے تعبیر کر دیا جاتا ہے کہ: (مَا فِيُ قَلُبِيُ إِلَّا اللّٰهُ) (یعنی میرے دل میں کچھ نہیں مگر اللہ) یا (مَا عِنُدِيُ إِلَّا اللّٰهُ) (میرے پاس کچھ نہیں مگر اللہ) جیسے ایک صحیح قدسی حدیث میں ہے: میرا فلاں بندہ بیمار پڑا تھا اگر تم اس کی عیادت کو آتے تو اس کے پاس مجھے پاتے، کسی نے یہ شعر کہا:

سَاكِنٌ فِي الْقَلْبِ يَعْمُرُهٗ لَسْتُ اَنْسَاهُ فَاَذْكُرَهٗ

(وہ دل کا مکین ہے اسے آباد کئے ہوئے، میں تو اسے بھولتا ہی نہیں کہ اسے یاد کروں) اور کہا گیا:

مِثَالُكَ فِيُ عَيُنِيُ وَذِكُرَاكَ فِيُ فَمِيُ وَمَثُوَاكَ فِيُ قَلُبِيُ فَاَيُنَ تَغِيُبُ

(تیرا نقش میری آنکھ میں، تیرا ذکر میری زباں پہ اور تیرا مسکن میرا دل ہے پھر تو غائب کہاں ہے؟)

یہ قدر ایک عظیم قوت سے تقویت پاتی ہے حتیٰ کہ عقلاء کے بالاتفاق اسے تجلی، کشف اور ان کے ہاں معروف دیگر اصطلاحات کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے اور اس کے ساتھ اس کا قرب حاصل ہوتا ہے جیسے آنجناب کا یہ فرمان ہے: (اَقُـرَبُ مَـا يَـكُـوُنُ الُـعَبُـدُ مِنُ رَبِّهٖ وَهُوَ سَاجِدٌ) (انسان حالتِ سجدہ میں اللہ کے سب سے زیادہ قریب ہوتا ہے) ایک حدیث میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا جو ایک بالشت میری طرف قریب ہوا تو میں گز بھر اس کی طرف قریب ہوتا ہوں، لیکن آیا اللہ کی طرف اس تقرب سے مراد اس کی طرف حرکت ہے یا بعض اماکن کی طرف؟ اس امر پر متفق ہیں کہ کبھی بعض اماکنِ مقدسہ کی طرف عبد کے بدن کی حرکت حاصل ہوتی ہے جن میں اللہ کی معرفت، اس کے ذکر اور اس کی عبادت سے ایمان باللہ ظاہر ہوتا ہے مثلاً حج بیت اللہ اور دیگر مساجد کا قصد، اسی سے حضرت ابراہیم کا قول ہے:

(اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ) [الصافات: **99**] (کہ میں اپنے رب کی طرف جانے والا ہوں وہ مجھے راستہ دکھائے گا) جہاں تک سماوات وغیرہ اماکن کی طرف اس کی روح کی حرکت تو جمہور اہلِ اسلام نے اس کا اقرار کیا ہے، صابی فلاسفہ اور ان کی موافقت کرنے والوں نے اس کا انکار کیا، اہلِ فطرت اور اہلِ سنت والجماعت نے بھی عبد کے بدن اور روح کی اللہ کی طرف حرکت کا اقرار کیا ہے، کثیر اہلِ کلام نے اس کا انکار کیا، جہاں تک اللہ کی جانب سے اپنے بندے کا قرب تو آیا یہ عبد کے تقرّب اور تقریب کے تابع ہے جو کہ اس کا علم یا عمل ہے؟ یا رب سے ایک اور نوع کا قرب ہے؟ اس بارے بحث ہے جس کا یہ مقام نہیں، اور جو سوائے اول کے کسی کا اثبات نہیں کرتے تو وہ رب کے قرب کی بابت دو اقوال پر ہیں: ایک کہ یہ اس کی تجلی اور اس کیلئے اس کا ظہور ہے اور دوم کہ اس کے ساتھ عبد کا اس سے دنو اور اقتراب ہے جو اس کے عمل و حرکت کے ساتھ ہے، قرب کا ایک اور معنی بھی ہے اور وہ ہے تقارب بمعنی المناسبت جیسے کہا جاتا ہے: (هذَا يُقَارِبُ هذَا) (یہ اس سے ملتا جلتا ہے) تفصیل کا یہ مقام نہیں۔

فصل

جہاں تک ان کی اصطلاحِ اتحاد سے مشابہ تو بات یہ ہے کہ دو الگ الگ ذاتوں میں سے کسی کا عین دوسری کی عین کے ساتھ متحد نہیں ہوتا اسی طرح عین صفتِ ذات کا دوسرے کی عینِ صفت سے الا یہ کہ دونوں تغیُّر واستحالت کے بعد کوئی تیسری ذات بن جائیں جیسے پانی اور دودھ کا اتحادِ ذات کہ بعد از اتحاد تیسری شئ (یعنی لسی) بن جائیں گے، نہ اسے خالص پانی اور نہ خالص دودھ کہا جائے گا، جہاں تک اتحادِ ذات کے بعد اسی حالت میں باقی رہنا جو قبل از اتحاد تھی تو یہ محال ہے اور اس سے معلوم پڑا کہ ممکن نہیں کہ اللہ کا اس کی مخلوق سے اتحادِ ذات ہو کیونکہ اس کا استحالہ محال ہے، صرف عین میں اسباب اور احکام باہم متحد ہوتے ہیں اور نوع میں اسماء وصفات جیسے دو دوستوں کی مثال ذکر کی کہ بوجہ اپنی محبت کی شدت اور پختگی کے ہر ایک ہر اس چیز کی عین کو پسند کرتا ہے جسے دوسرا پسند کرے اور اس سے بغض کرتا ہے جس سے وہ کرے اور اس میں مراتب اور درجات ہیں جو کسی ضابطہ کے تحت نہیں لائے جاسکتے تو ان دونوں کے اسماء اور صفات ایک نوع کے ہو جاتے ہیں اور ان سے متعلقہ احکام واسباب کے عین جو کہ مثلاً محبوب اور مکروہ واحد بالعین ہوگا، رسول کی مانند جن سے کل اہلِ ایمان محبت کرتے ہیں تو وہ اس کی محبت میں متحد (یعنی ایک) ہیں اس معنی میں کہ ان کا محبوب ایک ہے اور اس کی محبت دوسرے کی محبت کی نوع سے ہے، یہ نہیں کہ عین وہی ہوئی تو یہ لوگوں کے بعض کے بعض کے ساتھ اتحاد کے ضمن میں ہے اور یہ دینی اخوت وخلت ہے جس کی بابت آپ نے فرمایا تھا اہلِ ایمان کی ان کی باہمی مودت اور یگانگت میں مثال ایک جسد کی سی ہے کہ اگر ایک عضو کو کوئی شکایت والم ہو تو دیگر سب اعضاء بیداری اور بخار کے ساتھ اس کی غمخواری کرتے ہیں، یہ متفق علیہ ہے تو یوں مومن کو دوسرے مومن کی نسبت بمنزلہ عضو کے قرار دیا اسی لئے اللہ نے کتاب وسنت کے متعدد مقامات میں مومن کو اپنے بھائی مومن کیلئے نفس کا نام دیا مثلاً کہا:

(فَلَا تُزَكُّوٓا أَنفُسَكُمْ)[والنجم: ۳۲] (تو اپنے آپ کو [یعنی ایک دوسرے کو] پاک صاف نہ جتاؤ) اور کہا:

(لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ)[التوبة: ۱۲۸] (تمہارے پاس تم ہی میں سے ایک پیغمبر آئے ہیں)

(لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ) [آل عمران: ۱۶۴] (اللہ نے مومنوں پر بڑا احسان کیا ہے کہ اُن میں انہیں میں سے ایک پیغمبر بھیجا)

(فَسَلِّمُوا عَلَىٰ أَنفُسِكُمْ) [النور: ۶۱] (تو اپنے آپ [یعنی ایک دوسرے] کو سلام کیا کرو) **(فَاقْتُلُوٓا أَنفُسَكُمْ)[البقرة: ۵۴]** (تو اپنے آپ [یعنی ایک دوسرے] کو قتل کرو) تو عبدِ مومن جب اپنے رب کی طرف رجوع کرتا، عبادت کرتا اور اس کی موافقت کرتا ہے حتیٰ کہ ہر وہ چیز اسے پسند ہوجاتی ہے جو اس کے رب کو ہے اور وہ ناپسند جو اس کے رب کو ناپسند ہے اور اس کا امر ونہی اس کا امر ونہی ہے اور اس کی رضا میں اس کی رضا اور اس کے غضب میں اس کا غضب ہے اور اس کی عطاء ومنع اسی کے حکم کے تابع ہو تو یہ وہ بندہ ہے

جس کی بابت نبی اکرم نے قاسم عن ابوامامہ کی حدیث جسے ابوداود نے نقل کیا، میں فرمایا جس نے اللہ کی خاطر محبت کی اور اسی کی خاطر بغض کیا اور اسی کیلئے عطا کیا اور اسی کیلئے منع کیا تو اس کا ایمان مکمل ہوا، اس قسم کے عبد کا سارا دین اللہ کیلئے ہو جاتا ہے اور ساری زندگی صراط مستقیم پر گزرتی ہے تو اس کی صفات کے احکام واسباب رب تعالیٰ کی صفات واحکام کے ساتھ متحد ہو جاتے ہیں پھر لوگ اس ضمن میں متفاوت درجہ کے حامل ہیں، انبیاء کرام کیلئے اللہ سے وہ موافقت حاصل ہے جو غیرِ نبی کو نہیں اور مرسلین اس سے بھی فائق درجہ کے حامل ہیں اور اولوالعزم رسل اس سے بھی آگے اور ہمارے نبی سب سے بالاتر، آپ کیلئے ہر مقام میں وسیلہِ عظمٰی ہے تو یہ موافقت ہی سائغ (جائز) اتحاد ہے چاہے یہ واجب ہو یا مستحب اور اس کے مثل میں کتاب وسنت کی نصوص وارد ہیں، فرمایا:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَكَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰهَ یَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ﴾ اور کہا: (**﴿وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَحَقُّ اَنْ یُّرْضُوْهُ﴾** اور: **﴿مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ﴾ ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ﴾ ﴿اَحَبَّ اِلَیْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾** (یہ سب گزری ہیں) **﴿قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ﴾[الانفال : ۱]** (کہہ دو کہ غنیمت اللہ اور اُس کے رسول کا مال ہے) اسی باب سے حضرت مسیح کا قول ہے اگر یہ الفاظ ان سے ثابت ہیں: (اَنَا وَاَبِیْ وَاحِدٌ مَنْ رَآنِیْ فَقَدْ رَآى اَبِیْ) (میں اور میرا باپ ایک ہیں جس نے مجھے دیکھا اس نے میرے باپ کو دیکھ لیا) اور اس کا نحو، تو یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کی مثل ہے: (**﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَكَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰهَ﴾**[الفتح : ۱۰] (**﴿مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ﴾** (گزری) اور ان جیسی آیات جن کے الفاظ باہم متشابہ ہیں، اللہ کے متقی اولیاء میں اس سے ایک نوع موجود ہے چنانچہ بخاری نے حضرت ابو ہریرہ کے حوالے سے نبی پاک سے نقل کیا کہ اللہ فرماتا ہے جس نے میرے ولی سے دشمنی مول لی اس نے میرے خلاف اعلانِ جنگ کیا (آگے وہ جو مردِ مومن کے تقربِ الٰہی کے حصول کے ذرائع اختیار کرنے بارے گزرا کہ فرائض ونوافل کے ساتھ تقرب کی سعی کرتا رہتا ہے۔۔الخ) تو اس کے شروع میں اپنے ولی بندے سے دشمنی وبغض کرنے کو اپنے لئے معادات قرار دیا تو اس کے دشمن کا عین اس کے بندے کے دشمن کا عین ہے اور اس کے ولی سے عینِ معادات اس کے لئے عینِ معادات ہے، دونوں جدا جدا شیٔ نہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ عینِ اللہ اس کے عبد کی عین ہوگئی اور نہ یہ کہ اس کے عبد کی عداوت کی جہتِ عین اس کی ذات کی عداوت کی جہتِ عین ہوئی، یہ دراصل نوعی اتفاق ہے پھر اگلی عبارت میں خود کو اس کی بصر اور کان وغیرہ قرار دیا تو یہاں بھی (جیسا کہ اس کی تشریح گزری) عین کا اتحاد مراد نہیں! مطلب یہ کہ ان اعضاء وقویٰ کے ساتھ وہی مقصود ہوتا ہے (کہ اس کی منشاء کے برخلاف انہیں استعمال نہیں کرتا، یہ معنی نہیں جو ایک بریلوی خطیب نے کہا اور میں راستہ میں ہونے کی وجہ سے اس کے سامعین میں موجود تھا تو یہی حدیث پڑھی اور تشریح کرتے ہوئے کہا یعنی اس کی آنکھ، کان، ہاتھ وغیرہ میں اللہ کی طاقت آجاتی ہے) اور اللہ تعالیٰ اس ضمن میں ان اعضاء کے بمنزلہ ہوتا ہے تو عبد کیلئے اس کے اعضاء وقویٰ کے بحسب ہی اس کا ادراک اور حرکت ہوتی ہے تو جب اس کا ادراک اور حرکت بالحق ہو تو اس کا معنی یہ نہیں کہ ادراک اور حرکت کی تخلیق ہوئی کہ یہ تو اس کے چاہنے

والوں اور نہ چاہنے والوں کے درمیان قدرِ مشترک ہے، دراصل محبوبِ حق کیلئے حق تعالیٰ کی جانب سے اسے حاصل معیت، ربوبیت اور الوہیت کے بقدر اعانت ہے تو ان امور میں سے ہر امر عام وخاص ہے

مسلم نے حضرت ابو ہریرہ کے حوالے سے نبی اکرم سے نقل کیا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اے میرے بندے میں بیمار ہوا تو نے میری عیادت نہ کی؟ وہ کہے گا اے رب میں کیسے تیری عیادت کرتا اور تو رب العالمین ہے؟ (یعنی کیسے بیمار پڑ سکتا ہے) فرمائے گا میرا فلاں بندہ بیمار ہوا، اگر تم اس کی عیادت کو جاتے تو مجھے اس کے پاس پاتے (آگے بھوک اور پیاس کے ضمن میں بھی یہی کہا) تو اس حدیث میں دو برحق معنی ذکر کئے اور دو باطل معانی کی نفی کی اور ان کی تفسیر کی تو اس کا قول: (جُعْتُ وَ مَرِضْتُ) (مجھے بھوک لگی اور میں بیمار ہوا) لفظِ اتحاد ہے جو حق ثابت کرتا ہے اور قولہ: (لَوَجَدْتَنِیْ عِنْدَہٗ) لفظِ ظرف ہے اور اسی سب کے ساتھ حلولِ حق کا درست معنی (اور صحیح توجیہہ) کا اثبات ہوتا ہے جو کہ ایمان کے ساتھ ہے نہ کہ ذات کے ساتھ اور قولہ: (مَرِضْتُ فَلَمْ تَعُدْنِیْ) تفسیر کرتا ہے! تو اگر رب تعالی عین وہ مریض اور عین وہ بھوکا ہوتا تو بندہ جب اس کی عیادت کرتا اور جب اسے کھانا کھلاتا تو اسے وہی پاتا، مریض کے ضمن میں اس کا کہنا: (وَجَدْتَنِیْ عِنْدَہٗ) (مجھے اس کے پاس پالیتا) اور بھوک کے بارے کہنا: (لَوَجَدْتَ ذٰلِكَ عِنْدِیْ) (تو اسے میرے پاس پاتا) ایک عمدہ فرق ہے کیونکہ مریض جس کی عیادت کرنا مستحب ہے اور وہ (یعنی عیادت کرنے والا) اس کے پاس اللہ کو پاتا ہے چونکہ وہ اپنے رب پر ایمان والا ہے اور اپنے الٰہ کے موافق ہے جس کا وہ ولی ہے، جہاں تک کھانا کھلانے والا تو اس میں ہر بھوکے کیلئے عموم ہوسکتا ہے جسے کھانا کھلانا مستحب ہے تو اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَهٗ لَهٗ اَضْعَافًا كَثِیْرَةً﴾ [البقرۃ: ۲۴۵] (کون ہے کہ اللہ کو قرضِ حسنہ دے کہ وہ اس کے بدلے اُس کو کئی حصے زیادہ دے گا) تو جس نے واجب یا مستحب صدقہ کیا اس نے گویا اس کے بندے کو عطا کرنے کے باوصف اللہ کو قرضِ حسنہ دیا، صحیح میں نبی اکرم سے مروی ہے کہ فرمایا جس نے حلال کی کمائی سے کھجور برابر بھی صدقہ دیا۔ اور اللہ صرف حلال کمائی ہی قبول کرتا ہے۔ تو اللہ اپنے دائیں ہاتھ سے اسے تھام کر اس طرح اس کی پرورش کرتا ہے جیسے تمہارا کوئی اپنے بکری کے بچے یا بچھڑے کی کرتا ہے حتی کہ وہ بڑے پہاڑ کی مثل ہو جاتا ہے اور فرمایا صدقہ سائل کے ہاتھ میں واقع ہونے سے قبل ہی حق باری تعالی کے ہاتھ میں پہنچ جاتا ہے، انسب یہ ہے کہ بھوک کے ضمن میں یہ عبدِ مذکور وہی ہے جس کا مرض کے ضمن میں ذکر کیا یعنی صاحبِ ولایت عبد جس میں ایک نوعِ اتحاد کا وجود ہے اگرچہ فاسق وفاجر کی دادرسی کرنے پر بھی اجر دیتا ہے، اسی قرض کی نظیر نصرت ہے جس کا ذکر اس آیت میں کیا:

﴿وَ لِیَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ یَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَیْبِ﴾ [الحدید: ۲۵] (اور اس لئے کہ جو لوگ بن دیکھے اللہ اور اس کے پیغمبروں کی مدد کرتے ہیں اللہ ان کو معلوم کرلے) اور ﴿اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ یَنْصُرْكُمْ﴾ [محمد: ۷] (اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ بھی تمہاری مدد کرے گا) ونحوذلک، لیکن (نصرت) میں ایک معنی ہے جس کا مثل (جُعْتُ) میں نہیں کہا جاسکتا، اللہ نے قرآن میں قرض

اورنصرت کا ذکر کیا ہے اور اسے اس کیلئے کیا، یہ رزق میں اور یہ نصرت میں اور حدیث میں عیادت کا ذکر ہوا اور یہی تینوں اس آیت میں مذکور ہوئے:﴿وَ الصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَ حِیْنَ الْبَاْسِ﴾[البقرۃ : ۱۷۷] (اورسختی اور تکلیف میں اور کارزار کے وقت ثابت قدم رہیں) اور:

﴿مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا﴾[البقرۃ:۲۱۴] (اُن کوسختیاں اور تکلیفیں پہنچیں اور وہ جھنجھوڑ دیئے گئے) حدیث میں فقط باساء اور ضراء کا ذکر ہے اسلئے کہ اس کے ساتھ ساتھ قولہ: (عَبْدِیْ مَرِضْتُ وَ جِعْتُ) کا مخاطب منفرد ہوگا اسی لئے عتاب کا اظہار کیا، جہاں تک نصرت تو عرف میں یہ تعدد (یعنی کئی افراد) کا محتاج ہے تو عموماً اس ضمن میں کسی ایک معین کو معتوب نہیں کیا جاسکتا یا حدیث کے ساتھ مقصود تنبیہہ (یعنی توجہ دلانا) ہے اور قرآن میں نصرت اور رزق اور اس میں عیادت کا ذکر نہیں ہوا کیونکہ قرض و نصرت میں عموم ہے جو کسی خاص شخص کے ساتھ مختص نہیں جہاں تک عیادت ہے تو یہ اسی کیلئے ہے جس کے پاس وہ حق تعالیٰ کو پاسکتا ہے (یعنی مردِ مومن کی عیادت) ہے۔

فصل

تو یہ **دومعانی صحیح اور ثابت ہیں بلکہ یہ دین، یقین اور ایمان کی حقیقت ہیں،** اول ۔ اور یہ اللہ کا بندے کے قلب میں محبت و معرفت کے ساتھ ہونا ۔ ہر ایک پر فرض اور ہر مومن کیلئے ضروری ہے اگر اپنا کردار ادا کرے تو وہ مقتصد (یعنی سابقین کے بعد والے درجہ میں) ہے اور اگر بعض واجبات کا ترک کرے تو وہ (قرآنی اصطلاح میں) ظالم لنفسہ ہے اور اگر کلی ترک کرے تو اپنے رب کا کافر ہے اور دوم ۔ اور یہ اپنے رب کی موافقت اس چیز میں جو وہ پسند اور ناپسند کرے اور جس سے راضی ہو یا ناراض ہو۔ علی الاطلاق سابقین مقربین کیلئے ہے جو نوافل کے ساتھ اللہ کے تقرب کے جو یا ہوتے ہیں، وہ جو اللہ کو پسند ہیں البتہ انہیں فرض نہیں کیا، ان فرائض کی ادائیگی کے بعد جو اسے پسند ہیں اور انہیں فرض کیا ہے اور ان کے تارک کو وہ عذاب دے گا اسی لئے یہ لوگ جب حق باری تعالیٰ کو محبوب اقوال، افعال اور ظاہری و باطنی اعمال بجالاتے ہیں جو معارف، احوال اور اعمال کیلئے منتظم ہیں تو انہیں اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل ہوتی ہے، فرمایا: (حَتّٰی أُحِبَّهُ) (حتی کہ مجھے اس سے محبت ہو جاتی ہے) کیونکہ اس نے محبوب کام کئے تو اس نے ان سے محبت کی کیونکہ جزا عمل کی جنس سے ہوتی ہے، اس کی اس سے مناسبت وہی جو معلول کی علت کیلئے ہوتی ہے، یہ تو ہم نہ کیا جائے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ بندہ (اس مقام پر فائز ہونے کے بعد) عین وہ ہر حرکت کرتا ہے جو اللہ کو پسند ہے کہ یہ محال ہے، مقصود یہ ہے کہ اللہ کو پسند جن ظاہری اور باطنی اعمال کے کرنے کی اس میں استطاعت ہو اور ممکن ہے باطنی اعمال بنسبت ظاہری کے زیادہ ہوں جیسے بعض سلف نے کہا مومن کی قوت اس کے دل میں اور اس کا ضعف اس کے جسم میں ہے جبکہ منافق کی قوت اس کے جسم اور اس کا ضعف اس کے دل میں ہوتا ہے، اسی لئے آنجناب نے فرمایا آدمی اسی کے ساتھ ہوگا جس سے اسے محبت ہو اور فرمایا: یہاں مدینہ میں ایسے افراد ہیں کہ تم کوئی جہادی سفر نہیں کرتے اور نہ کوئی وادی قطع کرتے ہو مگر وہ (ہمراہ نہ ہوتے ہوئے

بھی) تمہارے ساتھ ہوتے ہیں کہ انہیں عذر نے روک لیا ہے اور فرمایا اجر میں وہ تمہارے برابر ہیں، یہی بات انفاق پر قادر اور اس سے ایسے عاجز بارے فرمائی تھی جو کہتا ہے اگر میرے پاس بھی فلاں کی طرح مال ہوتا تو میں بھی ایسا صدقہ وخیرات کرتا جو وہ کرتا ہے تو وہ دل کے عمل میں برابر ہوئے، نیز فرمایا جب بندۂ مومن بیمار پڑے یا وہ سفر میں ہو تو اس کیلئے وہی عمل لکھا جاتا ہے جو وہ حالتِ صحت واقامت میں کرتا ہے۔

فصل

بعض ایسے لوگ **جن پر غلبہِ حال ہو جائے** کبھی ایک نوع کے حلول اور اتحاد میں واقع ہوتے ہیں تو اس میں اتحاد حق بھی ہے اور باطل بھی لیکن جب اس کی ایسی حالت ہوئی ہے کہ اس کی عقل غائب ہوئی یا محبوب کے ماسوا ہر شئ سے اسے غافل کر دیا اور اس میں اس کا کوئی دوش نہیں (یعنی یہ ارادی حرکت نہیں کہ میسنا بنا بیٹھا ہو) تو وہ (شرعا) معذور باور ہوگا اور جب تک اس کے ہوش و حواس واپس نہیں آنے اس پر (نماز وروزہ کے ترک کے سبب) کوئی عقوبت نہیں کیونکہ (حدیث کی رو سے) مجنون مرفوع القلم ہے حتی کہ افاقہ ہو، اگر وہ اس ضمن میں مخطئ ہے تو اللہ کے اس فرمان میں داخل ہے:

(رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ إِن نَّسِينَآ أَوْ أَخْطَأْنَا) [البقرة:٢٨٦] (اے رب اگر ہم سے بھول چوک ہوگئی ہو تو ہم سے مواخذہ نہ کرنا)

اور: **(وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيمَآ أَخْطَأْتُم بِهِ)** [الأحزاب: **۵**] (اور جو بات تم سے غلطی سے ہوگئی ہو اس میں تم پر کچھ گناہ نہیں)

یہ ایسے ہی جیسے بیان کیا جاتا ہے کہ کسی کے محبوب نے دریا میں الخ (اس کا پہلے بھی ذکر ہوا) تو کثیر اہلِ محبت وارادت کی (جانبِ حق میں) یہ حالت ہو جاتی ہے اور غیر جانبِ حق (یعنی عشقِ مجازی) میں بھی اگر چہ اس میں نقص وخطا ہے کیونکہ وہ اپنے محبوب کے ساتھ اپنی محبت، اپنے مذکور کے ساتھ اپنے ذکر، معروف کے ساتھ اپنے عرفان، اپنے شہود کے ساتھ اپنے شہود اور موجود کے ساتھ اپنے وجود سے ایسا غائب ہو جاتا ہے کہ تب اسے تمیز اور اپنے وجود کا کوئی شعور نہیں ہوتا، کبھی اس حالت میں وہ اس قسم کے جملے کہہ سکتا ہے: (أَنَـا الْحَقُّ) (میں حق ہوں) (سُبْحَانِیْ) (میری پاکی) (مَـا فِي الْجُبَّةِ إِلَّا اللّٰهُ) (اس جبہ میں نہیں مگر اللہ) اور اس کے نحو، دراصل وہ محبت کے وجد کی وجہ سے حالتِ سکر میں ہے جو کہ لذت وسرور اور خود فراموشی کا عالم ہے (اور کچھ پتہ نہیں کیا کہہ رہا ہے) اور حالتِ سکر کی باتیں (یُـطْـویٰ ولاَ یُـرْویٰ) (یعنی ایسی باتوں کو نظر انداز کر دیا جائے بیان نہ کیا جائے) اگر اس کی یہ حالتِ سکر کسی محظور سبب (یعنی شراب اور بھنگ وغیرہ کے نشہ کی وجہ) سے نہیں لیکن اگر ان کے سبب ہے تب یہ معذور نہیں (بلکہ اسے شرعی سزا بھگتنا ہوگی)

جہاں تک اہلِ حلول تو ان میں سے بعض پر دل کے شہود اور اس کی تجلی کا ایسا غلبہ ہو جاتا ہے کہ وہ توھم کرتا ہے کہ وہ اللہ کو اپنی ان سر کی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے اور یہ بات صحیح الحواس عابدوں کی ایک جماعت سے نقل کی گئی اور یہ ان کی غلط فہمی تھی (یعنی عشقِ حقیقی کے غلبہ کی وجہ سے انہیں یوں لگا) مسلم نے حضرت نواس بن سمعان سے روایت نقل کی کہ نبی اکرم نے (دجال اور اس

کے دعوائے ربوبیت کا تذکرہ کرتے ہوئے) فرمایا جان لو کہ تم میں سے کوئی اس دنیا کی زندگی میں اپنے رب کو نہیں دیکھ سکتا، یہ بات کئی دیگر حسن درجہ والی اسانید کے ساتھ بھی مروی ہے، اس کے دعوائے ربوبیت کے ضمن میں آپ نے ہر ایک کیلئے دو واضح فرق بیان فرمائے ایک: کہ دجال کانا ہوگا جبکہ اللہ تعالیٰ میں یہ نقص نہیں اور دوم کہ ہم میں سے کوئی اللہ تعالیٰ کا یہ دنیوی زندگی ختم ہونے سے قبل دیدار نہیں کرسکتا، دجال کے تذکرہ کے ضمن میں یہ بات اس لئے ذکر کی کیونکہ اس کے ہاتھوں ایسے مافوق الفطرت امور کا ظہور ہوگا کہ عوام الناس کے دلوں میں شبہ در آئے گا کہ واقعی وہ رب ہے۔

فصل

تو یہ ہے شرع میں اتحادِ معین جو اس حلول اور اتحاد سے مشابہ ہے جس میں ایک نوعِ حق ہے، اس سے مطلق اتحاد کے نظریہ کا بگاڑ بھی واضح ہوا، ہم کہتے ہیں بلا شبہ اللہ رب العالمین ہے آسمانوں، زمینوں اور ان کے جو مابین ہے، سب کا رب اور عرشِ عظیم کا اور مشرق و مغرب کا رب ہے اس کے سوا کوئی الہٰ نہیں، اسے ہی کارساز سمجھو اور بناؤ، وہ تمہارا اور تمہارے آباء واجداد کا رب ہے اور تمام لوگوں کا بادشاہ ہے، الہ اور ہر شئ کا خالق اور ہر شئ پر وکیل ہے اس نے زوجین (یعنی صنفین) نر اور مادہ کی نطفہ سے تخلیق کی ہے، اسی کے ہاتھ میں بادشاہی ہے، جسے چاہے عزت اور جسے چاہے ذلت دے، کوئی جاندار نہیں مگر وہ اس کی پیشانی کو تھامے ہوئے ہے (یہ سب مختلف قرآنی آیات کا ترجمہ ہے) پس بندوں کے قلوب ونواصی (پیشانیاں) اس کے دستِ قدرت میں ہیں اور ان کے دل رحمٰن کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان ہیں جس طرف چاہے دلوں کو پھیر دے، وہی ہنساتا اور رلاتا، مالدار اور فقیر بناتا ہے اسی کے حکم سے بارشیں برستی اور ہوائیں چلتی ہیں، آسمان سے پانی نازل کر کے مردہ پڑی زمین کو زندہ کرتا اور کھیتیاں اگاتا ہے (آگے بھی اس نکتہ پر آیات اور ان کا نچوڑ پیش کی) تو یہ اور ان سے مشابہ معانی ربوبیت، ملک، خلق، رزق، ہدایت، نصرت، احسان و براور تدبیر وصنعت گری اور جو ان کے ساتھ متصل و منسلک ہے کہ وہ ہر شئ کا علیم اور ہر شئ پر قدیر اور سمیع و بصیر ہے ہر ایک کی سنتا ہے، بیک وقت مختلف لوگوں کی دعائیں سنتا ہے اسے کوئی مشکل پیش نہیں آتی اور نہ وہ تنگ پڑتا ہے، کالی سیاہ رات میں سیاہ چٹان پر رینگنے والی کالی چیونٹی کے چلنے کی آواز بھی سنتا ہے پھر اس کے ساتھ ساتھ اس نے ہر شئ کو اس کی خلق عطا کی پھر ہدایت دی (یعنی جینے اور عمرِ عزیز بِتانے کے طریقوں سے آشنا کیا) اور یہ سب بطریقِ احسن کیا اور تخلیقِ انسانی کا آغاز مٹی سے کیا، ہر خیر اس کے قبضۂ قدرت میں ہے وہ ارحم الراحمین ہے، بندوں کے ساتھ اس کی مہربانی ماں کی اپنی اولاد کے ساتھ مہربانی اور شفقت سے بڑھ کر ہے جیسا کہ نبی اکرم نے یہ بات قسم کھا کر بیان فرمائی اور یہ سب معانی اس کی رحمت کی وسعت اور اس کی عظمت پر دال ہیں اور اس کی رحمت اس کے غضب سے سابق ہے، یہ سب حق ہے۔

تو یہ دونوں اصول:

اول عمومِ خلق اوراس کی ربوبیت اوردوم اس کا عمومِ احسان اوراس کی حکمت عظیم اصول ہیں اگر چہ کئی لوگ اول کے بعض کے منکر ہیں مثلاً قدریہ جو بندوں کے افعال کواس کی خلق سے خارج کرتے ہیں اورانہیں خالص ذی اختیار کےفعل کی طرف مضاف کرتے ہیں یا جیسے طبعیہ (یعنی نیچری) جواللہ سبحانہ کی طرف سے اضافتِ فعل کا قطع کرتے ہیں اورانہیں یا تو فطرت کی طرف منسوب ومضاف کرتے ہیں یا پھراس جسم کی طرف جس میں طبع ہے، یا فلک کی طرف یا نفس کی طرف یا کسی دیگر کی طرف جواس کی مخلوقات میں سے ہےاور جواپنی اقامتِ نفس سے عاجز ہے اپنے غیر کی اقامت سے اعجز ہوگا،بعض حضرات ثانی کا انکار یااس سے اعراض کرتے ہیں یہ توہم کرتے ہوئے کہ اس کی سب مخلوقات اللہ کے احسانِ خلق واتقان سے خالی ہیں اوراس کی حکمت سے وہ اس کی رحمت کوقاصر و عاجز قرار دیتے ہیں، یہ قدریہ ابلیسیہ مجوسی وغیرہم ہیں جبکہ اہل سنت والجماعت کا عقیدہ یہ ہے کہ تمام کائنات اس کی آیات،شاہد، دال اورمظہر ہیں اس کا جس کا وہ اسمائے حسنی اورصفاتِ علیٰ میں سے مستحق ہےاوراس کے اسماء وصفات کا مقتضا تخلیقِ کائنات ہےتورحم رحمٰن سے ماخوذ ہے،اس نے رحم کی تخلیق کی اوراپنے اسم (یعنی رحمٰن) سےمشتق کر کےاسے یہ نام دیا، یہ سب جہان اس کےاسماء وصفات کے آثار سے بھرے پڑے ہیں ہرشئ اپنی اپنی زبان میں اسکی حمد کے ساتھ رطب اللسان ہےجنہیں عوام الناس نہیں سمجھتے البتہ بعض لوگ ان کی تسبیحات میں موجود دلالت وشہادت کا خود کوعطا شدہ علم ومعرفت کی وجہ سے ادراک کر لیتے ہیں اور جسے اللہ نے مافوق العادت قوتِ سامعہ سےنوازا وہ پہاڑوں اورطیور کی آہ وزاری کوسنتا ہےاوراسے پرندوں کی بولی بھی سمجھ آتی ہے، جب اس کےظہور وتجلی کواس معنی کے ساتھ مفسر کیا جائے تو یہ صحیح ہے البتہ ظہوراور تجلی کےلفظ میں اجمال ہے،ہم آگےاس کی تبیین کریں گے

اگرکوئی قائل کہے: میں نے کوئی شئ نہیں دیکھی مگر (رَاَیْتُ اللّٰهَ قَبْلَهٗ) (اس سےقبل اللہ کودیکھا) کیونکہ وہ اس کا رب ہےاوررب عبد پرمتقدم ہوتا ہے یا کہے: (رَاَیْتُ اللّٰهَ بَعْدَهٗ) (اس کے بعداللہ کودیکھا) کیونکہ وہ اس کی نشانی، دلیل اور شاہد ہےاورمدلول کاعلم دلیل (جاننے) کے بعدہی ہوتا ہے یا کہے:(رَاَیْتُ اللّٰهَ فِیْهِ)(اس میں اللہ کودیکھا)اس معنی میں کہ اس کی صنعت میں صانع کے آثار کاظہور ہےتو یہ صحیح ہے بلکہ ساراقرآن اسے بیان کرتا اوراس پر دلالت کرتا ہےاور یہی مرسلین کا دین اوران لوگوں کا راستہ ہے جن پر انعامِ خداوندی ہوا نبیوں،صدیقوں،شہیدوں اورصالحین میں سے اور یہی اہل سنت والجماعت کےمسلمانوں کاعقیدہ ہےاور جواہلِ علم وایمان میں سے ان میں داخل ہیں اورمعرفت ویقین والےمتقی اولیاء کا بھی۔

فصل

اس ضمن میں ایک غلط فہمی کا ازالہ:

کثیر اللہ کی طرف توجہ والے جب اس کے ذکراوراس کی عبادت وانابت پرمتوجہ ہوتے ہیں تواپنے قلوب کے ساتھ وہ اس جامع ربوبیت کی گواہی دے رہے ہوتے ہیں اوراس عام احاطہ کی کہ اللہ تعالیٰ ہرشئ کومحیط ہے، اللہ کے ہاں لیل ونہار (کا یہ

تصور) نہیں، سماوات کا نور اس کے چہرہِ اقدس کے نور سے ہے، ابن مسعود نے یہی کہا تھا کہ وہ سوتا نہیں اور اسے سونا چاہئے بھی نہیں، اس کی طرف رات کا عمل دن کے عمل سے اور دن کا عمل رات کے عمل سے قبل پیش کیا جاتا ہے، اس کا حجاب نور ہے اگر اس حجاب کو اٹھا دے تو اس کے چہرہ کے نقوش تمام کائنات کو جلا دیں، یہ بات نبی اکرم نے صحیحین کی حضرت ابوموسی سے نقل کردہ ایک حدیث میں کہی، کبھی بندہ مصنوعات کے مابین قدرِ مشترک کا مشاہدہ کرتا ہے اور وہ ان میں موجود حق کا جو ان سب کو شامل ہے تو وہ انہیں ہی خالق خیال کرنے لگتا ہے اس کے ایک عمومی نوع میں اپنے لئے مطابقت کے مدنظر حالانکہ یہ دراصل اس کی خلق اور صنعت گری ہے پھر کبھی اس کا طائرِ خیال اس کے نوری یا ناری حجب میں سے حجاب کی طرف پرواز کرتا ہے تو اسے وہ (یعنی وجودِ باری تعالیٰ) خیال کرتا ہے پھر اس کے نور اور اس کی صفات کے ظاہری اثر کی طرف مرتقی ہوتا ہے تو بعض لوگ اہلِ اتحادِ مطلق و عام کے نظریہ میں واقع ہو جاتے ہیں اگر اللہ اپنی رحمت کے ساتھ ان کا تدارُک کر لے تب تو اس کی رسی کو تھام کر اور اس کی ہدایت کی اتباع کر کے صراطِ مستقیم کی طرف پلٹ آتے ہیں اور جان لیتے ہیں کہ یہ سب اللہ کی مخلوق ہیں اور خالق مخلوق نہیں اور وہ سب اس کے بندے ہیں کئی دفعہ ایسے بعض حضرات ایک نوعِ فناء وسکر میں واقع ہو جاتے ہیں تو یوں مخطئ اور غلط کار بن جاتے ہیں اگرچہ اس حالت کے افعال واقوال معاف شدہ ہیں اگر یہ حالت (جیسا کہ قبل ازیں کہا) کسی محظور سبب سے نہیں۔

فصل

بندہ جس طرح اللہ کی ربوبیت اور اس کی ہمہ گیر تدبیرِ عالم اور اس کی حکمت ورحمت کا شاہد ہے اسی طرح اس کی عمومی الوہیت کا بھی ہے، وہی ارض وسماء میں الہ ہے کوئی اور اس کے سوا نہیں **﴿يَسْـَٔلُهُۥ مَن فِى ٱلسَّمَـٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضِ ۚ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِى شَأْنٍ﴾** **[الرحمن: ۲۹]** (آسمان اور زمین میں جتنے لوگ ہیں سب اسی سے مانگتے ہیں وہ ہر روز کام میں مصروف رہتا ہے)

﴿وَهُوَ ٱللَّهُ فِى ٱلسَّمَـٰوَٰتِ وَفِى ٱلْأَرْضِ ۖ يَعْلَمُ سِرَّكُمْ وَجَهْرَكُمْ وَيَعْلَمُ مَا تَكْسِبُونَ﴾[الأنعام: ۳] (اور آسمان اور زمین میں وہی اللہ ہے تمہاری پوشیدہ اور ظاہر سب باتیں جانتا ہے اور جو تم عمل کرتے ہو سب سے واقف ہے) دو میں سے ایک قول پر، ان حضرات کے قول پر جو(وَفِي الأرض) پر وقف کرتے ہیں تو معنی یہ ہوا کہ: وہ سماوات میں اللہ ہے اور زمین میں (بھی) اللہ ہے، ان دونوں میں کوئی اور نہیں جو اللہ ہو، یہ اگرچہ اس آیت کے مشابہ ہے: **﴿وَهُوَ ٱلَّذِى فِى ٱلسَّمَآءِ إِلَـٰهٌ وَفِى ٱلْأَرْضِ إِلَـٰهٌ﴾**[الزخرف: **۸۴**] (اور وہی آسمانوں میں معبود ہے اور زمین میں معبود ہے) البتہ وہ اس سے ابلغ ہے اور اس کی نظیر یہ آیت ہے:

﴿لَوْ كَانَ فِيهِمَآ ءَالِهَةٌ إِلَّا ٱللَّهُ لَفَسَدَتَا﴾[الأنبياء: **۲۲**] (اگر آسمان اور زمین میں اللہ کے سوا اور معبود ہوتے تو زمین و آسمان درہم برہم ہو جاتے) اور یہ بھی کہا:

﴿وَلَهُ ٱلْمَثَلُ ٱلْأَعْلَىٰ فِى ٱلسَّمَـٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضِ ۚ وَهُوَ ٱلْعَزِيزُ ٱلْحَكِيمُ﴾[الروم: **۲۷**] (اور آسمانوں اور زمین میں اُس

کی شان بہت بلند ہے اور وہ غالب حکمت والا ہے) اور کہا:

﴿ تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ﴾[الإسراء : ۴۴] (ساتوں آسمان اور زمین اور جولوگ ان میں ہیں سب اُسی کی تسبیح کرتے ہیں اور کوئی چیز نہیں مگر اُس کی تعریف کیساتھ تسبیح کرتی ہے لیکن تم اُن کی تسبیح کو نہیں سمجھتے) اور:

﴿اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ﴾[آل عمران:۸۳] (کیا یہ اللہ کے دین کے سوا کسی اور دین کے طالب ہیں حالانکہ سب آسمان و زمین خوشی یا زبردستی سے اللہ کے فرمانبردار ہیں اور اُسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں) اور:

﴿وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ﴾[الرعد : ۱۵] (اور جتنی مخلوقات آسمانوں اور زمین میں ہے خوشی سے یا زبردستی سے اللہ کے آگے سجدہ کرتی ہیں اور اُن کی سائے بھی صبح وشام کرتے ہیں)

﴿ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ﴾[الحج: ۱۸] (کیا تم نے نہیں دیکھا کہ جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے اور سورج اور چاند اور ستارے اور پہاڑ اور درخت اور چوپائے اور بہت سے انسان اللہ کو سجدہ کرتے ہیں اور بہت سے لوگ)

﴿ وَلَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾[الأنبياء: ۱۹] (اور جو لوگ آسمانوں میں اور جو زمین میں ہیں سب اُسی کے ہیں)

﴿سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ﴾[الحديد: ۱] (جو مخلوق آسمانوں اور زمین میں ہے اللہ کی تسبیح کرتی ہے اور وہ غالب حکمت والا ہے)اور اس کے نحو آیات جن میں اس کی الوہیت کے معانی مذکور ہیں اور کائنات کے اس کے سامنے خضوع وتسلیم اور محتاجگی کا ذکر ہے اور یہ کہ تمام خلق اسکے سامنے دعا بدست ہے یا تو دعائے عبادت یا دعائے مسئلہ (یعنی مانگ اور طلب) یا دونوں اکٹھی اور جس نے وقتِ اختیار میں اس سے اعراض کیا:

﴿وَاِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِي الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُوْنَ اِلَّا اِيَّاهُ﴾[الإسراء :۶۷] (اور جب تمہیں سمندر میں تکلیف پہنچتی ہے تو جن کو تم پکارتے ہو سب اس کے سوا گُم ہو جاتے ہیں)

﴿اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ﴾[النمل : ۶۲] (بھلا کون بیقرار کی التجا قبول کرتا ہے؟ جب وہ اس سے دعا کرتا ہے)

اور ہم گواہی دیتے ہیں کہ اس کے عرش (کے پانی پر ہونے) سے لے کر اس کی زمین کے قرار تک اس کے سوا ہر وہ جسے لوگوں نے اپنا معبود بنایا، باطل ہے جیسا کہ ہم گواہ ہیں کہ پوری کائنات اپنے مبدا اور منتہا میں اس کی محتاج ہے اس کے سہارے کے بغیر کچھ بھی قائم نہیں، تو یہ معانی جن میں کائنات کے صرف اسی کیلئے تا ٔلہ اور اس کے ساتھ ان کے جڑے ہونے کا ذکر ہے اور وہ قبل

ازیں ذکر شدہ معانی جن میں اس کی ان کیلئے ربوبیت اور خلق کا ذکر ہے یہ اس امر کا موجب ہے کہ بندے کو پتہ ہو کہ وہ رب الناس، مالک الناس، الہ الناس اور رب العالمین ہے، بجز اس کے کوئی الہ نہیں اور کائنات میں سے کوئی خود کفیل نہیں بلکہ اس کے بغیر سب عدمِ محض اور نفیِ صرف ہے! جو بھی یہاں وجود ہے اسی سے ہے اور اسی کے ساتھ ہے پھر اسی کی طرف سب کا مصیر و مرجع ہے وہی ان کا معبود اور الہ ہے کوئی اور اس کا حقدار ہی نہیں جیسا کہ اس کے سوا کوئی خالق بھی نہیں اور نہ کوئی اور ان صفاتِ الوہیت کے ساتھ متصف اور اس کا سمیّ (ہم نام) ہے اور نہ اس کی مثل کوئی شیٔ ہے، پس وہ اول ہے جس سے قبل کچھ نہ تھا اور وہ آخر ہے جس کے بعد کوئی شیٔ نہیں، وہی ظاہر ہے جس کے اوپر کوئی شیٔ نہیں، وہی باطن ہے جس سے ماوراء کوئی شیٔ نہیں، وہ ہمارے ساتھ ہے جہاں بھی ہم ہوں اور ہم جانتے ہیں کہ اس کی اپنے بندوں کی معیت کئی انواع پر ہے اور وہ اس ضمن میں درجات ہیں اسی طرح اس کی ان کیلئے ربوبیت اور ان کی اس کیلئے عبودیت ہے جس کے ساتھ وہ اس کے عابد ہیں اسی طرح ان کے اسے الہ ماننے کا مسئلہ اور اللہ کی ان کیلئے الوہیت کا اور اس کے ان سے اور ان کے اس سے قرب کا۔

فصل

یہ اس بابت جو کسی معین فرد مثلاً نبی یا مردِ صالح میں اتحاد یا حلول سے مشابہ ہے، ہم اس ضمن خالص حق اور باطل کے ساتھ ممتزج حق کا بیان کر چکے ہیں اور اب چاہتے ہیں کہ خالص باطل نظریہ و تصور بارے کچھ بیان کریں، یہ قسم دراصل ان افراد کی بابت واقع ہے جو اللہ سبحانہ کی عبادت کرتے ہیں اور وہی ان کا متولی ہے یا اس کا ظن یہی ہے اور اعتقاد رکھتا ہے کہ اس وجہ سے اللہ کے بندے میں الوہیت اور بندے کی اپنے رب کی طرف انابت ظاہر کرتی ہے، اس کی اس کیلئے موافقت، اس کی محبت و رضا اور امر و نہی میں کبھی اس کے ساتھ ایک اور قسم مشتبہ ہو جاتی ہے اور یہ وہ جو رب تعالیٰ اپنی ربوبیت کے آثار میں سے کچھ اپنے بعض بندوں میں ظاہر کرتا ہے اگرچہ وہ اس کے ساتھ مامور نہیں اور نہ یہ اس کے لئے عبادت ہے، اس امر کی مثل جو وہ بعض مسلط بادشاہوں کو اپنی (صفتِ) مُلک و سلطان میں سے کچھ عطا فرما دیتا ہے جو کبھی مسلم اور کبھی غیر مسلم ہوتے ہیں جیسے فرعون اور چنگیز خان وغیرہما اور پھر جو اپنے بعض بندوں کو مال و دولت کی فراوانی دیتا ہے اور جو بعض مردوں اور عورتوں کو جمال وحسن میں سے وافر قسط عطا کرتا ہے اسی طرح جو علوم و معارف بعض کو عطا کرتا ہے یا طرح طرح کے فوائد، منافع اور انعامات اور کئی انواع کے خارقِ عادت (یعنی غیر معمولی) مکاشفات اور تاثیرات، چاہے یہ مومن ہوں یا کانے دجال جیسے کافر، تو اس قسم میں کسی معین بندے میں اس طرح کے آثارِ ربوبیت اور احکامِ قدرت ظاہر ہوتے ہیں جن سے دیگر محروم ہیں جیسے قسم اول کے لوگوں میں ایسے آثارِ الوہیت اور احکامِ شرع ظاہر اور قائم ہوتے ہیں جو ان کے غیر کی نسبت اکثر ہیں، کبھی یہ دونوں قسمیں ایک فرد میں مجتمع ہو جاتی ہیں جیسا کہ ملائکہ، انبیاء اور اولیاء میں سے کئی میں مجتمع ہوئیں مثلاً ہمارے نبیؐ اور حضرت مسیحؑ بن مریمؑ وغیرہما

توا کیلی یہ قسم کلماتِ کونیہ کے احکام میں کافی ہے جیسے قسم اول دینی کلمات کے احکام میں ہے کہ حوادث اللہ کی مشیت اور اس کی قدرت سے ہی ہوتے ہیں اور نبی اکرم خود بھی ۔اورامت کو بھی اس کی تعلیم دی۔ اللہ کے تام کلمات جن سے کوئی نیک و بد متجاوز نہیں ہوسکتا، کے ساتھ پناہ کے طالب ہوا کرتے تھے توان کلمات سے جن کے ساتھ اللہ نے کائنات تشکیل دی سے کوئی نیک و بد خارج نہیں تو کوئی اقتدار و بادشاہی، مال و جمال، علم و حال اور کشف و تصرف نہیں مگر اسی کی مشیت اور قدرت اور کلمات تامہ کے ساتھ لیکن اس ضمن میں کچھ وہ امور ہیں جو اللہ کو محبوب ہیں اور وہ مامور بہ ہیں اور کچھ ایسے جو اسے مکروہ اور منہی عنہ ہیں بلکہ کئی مباح اور قابلِ عفو بھی ہیں اور اگر یہ اللہ کی مشیت اور اس کی قدرت اور اس کے کلمہ کے ساتھ واقع ہیں اور ان پر اس کا غیر قادر نہیں اور یہ اللہ کی طرف مضاف ہیں اس کی ربوبیت اور بادشاہی کی جہت سے تو اس کے اور قسمِ اول کے درمیان ایسا اشتراک اور تشابہ ہے جو کچھ افراد کے اللہ کے باب میں غلطی کرنے کا موجب بنا تو انہوں نے اسے دو قسموں میں ایک کر ڈالا بلکہ انہوں نے خود رب تعالیٰ کے ضمن میں غلطی کی تو (قسمِ ثانی میں سے) بعض معبود عباد کو قسمِ اول کے بعض عابد عباد کے ساتھ ملحق کر دیا اور اس وجہ سے وہ اتحاد و حلول میں داخل ہو گئے حتیٰ کئی نے فرعون و دجال (جیسوں) کو معبود پکڑا اور کئی اور نے خوبصورت تصاویر وغیرہ کو اور یہ زعم کیا کہ یہ مظاہرِ جمال ہیں تو ان حضرات نے کبھی عبادات اور ایمان کے ساتھ اور کبھی معبود کے ساتھ، کفر کیا جب یہاں مقصود اس میں سے حق کا بیان ہے یا وہ جس میں حق ہے تو درجِ ذیل معروضات کیں

جہاں تک اول ! تو اللہ تعالیٰ نے قرآن اور ایمان کے ساتھ اپنے امرِ دینی اور خلقِ کونی کے مابین تفرقہ کیا ہے تو وہ سبحانہ و تعالیٰ ہر شئ کا خالق، مالک اور رب ہے، اس ضمن میں ذوات اور ان کی صفات و افعال ایک برابر ہیں اور ہر کام اس کی مشیت سے ہوتا ہے، کچھ بھی اس کے دائرۂ مشیت سے خارج نہیں، اس امت اور دیگر امم کے قدریہ مجوسیہ نے ان مذکورات میں سے بعض کا انکار کیا اور یہ زعم کیا کہ اللہ فرشتوں، جن و انس اور بہائم میں سے اپنے عباد کے افعال کا خالق نہیں ہے اور نہ اس کے بس میں ہے کہ ان کے ساتھ مزید خیر کا معاملہ کرے بلکہ وہ ان کے افعال پر بھی قادر نہیں اور یوں وہ ہر شئ پر قادر نہیں یا بالفاظِ دیگر سیآت اور برائیوں میں سے جو کچھ ہوتا ہے وہ اس کی مرضی اور ارادہ کے بغیر ہے، یہ گمراہ اور بدعتی کتاب و سنت اور سلفِ امت کے اجماع کے مخالف ہیں اور اس کے جو عقل و ذوق کے ساتھ معروف ہے پھر ان کے بالمقابل ان سے بھی بدتر حضرات ہیں اور یہ قدریہ مشرکیہ جن کی رائے میں تمام افعال اللہ کی مشیت اور ارادہ سے ہی صادر ہوتے ہیں، یہ قائل ہیں کہ:

﴿لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ﴾[الأنعام: **۱۴۸**] (اگر اللہ چاہتا تو ہم شرک نہ کرتے اور نہ ہمارے باپ دادا کرتے اور نہ ہم کسی چیز کو حرام ٹھہراتے) اور اگر کوئی شئ اللہ کو ناپسند ہے تو وہ اسے زائل کر دیتا ہے اور کائنات میں وہی کچھ ہے جو اسے پسند اور محبوب ہے اور کوئی بھی یہاں عاصی نہیں اور جو کسی امر (خداوندی) کا عاصی اور کافر ہے وہ امر کا تو عاصی مگر (اللہ کے) ارادہ کا

مطیع ہے، یہ بسا اوقات جبر کے ساتھ استدلال کرتے ہیں اور بندے کو مجبورِ محض قرار دیتے ہیں کہ وہ معذور ہے اور اس سے جو بھی فعل صادر ہو وہ اللہ کیلئے ہے نہ کہ اس کے لئے لہذا اس پر کوئی لوم نہیں، یہ اللہ کی کتب، رسل، اوامر ونواہی، ثواب وعقاب، وعد ووعید اور اس کے دین وشرع کے منکر و کافر ہیں، ایسا کفر جس میں کوئی شک نہیں، یہ یہود ونصاریٰ بلکہ صابی اور ان برہمنوں سے بھی بڑے کافر ہیں جو عقلی سیاسیات کے قائل ہیں، یہ لوگ الوہی شرائع اور دیانات کے کافر ہیں اسی طرح آیات اور سیاسیاتِ عقلیہ کے بھی، جہاں تک پہلے حضرات تو ان کی تکفیر میں تفصیل ہے جس کے بیان کا یہ محل ومقام نہیں، اور یہ حضرات اللہ اور اس کے تمام رسل کے اعداء ہیں بلکہ سب عقلائے بنی آدم کے بلکہ اپنے آپ کے بھی کہ ان کے نظریات ایک ساعت کیلئے بھی قابلِ عمل نہیں کیونکہ ان کے بموجب کسی ظالم کا ہاتھ نہ روکا جائے اور نہ کسی مجرم کو سزا ملے اور کسی سے کوئی حساب کتاب اور پوچھ گچھ نہ ہو، چاہے جو مرضی کرتا پھرے، ان میں سے اکثر اپنی نفسانی خواہشات کی پیروی کے وقت ہی یہ باتیں کرتے ہیں تا کہ کوئی انہیں ملامت کا نشانہ نہ بنائے وگرنہ اگر کوئی اوران پر ظلم یا زیادتی کرے تب انہیں اپنے یہ نظریات یاد نہ رہیں گے (یعنی اب اتنے بھی پاگل نہیں) یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا مصداق ہیں:

وَ حَمَلَهَا الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا[فاطر: **۷۲**] (اور انسان نے اس کو اٹھا لیا بے شک وہ ناعاقبت اندیش اور لا پرواہ تھا) یہ عادی (یعنی حملہ کرنے والے) درندے ہیں جو اپنی نفسانی خواہشات کے غلام بنے ہوئے ہیں اور پھر باطل کا سہارا لے کر اپنے آپ سے لوم وتنقید دور کرنے کا ناکام سعی وکوشش کرتے ہیں اور تقدیر کا سہارا لے کر من چاہی کاروائیاں کرنا چاہتے اور امر ونہی سے اعراض کرتے ہیں اور دوسروں کی نسبت یہ عذر اور تقدیر کا یہ سہارا لینا خود ان کیلئے ناقابلِ قبول ہے، میں نے ایک جگہ تفصیل کے ساتھ ان قدریہ ابلیسیہ اور قسمِ اول بارے گفتگو کی ہے! یہاں مقصود فقط ان کے گنجلک اقوال کی نشاندہی تھی، اللہ نے اپنی کتاب میں ان دونوں اقسام کے مابین تفریق کی ہے، ایک وہ جو اللہ کے کونی کلمات کے ساتھ قائم ہیں اور دوم جو اس کے دینی کلمات کی پیروی کرتے ہیں اور یہ اس کے امر، ارادہ، قضاء وحکم، اذن، بعث اور ارسال میں، تو دینی وشرعی امر بارے کہا:

﴿اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ﴾ [یٰس: **۸۲**] (اس کی شان یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس سے کہتا ہے ہو جاؤ تو وہ ہو جاتی ہے)

﴿اَتٰٓى اَمْرُ اللّٰهِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ﴾[النحل: **۱**] (اللہ کا حکم آ ہی پہنچا تو اس کیلئے جلدی مت کرو)

﴿وَاِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا﴾ [الإسراء: **۱۶**] (اور جب ہمارا ارادہ کسی بستی کو ہلاک کرنے کا ہوا تو وہاں کے آسودہ حال لوگوں کو فسق پر مامور کر دیا) ایک قول کے مطابق، جبکہ شرعی ودینی ارادہ کے ضمن میں کہا:

﴿يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ﴾[البقرة: ۱۸۵] (اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ آسانی چاہتا ہے اور سختی نہیں چاہتا)

﴿يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَيَتُوْبَ عَلَيْكُمْ﴾[النساء: ۲۶] (اللہ چاہتا ہے کہ تم

سے کھول کھول کر بیان فرمائے اور تمہیں اگلے لوگوں کے طریقے بتائے اور تم پر مہربانی کرے)

﴿مَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُم مِّنْ حَرَجٍ﴾[المائدۃ :۶] (اللہ تعالیٰ تم پر کسی طرح کی تنگی نہیں کرنی چاہتا) اور کونی قدری ارادہ کی بابت ارشاد کیا:

﴿فَمَن يُرِدِ اللَّهُ أَن يَهْدِيَهُ يَشْرَحْ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ وَمَن يُرِدْ أَن يُضِلَّهُ يَجْعَلْ صَدْرَهُ ضَيِّقًا حَرَجًا﴾[الأنعام :۱۲۵] (تو جس شخص کو اللہ چاہتا ہے کہ ہدایت بخشے اُس کا سینہ اسلام کیلئے کھول دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے کہ گمراہ کرے اس کا سینہ تنگ اور گھٹا ہوا کر دیتا ہے)

﴿وَلَا يَنفَعُكُمْ نُصْحِي إِنْ أَرَدتُّ أَنْ أَنصَحَ لَكُمْ إِن كَانَ اللَّهُ يُرِيدُ أَن يُغْوِيَكُمْ﴾[ھود: ۳۴] (اور اگر میں یہ چاہوں کہ تمہاری خیر خواہی کروں اور اللہ یہ چاہے کہ تمہیں گمراہ کرے تو میری خیر خواہی تمہیں کچھ فائدہ نہیں دے سکتی)

﴿أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَمْ يُرِدِ اللَّهُ أَن يُطَهِّرَ قُلُوبَهُمْ﴾[المائدۃ : ۴۱] (یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے پاک کرنا نہیں چاہا) تو اس جمع وتفریق کے ساتھ امرِ شرعی کے مسئلہ میں شبہ زائل ہو جاتا ہے کہ آیا یہ ارادہِ کونیہ کو مستلزم ہے یا نہیں؟ تحقیق یہ ہے کہ یہ اسے مستلزم نہیں ہے اگر چہ دینی شرعی ارادہ کو مستلزم ہے، اذنِ دینی کے بارہ میں فرمایا:

﴿مَا قَطَعْتُم مِّن لِّينَةٍ أَوْ تَرَكْتُمُوهَا قَائِمَةً عَلَىٰ أُصُولِهَا فَبِإِذْنِ اللَّهِ﴾[الحشر : **۵**] (کھجور کے جو درخت تم نے کاٹ ڈالے یا ان کو اپنی جڑوں پر کھڑا رہنے دیا سو اللہ کے حکم سے تھا) اذنِ کونی بارے کہا:

﴿وَمَا هُم بِضَارِّينَ بِهِ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ﴾[البقرۃ : **۱۰۲**] (اور اللہ کے حکم کے سوا وہ اس سے کسی کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے تھے) اسی طرح قضائے دینی بارے کہا:

﴿وَقَضَىٰ رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ﴾[الإسراء : **۲۳**] (اور تمہارے رب نے ارشاد فرمایا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو) یعنی تمہارے رب نے اس کا حکم دیا ہے اور قضائے کونی بارے کہا:

﴿فَقَضَاهُنَّ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ فِي يَوْمَيْنِ﴾[حم السجدۃ : **۱۲**] (پھر دو دن میں سات آسمان بنائے) حکمِ دینی بارے کہا:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَوْفُوا بِالْعُقُودِ أُحِلَّتْ لَكُم بَهِيمَةُ الْأَنْعَامِ إِلَّا مَا يُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ غَيْرَ مُحِلِّي الصَّيْدِ وَأَنتُمْ حُرُمٌ إِنَّ اللَّهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيدُ﴾[المائدۃ : **۱**] (اے ایمان والو! اپنے اقراروں کو پورا کرو تمہارے لئے چارپائے جانور حلال کر دیئے گئے ہیں بجز اُن کے جو تمہیں پڑھ کر سنائے جاتے ہیں مگر حالتِ احرام میں شکار کو حلال نہ جاننا اللہ تعالیٰ جیسا چاہتا ہے حکم دیتا ہے)

﴿ذَٰلِكُمْ حُكْمُ اللَّهِ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ﴾[الممتحنۃ : ۱۰] (یہ اللہ کا حکم ہے جو تم میں فیصلہ کئے دیتا ہے اور اللہ جاننے والا حکمت

والا ہے)

﴿أَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُونَ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللَّهِ حُكْمًا لِقَوْمٍ يُوقِنُونَ﴾[المائدة: ۵۰] (کیا یہ زمانۂ جاہلیت کے حکم کے خواہشمند ہیں؟ اور جو یقین رکھتے ہیں ان کیلئے اللہ سے اچھا حکم کس کا ہے؟) حکمِ کونی بارے ارشاد کیا:

﴿فَلَنْ أَبْرَحَ الْأَرْضَ حَتَّىٰ يَأْذَنَ لِي أَبِي أَوْ يَحْكُمَ اللَّهُ لِي وَهُوَ خَيْرُ الْحَاكِمِينَ﴾[یوسف: ۸۰] (تو جب تک والد صاحب مجھے حکم نہ دیں میں تو اس جگہ سے ہلنے کا نہیں یا اللہ تعالیٰ میرے لئے کوئی اور تدبیر کرے اور وہ سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے) درجِ ذیل آیت میں ان دونوں حکموں کو یکجا کیا:

﴿إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ﴾ [الأنعام: ۵۷] (حکم اللہ ہی لئے ہے) اسی طرح اس کا فعل: (﴿وَاللَّهُ يَقْضِي بِالْحَقِّ﴾[الغافر: ۲۰] (اور اللہ حق کے ساتھ حکم فرماتا ہے) دونوں اقسام کے بعث وارسال بارے کہا:

﴿هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِنْهُمْ﴾ [الجمعة: ۲] (وہی تو ہے جس نے بے کتاب قوم میں انہی میں سے رسول بھیجا) اور:

﴿بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَنَا أُولِي بَأْسٍ شَدِيدٍ﴾[الإسراء: ۵] (ہم نے اپنے سخت لڑائی لڑنے والے بندے تم پر مسلط کر دیئے) اور قولہ: ﴿إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا﴾[الأحزاب: ۴۵] (بے شک ہم نے تم کو گواہی دینے والا اور خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے)

﴿لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ﴾[الحديد: ۲۵] (ہم نے اپنے پیغمبروں کو کھلی نشانیاں دے کر بھیجا)

﴿أَنَّا أَرْسَلْنَا الشَّيَاطِينَ عَلَى الْكَافِرِينَ تَؤُزُّهُمْ أَزًّا﴾[مریم: ۸۳](ہم نے شیطانوں کو کافروں پر چھوڑ رکھا ہے کہ وہ ان کو برانگیختہ کرتے رہتے ہیں) ﴿وَأَرْسَلْنَا الرِّيَاحَ لَوَاقِحَ﴾[الحجر: ۲۲] (اور ہم نے ہوائیں چلائیں بھری ہوئی)۔

فصل

جہاں تک معبود کے ساتھ ان کا کفر تو اگر کسی مخلوق سے ان کی ہوائے نفس متعلق ہو تو کبھی حلول یا اتحادِ فاسد کے شبہ میں اس کی عبادت کرتے ہیں جیسے وہ جو خوبصورت صورتوں کی پوجا کرتے اور کہتے ہیں یہ مظہرِ جمال ہیں یا کسی جابر سخت گیر بادشاہ کی اور کہتے ہیں یہ مظہرِ جلال ہے یا مظہرِ ربانی وغیرہ، ان مخلوقات میں اتحاد یا حلول کی کوئی نوع نہیں البتہ اس میں جو ہے وہ حق سے اس جہت سے مشابہ ہے کہ دونوں اللہ کے ساتھ اور اللہ سے اور وہ اللہ کیلئے ہیں اسی لئے اہلِ حلول اور اتحادِ مطلق کے قائلین ان دونوں کے مابین تسویہ کرتے ہیں، آگے ان شاء اللہ اس کی وضاحت کریں گے

تو یہ اتحادیہ اور حلولیہ جو اسے بعض مصنوعات کے ساتھ خاص کرتے ہیں، وہ جن میں عبادت واثابت نہیں، ان حضرات

پر فرع ہیں، ان کے ساتھ حق کی ایک رمق بھی نہیں جیسے ان کے ساتھ بعض انبیاء اور صالحین کے بعض متشابہ الفاظ ہیں، لیکن ان کے ساتھ فرعون کا قول: **﴿أَنَا رَبُّكُمُ الْأَعْلَىٰ﴾** [النازعات : **۲۴**] (کہ تمہارا رب اعلیٰ ہوں) اور: **﴿مَا عَلِمْتُ لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرِي﴾** [القصص : **۳۸**] (میں تمہارا اپنے سوا کسی کو معبود نہیں جانتا) اور قولِ دجال: (أَنَا رَبُّكُمْ) (میں تمہارا رب ہوں) ونحوہا ہے! تو یہ الفاظ جو ان کے ساتھ ہیں کفار اور منافقین کے الفاظ ہیں اور ان کے ساتھ کونیات کی دینیات کے ساتھ تشبیہ ہے اور کونیات عام ہیں، ان میں اختصاص نہیں اسی لئے یہ حضرات معین میں اتحاد وحلول کی بات کرنے سے زیادہ اعتقاداً اور قولاً مطلق اتحاد اور حلول میں دخیل ہیں اگرچہ حال اور ہویٰ کی جہت سے یہ بعض اعیان کی تخصیص کرتے ہیں جیسا کہ امرِ واقع ہے بعض کونی احکام کے ساتھ اس کے شبہ اختصاص کے مدِ نظر، آگے اس نکتہ پر بات ہوگی یہاں اسلئے ان کا ذکر کر دیا کیونکہ ارادہ تھا کہ ہر اس کا ذکر کروں جس میں اتحاد یا حلول بحق کا شائبہ ہے تا کہ ان کے محلِ ضلال کی نشاندہی ہو، جب ان امور کی حقیقت کا علم ہوا تو اس سے نبی اکرم کے حضرت لبید کے اس شعر کو کسی بھی شاعر کا کہا ہوا سچا ترین جملہ قرار دینے کی حقیقت ظاہر ہوئی: (اَلَا كُلُّ شَيْءٍ مَا خَلَا اللّٰهَ بَاطِلٌ) (کہ اللہ کے سوا ہر چیز باطل [یعنی بے حقیقت] ہے)

کیونکہ باطل حق کی ضد اور عکس ہے اور اللہ ہی حقِ مبین ہے، حق کے دو معانی ہیں: ایک ثابت وجود اور دوم نافع مقصود جیسے یہ فرمانِ نبوی ہے: (اَلْـوِتْـرُ حَـقٌّ) اسی طرح باطل کی بھی دو انواع ہیں: ایک معدوم، اور جب یہ معدوم ہو تو اس کے وجود کا اعتقاد اور اس کے وجود بارے خبر دینا باطل ہوگا کیونکہ اعتقاد اور خبر معتقد مخبر عنہ کے تابع ہیں، اس کی صحت کے ساتھ صحیح اور اس کے بطلان کی صورت میں باطل ہوں گے، اور دوم جو نافع اور مفید نہیں جیسے فرمایا: **﴿وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاءَ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا﴾** [ص : **۲۷**] (اور ہم نے آسمان اور زمین کو اور جو کائنات ان میں ہے اس کو خالی از مصلحت نہیں پیدا کیا) اور جیسے نبی اکرم کی یہ حدیث: (كُلُّ لَهْوٍ يَلْهُوْ بِهِ الرَّجُلِ فَهُوَ بَاطِلٌ اِلَّا رَمْيُهٗ بِقَوْسِهٖ وَ تَأْدِيْبُهٗ فَرَسَهٗ وَ مُلَاعَبَتُهٗ امْرَأَتَهٗ فَإِنَّهُنَّ مِنَ الْحَقِّ) (گزری) اور حضرت عمر کے بارہ میں آپ کا کہنا: یہ ایسا شخص ہے جو باطل کو پسند نہیں کرتا اور اسے بھی جس میں منفعت نہ ہو، تو اس کا حکم دینا اور اس کا قصد کرنا اور عمل کرنا باطل ہے، اسی سے علماء نے کہا کہ عبادات اور عقائد کی دو اقسام ہیں: صحیح اور باطل، صحیح وہ جس پہ اس کا اثر مرتب ہو اور حصولِ مقصود ہو اور باطل جو ایسا نہ ہو اسی لئے کفار کے اعمال باطل ہیں، تو کافر اپنے کافر ہونے کی جہت سے ایسی چیز کا اعتقاد رکھتا ہے اور اس کی بابت خبر دیتا ہے جس کا وجود نہیں تو یہ باطل شمار ہوگا اور وہ اس چیز کی عبادت کرتا ہے جس کی عبادت اس کے لئے نافع نہیں اور اسی کیلئے عمل کرتا اور اس کا امر دیتا ہے تو یہ بھی باطل ہوں گے لیکن جب ان کیلئے ایسے اعمال واقوال ہیں کہ جن کی وجہ سے وہ اہلِ حق کے مشابہ ہوتے ہیں تو اس کے مدِ نظر اللہ تعالیٰ نے کہا:

﴿ وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ بِقِيعَةٍ يَحْسَبُهُ الظَّمْآنُ مَاءً حَتَّىٰ إِذَا جَاءَهُ لَمْ يَجِدْهُ شَيْئًا وَوَجَدَ اللَّهَ

﴿عِنْدَهٗ فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ﴾[النور : ۳۹] (جن لوگوں نے کفر کیا ان کے اعمال کی مثال ایسی ہے جیسے میدان میں ریت کہ پیاسا اسے پانی سمجھے یہاں تک کہ جب اس کے پاس آئے تو اسے کچھ بھی نہ پائے اور اللہ ہی کو اپنے پاس دیکھے تو وہ اس کا حساب پورا پورا چکا دے اور اللہ جلد حساب کرنے والا ہے) اور کہا:

﴿اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ﴾[محمد : ۱] (جن لوگوں نے کفر کیا اور اللہ کے رستے سے روکا اللہ نے ان کے اعمال برباد کر دئے)﴿وَلَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَكُمْ﴾ تک [محمد: ۳۳] اور کہا:

﴿وَقَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا﴾[الفرقان: ۲۳] (اور جو انہوں نے عمل کئے ہوں گے ہم ان کی طرف متوجہ ہوں گے تو ان کو اڑتی خاک کر دیں گے) اور:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى﴾[البقرة : ۲۶۴] (مومنو اپنے صدقات احسان جتلانے اور ایذا دینے سے برباد نہ کر دینا) تو واضح کیا کہ من واذی صدقہ کا ابطال کر کے اسے باطل صدقہ نہ کہ حق صدقہ (یعنی جس پر ثواب ملنا ہو) بنا ڈالتا ہے جیسے ریاکاری اور عدم ایمان بھی انفاق کو ایسا ہی بنا ڈالتے ہیں، اپنے فرمان: ﴿وَلَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَكُمْ﴾ کے ساتھ تعمیم کی یعنی انہیں باطل نہ بناؤ کہ نہ ان میں منفعت ہو اور نہ ثواب اور نہ فائدہ، اتحادیہ وغیرہم جیسے ابن عربی اور ایک گروہ کو غلطی لگی تو رائے دی کہ حق وہ جو موجود ہے تو ہر موجود حق ہے تو کہا: (مَا فِي الْعَالَمِ بَاطِلٌ) (کائنات میں باطل ہے ہی نہیں) کہ عالم میں عدم نہیں ہے

انہوں نے کہا: کفر دراصل شریک کا عدم وجود ہے، تو مجمل لفظ کی جہت سے یہ کہا، شیٔ کے دو مراتب ہیں ایک اس کی ذات کے اعتبار سے مرتبہ تو وہ یا موجود ہے تب وہ حق ہے اور یا معدوم ہے تب وہ باطل ہے اور دوم اذہان، لسان اور بنان میں اس کے وجود کے اعتبار سے مرتبہ اور یہ علم، قول اور کتاب تو اعتقاد، خبر اور تحریر شیٔ کے تابع امور ہیں تو اگر یہ مطابق و موافق ہوں تو حق ہوں گے وگرنہ باطل! تو جب ہم موجود حق بارے خبر دیں کہ وہ حق موجود ہے اور معدوم باطل بارے کہ وہ باطل معدوم ہے تو اعتقاد وخبر حق ہوئے اور اگر بالعکس ہیں تو باطل ہوں گے اور اگر اعتقاد وخبر امر موجود ہیں تو ان کا حق یا باطل ہونا اس کی مخبر عنہا حقیقت کے اعتبار سے ہے نہ کہ اس کی ذات کے اعتبار سے مطلقاً اسے حق قرار دینا مجرد اس کے موجود ہونے کے پیشِ نظر جائز نہ ہوگا مگر کسی قرینہ کے ساتھ جو تبیینِ مراد کرے، اسی طرح عمل، قصد اور امر صرف اپنی حقیقتِ مقصودہ کے اعتبار سے حق ہوں گے تو اگر یہ نافع بن کر حاصل ہوئے تو حق ہیں اور اگر حاصل نہ ہوئے یا حصول کے بعد کوئی منفعت نہ ہوئی تو یہ باطل ہیں اور حق و باطل کی پرکھ اور تمییز کیلئے انہی دونوں اعتباروں کو مدِ نظر رکھا جائے گا جیسا کہ اس پر کتاب وسنت اور اجماع دال ہیں پھر اس کے ساتھ ساتھ عقل، ذوق اور کشف کی موافقت بھی، برخلاف اس کے جو اس گمراہ کن اور گم کردہ راہ گروہ کا زعم ہے، ارشادِ ربانی ہوا:

﴿اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا وَمِمَّا يُوْقِدُوْنَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ

ابْتِغَاءَ حِلْيَةٍ أَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهُ كَذَٰلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً وَأَمَّا مَا يَنفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ كَذَٰلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ﴾[الرعد:۱۷] (اُسی نے آسمان سے مینہ برسایا پھراس سے اپنے اپنے اندازے کے مطابق نالے بہہ نکلے پھر نالے پر پھولا ہوا جھاگ آ گیا اور جس چیز کو زیور یا کوئی اور سامان بنانے کیلئے آگ میں تپاتے ہیں اس میں بھی ایسا ہی جھاگ ہوتا ہے۔اس طرح اللہ حق اور باطل کی مثال بیان فرماتا ہے سو جھاگ تو سوکھ کر زائل ہو جاتا ہے اور جو لوگوں کو فائدہ پہنچاتا ہے وہ زمین میں ٹھہرا رہتا ہے۔اس طرح اللہ مثالیں بیان فرماتا ہے)

تو یوں دلوں پر نازل کردہ ایمان وقرآن جن کے ساتھ شبہات اور مُغوی (یعنی گمراہ کن) اہواء کا اختلاط کرلیا جاتا ہے،کو بارش کے ساتھ تشبیہہ دی جس کا ریلا جھاگ سطح پر لئے نمودار ہوتا ہے اسی طرح سونا چاندی اور لوہا بھی اپنے جلو میں لئے تو جھاگ تو جلد ختم ہو جاتی ہے اور اس سے کوئی منفعت بھی حاصل نہیں ہوتی تو اس کے ساتھ ان باطل شبہات اور خرافات سے کنایہ کیا جن میں کوئی منفعت نہیں اور جو لوگوں کیلئے نافع پانی اور معادن ہیں وہ نافع حق کی مثل ہیں جو دل میں باقی اور قائم ومستقر رہتا ہے، پیچھے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ذکر کیا:﴿الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوا عَن سَبِيلِ اللَّهِ أَضَلَّ أَعْمَالَهُمْ﴾ (گزری) تو اللہ سبحانہ نے خبر دی کہ ان کفار کے بظاہر اچھے اعمال کے اکارت جانے اور اہلِ ایمان کے اعمال کے نافع ہونے کا سبب یہ ہے کہ کفار نے قولاً، فعلاً،اعتقاداً،اقتصاداً،خبراً اور امراً باطل کی پیروی کی جبکہ اہلِ ایمان نے اپنے رب کی طرف سے عطا کردہ حق کی اتباع کی اور اس کے پیچھے نہ لگے جو ان کے رب کے غیر کی طرف سے ہے اگر چہ وہ ایک وجہ سے حق ہی ہو! تو یہ ہماری اس بحث کی تحقیق ہے کہ خبر اور عمل مخبر عنہ کیلئے تابع ہوتے ہیں اور مقصود بالعمل کے بھی تو اگر یہ باطل ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں تو تابع بھی اسی کی مثل ہوگا اگر چہ وہ موجود ہو اسی طرح جو یہ آیت گزری:﴿لَا تُبْطِلُوا صَدَقَاتِكُم﴾ اور﴿وَلَا تُبْطِلُوا أَعْمَالَكُمْ﴾ اور دیگر آیات جن میں موجود عمل کے ابطال کا ذکر ہے تو یہ صرف اس کے عدم فائدہ کے پیشِ نظر ہے نہ کہ عدم ذات کی وجہ سے کہ ان کی ذات غیر مبطل اعمال کی ذوات کی مانند موجود اور ثابت ہے تو یہ کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ کائنات میں باطل کا وجود ہی نہیں؟ پھر اسے اس نظریہ کی بنیاد اور ذریعہ بنایا جائے کہ یہ موجود جس میں حق اور باطل ہے عین اللہ ہے کیونکہ وہ حق ہے اور یوں خالق حق اور مخلوق حق کے درمیان تمییز نہ کی جائے

تو غور کرو کہ کیسے ان کی اس طرح کی کلام ان دو باطل مقدموں پر مشتمل ہے اور وہ کیسے عامیوں کی عقول کو اس شبہ کے ساتھ غلط راہ پر ڈالتے اور خراب کرتے ہیں انہوں نے کہا شاعر کا قول:(أَلَا كُلُّ شَيْءٍ مَا خَلَا اللَّهَ بَاطِلٌ) اور باطل تو معدوم ہے لہذا ہر ماسوا اللہ معدوم ہے اور موجود معدوم نہیں لہذا (ثابت ہوا کہ) موجود میں سوا نہیں کہ سوا تو عدم ہے تو یہ دو باطل مقدموں پر مشتمل ہے ایک: ان کا قول کہ باطل معدوم ہے، تو یہ درست نہیں بلکہ معدوم باطل ہے اور ہر موجود باطل نہیں بلکہ بعض موجودات حق اور بعض باطل ہیں جیسا کہ گزرا اور یہ وہ اعمال جو نافع نہیں اور وہ اِخبار جو سچی نہیں اور جو ان دونوں کے تحت مقاصد

اورعقائد مندرج ہوں اوردوم: کہ اگرصرف معدوم ہی باطل ہو(یعنی اگر یہ نظریہ درست ہو) تو موجود (سب کا سب) حق ہواور ہر موجود کو قرینہ مفسرہ کے ساتھ حق کا نام دیا جا سکے اس کے وجود کے اعتبار سے اگر چہ وہ باطل ہوا پنی حقیقت کے انتفاء کے مدِ نظر جس کی وجہ سے اس پر حق (کے لفظ) کا اطلاق جائز ہوا! لیکن حق دو(طرح کے) ہیں ایک: خالق حق اوردوم مخلوق حق، ابن عباس کی متفق علیہ روایت میں ہے کہ نبی اکرم جب رات کو(تہجد کیلئے) بیدار ہوتے تو کہتے:(اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ اَنْتَ رَبُّ السَّمٰوَاتِ وَالأَرْضِ وَ مَنْ فِیْھِنَّ وَلَکَ الْحَمْدُ اَنْتَ نُوْرُ السَّمٰوَاتِ وَالأَرْضِ وَ مَنْ فِیْھِنَّ وَلَکَ الْحَمْدُ اَنْتَ قَیِّمُ السَّمٰوَاتِ وَالأَرْضِ وَ مَنْ فِیْھِنَّ اَنْتَ الْحَقُّ وَقَوْلُکَ الْحَقُّ وَ وَعْدُکَ حَقٌّ وَالْجَنَّۃُ حَقٌّ وَالنَّارُ حَقٌّ وَالنَّبِیُّوْنَ حَقٌّ وَ مُحَمَّدٌ حَقٌّ اَللّٰھُمَّ لَکَ اَسْلَمْتُ الخ)

اورجب ظاہر ہوا کہ کائنات میں ایسی موجودات بھی ہیں جو فی الحقیقت باطل ہیں تو ان کے قول:(إِنَّ الْبَاطِلَ ھُوَ السِّوٰی) اور (العدم) کی تمویہ(یعنی حقیقت مسخ کرنا) ثابت ہوئی اور یہ کہ جوموجود ہے وہ وہ(یعنی اللہ) ہے! نیز شاعر کا یہ مصرعہ جو حدیث میں مذکور ہوا: (اَلَا کُلُّ شَیْءٍ الخ) ان کے خلاف حجت ہے کہ یہ عام لفظ ہے جس میں ماسوااللہ ہرموجود داخل ہے کہ شیٔ کا لفظ بالاتفاق ہرموجود کو عام ہے اوراس میں وہ بھی داخل ہے جس کیلئے ذہنی وجود ہے اوروہ بھی جس کا لفظی یا رسمی کتابی وجود ہے اورمعدومات اور ناممکنات میں سے وہ بھی جس کیلئے وجودِ حقیقی نہ ہوتو یہ اس امر میں نص ہے کہ کثیر موجودات باطل ہیں اور **مصرعہ سے یہ مراد لینا کہ اللہ کے سوا ہر معدوم باطل ہے درج ذیل وجوہ کی رو سے جائز نہیں**:

۱۔ شاعر نے لفظِ اثبات سے اللہ تعالی کا استثناء کیا ہے اوروہ حق مبین ہے اوراس طرح کا استثناء تناول پر دال ہوتا ہے بخلاف بغیر موجب کے استثناء کے جیسے کہا: (**مَا لَھُمْ بِہٖ مِنْ عِلْمٍ إِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ**) [النساء: **۱۵۷**] (اور پیروئ ظن کے سوا ان کو اُس کا مطلق علم نہیں) تو یہ تناول پر دلالت نہیں کرتا تو اگر تقدیر ہو: (کُلُّ مَعْدُوْمٍ مَا خَلَا اللّٰہَ بَاطِلٌ) تو لازم آئے گا کہ حق تعالی معدوم ہو اور یہ کہنا ابطل الباطل ہو

۲۔ کہ (کُلُّ شَیْءٍ) بالاتفاق وجود میں نص ہے، معدومات پر ہی اسے مقصور جائز نہیں

۳۔ کہ اہل سنت اور عامۃ العقلاء کے نزدیک معدوم (کُلُّ شَیْءٍ) میں داخل نہیں چہ جائے کہ وہ اس کے ساتھ مختص ہو

۴۔ کہ اگر معنی یہ ہو:(کُلُّ مَعْدُوْمٍ فَھُوَ بَاطِلٌ) تو یہ تحصیلِ حاصل کے باب سے ہو، بلکہ (العدم) کا لفظ باطل کے لفظ سے بڑھ کر نفی پر اَدل ہے تو جلی کی خفی کے ساتھ کیونکر تبیین کی جا سکتی ہے؟

۵۔ اگر شاعر کی مراد یہ ہوتی تو عبارت یوں ہوتی: (کُلُّ مَا سِوَی اللّٰہِ بَاطِلٌ) کیونکہ یہی اس معنی کے قریب تر ہے جو یہ ملحد کرتے ہیں اگر چہ اس سے بھی ان کے معنی پر کلی دلالت نہیں ملتی! جب معنائے حدیث ان کے حسبِ دعوی نہیں کہ معروف امر ہے

کہ ہر ماسوا اللہ جو ہے وہ باطل کی ان دونوں وجھوں کے ساتھ باطل ہے جن کی تشریح گزری، ایک جو نافع مقصود ہے جبکہ باطل کے قصد میں کوئی منفعت نہیں ہوتی اور ما خلا اللہ ہر شئ باطل ہے جب اس کیلئے قصد و عمل ہو، اوراس کا امر بھی اور یہ مشرکین کے حال سے مشابہ ہے جو غیر اللہ کی عبادت کرتے ہیں یا اللہ کے امر و شرع کے بغیر (بدعتی طریقوں سے) اس کی عبادت کرتے ہیں، اگر کہا جائے باطل تو یہ نفسِ قصد اور عمل ہوا نہ کہ عینِ مقصود؟ جواباً کہوں گا بلکہ عینِ مقصود ہی باطل ہوا اس اعتبار سے جس کی رو سے اس کا قصد کیا گیا جیسے ایک حدیث میں ہے: (اَشْهَدُ اَنَّ كُلَّ مَعْبُوْدٍ مِنْ لَّدُنْ عَرْشِكَ اِلىٰ قَرَارِ اَرْضِكَ بَاطِلٌ اِلَّا وَجْهَكَ الْكَرِيْمَ) (میں گواہی دیتا ہوں کہ کائنات میں سوائے تیرے وجہِ کریم کے ہر [خودساختہ] معبود باطل ہے) اور یہ اس وجہ سے کہ اگر باطل فی الاصل عدم اور عدم منفی ہے تو شئ فی الجملہ اپنے انتفائے وجود کے سبب منفی ہوتی ہے جیسے اللہ کا یہ فرمان:

(لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ) [سورة الإخلاص] (نہ وہ کسی کا باپ ہے اور نہ کسی کا بیٹا۔ اور کوئی اس کا ہمسر نہیں) اور: **(لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ)[الشورىٰ: ۱۱]** (اس جیسی کوئی چیز نہیں) اور: **(مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ وَّمَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ)** [المؤمنون: **۹۱**] (اللہ نے نہ تو کسی کو بیٹا بنایا ہے اور نہ اس کے ساتھ کوئی اور معبود ہے) اور (لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ) اور فرمانِ نبوی: (لَا نَبِيَّ بَعْدِيْ) اور کبھی اپنے فائدہ، مقصود اور اپنی خصوصیت جس کے ساتھ وہ قائم ہے، کے انتفاء کے سبب منفی ہوتی ہے جیسا کہ ہم نے کہا تو جس میں فائدہ نہ ہو وہ باطل ہے اور باطل معدوم ہے اور یہ نبی اکرم کے اس فرمان کی مانند جب آپ سے کاہنوں بارے سوال کیا تو کہا: (لَيْسُوْا بِشَيْءٍ) (وہ کوئی شئ نہیں) اسی سے یہ ارشادِ باری ہے:

(يٰاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَا اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ)[المائدة: ۶۸] (اے اہلِ کتاب! جب تک تم تورات اور انجیل کو اور جو تمہارے رب کی طرف سے تم لوگوں پر نازل ہوئیں اُن کو قائم نہ رکھو گے تم کسی شئ پر نہیں) کبھی کوئی شئ اس کے کمال و تمام کے انتفاء کی وجہ سے منفی کی جاتی ہے یا تو مطلقاً اور یا کسی اور شئ کی نسبت سے جیسے نبی اکرم کی یہ حدیث: (لَيْسَ الْمِسْكِيْنُ بِهٰذَا الطَّوَافِ الَّذِيْ تَرُدُّهُ اللُّقْمَةُ وَاللُّقْمَتَانِ وَ التَّمْرُ وَالتَّمْرَتَانِ وَ إِنَّمَا الْمِسْكِيْنُ اَلَّذِيْ لَا يَجِدُ غِنىً يُغْنِيْهِ ولَا يُتَفَطَّنُ لِهٗ فَيُتَصَدَّقَ عَلَيْهِ وَلَا يَسْأَلُ النَّاسَ إِلْحَافًا) (مسکین وہ نہیں جو در در پہ جاکے ایک دو لقمے مانگتا پھرے، مسکین تو وہ ہے کہ اس کے پاس گزارے لائق پیسے نہیں اور ظاہر سے اس کی غریبی کا پتہ بھی نہیں چلتا کہ لوگ اس پر تصدق کر دیں اور نہ ہی وہ لوگوں سے چمٹ کر مانگتا ہے) اسی طرح کی بات مفلس اور رقوب (یعنی جو لوگوں کی عطا کا منتظر ہے) بارے بھی کہی، ان تینوں اقسام کی نظائر کثیر ہیں تو مقصود للاً مر شئ باطل اور منتفی ہوگی اگر اس کا فائدہ و مقصود منتفی ہوگا تو ہر ماسوا اللہ جائز نہیں کہ معبود اور مستعان ہو کیونکہ اللہ کے ہر ماسوا سے یہ معنی و مقصود منتفی ہے لہذا وہ باطل ہے (اس معنی کے اعتبار سے) اور ممکن نہیں کہ ماسوا اللہ میں سے کوئی صمد مقصود اور معبود ہو اور نہ اس کے قصد میں کوئی فائدہ اور نہ اس کی عبادت اور اس سے استعانت

میں کوئی منفعت ہو لہذا وہ باطل ہے اور یہ واضح ہے اور یہ عموم محفوظ ہے اس سے کوئی شئ مستثنیٰ نہیں

اس کی مزید وضاحت یہ ہے کہ **ہر ماسوا اللہ کا قصد یا تو لنفسہ ہوتا ہے یا اس کے غیر کی خاطر**! تو مقصود لغیرہ جیسے روٹی کا کھانے، لباس کا پہننے اور ہتھیار کا قصد دفاع کی غرض سے کیا جاتا ہے اور ان اشیاء کو اللہ نے اعیان میں سے بنی آدم کے نفع کیلئے تخلیق کیا ہے تو ان کا قصد لنفسہا نہیں بلکہ ان کے غیر (یعنی یہ مذکورہ اغراض وغیرہ کے مدِ نظر) کیا جاتا ہے اسی طرح وہ مال جس کا قصد کسی منفعت کے جلب (یعنی حصول) یا دفع مضرت کیلئے کیا جائے نہ کہ لذاتہٖ تو ایسی ہر شئ کی بابت فی الحقیقت مقصود وہ غیر ہے (نہ کہ اس کی ذات) اور یہ اس کے لئے مراد ہے اس طور کہ اگر مقصود لنفسہ وہ غیر حاصل ہو تو ٹھیک وگرنہ یہ شئ بے مصرف اور بلا فائدہ و منفعت ہے تو یہ اس منفی باطل میں سے ہوگی اور اسکی کی بابت یہ کہا جا سکے گا کہ (لَیْسَ بِشَیْءٍ) اور معدوم کے ساتھ وہ ملحق کی جائے گی تو ثابت ہوا کہ یا تو ہر قصد میں مقصود لنفسہ حاصل ہوگا وگرنہ وہ باطل ہوگا اور مقصود لنفسہ اگر اللہ نہیں تو باطل ہے کیونکہ مقصود لنفسہ وہی معبود ہے کیونکہ نہ اس میں اور نہ اس کی عبادت کرنے میں کوئی منفعت ہے اور جس نے غیر کی عبادت کی تو وہ باطل ہے اور اس کی عبادت بھی بلکہ یہ ضرر محض ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: (**یَدْعُوْا لَمَنْ ضَرُّهٗۤ اَقْرَبُ مِنْ نَّفْعِهٖ**) [الحج : ۱۳] (ایسے شخص کو پکارتا ہے جس کا نقصان فائدہ سے زیادہ قریب ہے) اور یہ (ما سوا اللہ) ہر معبود میں عام ہے اور یہ دین کی حقیقت ہے تو اللہ نے خلق کو بلا شرکتِ غیرے صرف اپنی عبادت کی خاطر تخلیق کیا ہے اور ان کیلئے سب کائنات کو مسخر کیا تا کہ اللہ کی عبادت کرنے میں اسے استعمال کریں تو جس نے ان اشیاء کو اللہ کی عبادت پر استعمال نہ کیا تو اس کا سارا عمل اور قصد باطل ہے اور اس میں کوئی منفعت نہیں بلکہ اس میں ضرر ہے تو ثابت ہوا کہ اللہ کے ماسوا ہر قصد و مقصود باطل ہے چاہے وہ لنفسہ مقصود ہو یا لغیرہ! حق یہی ہے کہ اللہ مقصود ہو یا وہ جو اللہ کے قصد میں مددگار ثابت ہو تو یہ اس شعر: (أَلَا کُلُّ شَیْءٍ مَا خَلَا اللّٰهَ بَاطِلٌ) کی دونوں وجہوں: حق اور باطل میں سے ایک کے ساتھ تحقیق ہے اور یہ اس کا مقصود و مطلوب ہونا اور یہ اظہر الوجہین ہے

دوم: کہ اللہ کے علاوہ جو کچھ ہے وہ بنفسہ معدوم ہے اس کیلئے اس کے نفس کی جہت سے وجود نہیں اور نہ کوئی حرکت و عمل اور نہ کسی کو اس کے کوئی فائدہ مل سکتا ہے کہ یہ سب اللہ تعالیٰ کا مرہون منت، اس کی خلق و اِبداع اور برء و تصویر ہے تو اگر اشیاء سے اللہ کو متخلی کر دیں وہ باطل (یعنی معدوم) ہیں ان کے عدم و بطلان میں یہی کہنا کافی ہوگا کہ اللہ کے بغیر ان کا وجود ہی نہ ہوتا تو جب وہ فی نفسہا باطل ہیں اور حق صرف اللہ کے لئے اور اس کے ساتھ اور اس کی طرف سے ہے تو شاعر کا یہ کہنا دو اعتبار کے ساتھ صحیح ہوا ایک: کہ اس تقدیر پر اس کی صنعت گری سے استغناء نہیں اور اس کے سوا کے ساتھ وہ قائم ہے اور نہ اس (کے دائرہ قدرت) سے وہ خارج ہے تو علی سبیل التبع اس کے اسم میں اسے داخل کیا گیا، نہ کہ اس لئے کہ وہ مسمّیٰ کا جزو ہے اور کثیر اوقات کسی جامع اسم یا عام اسماء میں اشیاء کو علی سبیلِ تبع داخل کیا جاتا ہے نہ کہ اس لئے کہ وہ جزوِ مسمّی ہیں جیسے کوئی کہے: میں نے تجھے یہ گھوڑا فروخت کیا

تو (بالتبع) اس میں گھوڑے کی نعل بھی شامل ہوگی اسی طرح اگر کوئی کہے : زید میرے گھر میں داخل ہوا تو اس کے اسم کے حکم میں اس کا لباس بھی داخل ہے اور اگر مثلاً بنی ہاشم کہا جائے تو ان کے موالی (نوکر چاکر) بھی اس میں شامل ہیں کیونکہ حدیث میں ہے : (مَوْلَی الْقَوْمِ مِنْهُمْ) (لوگوں کا غلام انہی میں ہے) اور کبھی حلیف اور بھانجا بھی شامل ہوتا ہے اور یہ اہلِ مغازی اور عربوں کی کلام میں مشہور ہے (ایک حدیث میں ہے: اِبْنُ أُخْتِ الْقَوْمِ مِنْهُم یعنی بھانجا بھی خاندان کا حصہ ہوتا ہے)

دوسرا اعتبار یہ کہ قائل جب کہے: (جَاءَ الْقَوْمُ مَا خَلاَ زَيْداً) (یعنی زید کے سوا سبھی آئے) تو یہاں (خَلاَ) اخواتِ کان میں سے فعلِ ناقص ہے اور زید اس کی وجہ سے منصوب ہے اور اس میں ضمیر مرفوع ہے جو (مَا) جو (الذی) کی اخت (ہم معنی، یعنی ما موصولہ) ہے جو اسم موصول ہے، پر عائد ہے اور یہ جملہ (مَا) کا صلہ ہے اور تقدیر کلام ہوئی: (جاءَ الْقَوْمُ الَّذِيْنَ هُمْ خَلاَ زَيْداً) لیکن (مَا) ایک دو اور سب کو محتمل ہے اور ضمیر معنی سے زیادہ اس کے لفظ کی طرف عائد ہوتی ہے تو قولہ: (رَاَيْتُ مَا رَاَيْتُهٗ مِنَ الرِّجَالِ) (میں نے کچھ مرد دیکھے) تمہارے یہ کہنے سے احسن ہے: (رَاَيْتُ مَا رَاَيْتُهُمْ مِنَ الرِّجَالِ) اور (**وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ**) [**محمد : ۱۶**] (اور ان میں بعض ایسے بھی ہیں جو تمہاری طرف کان لگائے رہتے ہیں) الآیۃ، بنسبت (مَنْ يَسْتَمِعُوْنَ) کے اکثر اور افصح ہے اسی لئے یہ کہنا قوی ہے کہ (مَا خَلاَ زَيداً) (الَّذِيْ خَلاَ، والذين خلَوْا، واللاتي خَلَوْنَ) کے قائمقام ہوا (یعنی سب صیغوں کے) اسی کے نحو کہ تم کہو: (قَامَتِ النِّسْوَةُ مَا خَلاَ هذَا) (ما) کیلئے یا تو کوئی محلِ اعراب ہوگا اور وہ ماقبل کا وصف (یعنی ماقبل موصوف کی صفت) یا بطورِ حال نصب یا پھر اس کے لئے کوئی محلِ اعرابی نہیں اور جب تقدیر کلام ہو: (كُلُّ شَيْءٍ فِيْ حَالِ خُلُوِّهِ عَنِ اللّٰهِ بَاطِلٌ) یا (كُلُّ الأشْيَاءِ حَالَ كَوْنِهَا خَلَتِ اللّٰهَ اَو الَّتِيْ خَلاَ اللّٰهَ باطِلٌ) تو یہ اللہ سے ان کے خلو ہونے کے معنی کو متضمن ہے اور معلوم امر ہے کہ یہ جب اللہ سے خالی ہوں گے تو باطل ہوں گی، ان کا قیام اسی کے ساتھ ہے کہ یہ اس سے متخلی نہ ہوں بلکہ یہ اس کے ساتھ متقوم ہیں اور توحید کا یہ نظریہ اور قولہ (اَلا كُلُّ شَيْءٍ الخ) کی مذکورہ تفسیر اسی کا نحو ہے جو قولہ تعالیٰ: (**كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ**) کی تفسیر میں ذکر کیا گیا بعد اس قولہ کے: (**فَلَا تَكُوْنَنَّ ظَهِيْرًا لِّلْكٰفِرِيْنَ وَلَا يَصُدُّنَّكَ عَنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ بَعْدَ اِذْ اُنْزِلَتْ اِلَيْكَ وَادْعُ اِلٰى رَبِّكَ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ لَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ**) [القصص : **۸۶۔ ۸۸**] (تو تم ہرگز کافروں کے مددگار نہ ہونا۔ اور وہ تمہیں اللہ کی آیتوں سے بعد اس کے کہ وہ تم پر نازل ہو چکی ہیں روک نہ دیں اور اپنے رب کو پکارتے رہو اور مشرکوں میں سے ہرگز نہ ہو جانا۔ اور اللہ کے ساتھ کسی اور کو معبود نہ پکارنا اُس کے سوا کوئی معبود نہیں اُس کی ذات کے سوا ہر چیز فنا ہونے والی ہے۔ حکم اُسی کا ہے۔ اور اُسی کی طرف تم لوٹ کر جاؤ گے) تو اشراک سے اور اس کے ساتھ کسی اور الٰہ کو پکارنے سے نہی کے بعد اس کا ذکر ہوا اور قولہ: (**لَآ اِلٰهَ**

اِلَّا هُوَ دو وجہوں میں سے اظہر کو مقتضی ہے وہ یہ کہ ہرشیٔ معرضِ ہلاکت میں ہے مگر وہ جو اعیان و اعمال وغیر ہما میں سے اس کے وجہ (یعنی رضا جوئی) کیلئے ہو، ابوالعالیہ سے اس کی تفسیر میں یہ عبارت منقول ہے: (اِلَّا مَا اُرِیْدَ بِہٖ وَجْهُهٗ) (مگر جس کے ساتھ اس کی رضا جوئی مراد ہو) جعفر صادق نے (اِلَّا دِیْنَهٗ) کہا، دونوں کا معنی ایک ہے! حضرت عبادہ بن صامت سے منقول ہے کہ کہا روزِ قیامت دنیا کو لایا جائے گا اور کہا جائے گا جو ان میں سے اللہ کیلئے تھا اسے الگ کردو تو ایسا ہی کیا جائے گا پھر دیگر سب کو آگ میں ڈال دیا جائے گا، حضرت علی سے (مَا یَعِمُّ) مروی ہے چنانچہ تفسیر ثعلبی میں صالح بن محمد عن سلیمان ابن عمرو عن سالم افطس عن الحسن وسعید بن جبیر عن علی بن ابی طالب سے مروی ہے کہ ایک آدمی نے ان سے (مالی مدد کا) سوال کیا، انہوں نے عطا نہ کیا تو وہ بولا: (اَسْأَلُكَ لِوَجْهِ اللّٰهِ) (یعنی اللہ کے واسطے مانگتا ہوں) تو کہا تم غلط کہہ رہے ہو تم نے لوجہ اللہ مجھ سے سوال نہیں کیا، اللہ کا وجہ تو حق ہے، کیا تم اس آیت کو نہیں دیکھتے: (**كُلُّ شَیْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ**) یعنی الحق، تم نے تو (بِوَجْهِكَ الْحَقِّ) (اپنے وجہِ حق کے ساتھ) مجھ سے سوال کیا ہے

مجاہد سے (اِلَّا هُوَ) اور ضحاک سے (**كُلُّ شَیْءٍ هَالِكٌ اِلَّا اللّٰهُ وَالْجَنَّةُ وَالنَّارُ وَالْعَرْشُ**) (ہرشیٔ کو فنا ہے مگر اللہ، جنت، دوزخ اور عرش کو نہیں) اور ابن کیسان سے (اِلَّا مُلْكَهٗ) منقول ہے اور یہ اس وجہ سے کہ (الْوَجْهُ) کا لفظ اشبہ ہے کہ اصل میں (الجِهَةُ) کی مثل ہو جیسے (وَعْدٌ) اور (عِدَةٌ) اور (وَزْنٌ) اور (زِنَةٌ) اور (وَصْلٌ) اور (صِلَةٌ) اور (وَسْمٌ) اور (سِمَةٌ) ہے لیکن اس کے فعل کی فاء حذف کی گئی اور یہ فعل سے اخص ہے جیسے (الأكل) اور (الإكْلَةُ) تو یہ مصدر بمعنی (تَوَجَّهَ) مقصود ہوگا جیسے شاعر نے کہا:

اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ ذَنْباً لَسْتُ مُحْصِيَهٗ رَبَّ الْعِبَادِ اِلَيْهِ الْوَجْهُ وَالْعَمَلُ

(میں اللہ سے اپنے لاتعداد گناہوں سے استغفار کرتا ہوں، وہ رب العباد ہے اس کے لئے وجہ وعمل ہے)

پھر اس کے ساتھ مفعول بھی مسمی ہوتا ہے اور وہ مقصود اور (الْمُتَوَجَّهُ إِلَيْهِ) جیسے اسم خلق، درھم اور (ضَرْبُ الأَمِيْرِ) اور نظائر میں ہے اور فاعل متوجہ پر بھی اس کا اطلاق ہے جیسے (وَجْهُ الحيوان) کہا جاتا ہے: (اَرَدْتُ هٰذَا الْوَجْهَ) یعنی (الجِهَة والنَّاحِيَة) (میں نے اس طرف کا رخ کیا) اسی سے قرآن میں ہے: (**وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ**) [البقرة: ۱۱۵] (اور مشرق اور مغرب سب اللہ ہی کا ہے تو جدھر تم رخ کرو ادھر اللہ کی ذات ہے) یعنی (قِبْلَةُ اللّٰهِ وَ وِجْهَةُ اللّٰهِ) یہی جمہور سلف نے کہا اگرچہ ان کے بعض نے اس کا صفات میں شمار کیا ہے، کبھی کسی محلِ نظر وجہ کے ساتھ یہ صفت پر دال ہوتا ہے کیونکہ (**فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا**) کا معنی ہے (تَتَوَلَّوْا) ای (تَتَوَجَّهُوْا) اور (تَتَقَبَّلُوْا) یہ ایک مفعول کی طرف متعدی ہوتا ہے بمعنی (يَتَوَلَّاهَا) وَلّٰی تَوَلّٰی کی نظیر (قَدَّمَ و تَقَدَّمَ) اور (بَيَّنَ و تَبَيَّنَ) ہے جیسے کہا: (**لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ**) [الحجرات: ۱] (مومنو! اللہ اور اس کے رسول سے آگے مت بڑھو) اور (**بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ**) **[النساء: ۱۹]**

اور یہ وہ وجہ جو اللہ کیلئے ہے اور جس کی بابت اللہ نے حکم دیا کہ اس کی طرف چہرے کریں تو اس کا قول: (**وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ**) دال ہے کہ مشرق اور مغرب سے اللہ کا وجہ وہ ہے جو اللہ کے لئے ہوگا جیسے آیۃ القبلۃ میں فرمایا:

(سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَاوَلّٰهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ) [البقرۃ: ۱۴۲] (احمق لوگ کہیں گے کہ مسلمان جس قبلے پر تھے اس سے کیوں منہ پھیر بیٹھے؟ تم کہہ دو کہ مشرق اور مغرب سب اللہ ہی کا ہے وہ جس کو چاہتا ہے سیدھی راہ پر چلاتا ہے) جب قبلہ اولی (یعنی بیت المقدس) سے انہیں پھیر دیئے جانے کا سبب دریافت کیا گیا تو جواب دیا کہ اللہ کے لئے ہی مشرق ومغرب ہیں (یعنی وہ جس طرف چاہے رخ کرنے کا حکم دے) جہاں تک (وِجْهَةٌ) کا لفظ جیسے اس کا یہ قول: (وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا) [البقرۃ: **۱۴۸**] (اور ہر ایک کے لئے ایک سمت ہے جدھر وہ منہ کرتا ہے) تو خیال کیا جاسکتا ہے کہ یہ بھی مصدر ہے (الوَجْهُ) کی مثل جیسے (الوَعْدُ) اور (العِدَةُ) ہے اور یہ صحیح حالت پر چھوڑا گیا اس کی فاء حذف نہ کی گئی، مگر ایسا نہیں کیونکہ اگر یہ مصدر ہوتا تو اس کی واو محذوف ہوتی اور وہ (الجهة) اور کہا جاتا: (وَلِكُلٍّ جِهَةٌ) یا (وجه) دراصل یہاں (فِعْلَةٌ) بمعنی مفعول ہے جیسے (القِبْلَةُ، البِزْعَةُ، الذِّبْحَةُ) وغیرہ ہیں تو قبلہ (مَا اُسْتُقْبِلَ) ہے (جس کی طرف رخ کیا گیا) اور (الوِجْهَةُ) مَا تُوُجِّهَ إِلَيْهِ (جس کی طرف متوجہ ہوا گیا) اور (البِدْعَةُ) مَا ابْتُدِعَ (جس کا ابتداء کیا گیا) اور (الذِّبْحَةُ) مَا ذُبِحَ (جو ذبح کیا گیا) لہذا یہ صحیح ہے اور اس کی فاء محذوف نہیں کیونکہ حذف تو مصدر سے ہوتا ہے نہ کہ بقیہ اسماء سے جیسے صفات اور جو ان کے مشابہ ہیں مثلا اسمائے مکان اور زمان اور آلات اور مفاعیل وغیرہ، جہاں تک بعض فقہاء کا کہنا کہ وجہ (الواجهة) سے مشتق ہے تو اس کی کوئی دلیل نہیں بلکہ اس کے معارض بعض کا قول ہے کہ یہ (الوَجَاهَةُ) سے مشتق ہے مگر یہ دونوں اقوال ضعیف ہیں دراصل (المُوَاجَهَةُ) الوجہ سے مشتق ہے جیسے (المُشَافَهَةُ) الشفۃ سے ہے اور (المُنَاظَرَةُ) نظر سے اور (المُعَايَنَةُ) عین سے، جہاں تک (الوجه) جو کہ (المتوجه) ہے، کا اشتقاق (الوجه) جو کہ (التوجه) ہے، سے ہونا تو یہ انسب ہے کیونکہ اس کی توجہ اس کے ساتھ مختص اس کا فعل ہے جس کے بجالانے میں وہ اپنے غیر کا محتاج نہیں بخلاف المواجہۃ کے کہ یہ دو کو مستدعی ہے اور انسان حارث (یعنی جد وجہد کا خوگر) اور ہمام ہے (یعنی ارادے باندھنے والا) اور اس کا ھمّ اس کی توجہ ہے، دراصل وہ اس عضو کے ساتھ کسی بھی شئ کی طرف متوجہ ہوتا ہے جس کا وہ ارادہ کرے، اسی باب سے یہ قولہ تعالی ہے:

(بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ) [البقرۃ: ۱۱۲] (کیوں نہیں! جو شخص اللہ کے آگے گردن جھکا دے اور وہ نیکو کار بھی ہو تو اُس کا صلہ اُس کے پروردگار کے پاس ہے اور ایسے لوگوں کو نہ کسی طرح کا خوف ہوگا اور نہ وہ غمناک ہوں گے) اور:

(وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا) [النساء: ۱۲۵] (اور اُس

شخص سے کس کا دین اچھا ہوسکتا ہے جس نے حکمِ الٰہی کو قبول کیا اور وہ نیکوکار بھی ہے اور ابراہیم کے دین کا پیرو ہے جو یکسو تھے) اور حضرت خلیل کا اور ہمارے نبی کا نماز میں یہ کہنا:

﴿إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ حَنِيفًا وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ﴾ [الأنعام: ۷۹] (میں نے سب سے یکسو ہوکر اپنے آپ کو اُسی ذات کی طرف متوجہ کیا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں) اور قولہ تعالیٰ:

﴿قُلْ أَمَرَ رَبِّي بِالْقِسْطِ وَأَقِيمُوا وُجُوهَكُمْ عِندَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَادْعُوهُ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ﴾ [الأعراف: ۲۹] (کہہ دو کہ میرے رب نے تو انصاف کرنے کا حکم دیا ہے اور یہ کہ ہر نماز کے وقت قبلہ رو ہوا کرو اور مخلص ہوکر اُسی کو پکارو) الآیۃ اور قولہ:

﴿فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا﴾ [الروم: **۳۰**] (تو تم ایک طرف کے ہوکر دین پر سیدھا منہ کئے چلے جاؤ، اللہ کی فطرت کو جس پر اُس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے) اور: (**فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ الْقَيِّمِ**) [الروم: **۴۳**] (پس دین پر سیدھا منہ کئے چلے چلو) اور نبی کریم کے ایک صحابی کو نیند کی دعائے سکھلاتے ہوئے یہ الفاظ: (اَللّٰهُمَّ أَسْلَمْتُ نَفْسِيْ إِلَيْكَ وَ وَجَّهْتُ وَجْهِيْ إِلَيْكَ) زید بن عمرو بن نفیل (یہ جاہلیت کے ان معدودے چند لوگوں میں سے تھے جو بت پرستی نہ کرتے تھے) نے کہا تھا: (اَسْلَمْتُ وَجْهِيْ لِمَنْ اَسْلَمَتْ لَهُ الْمُزْنُ تَحْمِلُ عَذْباً زُلَالاً) (یعنی میں اپنا آپ اس کے لئے مطیع کردیا جس کے حکم سے میٹھے پانی کی حامل بارشیں ہیں) تو یہ تین تراکیب ہیں: (اَسْلَمَ وَجْهَهٗ، وَجَّهَ وَجْهَهٗ) اور (قَامَ وَجْهَهٗ) قدمائے مفسرین نے قولہ: (اَسْلَمَ وَجْهَهٗ) بارے کہا: (اَيْ اَخْلَصَ فِيْ دِيْنِهٖ وَ عَمَلِهٖ لِلّٰهِ) (یعنی اپنے دین وعمل میں اللہ کے لئے اخلاص کیا) ان کے بعض نے کہا: (فَوَّضَ اَمْرَهٗ إِلَى اللّٰهِ) (اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کردیا) یہ بھی کہا گیا: (خَضَعَ وَ تَوَاضَعَ لِلّٰهِ) (اللہ کے لئے جھکا اور تواضع اختیار کی) اور یہ تیسرا قول اسلامِ لازم کے لائق ہے کیونکہ اس کا وجہ اس کا قصد اور اس کی توجہ ہے جو اس کے عمل کی اصل ہے اور یہ اس کے دل کا عمل ہے جو اس کے بدن کا بادشاہ ہے تو جب دل متوجہ ہوگا تو اس کے چہرے کی توجہ بھی اسی کے تابع ہوگی تو جب اس سے قصد جو اصلاً دل سے ہے حاصل ہوا اور یہی عمل کیلئے اصل ہے اور یہ اس کے دل کا عمل ہے جو اس کے بدن کا بادشاہ ہے تو جب دل متوجہ ہوگا تو اس کے چہرے کی توجہ بھی اسی کے تابع ہوگی اور یہ چہرہ اور دیگر اعضائے بدن سے بطورِ تبع ہے کہ تمام اعضاء دل کے تابع ہیں تو اس شکل میں اس کا ظاہر و باطن عمل اور اس کے ظاہری و باطنی اعضاء اللہ کے لئے مسلم ہوئے یعنی اس نے اپنا آپ اللہ کو سونپ دیا اور اس کیلئے مخلص ہوا جیسا کہ یہی اسلامِ لازم کا تقاضہ ہے اور اسی طرف قولہ: (**أَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ**) [البقرة: ۱۳۱] (میں رب العالمین کے آگے سرِ اطاعت خم کرتا ہوں) اشارت کناں ہے اور

ابلقیس ملکہ یمن کا قول نقل کیا: (**رَبِّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ وَاَسْلَمْتُ مَعَ سُلَیْمٰنَ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ**)[النمل : **۴۴**] (میں اپنے آپ پر ظلم کرتی رہی تھی اور میں سلیمان کے ہاتھ پر اللہ رب العالمین پر ایمان لاتی ہوں) اور حضرات ابراہیم واسماعیل کے جو یہ دعائیہ الفاظ نقل کئے: (**رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَکَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِنَآ اُمَّۃً مُّسْلِمَۃً لَّکَ**) [البقرۃ :۱۲۸] (اے رب ہم دونوں کو اپنا فرمانبردار بنائے رکھ اور ہماری اولاد میں سے بھی ایک گروہ کو اپنا مطیع بنالینا) ای (مُنْقَادَۃً مُخْلِصَۃً) (مطیع اور مخلص)

اسی طرح چہرے کو اس ذات کیلئے مؤجہ کرنا جس نے سماوات وارض کا فطر کیا اس کے قصد، ارادہ اور عبادت کی توجیہہ ہے اور یہ چہرے وغیرہ کو مستتبع ہے (یعنی ان سے تبعیت کا طالب اور متقاضی) وگرنہ دل کے عمل (یعنی نیت وقصد) کے بغیر مجرد کسی عضو کو اس کی طرف متوجہ کرنا کسی کام کا نہیں، زجاج نے قولہ: (وَجَّھْتُ وَجْھِیَ) کی یہ تفسیر کی: (اَی جَعَلْتُ قَصْدِیْ بِعِبَادَتِیْ وَ تَوْحِیْدِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْن) (یعنی میں نے اپنی عبادت کے ساتھ اپنا قصد اور اپنی توحید کو اللہ رب العالمین کے لئے کیا ہے) اسی طرح قولہ: (وَاَقِیْمُوْا وُجُوْھَکُمْ) ہے تو وجوہ (یعنی چہرے) جو کہ مقاصد ہیں اور نیات جو کہ دل کا عمل ہیں اور یہ دین کی اصل (بنیاد) ہے جو کبھی قائم کی جاتی ہے اور کبھی اکھاڑ دی جاتی ہے) جیسے نبی اکرم کا فرمان ہے کہ بندوں کے دل رحمٰن کی دو انگلیوں کے درمیان ہیں چاہے تو اسے (راہِ ہدایت پر) قائم کردے اور چاہے تو پھیر دے تو اقامتِ وجہ (جس کا آیتِ مذکورہ بالا میں حکم ہوا) اس کے اِزاغت و اِمالت (راہِ ہدایت سے پھر جانے) کا عکس ہے اور یہی صراطِ مستقیم ہے تو اگر کوئی سیدھا اس کا قصد کرے، دائیں بائیں منحرف نہ وہ تو یہ رب العالمین کیلئے اس کا قصد ہوا جیسے کہا: (**لَا شَرْقِیَّۃٍ وَّلَا غَرْبِیَّۃٍ**)[**النور: ۳۵**](نہ مشرق کی طرف ہے اور نہ مغرب کی طرف) ربیع بن انس نے (اس کی تفسیر کرتے ہوئے) کہا تھا: (اِجْعَلُوْا سُجُوْدَکُمْ خَالِصاً لِلّٰہِ فَلاَ تَسْجُدُوْا اِلاَّ لِلّٰہِ) (یعنی اپنے سجدوں کو خالص اللہ کے لئے کرو پس نہ سجدہ کرو مگر اللہ کو) ضحاک اور قتیبہ سے (اس کی تفسیر میں) منقول ہے کہ جب نماز حاضر ہو اور تم کسی مسجد کے پاس ہو تو اسی میں نماز پڑھ لو، کوئی یہ نہ کہے کہ میں تو اپنی مسجد جا کر نماز پڑھوں گا، گویا ان کی مراد یہ ہے کہ نماز تو اللہ کے لئے پڑھنی ہے چاہے مسجد جو بھی ہو، اس ضمن میں مساجد کی تخصیص نہیں کرنی چاہئے اور ان دونوں اقوال پر ہم نے جو ذکر کیا وہ درست ٹھہرتا ہے مجاہد، سدی اور ابن زید سے، آیت: (**وَحَیْثُ مَا کُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْھَکُمْ شَطْرَہٗ**) [البقرۃ :۱۴۴] (اور تم لوگ جہاں ہوا کرو اسی کی طرف منہ کرلیا کرو) بارے منقول ہے: (تَوَجَّھُوْا حَیْثُ کُنْتُمْ فِی الصَّلاَۃِ اِلَی الْکَعْبَۃِ) (یعنی جہاں بھی نماز پڑھو اپنا رخ جانبِ قبلہ کرلیا کرو) اور اس پر اقامتِ وجہ یہ ہے کہ کعبہ کی طرف رخ کیا جائے اور یہ محلِ نظر ہے کیونکہ یہ آیت مکی ہے اور کعبہ کو قبلہ تو مدینہ میں بنایا گیا تھا الا یہ کہ اقامتِ وجہ سے مراد مامور بہ استقبال (رخ کرنا) لیا جائے، یہ اختلافِ تفسیر دراصل قولہ: (**عِنْدَ کُلِّ مَسْجِدٍ**)[الأعراف: ۲۹] کے پیشِ نظر واقع ہوا بخلاف اس قولہ تعالیٰ کے: (**فَاَقِمْ وَجْھَکَ لِلدِّیْنِ حَنِیْفًا**) (ابھی گزری)

تو قولہ(**كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ**) [القصص : **۸۸**] (اُس کی ذات کے سوا ہر چیز فنا ہونے والی ہے) یعنی(دِیْنَهٗ و إِرَادَتَهٗ وعِبَادَتَهٗ) مصدر کبھی فاعل اور کبھی مفعول کی طرف مضاف کیا جاتا ہے اور یہ ان کا قول: (مَا أُرِیْدَ بِهٖ وَجْهُهٗ) اور یہ اس قولہ تعالی کی نظیر ہے:

(**لَوْ كَانَ فِيهِمَآ اٰلِهَةٌ إِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا**) [الأنبیاء: **۲۲**] (اگر آسمان اور زمین میں اللہ کے سوا اور معبود ہوتے تو زمین و آسمان درہم برہم ہو جاتے) تو اللہ کا ماسوا ہر معبود باطل ہے اور ہر جو اس کے وجہ کیلئے نہ ہو وہ ہالک، فاسد اور باطل ہے، آیت کا سیاق اسی معنی پر دال ہے اور اس میں ایک معنی اور بھی ہے تو الوہیت ربوبیت کو مستلزم ہے اسی لئے کہا: (**لَهُ الْحُكْمُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ**) [القصص : **۸۸**] (حکم اُسی کا ہے۔ اور اُسی کی طرف تم لوٹ کر جاؤ گے) اس میں ایک قول اور بھی ہے جو کثیر اہلِ علم نے کہا کہ اس طرح کی آیات: (اَسْلَمَ وَجْهَهٗ) (اَقِمْ وَجْهَكَ) (وَجَّهْتُ وَجْهِیَ) میں وجہ سے ظاہری چہرہ مراد ہے اور جیسا کہ سب کا اتفاق ہے کہ آیت (**قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِى السَّمَآءِ**) [البقرة: ۱۴۴] (ہم تمہارا آسمان کی طرف منہ پھیر پھیر کر دیکھنا دیکھ رہے ہیں) میں آنحضور کا ظاہری چہرہِ اقدس مراد ہے اسی طرح (**فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ**) [البقرة: ۱۴۴] (تو اپنا منہ مسجد حرام کی طرف پھیر لو) اور: (**فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ**)[**المائدة: ٦**] (پس اپنے منہ دھولیا کرو) میں بھی، اللہ تعالی کی صفات کے ذیل میں (وَجْـــهٌ) کا ذکر کتاب وسنت کے متعدد مواضع میں آیا ہے جس کی تفصیل کا یہ محل نہیں، علماء کہتے ہیں چہرے کو جب مُوَجہ کیا جائے تو انسان کا سارا بدن اس کی تبع کرے گا اور جب دل مسلم ہو جائے تو سارا بدن اس کے تابع ہوگا اسی طرح جب وہ مستقیم اور قائم ہو کیونکہ قاصد و طالب کے ظاہری اعضاء میں سے چہرہ ہی ہے جو سب سے پہلے کسی کام پر متوجہ ہوتا ہے اسی لئے دیگر اعضاء کیلئے علی وجہ الاستلزام اکثر اسی کا ہی ذکر کیا جاتا ہے اور سارے بدن سے اس کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے لیکن یہ عرفی حقیقت کے باب سے ہے جو اسم کا خصوص سے عموم کی طرف قلب کر دیتی ہے یا لغوی حقیقت باقی ہے اور آیا یہ لزومی دلالت کے باب سے ہے؟ اس بارے دو اقوال ہیں اسی طرح دیگر اعضاء میں حتی کہ اگر اپنے غلام سے کہے: (يَـــدُكَ لَا رِجْلُكَ حُـرٌّ) (یعنی تمہارا ہاتھ۔ نہ کہ پاؤں۔ آزاد کر دیا) یا بیوی سے کہے: (يَـدُكِ اَوْ رِجْـلُكِ طَـالِـقٌ اِنْ اَعْـطَيْتِنِـيْ اَلْفاً) (یعنی اگر تم نے مجھے ہزار دئے تو تمہارے ہاتھ یا پاؤں کو طلاق) پھر اعطاء سے قبل اس کا وہ عضو (جس کا نام لیا تھا) کاٹ دیا تو جو حضرات قائل ہیں کہ یہ لفظ پورے بدن سے عبارت ہے، ان کے نزدیک عتق اور طلاق کا وقوع ہوا اور جن کے نزدیک یہ اسم صرف اسی عضو کیلئے ہے ان کے مطابق بقیہ اعضاء کی طرف یہ حکمِ طلاق وعتق لاگو نہ ہوا، ان کے نزدیک اس صورت میں نہ غلام آزاد باور ہوگا اور نہ بیوی مطلقہ اور اس اصل کی طرف ان حضرات کے قول کا معنی عائد ہے جو کہتے ہیں کہ (**كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهٗ**) (گزری) اس آیت کی نظیر ہے: (**كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُوالْجَلٰلِ وَالْإِكْرَامِ**) [الرحمن:

[٢٦۔٢٧] (جو زمین پر ہیں سب کو فنا ہونا ہے۔ اور تمہارے رب ہی کی ذات جو صاحبِ جلال وعظمت ہے باقی رہے گی)
تو اللہ کے ذی جلال واکرام وجہ کی بقاء (سے مراد) اس کی ذات کی بقاء ہے۔

فصل

رہا معاملہ عبد کی ذات کے رب کی ذات کے ساتھ اتحاد کا بلکہ ذاتِ عبد کے کسی اور عبد کی ذات کے ساتھ اتحاد یا حقیقت کے کسی اور حقیقت میں حلول کا معاملہ جیسے پانی کا برتن میں حلول تو یہ (یعنی اس طرح اللہ کی ذات کے بندے کی ذات میں حلول کا نظریہ رکھنا) قطعاً باطل ہے بلکہ بندے کی بندے کے ساتھ اتحادِ ذات کا نظریہ بھی بالکل باطل ہے اور نہ کسی کی ذات کا کسی اور کی ذات میں حلول ہے، نصاریٰ وغیرہم کے حلولیہ اور اتحادیہ اور اس امت کے کئی غالی حضرات اس نظریہ کے قائل ہوئے اور ان کا مزعومہ یہ اتحاد دو ذاتوں کے درمیان متجد د ہے بعد اس کے کہ دونوں الگ اور جدا جدا تھیں پھر باہم متحد ہوئیں یا ایک کا دوسری میں حلول ہوا تو یہ نظریہ واضح البطلان ہے اور اس سے بھی ابطل وحدت الوجود کا نظریہ ہے کہ کائنات میں ایک ہی وجود ہے اور یہاں اصلاً ہی تعدد نہیں اور تعدد دراصل حجاب میں ہے تو جب حجاب اٹھا تو ہر طرف اللہ ہی اللہ تھا اور ہر شئ اللہ ہے، چاہے مطلقا وحدت کا قول ہو یا وجودِ مطلق کی وحدت کا نہ کہ معین کی وحدت یا وحدتِ وجود کا سوائے عدم میں ثابت اعیان کے، یہ اور سابق الذکر اہلِ کفر وضلال کے مذاہب ہیں! جہاں تک اہلِ ایمان تو وہ کتاب و سنت کی روشنی میں صراطِ مستقیم پر گامزن ہیں اور حق وہی ہے جو اللہ کے انبیاء اور اولیاء کو حاصل ہوا اور عام اہلِ ایمان بھی اس میں انہی کے تبع ہیں اور انہیں بھی اللہ کی محبت اور رضوان حاصل ہو سکتی ہے، اللہ نے کہا:

﴿فَسَوْفَ يَأْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ﴾[المائدۃ : ۵۴] (تو اللہ ایسے لوگ پیدا کر دے گا جن کو وہ دوست رکھے اور جسے وہ دوست رکھیں اور جو مومنوں کے حق میں نرمی کریں اور کافروں سے سختی سے پیش آئیں، اللہ کی راہ میں جہاد کریں اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں) اور:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ﴾[البقرۃ : ١٦٥] (اور بعض لوگ ایسے ہیں جو غیر اللہ کو شریک بناتے ہیں اور ان سے اللہ کی سی محبت کرتے ہیں لیکن جو ایمان والے ہیں وہ تو اللہ ہی سے سب سے زیادہ محبت کرتے ہیں) اور:

﴿وَاَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ وَاَحْسِنُوْا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ [البقرۃ : ١٩٥] (اور اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو اور نیکی کرو بے شک اللہ تعالیٰ نیکی کرنے والوں سے محبت کرتا ہے)

﴿بَلٰى مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ﴾[آل عمران:۷۶] (ہاں جو شخص اپنے اقرار کو پورا کرے اور ڈرے تو اللہ ڈرنے والوں کو دوست رکھتا ہے)

﴿فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ﴾[التوبة: ۷] (تو اگر وہ قائم رہیں تو تم بھی اپنے قول و اقرار پر قائم رہو بے شک اللہ پرہیزگاروں کو دوست رکھتا ہے)

﴿فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ﴾[التوبة: ۴] (تو جس مدت تک ان کے ساتھ عہد کیا ہو اسے پورا کرو، اللہ پرہیزگاروں کو دوست رکھتا ہے)

﴿فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَ يُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ﴾[البقرة:۲۲۲] (تو جس طریق سے اللہ تعالیٰ نے تمہیں ارشاد فرمایا ہے اُن کے پاس جاؤ کچھ شک نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں اور پاک صاف رہنے والوں سے محبت کرتا ہے)

﴿فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ﴾[التوبة :۱۰۸] (اُس میں ایسے لوگ ہیں جو پاک رہنے کو پسند کرتے ہیں اور اللہ پاک رہنے والوں ہی کو پسند کرتا ہے)

﴿فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ﴾ [الحجرات: ۹] (تو دونوں فریق میں مساوات کے ساتھ صلح کرا دو اور انصاف سے کام لو کہ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے)

﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ﴾[الصف: ۴](بے شک اللہ ان سے محبت کرتا ہے جو اس کی راہ میں پرے جما کر لڑتے ہیں کہ گویا سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں)

﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ﴾[آل عمران : ۱۳۱] (کہہ دو کہ اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو اللہ بھی تمہیں دوست رکھے گا اور تمہارے گناہ معاف کر دے گا اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے)

﴿قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ --- فِيْ سَبِيْلِهٖ﴾[التوبة:۲۴] (کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ اور بیٹے اور بھائی اور عورتیں اور خاندان کے آدمی اور مال جو تم کماتے ہو اور تجارت جس کے بند ہونے سے ڈرتے ہو اور مکانات جنہیں تم پسند کرو تمہیں اللہ اور اس کے رسول سے زیادہ محبوب ہوں) تک

﴿وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا﴾[النساء : ۱۲۵] (اور اللہ نے ابراہیم کو اپنا دوست بنایا تھا)

﴿وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ﴾ [التوبة :۱۰۰] (جن لوگوں نے سبقت کی، پہلے مہاجرین میں سے بھی اور انصار میں سے بھی اور جنہوں نے نیکوکاری

کیساتھ اُن کی پیروی کی اللہ اُن سے خوش رہے اور وہ اللہ سے خوش ہیں)

﴿أُولَٰئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ وَأَيَّدَهُم بِرُوحٍ مِّنْهُ﴾[المجادلة: **۲۲**] (یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان تحریر کر دیا ہے اور فیض غیبی سے ان کی مدد کی ہے)

﴿أُولَٰئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ جَزَاؤُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ جَنَّاتُ عَدْنٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا رَّضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ﴾ [البينة : **۷۔۸**] (وہ تمام مخلوق سے بہتر ہیں۔ان کا صلہ ان کے پروردگار کے ہاں ہمیشہ رہنے کے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں، ہمیشہ ان میں رہیں گے اللہ ان سے خوش اور وہ اس سے خوش) اور نبی اکرم نے فرمایا بے شک اللہ کو متقی اور خفی غنی بندے سے محبت ہے، بے شک اللہ جمیل ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے بے شک اللہ نظیف ہے اور نظافت کو پسند کرتا ہے، بے شک اللہ وتر (اکیلا) ہے اور وتر کو پسند کرتا ہے، بے شک اللہ کو اخلاقِ عالیہ پسند اور رذیل اخلاق ناپسند ہیں، ایک حدیث میں فرمایا بے شک اللہ نے تمہارے لئے تین باتیں پسند کی ہیں: کہ تم اسی کی عبادت کرو اور کسی چیز کو اس کے ساتھ شریک نہ بناؤ، کہ تم اللہ کی رسی کو اکٹھے ہو کر مضبوطی سے تھام لو اور تفرقہ بازی نہ کرو اور یہ کہ اپنے (شریعت پر کاربند) حکمرانوں کے ساتھ خیر خواہی کرو! قرآن کے کئی مقامات پر اصطفاء، اجتباء، تقریب، مناجات، منادات، اور خلق ونحوہا کا ذکر آیا ہے اسی طرح سنت میں بھی تو (اللہ کیلئے) ان صفات کے اثبات پر قدمائے اہل سنت والجماعت اور اہلِ معرفت وعبادت اور اہلِ علم ایمان متفق ہیں، اس کی حقیقت میں جہمیہ۔ اور جن میں تجہم کا شائبہ ہے اگرچہ ان پر غالب سنت ہو۔منافق ملحدوں کی ایک جماعت نے اختلاف کیا اور یہ صابئین اور ان جیسوں اور یہود ونصاری سے مشابہ ہیں تو یہ حضرات کبھی اس امر کا انکار کرتے ہیں کہ اللہ کا کوئی خلیل ہو یا وہ کسی سے محبت کرے یا کسی سے اس کی مودت ہو یا وہ کسی سے کلام کرے یا خود تکلم کرے اور یوں وہ (اس کے اثبات میں وارد) کلم کی ان کے مواضع سے تحریف کے مرتکب ہوئے تو ان کی تاویل کرتے ہوئے کبھی اپنے بندوں کے ساتھ اس کے احسان کرنے یا ارادہِ احسان کا معنی کرتے ہیں اسی طرح بندوں کی اللہ سے محبت کی تاویل یہ کی کہ مراد ان کی طرف سے اس کی طاعت کا ارادہ ہے یا اس کے احسانات پر اس کا تشکر

جہاں تک انکارِ باطل تو اللہ سبحانہ نے خود کو والد اور ولد سے منزہ کیا ہے اور جو ایسا سمجھتے ہیں انہیں کافر قرار دیا ہے تو اس سورۃ میں جو قرآن کے ایک تہائی کے برابر ہے یعنی سورۃ الاخلاص اور اس کی فضیلت میں جس قدر صحت کے ساتھ روایات ثابت ہیں اتنی کسی اور سورت کی فضیلت میں نہیں ہیں حتی کہ حفاظ محدثین نے خاص اس کی فضیلت میں کتب تالیف کیں جیسے دارقطنی، ابو نعیم اور ابو محمد خلال، اصحاب صحیح نے اس کی فضیلت میں متعدد احادیث تخریج کی ہیں تو اس میں ارشاد کیا: **﴿قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ﴾ [الإخلاص : ۱]** ائمہ نے توحید کے باب میں اس سورۃ کو اپنا عمدہ بنایا ہے مثلا امام احمد، فضیل بن عیاض اور دیگر سابق ولاحق ائمہ، تو اس میں اللہ نے اپنے آپ سے اصول (یعنی باپ دادا) اور فروع (یعنی اولاد واحفاد) اور نظراء (یعنی ہمسر) کی نفی کی ہے اور یوں اس کی طرف منسوب

کی جانے والی مخلوق مثلا انسان، بہائم، ملائکہ اور جن بلکہ نباتات ونحوہا کی نفی ہوئی کیونکہ جو کوئی بھی مخلوقات میں سے ہے تو لازم ہے کہ اس کے مناسبِ حال اس کے لئے کوئی شئ ہو، یا اصل یا فرع یا نظیر یا اس جیسے دو یا تین اور یہ انسانوں، جنوں اور بہائم میں تو ظاہر ہے اور جو ملائکہ ہیں تو اگر چہ ان کی تخلیق تناسُل وتوالُد کے ذریعہ نہیں ہوتی لیکن ان کیلئے نظراء، امثال اور اشباہ ہیں اسی لئے کہا:

﴿وَمِنْ كُلِّ شَىْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۔ فَفِرُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ﴾[الذاریات: **۴۹۔ ۵۰**] (اور ہر چیز کی ہم نے دو قسمیں بنائیں تاکہ تم نصیحت پکڑو۔ تو تم لوگ اللہ کی طرف بھاگ چلو) بعض سلف نے کہا **﴿لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ﴾** کا معنی ہے تاکہ جان لو کہ ان ازواج (یعنی جوڑے) کا خالق واحد ہے اس لئے اس سورۃ میں ان تمام اقوام وامم کا رد کیا جو اللہ کیلئے ولد، یا والد یا زوج یا کفو (یعنی ہمسر اور مثیل) کا اثبات کرتے ہیں تو (لَمْ یَلِدْ) ان کا رد ہے جو کہتے ہیں فرشتوں یا انسانوں میں سے اس کیلئے بیٹے اور بیٹیاں ہیں جیسے بعض نے فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیا تھا یا جیسے کہا مسیح یا عزیر اللہ کے بیٹے ہیں جیسے اللہ نے ان کی بابت نقل کیا کہ:

﴿وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ وَخَرَقُوْا لَهٗ بَنِيْنَ وَبَنٰتٍ بِغَيْرِ عِلْمٍ﴾[المؤمنون: ۱۰۰] (اور ان لوگوں نے جنوں کو اللہ کا شریک ٹھہرایا حالانکہ ان کو اُسی نے پیدا کیا اور بے سمجھے اس کیلئے بیٹے اور بیٹیاں بنا کھڑی کیں) اور کہا:

﴿ فَاسْتَفْتِهِمْ اَلِرَبِّكَ الْبَنَاتُ وَلَهُمُ الْبَنُوْنَ اَمْ خَلَقْنَا الْمَلٰٓئِكَةَ اِنَاثًا وَّهُمْ شٰهِدُوْنَ اَلَآ اِنَّهُمْ مِّنْ اِفْكِهِمْ لَيَقُوْلُوْنَ وَلَدَ اللّٰهُ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ اَصْطَفَى الْبَنَاتِ عَلَى الْبَنِيْنَ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ اَمْ لَكُمْ سُلْطٰنٌ مُّبِيْنٌ فَاْتُوْا بِكِتٰبِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ وَجَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا وَلَقَدْ عَلِمَتِ الْجِنَّةُ اِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ﴾[الصافات: ۱۴۹۔۱۵۸] (ان سے پوچھو تو کہ بھلا تمہارے رب کے لئے تو بیٹیاں اور ان کے لئے بیٹے؟۔ ہم نے فرشتوں کو عورتیں بنایا اور وہ موجود تھے؟۔ دیکھو یہ اپنی جھوٹ بنائی ہوئی کہتے ہیں۔ کہ اللہ کے اولاد ہے کچھ شک نہیں کہ یہ جھوٹے ہیں۔ کیا اس نے بیٹوں کی نسبت بیٹیوں کو پسند کیا ہے؟۔ تم کیسے لوگ ہو کس طرح کا فیصلہ کرتے ہو؟۔ بھلا تم غور کیوں نہیں کرتے؟۔ یا تمہارے پاس کوئی صریح دلیل ہے؟۔ اگر تم سچے ہو تو اپنی کتاب پیش کرو۔ اور انہوں نے اللہ میں اور جنوں میں رشتہ مقرر کیا حالانکہ جنات جانتے ہیں کہ وہ حاضر کئے جائیں گے) اور:

﴿وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ يُضَاهِـُٔوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ﴾[التوبۃ: ۳۰] (اور یہود کہتے ہیں کہ عزیر اللہ کے بیٹے ہیں اور عیسائی کہتے ہیں کہ مسیح اللہ کے بیٹے ہیں یہ ان کے منہ کی باتیں ہیں پہلے کافر بھی اسی طرح کی باتیں کہا کرتے تھے یہ بھی انہیں کی ریس کرنے لگے ہیں) تو آگاہ کیا کہ اس قسم کے کفریہ اقوال ان سے قبل کی امم نے بھی کہے، کہا گیا یہ ان کے قدماء ہیں بعض نے کہا یہ مشرکینِ عرب تھے مگر یہ دونوں قول محلِ نظر ہیں کیونکہ جن مشرکینِ عرب نے یہ کہا وہ یہود ونصاریٰ سے قبل کے نہ تھے تو ممکن ہے کہ یہ صابئین اور وہ مشرکین ہوں

جو حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ سے قبل تھے شام اور مصر وغیرہ کے ممالک میں جو ملائکہ کو اللہ کی اولاد قرار دیتے تھے، آگے اس کی تفصیل آرہی ہے! فرمایا:

﴿وَيَجْعَلُونَ لِلّٰهِ مَا يَكْرَهُونَ وَتَصِفُ أَلْسِنَتُهُمُ الْكَذِبَ أَنَّ لَهُمُ الْحُسْنٰى﴾[النحل: **۶۲**] (اور یہ اللہ کیلئے ایسی چیزیں تجویز کرتے ہیں جن کو خود ناپسند کرتے ہیں اور زبان سے جھوٹ بکے جاتے ہیں کہ ان کو بھلائی ہوگی) اور یہ بات عربوں میں سے بعض نے کہی تھی کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں اور کہا:

﴿وَيَجْعَلُونَ لِمَا لَا يَعْلَمُونَ نَصِيبًا مِّمَّا رَزَقْنٰهُمْ تَاللّٰهِ لَتُسْـَٔلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَفْتَرُونَ وَيَجْعَلُونَ لِلّٰهِ الْبَنٰتِ سُبْحٰنَهُ وَلَهُمْ مَّا يَشْتَهُونَ وَإِذَا بُشِّرَ أَحَدُهُمْ بِالْأُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهُ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيمٌ يَتَوَارٰى ـــ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾ تک [النحل: **۵۶۔ ۶۰**] (اور ہمارے دیئے ہوئے مال میں سے ایسی چیزوں کا حصہ مقرر کرتے ہیں جن کو جانتے ہی نہیں! اللہ کی قسم! کہ جو تم افتراء کرتے ہو اس کی تم سے ضرور پرسش ہوگی۔ اور یہ لوگ اللہ کیلئے تو بیٹیاں تجویز کرتے ہیں وہ اُن سے پاک ہے اور اپنے لئے جو مرغوب ہیں۔ حالانکہ جب اُن میں سے کسی کو بیٹی کی ولادت کی خبر ملتی ہے تو اُس کا منہ کالا پڑ جاتا ہے اور وہ اندوہناک ہو جاتا ہے) اور کہا:

﴿وَجَعَلُوا لَهُ مِنْ عِبَادِهِ جُزْءًا إِنَّ الْإِنْسَانَ لَكَفُورٌ مُّبِينٌ ـــ وَيُسْـَٔلُونَ﴾ تک [الزخرف: **۱۵۔ ۱۹**] (اور انہوں نے اس کے بندوں میں سے اس کے لئے اولاد مقرر کی بے شک انسان صریح ناشکرا ہے) تو یہ تنقید اس وجہ سے کہ انہوں نے اس کے ملائکہ کو اس کی بیٹیاں ثابت کیا جبکہ خود وہ انہیں اپنے لئے برا سمجھتے تھے تو اس کی نظیر نصاریٰ میں ہے جو اللہ کیلئے بیٹے کا اثبات کرتے ہیں جبکہ ان کے اکابر اہلِ دین (یعنی پادری) اپنے لئے نہ بیوی کا ہونا پسند کرتے ہیں اور نہ اولاد کا ہونا، تو جس امر کو اپنے لئے برا گردانتے ہیں اللہ کیلئے اس کا اثبات کرتے ہیں، فرمایا:

﴿وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْـًٔا إِدًّا تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْأَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ـــ فَرْدًا﴾ تک [مریم: **۸۹۔ ۹۶**] (اور کہتے ہیں کہ اللہ بیٹا رکھتا ہے۔ تم نے بُری بات کہی ہے۔ قریب ہے کہ اس سے آسمان پھٹ پڑیں اور زمین شق ہو جائے اور پہاڑ پارہ پارہ ہو کر گر پڑیں) اور:

﴿يٰٓأَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ وَلَا تَقُولُوا عَلَى اللّٰهِ إِلَّا الْحَقَّ إِنَّمَا الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُولُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهُ ـــ مِّنْ دُونِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيرًا﴾ تک [النساء: ۱۷۱۔ ۱۷۳] (اے اہلِ کتاب اپنے دین میں حد سے نہ بڑھو اور اللہ کے بارے میں حق کے سوا کچھ نہ کہو، مسیح مریم کے بیٹے عیسیٰ اللہ کے رسول اللہ اس کا کلمہ تھے جو اُس نے مریم کی طرف بھیجا تھا اور اس کی طرف سے ایک روح تھے) تو اہلِ کتاب کو دین میں غلو کرنے سے منع کیا اور یہ کہ اللہ کی طرف ناحق کو

منسوب کریں اورنصیحت کی کہ مسیح بارے حق اور سچ بات کہیں پھران سے کہا:(اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَ رَسُوْلِہٖ) کیونکہ وہ تثلیث کا عقیدہ اختیار کر کے اللہ کے ساتھ کفر کے مرتکب بنے تھے اوراتحاد وحلول کا نظریہ اختیار کر کے اللہ کے رسل کا کفر کیا تو یوں اسلامِ عام کے دونوں اصول کا کفر وانکار کیا یعنی الوہیت میں اللہ کیلئے وحدانیت کی اور رسل کیلئے رسالت کی گواہی دینے کا، اللہ نے باور کرایا کہ مسیح اور ملائکہ اس کی عبادت کرنے سے ہچکچاتے نہیں ہیں کیونکہ کئی ایسے لوگ تھے جو حضرت مسیح کی طرح (یعنی جیسے نصاریٰ نے انہیں اللہ کا بیٹا قرار دیا) فرشتوں کو اللہ کی اولاد قرار دیتے تھے اور وہ فرشتوں اور مسیح کی عبادت کرتے تھے، اسی لئے کہا:

(مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ) [البقرة : ۷۹- ۸۰] (کسی آدمی کے لئے لائق نہیں کہ اللہ اُسے کتاب اور حکومت اور نبوت عطا فرمائے اور وہ لوگوں سے کہے کہ اللہ کو چھوڑ کر میرے بندے ہو جاؤ بلکہ تم ربانی ہو جاؤ کیونکہ تم کتاب پڑھتے پڑھاتے رہتے ہو۔اوراس کو یہ بھی نہیں کہنا چاہیے کہ تم فرشتوں اور پیغمبروں کو رب بنا لو۔ بھلا جب تم مسلمان ہو چکے تو کیا اُسے زیبا ہے کہ تمہیں کافر ہونے کو کہے) تو یہاں فرشتوں اورانبیاء دونوں کا ذکر کیا،قرآن میں اللہ نے خود کے اپنے نفس سے ولادت کی نفی کی اسی طرح کسی کواپنا بیٹا بنالینے کی بھی تو کہا:

وَ(قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلِيٌّ مِّنَ الذُّلِّ) [الإسراء : ۱۱۱] (اورکہو کہ سب تعریف اللہ ہی کو ہے جس نے نہ تو کسی کو بیٹا بنایا ہے اور نہ اُس کی بادشاہی میں کوئی شریک ہے اور نہ اس وجہ سے کہ وہ عاجز وناتواں ہے نہ اُس کا کوئی مددگار ہے)اور:

(مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ وَّمَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ)[المؤمنون: ۹۱] (اللہ نے نہ تو کسی کو بیٹا بنایا ہے اور نہ اس کے ساتھ کوئی اورمعبود ہے)

(لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ)[الفرقان: ۲] (اسی کے لئے آسمانوں اورزمین کی بادشاہی اسی کی ہے اورجس کا کوئی بیٹا نہیں، جس کا بادشاہی میں کوئی شریک نہیں)

(وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ لَوْ اَرَدْنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا لَّاتَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّآ اِنْ كُنَّا فٰعِلِيْنَ بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُوْنَ)[الأنبياء : ۱۶- ۱۸] (اور ہم نے آسمان اورزمین کو اور جو ان دونوں کے درمیان ہے اس کو لہو ولعب میں پیدا نہیں کیا۔ اگر ہم چاہتے کہ کھیل بنائیں تو اگر ہم کو کرنا ہی ہوتا تو ہم اپنے پاس سے بنا لیتے ۔ بلکہ ہم سچ کو جھوٹ پر کھینچ مارتے ہیں تو وہ اس کا سر توڑ دیتا ہے اور جھوٹ اسی وقت

نابود ہو جاتا ہے اور جو باتیں تم بناتے ہو ان سے تمہاری ہی خرابی ہے)

﴿ وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ﴾ [الأنبياء : **۲۶۔۲۸**] (اور کہتے ہیں کہ اللہ بیٹا رکھتا ہے، وہ پاک ہے، اُس کے عزت والے بندے ہیں۔ اس کے آگے بڑھ کر بول نہیں سکتے اور اس کے حکم پر عمل کرتے ہیں۔ جو کچھ ان کے آگے ہو چکا ہے اور جو پیچھے ہوگا وہ سب سے واقف ہے اور وہ سفارش نہیں کر سکتے مگر اُس شخص کی جس سے اللہ خوش ہو اور وہ اُس کی ہیبت سے ڈرتے رہتے ہیں) جن لوگوں نے بلا علم اللہ کیلئے بیٹوں اور بیٹیوں کا اثبات کیا اور کہا اللہ صاحب اولاد ہے وہ بلا شبہ جھوٹے ہیں اور جنہوں نے کہا مسیح اللہ کا بیٹا ہے اور جنہوں نے کہا عزیر اللہ کا فرزند ہے تو ان کے عقلاء کی اس سے مراد حسی ولادت نہ تھی جو اس دنیا کی مخلوقات میں ہوتا ہے کہ نر اور مادہ کا باہم ملاپ ہو اور ان کا مادۂ منویہ باہم مختلط ہونے کے نتیجہ میں (اللہ کی مشیت کے مطابق) اولاد ہو تو نصاریٰ اور صابئین اس کی (اللہ سے) نفی پر متفق تھے اسی طرح مشرکینِ عرب بھی، میرا نہیں خیال کہ ان کے عقلاء اس کا اعتقاد رکھتے ہوں تو انہوں نے اللہ کیلئے صرف عقلی و روحانی ولادت کا اثبات کیا تھا جیسے نصاریٰ کہتے ہیں کہ وہ جوہر جو منجانب اللہ ہے وہی ایک وجہ سے کلمہ ہے جو حضرت مریم سے مخلوق تھا اور یہی ایک انسان (یعنی مسیحؑ) کے ساتھ متدرع (یعنی مختلط) ہوا تو ان کا عقیدہ ہے کہ لاہوت ناسوت کے ساتھ متدرع ہوا تو اس کا ظاہر۔ اور وہ بشری لبادہ۔ بشر ہے اور اس کا باطن ۔ اور وہ متدرع۔ لاہوت ہے جو بیٹا ہے جو اس اب سے جو وجود کا جوہر ہے، سے اس کلمہ کے ذریعہ متولد ہوا تو ان کے نزدیک یہ نبوت دو اصل سے مرکب ہے: ایک کہ وہ جوہر جو کہ کلمہ ہے اس جوہر سے متولد ہوا جو اب ہے جیسے عالم قائل سے علم و قول متولد ہوتا ہے اور دوم، کہ یہ جوہر مسیحؑ کے ساتھ متحد ہوا اور ان کے ساتھ متدرع ہوا اور یہ جوہر ایک جہت سے اب اور دوسری جہت سے ابن ہے، تو اسی لئے اللہ تعالیٰ نے بیان کیا کہ کبھی یہ کہتے ہیں مسیح اللہ کا ابن ہے اور کبھی کہتے ہیں اللہ! مسیح بن مریم ہے، جہاں تک قرآن کا یہ بیان کہ انہوں نے کہا:

﴿اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ﴾ [المائدۃ :۷۳] (کہ اللہ تین کا تیسرا ہے) تو مفسرین کہتے ہیں ان کی ان تین سے مراد: اللہ، حضرت مسیح اور ان کی والدہ ہے جیسے کہا:

﴿مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ﴾ [المائدۃ: **۷۵**] (نہیں تھے مسیح ابن مریم مگر رسول، اُن سے پہلے بھی بہت سے رسول گزر چکے تھے اور اُن کی والدہ صدیقہ تھیں) یعنی مسیح کی غایت بس رسالت ہے اور ان کی والدہ کی غایت صدیقیت ہے، وہ لاہوتیت تک نہیں پہنچے، ان کے بعض سمجھتے ہیں کہ اس سے مراد اقانیمِ ثلاثہ ہیں اور یہ: باپ، بیٹا اور روح القدس اور یہ محلِ نظر ہے! جہاں تک قولہ:

﴿وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ وَخَرَقُوْا لَهٗ بَنِيْنَ وَبَنٰتٍ بِغَيْرِ عِلْمٍ﴾ (ابھی گزری) تو اس کا قول: ﴿بَدِيْعُ

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ)[الأنعام:۱۰۱] (آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا) اَیْ مُبْدِعُهُمَا جیسے اس کا مثل البقرۃ میں ذکر کیا تو مراد یہ نہیں کہ ارض وسماوات بدیع (یعنی عجیب چیز) ہیں، ہاں البتہ عربیت اس (معنی) کی بھی محتمل ہے اگر سیاق مدِ نظر نہ رکھیں اس لئے کہ مقصود ان کے دعوائے خرقِ بنین وبنات کی نفی ہے اور اس امر کی کہ اس نے کسی کو اپنا بیٹا یا بیٹی بنالیا ہے اور یہ اپنے عکس اس کے آسمانوں اور زمین کے مبدِع ہونے کے ساتھ منتفی ہے پھر کہا: **(اَنّٰی یَکُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ)[الأنعام:۱۰۱]** (اُس کی اولاد کہاں سے ہو) تو یوں ان کے اس دعوی کی نفی پر تین ادلہ کا ذکر کیا:

(ا) کہ کوئی اس کی زوجہ نہیں ہے، تو یہ معہود ومعروف ولادت کی نفی ہوئی اور اس کا قول: **(وَ خَلَقَ كُلَّ شَیْءٍ)** (اور اُس نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے) عقلی ولادت کی نفی ہے اور یہ تولُّد، کیونکہ اس کی جانب سے ہر شیَ کی خلق سے اس کی تولد کی نفی ہوئی اور قولہ: **(وَهُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ)** (اور وہ ہر چیز سے باخبر ہے) ممکن ہے۔ واللہ اعلم۔ کہ جب نصاری نے دعوی کیا کہ ان کے ساتھ متحد وہ کلمہ ہے جسے وہ علم کے ساتھ مفسر کرتے ہیں جبکہ صابئین تولد اور علت کے قائل ہیں اور وہ اللہ کو ہر شیَ کا عالم نہیں مانتے تو ذکر کیا کہ وہ ہر شیَ کا علیم ہے اور یہ بات اس صفت کے اپنے لئے اثبات کے بطور اور صابئین کا رد کرتے ہوئے کہی اور اپنے غیر سے اس صفت کی نفی نصاری کا رد ہے تو جب معاملہ یہ ہے تو ان حضرات کا قول جو عقول ونفوس کے تولد کے قائل ہیں جنہیں وہ ملائکہ زعم کرتے ہیں نصاریٰ کے قول سے اظہر ہے کہ وہ انہیں (یعنی حضرت مسیح کو) فرشتوں کا بیٹا کہیں اور یہ کہ فرشتے اللہ کے بیٹے اور بیٹیاں ہیں تو عقول اس کے بیٹے اور نفوس اس کی بیٹیاں ہیں، اس میں وہ بھی شامل ہوگئے جو اپنے آپ کو مسلمان قرار دیتے ہوئے متفلسف بنے، میں ان کے ایک بڑے کو جانتا ہوں اس سے عقل ونفس کے بارہ میں سوال ہوا تو کہنے لگا یہ بمنزلہِ نر اور مادہ کے ہیں تو یوں اس نے بھی عقل اور نفس کو بیٹا اور بیٹی قرار دیا، وہ انہیں اللہ سے اس طرح کا متولد بناتے ہیں جیسے علت سے معلول کا تولُّد ہے تو ممکن نہیں کہ اس کی ذات اس کے معلول سے اور معلول کو اس سے جدا کیا جائے جیسے خود اس کے لئے ممکن نہیں کہ وہ اپنے آپ کو اس سے جدا کرے جیسے سورج کی نسبت اس کی شعاع ہے

اور یہ کہتے ہیں کہ یہ ارواح جنہیں اس نے مولد کیا افلاک، سورج، چاند اور کواکب کے ساتھ اس طرح متصل ہیں جیسے لاہوت کا جسدِ مسیح سے اتصال ہوا تو وہ اسی طرح ان کی عبادت کرتے ہیں جیسے نصاری حضرت مسیح کی البتہ یہ کئی وجوہ سے ان سے بڑے کافر ہیں اور نصاری سے بڑھ کر مشرک کہلانے کے حقدار ہیں کیونکہ یہ ان کی عبادت کرتے ہیں جن کی بابت انہیں علم ہے کہ یہ اللہ سے جدا ہیں، وہ یہ نہیں ہے اور نہ یہ اس کی صفات میں سے صفت ہیں جبکہ نصاری کا زعم ہے کہ وہ اس کی عبادت کرتے ہیں جس کا اللہ سے اتحادِ ذات ہوا ہے نہ کہ ان کی جو اس نے معلولات میں سے مولد کہا پھر ان فرشتوں، کواکب اور بشر کی ارواح و اجساد کے عابدین نے بتوں کو ان کی اشکال وطبائع پر گھڑ لیا تھا تو اسی سے بت پرستی رائج ہوئی اسی لئے امام الحنفاء حضرت ابراہیمؑ

خلیل اللہ نے کواکب اور شمس وقمر کی پوجا کرنے والوں سے اور ان سے جو اصنام کی پوجا کرتے تھے، مخاطب ہوکر وہ کچھ کہا جسے قرآن نے نقل کیا، اللہ نے قرآن میں کئی جگہ یہ ذکر کیا ہے! یہ صابئین اور مشرک تھے نمرود جن کا بادشاہ تھا اور انہی کے ہمنوا یونان کے فلسفی تھے اور دیگر جو ارضِ شام، جزیرہ اور عراق وغیرہ ممالک میں ان نصاریٰ سے قبل ہوئے، بنی اسرائیل کے دور میں یہ انہی علاقوں میں تھے انہی سے بنی اسرائیل کی کئی جنگیں ہوئی، کبھی اُنہیں اور کبھی اِنہیں غلبہ حاصل ہوا مثلا سخاریب اور بخت نصر وغیرہما جو حضرت خلیل کے عہد کے بعد صابئین کے بادشاہ بنے، نمرود تو انہی کے زمانہ میں تھا تو اس سے واضح ہوا کہ قرآن نے اس امت کے کفار ومنافقین سے قبل کی امم واقوام کے باطل اقوال اور اعتقادات مثلا اللہ کیلئے ولادت کا اثبات، کا بھی رد کیا ہے اگرچہ کثیر لوگ ان اقوال پر قرآن کی دلالت کی فہم نہیں رکھتے کیونکہ یہ دو امور کا محتاج ہے: ایک بالمعنی ان کے اقوال کا تصور نہ کہ مجرد لفظ کے ساتھ اور دوم قرآن کے معنی کا تصور اور دونوں کے مابین جمع وتطبیق! تو تم پاؤ گے کہ جو معنی انہوں نے مراد لیا قرآن نے اس کے ذکر اور ابطال پر دلالت کی ہے، جہاں تک اتحادِ ولد تو اسے عینِ ولادت کے ساتھ مفسر کیا گیا ہے اور یہ افعال کے باب میں سے ہے نہ کہ صفات کے باب سے جیسا کہ نصاریٰ کے ایک گروہ نے حضرت مسیح بارے قرار دیا۔

فصل

تو یہ اللہ سبحانہ کے کسی کے والد ہونے کی نفی ہے اور اس امر کی بھی کہ کسی کو اپنا بیٹا بنایا ہو، وجوہِ ولادت میں سے کسی بھی وجہ کے ساتھ یا کسی بھی طور! جہاں تک اس کے مولود ہونے کی نفی تو یہ اس کے کسی بھی نوعِ توالد کے ذریعہ کسی بشر یا غیرِ بشر سے متولد ہونے کو متضمن ہے تو یہ ان کا رد ہے جو قائل ہیں کہ مسیح اللہ ہے اور دجال کا بھی جو اپنے آپ کو اللہ قرار دے گا اور ان کا بھی جو کسی بھی بشر کی بابت کہیں کہ وہ اللہ ہے جیسے اس امت کے غالی لوگ حضرت علیؓ اور بعض دیگر اہلِ بیت کے بارہ میں اعتقاد رکھتے ہیں، کئی نے بعض انبیاء یا بعض مشائخ کی بابت بھی یہ کہا، ایک گروہ نے شیخ عدی اور ایک نے یونس عیسی بارے یہی ادعاء کیا، بعض نے سب مشائخ میں اس کی تعمیم کی تو قولہ تعالیٰ: (لَمْ يُولَدْ)[الإخلاص : ۳] اس سب کی نفی ہے کیونکہ یہ سب مولود تھے اور اللہ مولود نہیں، اسی لئے قرآن میں اللہ نے حضرت مسیح کا تذکرہ دیگر انبیاء سے مختلف انداز واسلوب سے کیا جیسے کہا:

(لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمَسِيحُ) اور قولہ:

(مَا الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ) اور:

(إِذْ قَالَ اللَّهُ يَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِي ـــ سِحْرٌ مُبِينٌ) تک [المائدة : ۱۱۰] (جب اللہ فرمائے گا کہ اے عیسیٰ بن مریم! میرے اُن احسانوں کو یاد کرو جو میں نے تم پر اور تمہاری والدہ پر کئے)

(وَإِذْ قَالَ اللَّهُ يَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ أَأَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُونِي وَأُمِّيَ إِلَٰهَيْنِ مِنْ دُونِ اللَّهِ) [المائدة: ۱۱۶]

(جب اللہ فرمائے گا کہ اے عیسیٰ بن مریم! کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ اللہ کے سوا مجھے اور میری والدہ کو معبود مقرر کرو؟)

﴿وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَأُمَّهُ آيَةً وَآوَيْنَاهُمَا إِلَى رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَمَعِينٍ﴾[المؤمنون : **۵۰**] (اور مریم کے بیٹے اور ان کی ماں کو نشانی بنایا تھا اور ان کو ایک اونچی جگہ پر جو رہنے کے لائق تھی اور جہاں پانی جاری تھا پناہ دی تھی)

﴿وَقَوْلِهِمْ إِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيحَ عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُولَ اللَّهِ﴾ [النساء : **۱۵۷**] (اور یہ کہنے کے سبب کہ ہم نے مریم کے بیٹے عیسیٰ مسیح کو جو اللہ کے پیغمبر تھے قتل کر دیا ہے) اس میں دو فائدے ہیں: ایک، اس امر کا بیان کہ حضرت مسیح مولود ہیں جبکہ اللہ مولود نہیں اور دوم حضرت مریم کی طرف ان کے بیٹا ہونے کی نسبت نہ کہ اللہ کا، جہاں تک قولہ:

﴿لَنْ يَسْتَنْكِفَ الْمَسِيحُ أَنْ يَكُونَ عَبْدًا لِلَّهِ﴾[النساء :۱۷۲] (مسیح اس بات سے عار نہیں رکھتے کہ اللہ کے بندے ہوں اور نہ مقرب فرشتے) الآیۃ اور قولہ:

﴿وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللَّهِ وَقَالَتِ النَّصَارَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللَّهِ﴾ [التوبۃ :۳۰] (اور یہود کہتے ہیں کہ عزیر اللہ کے بیٹے ہیں اور عیسائی کہتے ہیں کہ مسیح اللہ کے بیٹے ہیں) تو یہ ان کے قول کا نقل ہے جو انہوں نے کہا اور ان دو انبیاء کی نسبت اللہ کی طرف کی کہ وہ اس کے بیٹے ہیں تو یہ ان کے قول: (**الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ**) کو متضمن نہیں اور قولہ: **﴿وَلَمْ يَكُنْ لَهُ كُفُوًا أَحَدٌ﴾**[الإخلاص : **۴**] (اور کوئی اس کا ہمسر نہیں) شرکاء اور انداد کی نفی ہے اور اس میں ہر وہ داخل ہے جس نے خواصِ ربوبیت میں سے کوئی خصوصیت کسی بھی غیر اللہ میں قرار دی مثلاً تخلیقِ خلق، الوہیت، معبود ہونا اور اس سے دعاء کرنا وغیرہ تو یہ چند نکات ہیں جو کتاب اللہ کے کسی بھی بشر میں الوہیت کے اعتقاد کے اِبطال ورد پر مشتمل ہونے کی تبیین کرتے ہیں چاہے یہ الوہیت بذریعہ اتحادِ ذات یا حلول کرے اور یا کسی دیگر ذریعہ سے باور کرے۔

فصل

جہاں تک یہ ملاحدہ تو یہ اپنے کفر میں صرف یہ کہنے پر اقتصار نہیں کرتے کہ اللہ کسی کا والد ہوا یا اس نے کسی کو اپنا بیٹا بنالیا یا اللہ بشر مولود ہے، رب کے اس کے ساتھ اتحادِ ذات کی وجہ سے تو یہ سب دو جدا جدا اشیاء کے اثبات کو مقتضی ہے جن میں سے ایک کا دوسری سے اتحاد یا حلول ہوا اور ان کے نزدیک یہ خاص اور مقید اتحاد ہے، ان کے نزدیک کائنات میں صرف وہ ہی وہ ہے اس کے غیر کا جود ہی نہیں اور نہ کوئی اس کا ماسوا ہے، نہ اس نے کسی شئ کو پیدا کیا ہے اور نہ وہ کسی شئ کا رب اور مالک ہے، نہ کوئی اس کیلئے عبد ہے اور نہ عابد اور نہ داعی کہ جس کی دعائیں وہ قبول کرے اور نہ کوئی سائل ومضطر ہے جس کی وہ حاجت روائی کرے، ان کے مطابق لوگ ان معانی کے دراصل تبھی شاہد ہیں جب وہ وحدتِ مطلقہ کے شہود سے محجوب ہیں، جب ان کے دل کا حجاب رفع ہو جائے تو وہ دوئی کے قائل نہ رہیں گے کہ ایک خالق دوسرا مخلوق، ایک عابد اور دوسرا معبود اور ایک والد اور دوسرا مولود ہو یا یہاں کوئی شریک یا شفیع ہو، ان کے

حذاق مثلا تلمسانی اورابن فارض کا یہی موقف ہے،تلمسانی اس گروہ کے اقوال کے حقائق کا بنسبت دیگر کے اعرف تھا، جہاں تک ابن عربی تو وہ قائل ہے کہ یہ سب عدم میں ثابت ذوات میں ہے نہ کہ کسی موجود شئ میں اور جہاں تک وجود (یعنی کائنات) تو متصور نہیں (کہ ان کا الگ الگ وجود ہو) دراصل وجود جب اعیان پر فائض ہوا تو اعیان کی جہت سے ان میں تفرق ظاہر ہوا جیسے مختلف رنگ کی شیشیوں میں اسی رنگ کی روشنی نظر آتی ہے (یا پانی) تو قرآن کے شمار سے باہر مقامات میں ان کا رد کیا گیا ہے اور جو قصہ اللہ تعالیٰ نے فرعون کا ذکر کیا۔اور یہ ان کا رئیس تھا (یعنی اس نظریہ کا بانی)۔ان کے رد پر مشتمل ہے تو فرعون بھی رب العالمین کا منکر تھا اوراس امر کا کہ حضرت موسیٰ کا کوئی الہ ہے،اس نے اس وجود۔جو کہ یہ عالم ہے۔کا انکار نہ کیا تھا،تو اسی کی طرح یہ لوگ ہیں جو عالمِ ہذا کے مقر ہیں لیکن ان کے نزدیک یہاں اس کا غیر کوئی نہیں اور یہی (یعنی عالمِ وجود) اللہ ہے اور وہ انسانِ کبیر ہے۔

ابن تیمیہ کا ایک خط

احمد بن تیمیہ کی طرف سے قدوۃ، عارف شیخ، سالک وناسک ابوالفتح نصر کی طرف

اللہ تعالیٰ ان کے ظاہر و باطن پر وہ کچھ عیاں کرے جو وہ اپنے اولیاء کے قلوب پر کرتا ہے اور جہر واخفاء میں انس وجن کے شیاطین کے خلاف ان کی مدد کرے اور اپنی شریعت کے مطابق محمدی طریقہ کا انہیں راہبر بنائے اوران پر حقیقتِ دینیہ کا کشف کرے جو اس کی خلق و طاعت اور اس کے ارادہ ومحبت کے مابین ممیّز ہے تا کہ ان کے ذریعہ لوگوں کو کونی کلمات اور دینی کلمات کے درمیان فرق کا پتہ چلے،تو یوں خالص،صالح اور صادق اہلِ ایمان کی پرکھ ہو اوران کی نشاندہی جو فی الحقیقت منافق ہیں مگر بھیس اہلِ ایمان کا اختیار کر رکھا ہے جیسا کہ اللہ نے کتاب وسنت میں ان کی تفریق کی ہے

امابعد!

اللہ کا شیخ پر انعام ہے کہ انہیں دین و دنیا کی ظاہری و باطنی نعمتوں سے نواز رکھا ہے اور مسلمانوں کے دلوں میں ان کا احترام پیدا کیا ہے اورانہیں عطا کردہ حسنِ معرفت وقصد کے سبب انہیں بڑا رتبہ دے رکھا ہے ! دراصل علم اور ارادہ ہی ہدایت و عبادت کے طریق کی اصل ہیں اللہ تعالیٰ نے اس محبت کا اخراج کیا جن میں اشراک اورابہام ہے جیسا کہ کہا:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ﴾ [البقرة :١٦٥] (اور بعض لوگ ایسے ہیں جو غیر اللہ کو شریک بناتے ہیں اوران سے اللہ کی سی محبت کرتے ہیں لیکن جو ایمان والے ہیں وہ تو اللہ ہی سے سب سے زیادہ محبت کرتے ہیں) اور کہا:

﴿قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ

بِاَمْرِهٖ﴾[التوبۃ:۲۴] (کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ اور بیٹے اور بھائی اور عورتیں اور خاندان کے آدمی اور مال جو تم کماتے ہو اور تجارت جس کے بند ہونے سے ڈرتے ہو اور مکانات جنہیں تم پسند کرو تمہیں اللہ اور اس کے رسول سے زیادہ محبوب ہوں اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ عزیز ہوں تو ٹھہرے رہو یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم بھیجے)

اسی لئے ایمانی محبت ہی ایمانی ذوق اور دینی وجد کی موجب ہے جیسا کہ صحیحین میں حضرت انس سے مروی ہے کہ نبی اکرم نے فرمایا تین چیزیں ہیں جس کسی میں وہ ہوں وہ اپنے دل میں ایمان کی حلاوت کو پالے گا: کہ اللہ اور اس کا رسول اسے ہر ماسوا سے بڑھ کر محبوب ہوں، کہ اہل اللہ سے محبت کرے اور یہ کہ ایمان لانے کے بعد کفر میں واپس جانا اس طرح برا سمجھے جیسے آگ میں ڈالے جانے کو، تو یوں اللہ نے ایمانی حلاوت کا وجود اللہ اور اپنے رسول کی محبتِ فاضلہ کے ساتھ معلق کر رکھا ہے، اسی طرح اللہ کی وجہ سے محبت کرنے اور خلافِ ایمان امور کو ناپسند کرنے کے ساتھ، مسلم نے حضرت عباس سے نقل کیا کہ نبی اکرم نے فرمایا: اس نے ایمان کا ذائقہ چکھ لیا جو اللہ کو رب، اسلام کو دین اور حضرت محمد کو رسول مان لینے پر راضی ہوا تو یوں اس نے ایمان کا ذائقہ چکھنے کو اصولِ اسلام کے ساتھ راضی ہونے پر معلق کیا جیسے وجد کو محبت کے ساتھ معلق کیا تا کہ نبی اکرم ذوق اور وجد کے درمیان تفرقہ کریں جو کہ ظاہری اعمال کی اصل اور باطنی اعمال کا ثمرہ ہے اسی طرح اللہ و رسول کے اوامر کا دیگر کے اوامر سے جیسے سہل بن عبداللہ تستری نے کہا کہ ہر ایسا وجد جس کی تائید کتاب و سنت سے نہ ملے وہ باطل ہے کیونکہ ہر وہ جو کسی شئ سے محبت کرے تو اس کی محبت کے بحسب ہی اس کیلئے ذوق ہوگا اسی لئے اللہ نے اپنی محبت کے مدعی سے مطالبہ کیا کہ:

﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ﴾ [آل عمران:۳۱] (کہہ دو کہ اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو اللہ بھی تمہیں دوست رکھے گا اور تمہارے گناہ معاف کر دے گا) حسن بصری کہتے ہیں عہدِ نبوی میں کچھ حضرات نے ادعاء کیا کہ وہ اللہ کے محبّ ہیں تو اس آیت میں ان سے اتباعِ نبوی کا مطالبہ کیا، تو بندے کی اللہ سے محبت کو اپنے رسول کی اتباع اور اپنے رسول کی اتباع کو اپنے بندے سے محبت کا موجب قرار دیا، اپنے محبان کا وصف کرتے ہوئے کہا:

﴿فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ﴾[المائدۃ:۵۴] (تو اللہ ایسے لوگ پیدا کر دے گا جن کو وہ دوست رکھے اور جسے وہ دوست رکھیں اور جو مومنوں کے حق میں نرمی کریں اور کافروں سے سختی سے پیش آئیں، اللہ کی راہ میں جہاد کریں اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں) تو اپنے محبان اور وصفِ کمال کے ساتھ محبوبین کا وہی وصف ذکر کیا جو اللہ نے اپنے رسول کا کیا جو جلال و جمال کے جامع اور ہم سے قبل کی دونوں ملتوں میں مفرق ہیں اور یہ وصف ہے اللہ کے اعداء کے خلاف شدت و عزت اور اللہ کے اولیاء اور اس کے رسول کیلئے عاجزی اور نرمی، اسی لئے کثیر ایسے لوگ ہیں جن کیلئے مجمل و مطلق وجد اور حب ہے جیسا

کہ اس بارے ان کے ایک بڑے نے کہا: (مشردٌ عَنِ الْوَطَنِ مُبْعَدٌ عَنِ السَّکَنِ، یَبْکِی الطَّلَلَ وَالدِّمَنَ یَهْوَیٰ ولاَ یَدْرِیْ لِمَنْ) (وطن سے نکلا ہوا، در بدر کھنڈرات اور بیابانوں میں مارا مارا پھرتا،عشق کرتا ہے لیکن علم نہیں کس سے)

تو شیخ کو۔اللہ ان سے اچھا سلوک کرے۔اللہ نے نور ومعرفت ودیعت کیا ہے جو کہ محبت وارادت کی اصل ہے جس کے ساتھ محمدی مفصل ایمانی محبت مجمل ومشترک کی محبت سے متمیز ہے تو جس طرح یہ اجمال محبت میں واقع ہے اسی طرح کا اجمال توحید میں بھی ہے، اللہ تعالیٰ نے ام الکتاب جس کی قراءت ہر نماز میں واجب ہے، میں کہا: (اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ) [الفاتحۃ: ۴] (اے اللہ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں) ایک صحیح حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کہتا ہے میں نے نماز کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان آدھوں آدھ تقسیم کر دیا ہے نصف میرے لئے اور نصف اس کیلئے اور میرے بندے کیلئے وہ جس کا اس نے سوال کیا، تو بندہ جب کہے: (اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ) اللہ کہتا ہے میرے بندے نے میری حمد کی، جب کہا: (اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ) اللہ کہتا ہے میرے بندے نے میری ثناء کی، جب کہا: (مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ) اللہ فرماتا ہے: (مَجَّدَنِیْ عَبْدِیْ) (میرے بندے نے میری بزرگی بیان کی) یا (فَوَّضَ إِلَیَّ عَبْدِیْ) (میرے بندے میرے لئے سرِ تسلیم خم کیا) اور جب بندے نے کہا: (اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ) تو ارشاد کیا یہ آیت میرے اور میرے بندے کے درمیان نصف نصف ہے اور میرے بندے کو وہ عطا کیا جس کی اس نے طلب کی اور جب کہے:

(اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ) [الفاتحۃ: ۵-۷]

(ہمیں سیدھے راستے پر چلا۔ ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام کیا۔نہ کہ جن پر غضب ہوا اور نہ ان کا جو گمراہ بنے) فرمایا تو یہ سب میرے بندے کے لئے اور جو اس نے مانگا، اسی لئے مروی ہے کہ اللہ نے ایک سو چار کتب نازل کی ہیں جن کا نچوڑ اور معانی اس نے قرآن میں رکھ دئے ہیں، قرآن کے معانی مفصل (سورتوں) میں اور مفصل کے معانی (اور نچوڑ) سورۃ الفاتحہ میں ہے اور سورۃ فاتحہ کا نچوڑ ان دو جملوں میں ہے: (اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ) اسی معنی کو دوسرے الفاظ میں یوں بیان کیا:

(فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَیْهِ) [ھود: ۱۲۳] (تو اسی کی عبادت کرو اور اسی پر بھروسا رکھو) اور: (عَلَیْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَیْهِ اُنِیْبُ) [ھود: ۸۸] (میں اسی پر بھروسہ رکھتا ہوں اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں) اور:

(عَلَیْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَیْهِ مَتَابِ) [الرعد: ۳۰] (میں اُسی پر بھروسا کرتا ہوں اور اُسی کی طرف رجوع کرتا ہوں) نبی اکرم قربانی کرتے وقت کہا کرتے تھے: (اَللّٰهُمَّ هٰذَا مِنْكَ وَلَكَ) (یا اللہ یہ تجھ سے اور تیرے لئے) تو اللہ سبحانہ توحید کا مستحق ہے جو اسی سے دعاء اور دین کا اس کے لئے اخلاص ہے، دعائے عبادت، محبت، انابت، طاعت، اجلال، اکرام اور خشیت امید کے ساتھ، اور دیگر معنائے تألہ اور عبادت، اسی طرح دعائے مسئلہ (یعنی کسی چیز کی طلب اور مانگ کرنا) اور استعانت، اس پر توکل،

اس کی طرف التجا اور اس سے طلب کے ساتھ اور اس کا نحو جو اللہ سبحانہ اپنی ربوبیت کے مقتضا سے کرتا ہے! وہی اول وآخر اور ظاہر و باطن ہے اسی لئے عبادت میں شریعتِ کاملہ اسم اللہ کے ساتھ اور دعائے مسئلہ میں رب کے اسم کے ساتھ وارد ہے تو نماز میں مشغول اور ذاکر: اللہ اکبر، سبحان اللہ، لا الہ الا اللہ اور اذان کے کلمات ونحوہا کہتا ہے اور جب دعائے طلب کرے تو مثلا کہتا ہے:

﴿رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنْفُسَنَا الخ﴾ [الأعراف: ۲۳] ﴿رَبِّ اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ الخ﴾ [إبراهيم: ۴۱] (اے میرے رب مجھے اور میرے ماں باپ کو اور مومنوں کی مغفرت فرما)

﴿رَبِّ بِمَا أَنْعَمْتَ عَلَيَّ فَلَنْ أَكُونَ ظَهِيرًا لِّلْمُجْرِمِينَ﴾ [القصص: **۱۷**] (کہنے لگے اے رب! تو نے جو مجھ پر مہربانی فرمائی ہے میں کبھی گنہگاروں کا مددگار نہ بنوں گا)

﴿فَاغْفِرْ وَارْحَمْ وَأَنتَ أَرْحَمُ الراحمين﴾ [المؤمنون: **۱۱۸**] (اے میرے رب بخش دے اور رحم کر اور تو سب سے بہتر رحم کرنے والا ہے) ونحو ذلک، کثیر سالکین اس کے سلوک میں اعیان وصفات میں سے ہر مخلوق کے لئے ربوبیت اور کامل قیومیت کے شاہد ہیں اور یہ امور اللہ کے کونی کلمات کے ساتھ قائم ہیں نبی اکرم جن کے ساتھ استعاذہ کیا کرتے اور فرماتے تھے: (أَعُوذُ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّةِ الَّتِيْ لَا يُجَاوِزُهُنَّ بَرٌّ وَلَا فَاجِرٌ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ وَذَرَأَ وَ بَرَأَ وَ مِنْ شَرِّ مَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ وَ مَا يَعْرُجُ فِيهَا مِنْ شَرِّ مَا ذَرَأَ فِي الأَرْضِ وَ مَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمِنْ شَرِّ فِتَنِ اللَّيْلِ وَ النَّهَارِ وَمِنْ شَرِّ كُلِّ طَارِقٍ إلَّا طَارِقاً يَطْرُقُ بِخَيْرٍ يَا رَحْمٰنُ) (میں اللہ کے تام کلمات کے ساتھ پناہ کا طالب ہوں جن سے کوئی نیک وبد متجاوز نہیں اس کے شر سے جسے اس نے پیدا کیا اور اگایا اور وجود میں لایا اور اس کے شر سے جو آسمان سے نازل ہو اور جو اس میں چڑھے اور جو زمین سے نکلے اور جو اس میں داخل ہو اور رات اور دن کے فتنوں کے شر سے اور ہر آنے والے کے شر سے مگر جو خیر کے ساتھ آئے اے رحمٰن)

تو اس توحیدِ ربانی کے ساتھ یہ سالک حضرات مامور بہ اور اپنے سے مطلوب سے بھی غائب اور فانی ہو جاتے ہیں اور یہ حق کو محبوب اور پسندیدہ الٰہی توحید ہے جو کہ اس کی وحدہ لاشریک لہ عبادت اور اس کی اور اس کے رسول کی طاعت، اسی کا امر جس کا اس نے حکم دیا اور اس سے نہی جس سے اس نے نہی کی اور اس کی خاطر محبت اور بغض کرنا ہے! جس نے اس توحید سے اعراض کیا اور اول کا اخذ کیا تو وہ قدریہ شرکیہ سے مشابہ ہوا جو قائل تھے کہ: ﴿لَوْ شَاءَ اللّٰهُ مَا أَشْرَكْنَا وَلَا آبَاؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِن شَيْءٍ﴾ [الأنعام: ۱۴۸] (اگر اللہ چاہتا تو ہم شرک نہ کرتے اور نہ ہمارے باپ دادا کرتے اور نہ ہم کسی چیز کو حرام ٹھہراتے) اور جس نے اول چھوڑ کر ثانی کا اخذ کیا وہ قدریہ مجوسیہ سے مشابہ ہوا جو زعم کرتے تھے کہ اللہ بندوں کے افعال کا خالق نہیں اور نہ کل کائنات اس کی مشیت کے تابع ہے جیسے معتزلہ اور رافضیہ بھی یہی کہتے ہیں اور یہ کثیر متکلمین اور بزعمِ خود متفقہین کی کلام میں بھی واقع ہے

اول کو اوامر اور نواہی سے منحل (یعنی آزاد) اباحیت پسندوں کے کئی گروہوں نے اختیار کیا، اسے انہوں نے دراصل اپنی

خواہشات پوری کرنے کا آلہ بنا رکھا ہے وگرنہ یہ غیر مستمر ہے اور یہی شریعت سے خروج کرنے والے کثیر متألہین کی روش ہے تو ان کے ہاں کئی عبادات اور زہادات ایسی ہیں جو غیر مامور بہ ہیں تو یہ کئی فاسد احوال کا سبب بنتی ہیں جن سے ان کی بعض وجوہ سے رُہبان (راہب کی جمع) اور عبادِ بدود (یعنی کسی مادی طاقت کے غلام) سے مشابہت ہو جاتی ہے اسی لئے شیخ عبدالقادر (جیلانی) قدس اللہ روحہ کا قول ہے کہ کثیر لوگ جب قضاء وقدر کے موضوع میں داخل ہوئے تو متوقف ہوئے، میرے لئے اس میں ایک روزن کھلا ہے (ابن تیمیہ نے [روزنۃ] کا لفظ استعمال کیا ہے) تو میں نے حق کی اقدار سے حق کے ساتھ حق کے لئے منازعت کی اور ولی کی یہی روش ہے کہ وہ قدر کیلئے منازِع ہوتا ہے نہ کہ جو اس کے لئے موافق ہو، شیخ کی یہ کلام محمدیت کی زبان ہے، یعنی مسلمان مامور ہے کہ وہی کرے جس کا اللہ نے حکم دیا اور اس سے باز رہے جس سے اللہ نے نہی کی اگرچہ اس کے اسباب مقدر کیے گئے تو وہ اللہ کی تقدیر کو اللہ کی تقدیر کے ساتھ ٹالتا ہے جیسے طبرانی کی نقل کردہ کتاب الدعاء میں ایک حدیث میں ہے کہ آنجناب نے فرمایا: بے شک دعا اور بلا ارض وسماء کے درمیان ایک دوسری کے بالمقابل ہو جاتی ہیں (یعنی دعا اوپر جارہی اور بلا نازل ہو رہی ہوتی ہے کہ آمنے سامنے آجاتی ہیں)

جامع ترمذی میں ہے کہ عرض کی گئی یا رسول اللہ ان دواؤں اور دم کی بابت اور حفاظتی اقدامات بارے کیا ارشاد ہے؟ کیا یہ اللہ کی تقدیر کو ٹال سکتی ہیں؟ فرمایا یہ بھی تقدیر کا حصہ ہیں، انہی دونوں کی طرف طبرانی کی ایک اور روایت اشارت کناں ہے جس میں فرمایا اللہ تعالی کہتا ہے اے ابن آدم چار چیزیں ہیں: ایک میرے لئے، ایک تمہارے لئے، ایک میرے اور تمہارے مابین مشترک اور ایک میرے اور میری خلق کے درمیان مشترک! تو جو خالص میرے لئے (یعنی میرا حق ہے) وہ یہ کہ تو بغیر شرک کے خالص میری عبادت کرے، جو تمہارے لئے ہے وہ یہ کہ تمہارے عمل کا ایسے وقت تمہیں اجر و جزا دوں گا جب تمہیں اس کی اشد ضرورت ہوگی (یعنی روز قیامت) اور میرے اور تمہارے مابین مشترک یہ ہے کہ تم دعا کرو اور میرے ذمہ اسے قبول کرنا ہے اور چوتھی جو میرے اور میری خلق کے مابین مشترک ہے وہ یہ کہ لوگوں سے وہی سلوک کرو جو چاہتے ہو کہ وہ تم سے کریں، پھر الوہیت اور ربوبیت کی یا ان دونوں میں سے ایک کی جامع توحید تو بندے کیلئے اس میں تین مقامات ہیں: مقامِ فرق و کثرت، کثرت مخلوقات و مامورات سے اس کے انعام کے ساتھ، اور پھر مقامِ جمع اور مقامِ فناء اس طور کہ وہ اپنے مشہود کے ساتھ اس کے شہود، اپنے معبود کے ساتھ اس کی عبادت، اپنے موحد کے ساتھ اس کی توحید، اپنے مذکور کے ساتھ اس کے ذکر اور اپنے محبوب کے ساتھ اس کی حب سے غائب ہو جائے (یعنی فنا فی الذات ہو) تو یہ ادراکِ ماسوا سے فنا ہے اور یہ قاصرین کا فنا ہے! جہاں تک کامل محمدی فنا تو یہ ماسوا کی عبادت، اس کے ساتھ استعانت اور ماسوا کی رضا جوئی کے ارادہ سے فنا ہے اور یہ درجہ ثالثہ میں ہے اور یہ جمع میں تفرقہ اور وحدت میں کثرت کا شہود ہے تو وہ قیامِ کائنات کا شاہد بنتا ہے اس کے تفرق، اللہ وحدہ کی اقامت اور اس کی ربوبیت کے ساتھ اور دیکھتا ہے کہ کوئی دابہ (یعنی زمین میں موجود ذی حیات) نہیں مگر میرا رب اس کی پیشانی کو پکڑے ہوئے ہے

(یہ قرآنی آیت ہے: **مَا مِنْ دَآبَّةٍ إِلَّا هُوَ آخِذٌ بِنَاصِيَتِهَا [هود :۵۶]** جو چلنے پھرنے والا ہے وہ اس کو چوٹی سے پکڑے ہوئے ہے) اور وہ ہر شیٔ پر وکیل ہے، رب العالمین ہے، بندوں کے قلوب اور ان کی پیشانیاں اسی کے قبضۂ قدرت میں ہیں اس کے سوا کوئی خالق، نافع، ضار، معطی، مانع، حافظ، معز اور مذل نہیں نیز اس امر کا شاہد ہے کہ فعلِ مامورات باوجود اپنی کثرت کے اور ترکِ شبہات باوصف اپنی کثرت کے اللہ وحدہ لاشریک لہ کیلئے ہے اور یہ وہ عام اور جامع دین اور عام اسلام وایمان ہے جو تمام انبیاء لے کر آئے اسی کے ساتھ مکی سورتیں نازل کی گئیں، اسی طرف اللہ تعالیٰ نے اپنے اس فرمان میں اشارہ کیا:

(شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ) [الشوریٰ : **۱۳**] (اس نے تمہارے لئے دین کا وہی رستہ مقرر کیا جس کا نوح کو حکم دیا تھا اور جس کی ہم نے تمہاری طرف وحی بھیجی ہے اور جس کا ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو حکم دیا تھا کہ دین کو قائم رکھنا اور اس میں پھوٹ نہ ڈالنا) اور:

(وَسْـَٔلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَآ اَجَعَلْنَا مِنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ اٰلِهَةً يُّعْبَدُوْنَ) [الزخرف: **۴۵**] (اور جو اپنے رسل ہم نے تم سے پہلے بھیجے ہیں ان سے دریافت کرلو کیا ہم نے الرحمٰن کے سوا اَور معبود بنائے تھے کہ ان کی عبادت کی جائے؟)

(وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ) [النحل: **۳۶**] (اور ہم نے ہر جماعت میں پیغمبر بھیجا کہ اللہ ہی کی عبادت کرو اور بتوں سے اجتناب کرو) اسی لئے بخاری نے اس عنوان سے ایک باب قائم کیا: (بَابُ مَا جَاءَ أَنَّ دِيْنَ الأَنْبِيَاءِ وَاحِدٌ) (باب اس بارے کہ تمام انبیاء کا دین واحد ہے) اور اللہ نے فرمایا:

(اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِـِٕيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ) [البقرة :۶۲] (جو لوگ مسلمان ہیں یا یہودی یا عیسائی یا ستارہ پرست (یعنی کوئی شخص کسی بھی قوم و مذہب کا ہو پھر) جو اللہ اور روزِ قیامت پر ایمان لائے گا اور نیک عمل کرے گا تو ایسے لوگوں کو ان کے صلہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ملے گا اور نہ ان کو کسی طرح کا خوف ہوگا اور نہ وہ غمناک ہوں گے) تو چاروں ملل میں ان کا جمع کیا جو: **(مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا)** اور یہ نسخ وتبدیل (یعنی تحریف کرنے) سے قبل، آیت کے شروع میں مومنین کو خاص کیا اور یہ خاص شرعی ایمان ہے جس کی بابت کہا: **(لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا)** [المائدة: ۴۸] (ہم نے تم میں سے ہر ایک کیلئے ایک دستور اور طریقہ مقرر کیا ہے) شرعہ شریعت ہے اور منہاج طریقہ، اور جامع دین حقیقتِ دینیہ اور توحیدِ ربوبیت حقیقتِ کونیہ ہے تو کوئی موجود ومقصود حقیقتِ دینیہ انبیاء ومرسلین کے ہاں متفق علیہ ہے

جہاں تک (اسلامی) شریعت اور منہاج تو یہ امت محمد یہ کیلئے ہے جو **(خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ)**[آل عمران : **۱۱۰**] (جتنی امتیں لوگوں میں پیدا ہوئیں تم اُن سب سے بہتر ہو) ہے اور اسی کے ساتھ مدنی سورتیں نازل کی گئیں کیونکہ ہجرت

کے بعد ہی شریعت کے احکام وضوابط وضع کئے گئے تھے اوراحکام وفرائض اور حدود کا نزول ہوا تو یہ ہے وہ توحید جو انبیاء لے کر آئے اورآسمانی کتب جس کے ساتھ نازل ہوئیں، اسی کی طرف مشائخ طریقت اور علمائے دین داعی ہیں لیکن **بعض صاحبانِ حال** کیلئے کبھی حالِ فنائے قاصر میں حالتِ سکر اورسوا سے غیاب طاری ہو جاتا ہےاور سکر بلاتمیز وجد ہےتو یہ حال طاری ہونے پر سالک کہہ سکتا ہے: (سُبْحَانِیْ) یا(مَا فِی الْجُبَّةِ إِلَّا اللّٰهُ) یااس طرح کے دیگر کلمات جو کہ ابویزید بسطامی اوردیگر سے حالتِ صحو (یعنی ہوش قائم ہونے کی حالت) میں منقول ہیں، تو سکران (جس کے ہوش قائم نہیں) کے منہ سے نکلنے والے اس طرح کے کلمات کو نظر انداز کیا جائے انہیں بیان ونقل نہ کیا جائے بشرطِ کہ حالتِ سکر کا سبب کوئی شرعی محظور نہ ہو (مثلا شراب یا بھنگ وغیرہ پینے کی وجہ سے) لیکن اگر حالتِ سکر محظور سبب سے طاری ہوئی تب وہ معذور متصور نہ ہوگا، اس ضمن میں جسمانی اورروحانی سکر کے درمیان فرق نہیں تو جسمانی سکر (کسی خاص نوع کے) طعام وشراب کے ساتھ ہے، نفوس کا سکر صورتوں اورروحانی سکر آوازوں کے ساتھ ہے (یعنی ازقبیلِ الہام والقاء) اس طرح کی حالت میں بعض سے غلط طور پر (یعنی اسے شعور ہی نہ تھا کہ کیا کہہ رہا ہے) اتحاداورحلولِ عینی کا دعوی صادر ہوا عین اسی طرح کا جونصاری نے حضرت مسیح اورغالی لوگوں نے حضرت علی اوردیگر اہل بیت بارے کہا، اسی طرح جہال کے ایک گروہ نے حلاج اور حاکمِ مصر وغیرہ بارے، کئی دفعہ ان پر نوعی حکمی اتحاد کا معاملہ عینی ذاتی اتحاد کے ساتھ مشتبہ ہو جاتا ہے تواول جیسا کہ مسلم نے اپنی صحیح میں حضرت ابوہریرہ سے روایت کی کہ نبی اکرم نے فرمایا اللہ تعالیٰ فرمائے گا: اے میرے بندے میں بیمار ہوا تم نے میری عیادت نہ کی، وہ کہے گا میں کیسے تیری عیادت کرتا جبکہ تو رب العالمین ہے۔۔۔الخ

تواس حدیث میں جو کہا کہ اس نے اللہ کے بندے اوراس کے ایک محبوب کو بھوکا رکھا، اس کی تفسیر اللہ کے اس قول سے ذکر کی کہ: (لَوَجَدْتَ ذٰلِكَ عِنْدِیْ) (کہ اگر اسے کھانا دیتے تو اسے [آج] میرے یہاں پاتے) یہ نہیں کہا: (لَوَجَدْتَنِیْ قَدْ أَكَلْتُهُ) (کہ پاتے کہ میں نے اسے کھایا ہے) اوراس قول سے کہ:(لَوَجَدْتَنِیْ عِنْدَهُ)(یعنی مجھے اس کے پاس پاتے) اور یہ نہیں کہا: (لَوَجَدْتَنِیْ إِيَّاهُ) (یعنی مجھے وہ پاتے) یہ اس لئے کہ محبّ اورمحبوب کا باہمی اتفاق اس طرح کا ہو جاتا ہے کہ جو چیز اسے پسند ہو وہ اسے بھی ہوتی ہے اور جو اسے ناپسند ہو وہ اسے بھی ناپسند ہو جاتی ہے اور وہ اسی کا امر دیتا اوراسی سے نہی کرتا ہے جس کا وہ حکم دیتا اور جس سے نہی کرتا ہے تو جس کی رب تعالیٰ سے یہ محبت ہو جاتی ہے تو حق تعالیٰ ان کی رضا پر راضی اوران کی ناراضی پر ناخوش ہوتا ہے اوراس ضمن میں کامل مطلق حضرت محمدؐ کی ذاتِ بابرکات ہے اسی لئے آپ کی بابت کہا:

﴿إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللَّهَ﴾[الفتح: ۱۰] (جولوگ تم سے بیعت کرتے ہیں وہ اللہ سے بیعت کرتے ہیں) اور: **﴿وَاللَّهُ وَرَسُولُهُ أَحَقُّ أَنْ يُرْضُوهُ إِنْ كَانُوا مُؤْمِنِينَ﴾** [التوبة:۶۲] (اللہ اوراس کے پیغمبر زیادہ حقدار ہیں کہ یہ انہیں راضی کریں) اور: (**مَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ**)[النساء: ۸۰] (جوشخص رسول کی فرمانبرداری کرے گا تو بے شک اُس نے

اللہ کی فرمانبرداری کی)

آج کل جوانجیل کانسخہ نصاریٰ کے پاس ہےاس میں چند مجمل کلمات ہیں جوحضرت عیسیٰ کی طرف منسوب ہیں اورعلم نہیں کہ ان کی طرف ان کی نسبت صحیح ہے یانہیں، کہ انہوں نے کہا: (أَنَا وَ أَبِيْ وَاحِدٌ مَنْ رَآنِيْ فَقَدْ رَآىٰ أَبِيْ) ونحوذلک (لفظی ترجمہ: میں اور میرا اَبْ واحد ہیں جس نے مجھے دیکھا اس نے میرے اَبْ کو دیکھا) اوراسی سے نصاریٰ گمراہ ہوئے کہ جب متشابہات کے پیچھے لگے جیسا کہ قرآن نے ان کی بابت ذکر کیا، جب نجران کے عیسائیوں کا وفد آیا اورحضرت مسیح بارے نبی اکرم سے مناظرہ کیا، بخاری کی نقل کردہ حضرت ابوہریرہ سے روایت میں ہے کہ نبی کریم نے حدیثِ قدسی بیان کی کہ اللہ نے فرمایا جس نے میرے کسی ولی سے دشمنی کی اس نے مجھے جنگ کی دعوت دی(آگے وہی جوقبل ازیں ذکر ہوا کہ بندہ فرائض ونوافل کے ذریعہ میرا تقرب حاصل کرتا رہتا ہے۔۔۔ الخ)بعض کا یہ زعم غلط ہے کہ اس حدیث میں جس قرب کا ذکر ہوا وہ نوافل کا قرب ہےاورفرائض کا قرب یہ ہے کہ وہ خاص وہی بن جاتا ہے (یعنی اتحادِ ذات) کیونکہ اللہ فرائض کے بغیر نفلی عبادت قبول نہیں کرتا تو یہ قربِ مذکور فرائض اورنوافل دونوں کا جامع ہےتو یہ اوراس طرح کے معانی اہلِ طریقتِ اسلامی کے مذہب کےاصول ہیں اوریہی انبیاء ومرسلین کی اتباع ہے!

مجھ تک یہ بات پہنچی ہے کہ آپ کی خدمت میں موجود بعض حضرات نے اتحادیہ کے مذہب بارے کلام ذکر کی اور میں قبل ازیں آپ کی خدمت میں ایک مکتوب بھیج چکا ہوں جس میں بلا قصد ان حضرات کے حال کی طرف اشارہ کیا تھا، بخدا کسی خاص اورمعین شخص کی طرف اشارہ مقصود نہ تھا، شیخ تو مجمع المومنین ہیں (یعنی اہلِ ایمان کی مسلمہ شخصیت) ہم پر لازم ہے کہ دین ودنیا میں ان کے حسبِ حال ان کی معاونت کریں، جہاں تک یہ اتحادیہ تو راقم کی طرف ایک پیغام آیا ہے جس میں ان کی حقیقتِ حال ظاہر کرنے کو کہا گیا ہے! میں نے اس ضمن میں ایک خط لکھا ہے جوممکن ہے شیخ کو بھی بھیجا جائے،سیدنا شیخ عمادالدین نے بھی اس ضمن میں کئی خطوط لکھے ہیں، اللہ جانتا ہے۔ وکفی بہ علیما۔ کہ اگر میں ان لوگوں کے ضرر کواللہ تعالی کے طریق کے سالکین سے دورکرنا بڑی ذمہ داریوں میں سے نہ سمجھتا اور یہ ایسے ہی ضروری ہے جیسے تاتاریوں کے مسلمانوں پرحملوں کا دفاع کرنا تواللہ اوراس کے رسول پرایمان والوں کیلئے اس امر کی ضرورت نہ ہوتی کہ طریقت کے اسرار منکشف کئے جائیں اوراس کے حجاب دور کئے جائیں! لیکن شیخ ۔اللہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کرے۔ جانتے ہیں کہ دعوتِ نبوی کا بلکہ تخلیقِ کائنات، کتب کے انزال اوررسل کے ارسال کا مقصود یہ ہے کہ دین سب کا سب اللہ کیلئے ہوجائے، یہی خلائق کوان کے خالق کی طرف دعوت ہے جوآنجناب سے مخاطب ہوکر اللہ نے کہا:

﴿إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا﴾ [الأحزاب: ۴۵] (ہم نے تم کوگواہی دینے والا اورخوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے) اور:

﴿قُلْ هَٰذِهِ سَبِيلِي أَدْعُو إِلَى اللَّهِ عَلَىٰ بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي﴾ [یوسف:۱۰۸] (کہہ دوکہ میرا راستہ تو یہ ہے میں

اللہ کی طرف بلاتا ہوں سمجھ بوجھ کر میں بھی اور میرے پیرو بھی)اور:

﴿ وَإِنَّكَ لَتَهْدِيٓ إِلَىٰ صِرَٰطٖ مُّسْتَقِيمٖ صِرَٰطِ ٱللَّهِ ٱلَّذِي لَهُۥ مَا فِي ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَمَا فِي ٱلْأَرْضِۗ أَلَآ إِلَى ٱللَّهِ تَصِيرُ ٱلْأُمُورُ﴾ [الشوریٰ : **۵۳**] (اللہ کا راستہ جوآسمانوں اور زمین کی سب چیزوں کا مالک ہے دیکھو سب کام اللہ کی طرف رجوع ہوں گے) ان لوگوں نے سالکین پر اس توحید کو مسخ کر دیا ہے جس کے ساتھ اللہ نے کتب نازل کیں اور رسل مبعوث کئے اس اتحاد کے نظریہ کے ساتھ جسے یہ توحید کہتے ہیں لیکن اس کی حقیقت تعطیلِ صانع اور انکارِ خالق ہے ! میں قدیم زمانہ میں ابن عربی کو قابلِ تعظیم سمجھتا اور اس کے ساتھ حسنِ ظن رکھتا تھا کیونکہ اس کی مصنفات از قسم فتوحات، الکنہ، المحکم المربوط، الدرۃ الفاخرۃ اور مطالع النجوم ونحوہا میں کثیر فوائد دیکھے لیکن ابھی تک اس کے حقیقتِ مقصود پر مطلع نہ تھا اور فصوص الحکم وغیرہ کا مطالعہ نہ کیا تھا، ہم اللہ بارے اپنے بھائیوں کے ساتھ جمع ہوتے اور طلبِ حق اور اس کی اتباع اور طریقت کی حقیقت کا کشف کرتے تھے پھر صورتحال (اور ابن عربی کے اصل نظریات)واضح ہوئے تو ہم نے اپنی ذمہ داری کا احساس کیا، جب بلادِ مشرق سے معتبر مشائخ کی آمد ہوئی اور انہوں نے اسلامی طریقت کی حقیقت اور ان حضرت کے نظریات بارے آگہی چاہی تو بیان ضروری تھا، اسی طرح شام کے مختلف علاقوں سے وہاں کے اہلِ صدق وطلب سالکین کے ہمارے پاس خطوط آئے، انہوں نے بھی اس امر کا تقاضہ کیا اور چاہا کہ ان کے مقصود کی حقیقت میں جامع بیان لکھوں، شیخ بھی اللہ کے فضل وتائید سے اپنے نورِ قلب سے استفادہ کرتے ہوئے اور اسلام اور اس کے اہل کی خیر خواہی بجا لاتے ہوئے یہی کام کر رہے ہیں اور اس سے ان کا قصد اللہ کی رضوان اور دنیا وآخرت میں اس کی مغفرت کی طلب ہے، یہ حضرات جنہوں اس موضوع پر کلام کی تا تاریوں کا اقتدار قائم ہونے تک ان کا معاملہ معروف نہ تھا وگرنہ اتحادِ قدیم (کا نظریہ) یہی اتحادِ معین ہے اور یہ اس وجہ سے کہ اس ضمن میں رباعی تقسیم ہے تو اتحاد اور حلول میں سے ہر ایک یا تو کسی شخص میں معین ہے یا پھر مطلق، جہاں تک معین اتحاد وحلول جیسے نصاریٰ کا اور رافضیوں کے غالی لوگوں اور جہال درویشوں کا بعض مشائخ اور صوفیہ بارے اعتقاد تو یہ معین میں اس کے قائل بنے، یا تو اس طرح کا اتحاد جیسے پانی اور دودھ کا باہم ہوتا ہے اور یہی یعقوبیہ کا قول ہے اور یہ حبشہ اور قبطیوں میں سے سیاہ فام ہیں، اور یا حلول اور یہ نسطوریہ کا قول ہے اور یا کسی نہ کسی وجہ سے اتحاد، جسے ملکانیہ نے اختیار کیا

جہاں تک حلولِ مطلق اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کا اپنی ذات کے ساتھ ہر شئ میں حلول ہے تو اسے قدمائے اہل سنت اور سلف نے قدمائے جہمیہ سے نقل کیا ہے اور اس وجہ سے وہ ان کی تکفیر کرتے تھے اور جس اتحادِ عام کا عقیدہ اور تصور ان حضرات نے پیش کیا ہے تو مجھے نہیں علم کہ ان سے قبل کسی نے یہ بات کی ہو؟ ماسوائے وجودِ صانع کے منکرین کے مثلاً فرعون اور قرامطہ، ان کی حقیقتِ امر یہ ہے کہ ان کی رائے میں عین وجودِ حق ہی عین وجودِ خلق ہے اور ارض وسماء کے خالق اللہ تعالیٰ کی ذات کا وجود ہی مخلوقات کا وجود ہے تو ان کے نزدیک متصور نہیں کہ اللہ اپنے غیر کا خالق ہو، یا وہ رب العالمین ہو یا وہ غنی اور اس کا ماسوا فقیر ہو لیکن وہ درج ذیل تین طرق پر متفرق ہیں

اوران کی تحریر کا مطالعہ کرنے والے اکثر حضرات ان کے حقیقتِ امر کی فہم نہیں رکھتے کیونکہ وہ مبہم امر ہے:

(۱) اس بات کے قائل کہ ذوات سب کی سب عدم میں ثابت تھیں اور یہ ابدی اور ازلی ہیں حتی کہ حیوانات، نباتات اور معدنیات کی ذوات اور حرکات وسکنات بھی اور یہ کہ وجودِحق ان ذوات پر فائض ہوا (یعنی ان پر اس کا فیض ہوا) تو ان کا وجود وجودِ حق ہے مگر ان کی ذوات ذواتِ حق نہیں

(۲) جو وجود اور ثبوت کے مابین تفرقہ کرتے ہیں تو جس کے ساتھ تم اپنے ثبوت میں تھے اسی کے ساتھ اپنے وجود میں ظاہر ہوئے

(۳) جو کہتے ہیں اللہ تعالی نے کسی کو کچھ عطا نہیں کیا اور نہ کسی کو غنی، خوش بخت یا بد بخت بنایا بلکہ دراصل اس کا وجود ذوات پر فائض ہوا تو اگر حمد کرنا چاہو تو اپنے آپ کی کرو اسی طرح ذم بھی اور کہتے ہیں یہی تقدیر کا راز ہے اور اللہ تعالیٰ اشیاء کا ان کی رؤیت کی جہت سے کہ وہ عدم میں ثابت تھیں، عالم ہے اور یہ امر اس کے نفسِ مقدسہ سے خارج ہے، ان کے نزدیک اللہ کائنات میں ذرہ بھر تغیر پر بھی قادر نہیں اور یہ بھی اشیاء کے عالم ہیں اسی طور جیسے اللہ کو ان کی بابت علم ہے تو ان کا علم اور علمِ الٰہی ایک ہی معدن سے ہے اور وہ بعض وجوہ سے خاتم الرسل سے بھی افضل ہیں کیونکہ یہ اس معدن سے براہِ راست اخذ کرتے ہیں جس سے فرشتہِ وحی نے اخذ کیا اور کہتے ہیں کہ غیر اللہ کی عبادت کا تصور بھی محال ہے اور جو جہاں جس شیٔ کی عبادت (پوجا) کر رہا ہے یہ فی الحقیقت اللہ ہی کی ہے (یہ بحث تفصیل سے گزری ہے) اور قائل ہیں کہ اللہ کی طرف دعوت دینا مدعو کے ساتھ مکر ہے کیونکہ وہ ہدایت سے معدوم ہی نہیں حتی کہ غایت کی طرف اسے دعوت دی جائے اور قومِ نوح نے کہا:

﴿وَقَالُوا لَا تَذَرُنَّ آلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَلَا سُوَاعًا﴾ [نوح : **۲۳**] (اور کہنے لگے کہ اپنے معبودوں کو ہرگز نہ چھوڑنا اور وَدّ اور سواع اور یغوث اور یعوق اور نسر کو کبھی ترک نہ کرنا) کیونکہ اگر وہ ان میں سے کسی کا ترک کرتے تو اسی قدر حق ان سے چھوٹ جاتا اس لئے کہ ہر معبود میں حق کیلئے ایک وجہ ہوتی ہے جس کی معرفت خواص کو ہی نصیب ہوتی ہے اور تفریق وکثرت صورتِ محسوسہ میں اعضاء کی مثل ہے یا جیسے صورتِ روحانیہ میں معنوی قویٰ ہوں اور صاحب معرفت خوب پہچانتا ہے کہ کس کی عبادت کر رہا ہے اور وہ کس صورت میں ظاہر ہے حتی کہ عبادت کیا گیا، جاہل کہتا ہے یہ پتھر ہے یا درخت ہے جبکہ عارف کہتا ہے یہ حق تعالی کی تجلی گاہ ہے تو اس کی تعظیم ہونی چاہیے تو کسی ایک پہ اقتصار نہ کرنا ہوگا، ان کی نظر میں نصاری بوجہ تخصیص (کہ صرف حضرت مسیح میں اللہ کا حلول قرار دیا) کافر ہوئے اور بت پرستوں کی تقصیر بس یہ ہے کہ بعض مظاہر پر اقتصار کر لیا اور اللہ بھی ہر شیٔ کا عابد ہے اس لئے کہ اشیاء اسماء واحکام کے ساتھ اس کی غذا ہیں اور وہ وجود کے ساتھ ان کی غذا ہے وہ ان کا اور اشیاء اس کی محتاج ہیں اور وہ اس معنی میں ہر شیٔ کا خلیل ہے، یہ حضرات اسمائے ربانی کو مجرد نسبت اور وجود وثبوت کے درمیان اضافت قرار دیتے ہیں اور یہ عدمی امور نہیں ! کہتے ہیں مثلا اس کے اسماء میں (اَلْعَلِیُّ) ہے تو سوال یہ ہے کہ وہ کسی چیز سے علی (یعنی بالاتر) ہے؟ کہ کائنات میں صرف اسی کا تو وجود ہے، جب کوئی یہاں اس کا

غیر ہے ہی نہیں تو وہ کس سے علی ہے؟ (آگے ان کے عقائد بارے اشارات دئے جو قبل ازیں مفصلاً ذکر ہو چکے ہیں)

ابن تیمیہ کہتے ہیں پہلے تو مجھے شک تھا اور میرا گمان تھا کہ یہ حضرات فرعون کے نظریہ پر ہیں جو خالق وصانع کے وجود کا منکر تھا حتی کہ **ثقہ لوگوں نے بتلایا کہ ان کے اکابر بلا جھجک اعتراف کرتے ہیں کہ وہ فرعون کے نظریہ پر ہیں**، یہ سب اقوال اور معانی مصنفِ فصوص الحکم کے ہیں، اب اللہ ہی زیادہ جانتا ہے کہ کس امر پر اس آدمی کی موت ہوئی ہے اللہ تمام مسلمان اور مومن مردوں اور عورتوں کی مغفرت فرمائے، زندوں کی بھی اور مردوں کی بھی **(رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِي قُلُوبِنَا غِلًّا لِّلَّذِينَ آمَنُوا رَبَّنَا إِنَّكَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ)** [الحشر: **۱۰**] (اے ہمارے رب ہمارے اور ہمارے بھائیوں کے جو ہم سے پہلے ایمان لائے ہیں گناہ معاف فرما اور مومنوں کی طرف سے ہمارے دل میں کینہ نہ پیدا ہونے دے اے ہمارے پروردگار! تو بڑا شفقت کرنے والا مہربان ہے)

مقصود یہ بیان کرنا ہے کہ کتاب **فصوص الحکم کے اکثر و بیشتر مندرجات ایسے ہیں کہ تمام ملل وادیان کے اتباع اللہ کے سامنے ان سے اظہار براءت کریں**، سب کو علم ہے کہ بت پرست مشرک اور اہلِ کتاب کے کفار صانع، خالق، باری ومصور کے وجود کا اعتراف کرتے ہیں جس نے ارض وسماوات کی تخلیق کی اور نور وظلمت کو پیدا کیا، ان کا اور ان کے اولین آباء کا اور مشرق و مغرب کا وہ رب ہے اور ان میں سے کوئی یہ نہیں کہتا کہ وہ عینِ مخلوقات اور نفسِ مصنوعات ہے جیسا کہ انہوں نے کہا

حتی کہ یہ قائل ہیں کہ اگر ارض وسماوات کی حقیقت زائل ہو جائے تو اللہ کی حقیقت بھی زائل ہو جائے گی اور یہ دو اصول سے مرکب ہے ایک کہ معدوم عدم میں ثابت ہے جیسا کہ یہ کثیر معتزلہ اور رافضہ کا نظریہ ہے اور یہ کتاب وسنت، اجماع اور عقل کی رو سے باطل ہے، اہلِ اثبات کے کثیر متکلمین جیسے قاضی ابوبکر نے اس نظریہ کے قائلین کو کافر قرار دیا ہے، ان لوگوں کو یہ غلطی اس جہت سے لگی کہ یہ اللہ کے اشیاء کی بابت ان کے ہونے سے قبل اور کہ یہ اس کے ہاں لوح محفوظ میں ثابت شدہ ہیں کے مابین اور اللہ کے علم سے خارج میں ان کے ثبوت کے درمیان تفرقہ نہ کر سکے، اہل سنت والجماعت مسلمانوں کا مذہب یہ ہے کہ اللہ نے لوحِ محفوظ میں تمام خلائق کی تقدیر ان کی تخلیق سے قبل لکھ ہی دی تھی تو یوں وہ وجودِ علمی اور وجودِ عینی خارجی کے درمیان تفریق کرتے ہیں اسی لئے سب سے پہلی وحی جو ہمارے نبی پر نازل کی گئی وہ ہے:

(اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ)[العلق : **۱-۵**] (اپنے رب کا نام لے کر پڑھو جس نے پیدا کیا۔ جس نے انسان کو خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا ۔ پڑھو اور تمہارا رب بڑا کریم ہے۔ جس نے قلم کے ذریعے سے علم سکھایا۔ اور انسان کو وہ باتیں سکھائیں جن کا اس کو علم نہ تھا)

تو چار مراتب ذکر کئے اور یہی وجودِ عینی ہے جس کی اللہ نے تخلیق کی اور وجودِ رسمی جو دال؟ علی العلمی اور اللہ کے اس کے بارہ میں عالم

ہونے پر دال لفظوں کے مطابق ہے اسی لئے تعلیم (بالقلم) کا ذکر کیا تو یہ تین مراتب کو مستلزم ہے اور یہ قول۔ میری مراد ان حضرات کا قول جو قائل ہیں کہ معدوم فی نفسہ اللہ کے علم سے خارج ثابت شئ ہے۔ اگرچہ باطل ہے اور اس کی دلالت واضح ہے لیکن یہ اسلام میں آج سے چارسو برس قبل مبتدع کیا گیا اور ابن عربی نے اپنے اصحاب کی موافقت کی اور یہ فصوص میں بیان کردہ اس کے مذہب کے دو اصول میں سے ایک ہے

اصلِ ثانی یہ ہے کہ محدَثات مخلوقات کا وجود عین وجودِ خالق ہے، نہ اس کا اور نہ اس کا سوا، تو یہ خاص ابن عربی کی ابتداع ہے (یعنی وہ اس کا موجد ہے) اور اس کے ساتھ وہ اپنے مذہب کے تمام متقدمین مشائخ اور علماء سے متفرد ہوا، یہی قول باقی اتحادیہ نے بھی اختیار کیا البتہ ابن عربی ان میں سے اسلام کی طرف اقرب ہے اور کئی مقامات میں اس نے اچھی کلام کی ہے تو یہ ظاہر اور مظاہر کے مابین فرق کرتا ہے اور امر ونہی اور شرائع کا ان کے ظاہر کے مطابق مقر ہے اور راہِ سلوک کے کثیر اخلاق وعبادات جن کی مشائخِ طریقت تعلیم دیتے رہے، کا حکم دیتا ہے اسی لئے کثیر عباد اس کی کلام سے استفادہ کر کے سلوک کی منازل طے کرتے ہیں اگرچہ وہ اس کے حقائق کی فہم نہیں کرتے، جو ان میں سے ان کی فہم کر سکا اور موافقت کی اس کا قول واضح ہوا

جہاں تک اس کا تلمیذِ خاص صدر رومی تو وہ متفلسف تھا، وہ شریعت اور اسلام سے ابعد ہے اسی لئے فاجر تلمسانی جسے عفیف کا لقب دیا گیا، کہا کرتا تھا میرا قدیمی شیخ متروحنی متفلسف تھا جبکہ دوسرا فیلسوف متروحنی ہے، اس کی مراد صدر رومی سے تھی اس نے اس سے بھی اخذ واستفادہ کیا تھا، ابن عربی اس کتاب میں جمع و وجود کے غیب کی مفتاح کا ادراک نہ کر سکا، اس کا غیر کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مطلق اور معین وجود ہے جیسا کہ وہ حیوانِ مطلق اور حیوانِ معین کے اور جسمِ مطلق اور جسمِ معین کے مابین تفرقہ کرتا ہے اور مطلق خارج میں نہیں پایا جاتا مگر مطلقاً ہی، مطلق کا وجود نہیں مگر خارجی اعیان میں ہی، تو اس کے نظریہ کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اصلاً ہی وجود نہیں اور نہ حقیقت اور نہ ثبوت ہے ماسوائے قائم مخلوقات کے ساتھ نفس الوجود کے، اسی لئے وہ اور اس کا شیخ کہتا ہے کہ اللہ اصلاً ہی قابلِ رؤیت نہیں (یعنی جب اس کا وجود ہی نہیں تو دیکھیں کیسے؟) اور فی الحقیقت نہ اس کیلئے اسم ہے اور نہ صفت، اور انہوں نے صاف الفاظ میں لکھا ہے کہ (معاذ اللہ استغفر اللہ) کتے، خنزیر اور بول و براز کی ذوات عین اس کا وجود ہے، تعالیٰ اللہ عما یقولون، جہاں تک فاجر تلمسانی تو وہ ان سب سے خبیث تر اور کفر میں گہرا ہے، وہ وجود اور ثبوت کے مابین تفرقہ ہی نہیں کرتا جیسے رومی کرتا ہے لیکن اس کے نزدیک کائنات میں کسی بھی طور کوئی غیر اور سوا نہیں اور بندے سوا کے تبھی شاہد ہوتے ہیں جب تک وہ محجوب ہیں، حجاب (یعنی پردہ) جب ختم ہو تو اسے کوئی غیر اور سوا نظر نہ آئے گا اسی لئے وہ تمام محرمات کو حلال قرار دیتا تھا، ثقات نے اس سے نقل کیا ہے کہ کہتا تھا بیٹی، ماں اور اجنبی خاتون سب ایک برابر ہیں ان میں سے کوئی ہم پر حرام نہیں، یہ محجوب ہیں جو انہیں حرام کہتے ہیں! ہم نے کہا یہ تم پر حرام ہوں گی، کہتا تھا قرآن سارا شرک سے بھرا پڑا ہے اس میں توحید ہے ہی نہیں، توحید تو ہماری کلام میں ہے، کہتا رہتا تھا میں ایک ہی شریعت کا عامل نہیں ہوں، کئی دفعہ اچھے موڈ میں ہوتا تو کہتا، قرآن جنت تک جبکہ ہماری کلام اللہ تک پہنچاتی ہے، اس نے اپنے اصول و

نظریات کے موافق اسمائے حسنی کی شرح کی، اس کا شعری دیوان بھی ہے جس میں جودتِ صنعت اور شعری محاسن موجود ہیں لیکن جیسا کہ مقولہ ہے:(لَحۡمُ خِنۡزِیۡرٍ فِیۡ طَبَقٍ صِیۡنِیٍّ) (یعنی چینی کے طبق میں خنزیر کا گوشت)

خلاصہِ کلام یہ کہ حق تعالیٰ ان کے نزدیک بمنزلہ سمندر اور اجزائے موجودات سمندری امواج کے بمنزلہ ہیں، جہاں تک ابن سبعین تو وہ بھی البدو والاحاطہ میں وحدت الوجود کا قائل ہے اور یہ کہ کائنات میں غیر کا وجود نہیں اسی طرح ابن فارض اپنے قصیدہ نظم السلوک کے آخر میں، لیکن یہ تصریح نہیں کی کہ آیا وہ بھی تلمسانی کے قول کے مثل کا قائل ہے یا رومی کے قول کا، وہ تلمسانی کے موقف سے قریب تر ہے لیکن ان میں سے کسی کو تلمسانی کے کفر کی مثل کفر بکتے نہیں دیکھا، شیراز کے ان کے مشائخ میں سے ایک بلیانی نام کا ہے جس کا یہ شعر ہے:

وَفِیۡ کُلِّ شَیۡءٍ لَہٗ اٰیَۃٌ تَدُلُّ عَلیٰ اَنَّہٗ عَیۡنُہٗ

(ہر چیز میں دلیل ہے کہ وہ اس کا عین ہے) نیز:

وَمَا اَنۡتَ غَیۡرُ الۡکَوۡنِ بَلۡ اَنۡتَ عَیۡنُہٗ وَیَفۡھَمُ ھٰذَا السِّرَّ مَنۡ ھُوَ ذَائِقُہٗ

(تو کائنات کا غیر نہیں بلکہ اس کا عین ہے، اس راز کی معرفت اہلِ ذوق ہی کو ہے) (وحدت الوجود کے نظریہ پر مشتمل کئی اشعار پیش کئے جن میں سے بعض قبل ازیں ذکر ہو چکے ہیں)

ان کی نثر تو اس سے بھری پڑی ہے، جہال کو یہ ابہام دیتے ہیں کہ یہ اسلام کے مشائخ اور ائمہِ ہدیٰ ہیں اور اللہ نے اس امت میں انہیں صدق کی زبان بنایا ہے جیسے سلف میں سعید بن مسیّب، حسن بصری، عمر بن عبدالعزیز، امام مالک، اوزاعی، شافعی، ابوسلیمان، احمد بن حنبل، بشر حافی، عبد اللہ بن مبارک، شقیق بلخی، ابراہیم ادہم، سفیان ثوری، فضیل بن عیاض، معروف کرخی اور بہت سے دیگر تھے، اسی طرح متاخرین میں جنید بن محمد قواریری (بغدادی) سہل بن عبداللہ تستری، عمر بن عثمان مکی اور بعد والے ہیں ابوطالب مکی، الشیخ عبدالقادر جیلانی، الشیخ عدی، ابوالبیان، عبدالرحیم، عقیل، ابومدین، ابوالوفاء، رسلان، عبداللہ یونینی، قرشی اور ان کے مثل اولین اور آخرین میں سے حجاز، شام، عراق، مصر، المغرب (یعنی عالَمِ عرب کے مغرب میں واقع ممالک مثلاً الجزائر، مراکش، تیونس اور اندلس) اور خراسان کے مشائخ! یہ سب ان لوگوں (یعنی وحدت الوجود وغیرہ نظریات کے حامل) کی تکفیر پر متفق ہیں اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نہ اپنی خلق ہے اور نہ اپنی خلق کا جزو اور نہ اپنی خلق کی صفت بلکہ وہ اپنی مقدس ذات کے ساتھ متمیز (یعنی جدا) اور اپنی معظم ذات کے ساتھ اپنی مخلوقات سے الگ ہے، یہی چاروں آسمانی کتب تورات، زبور، انجیل اور قرآن پاک میں مذکور ہے اور اسی پر اللہ نے اپنے بندوں کو فطر کیا اور اسی پر عقول کی دلالت ہے! میں اکثر خیال کرتا ہوں کہ ان جیسے نظریات والوں کا ظہور تاتاریوں کے ظہور اور اسلامی شریعت ماند پڑنے کا سب سے بڑا سبب ہے اور یہ کانے کذاب دجال کی آمد کا پیش خیمہ ہیں جو دعوی

کرے گا کہ وہ خدا ہے کیونکہ ان کے نزدیک ہر شئ ہی اللہ ہے لیکن بعض اشیاء بعض سے بڑی ہیں، مصنف فصوص الحکم کی رائے یہ ہے کہ بعض مظاہر اور مستجلیات عدم میں ثابت اپنی ذات کے عظم کی وجہ سے اعظم ہیں جبکہ رومی کی رائے یہ ہے کہ بعض معینات اکبر ہیں کیونکہ کلی کی بعض جزئیات بعض سے بڑی ہوتی ہیں جبکہ بقیہ کی رائے پر سب ہی اس کے اجزاء ہیں اور جزو کا بعض بعض سے اکبر ہے، ان حضرات کے مطابق دجال فرعون کی مثل کبار اہلِ معرفت میں سے ہے اور ہمارے نبی اکرم، حضرات ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ کے بعد دیگر تمام انبیاء سے اکبر ہیں، موسیٰ فرعون کے قاتل ہیں جس نے ربوبیت کا ادعاء کیا تھا، اسی طرح اللہ تعالیٰ مسیح ہدایت کو (یعنی حضرت عیسیٰ) ۔ جن کی بابت کہا گیا کہ وہ الہ ہیں حالانکہ وہ اس سے بری ہیں۔ مسیحِ ضلالت (یعنی دجال) جو خود کہے گا کہ وہ اللہ ہے، پر مسلط کرے گا اور وہ آپ کے ہاتھوں قتل ہوگا اسی لئے بعض لوگوں کو نبی اکرم کی اس بات سے تعجب ہوتا تھا کہ دجال کانا ہوگا اور آپ کے اس فرمان سے کہ تم جان لو تم میں سے کوئی اپنے رب کو دیکھ نہیں سکتا حتیٰ کہ وہ فوت ہو، ابن خطیب تو اس کے حدیثِ نبوی ہونے کا انکار کرتے ہیں کیونکہ دجال پر حدوث و نقص کی علامات کا ظہور اس امر سے ابین ہے کہ اس کے کانا ہونے سے ہی اس کا پتہ چلے

ہم جب ان اتحادیہ کے قول کی حقیقت کو دیکھتے ہیں اور نصاریٰ اور حلولیہ کے عقیدہ میں تدبر کرتے ہیں تو نبی اکرم کی اپنی امت کو اس علامت کے ساتھ دلالت کا سبب ظاہر ہوتا ہے کہ آپ رحمۃ للعالمین بنا کر مبعوث کئے گئے تو جب کثیر خلق رب کے بشر (کی صورت) میں رب کے ظہور کی مجوِز ہوگی یا کہے گی کہ وہ بشر ہے تو اس پر اس کے کانا ہونے کے ساتھ استدلال اس سے انتفائے الوہیت کی دلیل ہے (یعنی جو خود کو کانا ہونے سے نہ بچا سکا وہ رب کیسے ہوسکتا ہے؟) بہت پہلے میرے اچھے ساتھیوں میں سے ایک نے جو اتحاد کی طرف میلان رکھتا تھا پھر تائب ہوا، مجھ سے اس حدیث کی بابت مباحثہ کیا تو میں نے اس کی توجیہہ بیان کی، ہمارے یہاں (یعنی دمشق میں) ایک شخص آیا جو اپنے آپ کو خاتم الاولیاء کہتا تھا، اس کا دعویٰ تھا کہ حلاج نے جب کہا: (أَنَــا الْـحَـقُّ) تو دراصل یہ بات اللہ اس کی زبان سے کہہ رہا تھا جیسے مصروع (یعنی جسے سایہ کی وجہ دورہ پڑا ہوا ہے) کی زبان سے جن بولتے ہیں اور یہ اسی کی نظیر ہے جو صحابہ کرام نبی اکرم کی زبان سے اللہ کی کلام سنتے تھے، تو میں نے اس رائے کی خرابی کو اس کے سامنے آشکار کیا کہ اگر ایسا ہوتا تو صحابہ کرام حضرت موسیٰ کے بمنزلہ ہوتے اور حلاج کے مخاطبین تو حضرت موسیٰ سے بھی اعظم بنے کیونکہ انہوں نے کلام الٰہی درخت سے سنی تھی جبکہ یہ بقول اس کے ایک ناطق جن (جو درخت سے بہر حال اعظم ہے) سے سن رہے ہیں، اتحادیہ کے بعض حضرات یہی کہتے ہیں لیکن ان کے اکثر جہال ہیں، وہ عام و مطلق اتحاد جسے فاجر تلمسانی اور اس کے ساتھیوں نے اختیار کیا اور معین اتحاد جسے نصاریٰ اور غالیہ (یعنی رافضی) نے اختیار کیا، کے مابین فرق نہیں کرتے

جہاں تک **اتحادیہ تو یہ پرانے زمانہ کے جہمیوں سے بھی اخبث اور اکفر ہیں۔** امت کے سلف اور سادات ائمہ نے جہمیہ کے کفر کو یہود کے کفر سے بھی اعظم خیال کیا تھا، عبداللہ بن مبارک اور بخاری وغیرہما نے یہی قرار دیا حالانکہ وہ تلویحات (یعنی اشارات)

سے کام لیتے تھے، کم ہی نے تصریح کی کہ اللہ کی ذات ہر جگہ موجود ہے لیکن سلف اور ائمہ اسلام اور اس کے حقائق کو ان سے زیادہ جانتے ہیں، کثیر لوگ بسا اوقات ان کی ان پر شدید تنقید کا سبب نہیں سمجھتے! دراصل ان کے نظریات واقوال کی حقیقت اسی پر آشکار ہوتی ہے جو خوب تدبر سے کام لے اور اسے نورِ ہدایت کی معاونت ملے اور سلف صالحین کا معاملہ یہی ہوا تھا، وہ جب ان کی حقیقتِ حال پر مطلع ہوئے تو ان سے سخت بد کے اور شدید تنقید کی، بعض کا قول ہے کہ جہمی متکلمین کسی بھی شئ کو معبود نہیں مانتے جبکہ ان کے عباد ہر شئ کو ہی معبود مانتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے متکلمین کے دل میں نہ تألُّہ ہے اور نہ تعبُّد کا جذبہ، وہ تو رب تعالیٰ کو عدم اور موات کی صفات کے ساتھ موصوف قرار دیتے ہیں جہاں تک ان کے متعبدین تو ان کے دلوں میں تألہ اور تعبد ہے اور دل نہیں قصد کرتا مگر موجود کا، نہ کہ معدوم کا تو وہ اس امر کے محتاج بنے کہ مخلوقات کو معبود مانیں یا تو وجودِ مطلق اور یا پھر بعض مظاہر کو جیسے چاند وسورج اور بشر اور بت وغیرہ، تو اتحاد کا نظریہ دنیا میں موجود شرک کی ہر صورت کا جامع ہے، وہ اللہ کو واحد نہیں مانتے بلکہ اس کے اور مخلوقات کے درمیان قدرِ مشترک کو، فَهُمْ بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ (یہ قرآن کی آیت کا حصہ ہے جس کا معنی ہے: وہ اپنے رب کے برابر ٹھہراتے ہیں) مجھے ثقہ حضرات نے بیان کیا کہ ابن سبعین ہندوستان جانے کا ارادہ رکھتا تھا اور کہتا تھا ارضِ اسلام اس کی تاب نہیں لاسکتی کیونکہ اہلِ ہند مشرک تھے جو ہر شئ کو اپنا معبود مانتے تھے حتی کہ نبات اور حیوان کو بھی، تو یہ ہے اتحادیہ کے نظریہ کی حقیقت میں

کئی ایسے صاحبان سے واقف ہوں جو فلسفہ وکلام سے شغف رکھتے ہیں اور وہ ان اتحادیہ کے طریق پر متألِہ ہوئے تو جب وہ علم کلام کی رو سے اللہ تعالی کا وصف کرتے ہیں تو کہتے ہیں وہ ایسا نہیں وہ ویسا نہیں، اسے اس امر سے موصوف کیا کہ وہ مخلوقات کا رب نہیں جیسا کہ مسلمانوں کا عقیدہ ہے وہ اس کی ان صفات کے منکر ہیں جو رسل علیہم السلام نے بیان کیں جب ان میں کوئی صاحبِ ذوق ووجد ہوتا ہے تو اتحادیہ کے طریق کا سالک اور متألہ بنتا ہے اور کہتا ہے: وہ یہی تمام موجودات ہے، اگر اسے کہا جائے ایک طرف وہ اثبات اور پھر یہ نفی؟ تو جواباً کہتا ہے یہ میرا وجد اور وہ میرا ذوق ہے! تو اس گمراہ سے کہا جائے ہر وہ ذوق اور وجد جو اعتقاد کے مطابق نہیں تو یا تو ان دونوں میں سے ایک یا پھر دونوں ہی باطل ہوں گے، اذواق اور مواجید تو معارف اور اعتقادات کے نتائج اور ثمرات ہوتے ہیں تو دل کا علم اور اس کا حال لازم ملزوم ہیں تو علم ومعرفت کے بقدر ہی وجد، محبت اور حال ہوتا ہے، اگر یہ لوگ انبیاء ومرسلین کے طریق کے سالک بنتے جنہیں اللہ وحدہ لاشریک لہ کی عبادت کا حکم تھا اور اللہ کا وہی وصف کرتے جو رسل نے کیا اور سابقین اولین کے نہج پر چلتے تو ہم انہیں راہِ ہدایت کے سالک قرار دیتے اور انہیں یقین کی دولت اور آنکھ کی ٹھنڈک عطا ہوتی! معاملہ وہی جو بعض حضرات نے کہا کہ رسل اثباتِ مفصل اور نفیِ مجمل کے ساتھ تشریف لائے جبکہ صابئہ معطلہ نفیِ مفصل اور اثباتِ مجمل کے ساتھ آئے تو قرآن اثبات میں اللہ تعالی کے فرامین کے ساتھ بھرا پڑا ہے:

﴿وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ﴾ [البقرة: ۲۹] (اور وہ ہر چیز سے باخبر ہے)

﴿اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ﴾ [البقرة:**۲۰**](بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے)

﴿اِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ﴾ [البقرة: ۱۸۱] (اور بے شک اللہ تعالیٰ سنتا (اور) جانتا ہے)

﴿وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا﴾ [الأعراف: ۸۹] (ہمارے رب کا علم ہر چیز پر احاطہ کئے ہوئے ہے) اور نفی میں کہا:

﴿لَیْسَ كَمِثْلِهٖ شَیْءٌ وَهُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ﴾[الشوری : **۱۱**] (اس جیسی کوئی چیز نہیں اور وہ دیکھتا سنتا ہے)

﴿وَلَمْ یَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ﴾[الإخلاص : **۴**] (اور کوئی اس کا ہمسر نہیں)

﴿هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِیًّا﴾[مریم : **۶۵**] (بھلا تم کوئی اس کا ہمنام جانتے ہو)

﴿ سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا یَصِفُوْنَ وَ سَلٰمٌ عَلَی الْمُرْسَلِیْنَ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾[الصافات : **۱۸۰**]

(یہ جو کچھ بیان کرتے ہیں تمہارا رب جو صاحبِ عزت ہے اس سے پاک ہے۔اور پیغمبروں پر سلام۔اور سب طرح کی تعریف اللہ رب العالمین کے لئے ہے) شیخ۔اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ اسلام کی تائید کرے اور آپ کے انفاس کی برکت اور آپ کے حسنِ مقاصد اور نورِ قلب کے ساتھ مسلمانوں کو نفع پہنچائے۔گو کہ اس خط میں میں نے کافی طول بیانی سے کام لیا ہے! لیکن حقیقت یہ ہے کہ موضوع اس سے کہیں زیادہ طوالتِ بیان کا متقاضی تھا، یہ تو مختصر نکات ہیں، ان نظریات پر اس مختصر مکتوب میں سیر حاصل بات نہیں کی جاسکتی، بہر حال شیخ کیلئے چند عاجلانہ ضروری نکات تحریر کر دئے ہیں، اللہ رب العزت سے دعا گو ہوں کہ مسلمانوں کے عوام وخواص کی اصلاح فرمائے اور انہیں ایسے امور کی ہدایت دے جو تقربِ الٰہی کا ذریعہ بنیں اور شیخ کو داعیانِ خیر میں سے بنائے جن کے بارہ میں اس کا ارشاد ہے:

﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ یَّدْعُوْنَ اِلَی الْخَیْرِ وَیَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾

[آل عمران : ۱۰۴] (اور تم میں ایک جماعت ایسی ہونی چاہیئے جو لوگوں کو نیکی کی طرف بلائی اور اچھے کام کرنے کا حکم دے اور بُرے کاموں سے منع کرے، یہی لوگ ہیں جو نجات پانے والے ہیں)۔

ایک استفتاء

علمائے دین **حلاج کے بارہ میں** کیا کہتے ہیں اور اس کی بابت جو کہے: میرا وہی عقیدہ ہے جو حلاج کا تھا، اس کی نسبت کیا کرنا واجب ہے؟ اور جو کہتا ہے کہ حلاج مظلومانہ قتل ہوا ہے جیسے بعض انبیاء کو قتل کیا گیا اور کہتا ہے کہ حلاج اللہ کے اولیاء میں سے ہے تو اس سب کی وجہ سے اس کی نسبت کیا واجب ہے؟ کیا یہ شریعت کی رو سے واجب القتل ہے؟

جواب

الحمدللہ! جس نے وہی اعتقاد رکھا جو حلاج کا تھا اور انہی نظریات کا حامل ہوا جن کی پاداش میں حلاج کو قتل کیا گیا تو وہ بالاتفاق کافر ومرتد ہے، مسلمانوں نے حلاج کو حلول اور اتحاد کا عقیدہ اور اہلِ زندقہ والحاد جیسے دیگر نظریات رکھنے کی پاداش میں قتل کیا تھا

جیسے اس نے کہا تھا : میں اللہ ہوں، اور کہا: ایک الٰہ آسمان میں اوردوسرا (یعنی میں) زمین میں ہے اوردین اسلام کی بنیادی معلومات میں سے ہر مسلمان کومعلوم ہے کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اوراللہ ہرشیٔ کا خالق ہےاوراس کا ماسوامخلوق ہے:

﴿اِنْ كُلُّ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّاۤ اٰتِی الرَّحْمٰنِ عَبْدًا﴾[مریم : ۹۳] (تمام شخص جوآسمانوں اورزمین میں ہیں سب اللہ کے روبرو بندے ہوکرآئیں گے) اورفرمایا:

﴿یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِكُمْ وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ﴾[المائدة: ۱۷۱] (اے اہلِ کتاب! اپنے دین میں حد سے نہ بڑھواوراللہ کے بارے میں حق کے سوا کچھ نہ کہو) الآیات، اورفرمایا:

﴿لَقَدْ كَفَرَ الَّذِیْنَ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِیْحُ ابْنُ مَرْیَمَ﴾[المائدة: ۱۷] (جولوگ اس بات کے قائل ہیں کہ عیسیٰ بن مریم، اللہ ہیں وہ بے شک کافر ہیں) دوآیات ! تو نصاریٰ جنہیں اللہ اور اس کے رسول نے کافرکہا اوراہل اسلام ان کے اللہ و رسول کے ساتھ کفر پرمتفق ہیں ان کے بڑے دعاوی میں سے حضرت مسیح بن مریم کی نسبت حلول واتحاد کا ادعاء ہےتو جس نے غیرِ مسیح کی نسبت حلول واتحاد کا اعتقاد رکھا جیسے غالی شیعہ حضرت علی، حلاجیہ حلاج اورحاکمیہ حاکم بارے یہی عقیدہ رکھتے ہیں توان کا قول نصاریٰ کےقول سے بھی بدتر ہے کیونکہ انہوں نے تو حضرت مسیح بارے یہ اعتقاد رکھا جو بلاشبہ ان سب سے افضل تھے، یہ لوگ دراصل دجال کے پیروکاروں کی جنس سے ہیں جو الوہیت کا دعویٰ کرے گا اورکئی طرح کے خارقِ عادت (یعنی طاقتِ انسانی سے ماوراء) اموانجام دے گا مثلاً آسمان سے کہے گا بارش برساؤ تووہ برسادے گا، زمین سے کہے گا (فلاں) کھیتی اگاؤ، خزانے باہرنکالو تووہ حکم کی تعمیل کرے گی، ایک مومن آدمی کوقتل کرے گا پھرحکم دے گا کہ زندہ کھڑے ہو جاؤ تو یہ ہوگا، اس کے باوجود وہ کانا کذاب ہےتو جس نے ان خوارق کے بغیرہی دعوائے الوہیت کیا وہ دجال سے کمتر ہے، حلاج کے ہاتھوں بھی کئی انواع کےخوارق اور جادو ٹونے کے کام ظاہرہوئے، جادو کےموضوع پرکئی کتب ہیں جواس کی طرف منسوب کی جاتی ہیں

بالجملہ امت کے ہاں اس ضمن میں کوئی اختلاف نہیں کہ جس نے بشر میں اللہ کےحلول اوراتحاد کا عقیدہ رکھا اور یہ کہ بشر بھی الٰہ ہوسکتا ہے وہ کافر مباح الدم ہے اسی وجہ سے حلاج کوقتل کیا گیا تھا، جو کہے اللہ نے حلاج کی زبان پرنطق کیا اورجو حلاج کے منہ سے کلام سنی گئی وہ اللہ کی کلام تھی اور(أَنَا اللّٰہُ) حلاج نے نہیں بلکہ اس کی زبان سے اللہ نے کہا تھا، وہ بالاتفاق کافر ہے، اللہ کا کسی بشر میں حلول نہیں اورنہ اس نے کبھی کسی بشرکی زبان پرکلام کی ہے، وہ تو اپنی کلام بذریعہ رسل پہنچا تارہا ہےتو وہ اس کے احکامات کولوگوں تک پہنچاتے رہے جیسے ایک موقع پرنبی کریم نے فرمایا: (اَمَا إِنَّ اللّٰهَ قَالَ عَلىٰ لِسَانِ نَبِيِّهٖ سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ) (یعنی اللہ نے اپنے نبی کی زبان سے یہ کہلوایا: سمع اللہ لمن حمدہ) کئی دفعہ کسی کوکسی ایلچی کے ذریعہ پیغام بھیجنے والا کہہ دیتا ہے تم میری زبان پرجو چاہے اسے کہہ دینا جیسے احمد بن حنبل نے مروزی سے کہا تھا: (قُلْ عَلىٰ لِسَانِيْ مَا شِئْتَ) (یعنی میری

زباں سے [میرے نام سے] جو چاہو کہہ دو) اور جیسے کہا جاتا ہے تم میری زباں پر (یعنی میرے حوالے سے اور میرے نمائندہ کے بطور) جو چاہو کہو اور جیسے کہا جاتا ہے یہ سلطان کی زبان پر ایسے ایسے کہہ رہا ہے (یعنی اس کے پیغامات اور اوامر سنا رہا ہے) لیکن یہ کہنا کہ اللہ بشر کی زبان پر خود بولتا ہے جیسے جنوں کا جس پہ سایہ ہو اس کی زبان سے جن بولے، تو یہ صریح کفر ہے لیکن اگر اس طرح کی بات (یعنی جو مستفتی نے بطورِ مثال استفتاء میں ذکر کی) کسی غائب الدماغ اور مفقود الحواس جو شرعاً مرفوع القلم ہو جاتا ہے (یعنی قابلِ مواخذہ نہیں رہتا) سے سرزد ہو تو یہ قابلِ نظر اندازی ومعافی ہے چونکہ وہ فناء وسکر کے احوال میں سے ایک حال میں ہے تو بات اگرچہ غلط اور باطل ہے لیکن قائل اس استثنائی صورتحال کی بناء پر نا قابلِ مواخذہ ہے

یہی حکم اس شخص کی بابت بھی لگایا جائے گا جس پر محبت وعشق کا تسلط ہوا جیسے بیان کیا جاتا ہے کہ کسی کے معشوق نے دریا میں چھلانگ لگادی تو اس کا عاشق بھی اس کے پیچھے کود گیا، اس نے کہا تم نے یہ کیوں کیا؟ بولا: (غِبْتُ بِكَ عَنِّيْ فَظَنَنْتُ اَنَّكَ اِنِّيْ) (یہ جملہ گزرا) بعض حضرات اس مقامِ فنا تک پہنچ جاتے ہیں کہ اپنے معبود کے ساتھ اس کی عبادت، اپنے مذکور کے ساتھ اس کے ذکر اور اپنے معروف کے ساتھ اس کی معرفت سے غافل ہو جاتے ہیں، جب کسی کے ساتھ اس طرح کا معاملہ ہو اور اس کے ہوش وحواس گم ہوں اور عقل وخرد ساتھ چھوڑے حتی کہ مرفوع القلم باور ہو تو اس حال میں کسی ایسی ویسی بات منہ سے نکالنے (یا کوئی نازیبا فعل سرزد ہونے) پر عقوبت کا مستحق نہ ہوگا اس علم کے ساتھ کہ یہ خطا اور ضلال ہے اور یہ حالِ ناقص ہے اولیاءاللہ پر اس طرح کا حال طاری نہیں ہوسکتا، حلاج کی نسبت سے جو کرامات بیان کی جاتی ہیں جو اس کے قتل ہوتے وقت ظاہر ہوئیں مثلاً کہ اس کے خون کے قطروں سے زمین میں: (اللّٰـه اللّٰه) کا نقش بن گیا یا وہ اپنے قتل ہونے پر از حد خوش تھا وغیرہ وغیرہ تو یہ سب کذب ہے، مسلمانوں نے کثیر مواضع میں حلاج کے واقعات جمع کئے ہیں جیسا کہ ثابت بن سنان نے اخبار الخلفاء میں اور وہ اس کے قتل ہوتے وقت ادھر موجود تھا اسی طرح مصنف تاریخِ بغداد اسماعیل بن علی حطفی بھی اور جیسے قاضی ابو بکر الخطیب، ابو محمد بن حزم، ابو یوسف قزوینی اور ابوالفرج بن جوزی نے اپنی کتب میں اس کے اخبار و واقعات ذکر کئے ہیں (مگر کسی نے مذکورہ بالا کا ذکر نہیں کیا) الشیخ ابوعبدالرحمٰن سلمی نے طبقات الصوفیہ میں لکھا کہ اکثر مشائخ نے حلاج کو طریقت سے خارج قرار دیا تھا، ابوقاسم قشیری نے مشائخِ طریقت بارے اپنے رسالہ میں حلاج کا ذکر نہیں کیا اور ہم ائمۃ المسلمین میں سے کسی کو نہیں جانتے کہ حلاج کا خیر کے ساتھ ذکر کیا ہو، نہ علماء میں سے اور نہ مشائخ میں سے، البتہ بعض حضرات نے اس کے بارہ میں توقف اختیار کیا کیونکہ اس کے امر کی معرفت نہ کر سکے تھے، بعض حسنِ ظن رکھنے والوں نے زیادہ سے زیادہ یہ بات لکھی ہے کہ بظاہر اس کا قتل کرنا شرعاً واجب ہو چکا تھا اور قاتل مجاہد اور مقتول شہید ہے، یہ موقف بھی غلط ہے، قائل کا کہنا کہ اسے ظلماً قتل کیا گیا تھا باطل قول ہے اس کا واجب القتل ہونا بالاتفاق اس کے اظہارِ الحاد کی وجہ سے تھا لیکن چونکہ اسلام ظاہر کرتا تھا اور بباطن ملحد تھا لہذا حکماً وہ زندیق ہے، جب اسے قید کیا گیا

تو توبہ ظاہر کر دی تھی اور فقہاء زندیق کی توبہ کے قبول کے مسئلہ میں اختلافِ آراء کا شکار ہیں تو اکثر کے نزدیک یہ قابلِ قبول نہیں ! یہی مالک اور اہلِ مدینہ کا مذہب ہے، احمد سے منقول دو روایتوں میں سے اشہر بھی یہی ہے اور یہی ابوحنیفہ کے مذہب کے دو اقوال میں سے ایک قول ہے، مذہبِ شافعی کا ایک فتویٰ بھی یہی ہے، دوسرا قول یہ ہے کہ اس کی توبہ مقبول ہے، اس امر پر سب کا اتفاق ہے کہ جسے اس طرح کے حالات میں قتل کیا جائے وہ مظلومانہ قتل نہیں ہوا، جہاں تک قائل کا اسے اللہ کا ولی قرار دینا تو یہ قائل قطعاً جاہل اور بغیر علم کے یہ کہہ رہا ہے، اگر حلاج سے اہلِ الحاد کے سے اقوال صادر نہ بھی ہوئے ہوتے تو اللہ کا ولی وہ ہوتا ہے جو اللہ کی ولایت پر فوت ہوا اس طور کہ وہ اس سے محبت کرتا اور اس سے راضی تھا، کثیر بلکہ اکثر علماء کے نزدیک یہ صرف نبی اکرم کے اختیار میں ہے کہ کسی کے بارہ میں اس طرح کی گواہی اور بشارت دیں کہ وہ جنتی ہے

سلف کی ایک جماعت مثلا ابن حنفیہ اور علی بن مدینی کی رائے ہے کہ کسی غیرِ نبی کی نسبت یہ بات نہ کہی جائے گی جبکہ بعض نے کہا اگر کسی کے بارہ میں عام مسلمانوں کی رائے خیر ہو تو اس کی بابت یہ کہا جا سکتا ہے کیونکہ ایک روایت میں ہے نبی اکرم تشریف فرما تھے کہ ایک جنازہ گزرا، لوگوں نے مرحوم کے بارہ میں کلمہِ خیر کہا تو آپ نے کہا: واجب ہوئی واجب ہوئی، تھوڑی دیر بعد ایک اور جنازہ گزرا اور اب کے لوگوں نے مرحوم کا اچھے الفاظ میں ذکر نہ کیا تو آپ بولے: واجب ہوئی واجب ہوئی، پوچھنے پر فرمایا یہ جس کی تم نے تعریف کی اس کیلئے جنت اور دوسرے کے لئے جہنم واجب ہوئی، تم زمین میں اللہ کے لوگوں پر گواہ ہو (بقولِ شاعر: زبانِ خلق کو نقارہ خدا سمجھو) اگر اس امر کو جائز بھی مانیں کہ کسی کی بابت یہ گواہی دی جا سکتی ہے کہ وہ اللہ کا ولی ہے، یا تو نص کے ساتھ یا امت کی گواہی کے ساتھ تو حلاج ان میں شمار نہیں ہو سکتا کیونکہ جمہور امت اسے مطعون کرتے اور اہلِ الحاد میں شمار کرتے ہیں، بالفرض اگر کسی کی ولایت پر مطلع ہوا جا سکتا ہے تو یہ صرف اہلِ صلاح وخیر ہی کا کام ہے (ہما و شما کسی کو ولی قرار دینے کے مجاز نہیں) تو یہ جس نے حلاج کی تعریف کی اور اس کے معتقدات کی موافقت ظاہر کی یہ کئی وجوہ سے گمراہ ہے:

(۱) زندیقت ثابت ہونے پر شرع کی تلوار سے کوئی قتل ہونے والا معروف نہیں کہ وہ ظلماً قتل ہوا اور وہ اللہ کا ولی ہو، اس سے قبل جہم بن صفوان، جعد بن درہم، غیلان قدری، محمد بن سعید مصلوب، نابینا بشار بن برد (یہ دورِ عباسی کا ایک نامور شاعر تھا) سہروردی اور ان جیسے بے شمار قتل کئے گئے، کسی اہلِ علم و دین نے نہیں کہا کہ یہ سب ظلماً قتل کئے گئے اور یہ اللہ کے ولی تھے تو حلاج میں ایسے کیا سرخاب کے پر لگے ہیں کہ اس کی بابت یہ کہا جائے؟ جہاں تک انبیائے کرام تو انہیں کفار نے شہید کیا اسی طرح صحابہ کرام میں سے کئی اور حضرات عثمان، علی اور حسین کو باغی خوارج نے قتل کیا، فقہائے دین مثلا مالک، شافعی، ابوحنیفہ اور احمد وغیرہم میں سے کوئی اس بات کا قائل نہیں کہ ان میں سے کوئی شریعت کے حکم سے قتل کیا گیا ہے

(۲) کسی کے ولی ہونے کی اطلاع اور اس کا پتہ ولایت کے طریق سے ہی لگ سکتا ہے جو ایمان وتقوی ہے اور ایمان وتقوی کی

بڑی نشانی یہ ہے کہ ملحدانہ اقوال ونظریات سے بچا جائے مثلاً حلول واتحاد کا نظریہ تو جو شخص حلاج کے ان نظریات کی موافقت کرتا ہے وہ ایمان وتقوی اور اولیاء کے طریق کا عارف نہیں لہذا اسے کوئی حق حاصل نہیں کہ وہ کسی کو اللہ کا ولی قرار دے

۳۔ اس قائل نے اعتراف کیا ہے کہ وہ بھی حلاج جیسے معتقدات کا حامل ہے لہذا یہ بھی اسی کی جنس سے ہے تو اس کے لئے ولی ہونے کی اس کی گواہی گویا اپنے آپ کے لئے بھی ہے جیسے یہود، نصاری اور رافضی اپنے آپ کے اہلِ حق ہونے کی گواہی دیتے ہیں اور آدمی کا خود اپنے لئے کذب وصدق کا علم ہوئے بغیر کوئی گواہی دینا مردود ہے، تو حلاج جیسے اقوال ونظریات کے حاملین کی گمراہی کتاب وسنت اور اجماع سے ثابت ہے

۴۔ یہ کہنا کہ حلاج نے مرتے دم توبہ کر لی تھی تو یہ معاملہ اس کے اور اللہ تعالی کے مابین ہے کہ یہ غیب کی بات ہے اور غیب دان صرف اللہ تعالی کی ذات ہے، پھر یہ کہنا کہ اس طرح کی باتیں حلاج نے عالمِ جذب ومستی اور حالتِ فناء میں کہی تھیں تو یہ قرار دینا بھی غلط ہے کیونکہ اس نے ہوش وحواس کی حالت میں کتابیں تصنیف کیں جن میں یہ نظریات درج کئے اور وہ ان پر تقریریں کرتا تھا اور پہلے گزرا کہ غائب الدماغی رفعِ قلم میں عذر بن سکتی ہے اسی طرح وہ شبہ (یعنی شک کا فائدہ دینا) جس کے ساتھ قیامِ حجت مرفوع ہو جاتی ہے تو یہ فی الظاہر عذر بن سکتا ہے! یہ بھی اگر فرض کر لیا جائے پھر بھی اس کے قتل کو ظلم کہنا جائز نہیں اور نہ یہ کہہ سکتا ہے کہ وہ اس کے نظریات پر اس کے موافق ہے لیکن جب معاملہ ہی اس کے برعکس ہو، مسلم ومومن کی غایت یہ ہے اگر وہ حلاج کو معذور باور کرنا چاہے کہ اس کے بارے میں اصطلام (یعنی حالتِ جذب ووجد اس طور کہ مفقود الحواس ہوا) اور شبہ کا دعوی کرتے لیکن یہ قائل تو صاف کہہ رہا ہے کہ اس کے نظریات صحیح ہیں اور وہ بھی اس کا موافق ہے تو یہ تو ملحدوں اور زندیقوں کا حال ہے اور جو اس کے مثل کے قتل کو ناجائز کہے وہ دینِ اسلام سے خارج ہے، ہمارے ذمہ یہ ہے کہ اس توحید کی معرفت کریں جس کا ہمیں کتاب وسنت میں حکم ملا ہے اور اسے ہی اللہ کا طریق قرار دیں جس کے ہم مامور کئے گئے تو دین اور شریعت کی معرفت کی رو سے ہم نے جانا ہے کہ حلاج نے جو کہا وہ باطل ہے اور اس جیسے کا قتل واجب ہے البتہ اس کے باطن کا حال ہم اللہ پر چھوڑیں گے کہ اگر اس نے بباطن توبہ کر لی تھی تو یہ معاملہ اللہ کے حوالے ہے کسی کو یہ ضرورت نہیں کہ کسی کے اندرون کی حقیقت کے عالم ہونے کا دعوی کرے (ہم تو صرف ظاہر کی بناء پر حکم لگائیں گے)

شیخ سے اس شخص کی بابت سوال ہوا جو کہے: (مَا ثَمَّ إِلَّا اللّٰہ) (لفظی ترجمہ: ادھر بس اللہ ہی اللہ ہے) آیا یہ کافر ہے؟

جواب میں کہا:

الحمد للہ! قائل کا یہ کہنا ایک مجمل جملہ ہے جو صحیح اور باطل دونوں معانی کو محتمل ہے اگر یہ کہنے سے اس کی مراد یہ ہے کہ کائنات میں بجز اللہ کے کوئی خالق، رب، رازق، معطی، مانع، خافض، رافع، دعائیں قبول کرنے والا، مدد کرنے والا، دادرسی کرنے والا، شفا دینے والا اور عزت وذلت دینے والا کوئی نہیں، اس بات کا حقدار کہ اس پر توکل کیا جائے اور اس سے استعانت لی جائے جیسے فاتحہ

میں کہا: ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ﴾ [الفاتحۃ : ۴] (اے اللہ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں) اور: ﴿فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ﴾ [ھود: ۱۲۳] (تو اسی کی عبادت کرو اور اسی پر بھروسا رکھو اور جو کچھ تم کر رہے ہو تمہارا پروردگار اس سے بے خبر نہیں ہے) ﴿قُلْ هُوَ رَبِّي لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ مَتَابِ﴾ [الرعد: ۳۰] (کہہ دو وہی تو میرا رب ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں، میں اُسی پر بھروسا کرتا ہوں اور اُسی کی طرف رجوع کرتا ہوں) تو یہ سب معانی درست ہیں اور یہی صریح توحید ہے، قرآن اسی کو لے کر آیا تو بندوں کیلئے لائق ہے کہ وہ اللہ کے سوا کسی کا خوف نہ کریں جیسے کہا: ﴿فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ﴾ [المائدۃ: ۴۴] (تو تم لوگوں سے مت ڈرنا اور مجھ ہی سے ڈرتے رہنا) اور:

﴿الَّذِينَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ إِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ إِيمَانًا وَقَالُوا حَسْبُنَا اللَّهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ فَانْقَلَبُوا بِنِعْمَةٍ مِنَ اللَّهِ وَفَضْلٍ لَمْ يَمْسَسْهُمْ سُوءٌ﴾ [آل عمران: ۱۷۳ ۔ ۱۷۴] (اُن سے لوگوں نے آ کر بیان کیا کہ کفار نے تمہارے لئے جمع کیا ہے تو اُن سے ڈرو تو اُن کا ایمان اور زیادہ ہو گیا اور کہنے لگے کہ ہمیں اللہ کافی ہے اور وہ بہت اچھا کارساز ہے۔ پھر وہ اللہ کی نعمتوں اور اُس کے فضل کے ساتھ واپس آئے اُن کو کسی طرح کا ضرر نہ پہنچا) اور:

﴿إِنَّمَا ذَٰلِكُمُ الشَّيْطَانُ يُخَوِّفُ أَوْلِيَاءَهُ فَلَا تَخَافُوهُمْ وَخَافُونِ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ﴾ [آل عمران : ۱۷۵] (یہ تو شیطان ہے جو اپنے دوستوں سے ڈراتا ہے، تو اگر تم مومن ہو تو اُن سے مت ڈرنا اور مجھ ہی سے ڈرتے رہنا) اسی طرح سوائے اللہ کے کسی کو امیدوں کا مرکز بنانا بھی صحیح نہیں، ارشاد کیا:

﴿مَا يَفْتَحِ اللَّهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا وَمَا يُمْسِكْ فَلَا مُرْسِلَ لَهُ مِنْ بَعْدِهِ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾ [فاطر: ۲] (اللہ جو اپنی رحمت (کا دروازہ) کھول دے تو کوئی اس کو بند کرنے والا نہیں اور جو بند کر دے تو اس کے بعد کوئی اس کو کھولنے والا نہیں اور وہ غالب حکمت والا ہے) اور:

﴿قُلْ أَفَرَأَيْتُمْ مَا تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ أَرَادَنِيَ اللَّهُ بِضُرٍّ هَلْ هُنَّ كَاشِفَاتُ ضُرِّهِ أَوْ أَرَادَنِي بِرَحْمَةٍ هَلْ هُنَّ مُمْسِكَاتُ رَحْمَتِهِ قُلْ حَسْبِيَ اللَّهُ عَلَيْهِ يَتَوَكَّلُ الْمُتَوَكِّلُونَ﴾ [الزمر: ۳۸] (کہو کہ بھلا دیکھو تو جن کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو اگر اللہ مجھ کو کوئی تکلیف پہنچانی چاہے تو کیا وہ اس تکلیف کو دُور کر سکتے ہیں یا اگر مجھ پر مہربانی کرنا چاہے تو وہ اس کی مہربانی کو روک سکتے ہیں؟ کہہ دو کہ مجھے اللہ ہی کافی ہے بھروسہ رکھنے والے اسی پر بھروسہ رکھتے ہیں) عبادت بھی صرف اللہ ہی کی ہوگی:

﴿وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ حُنَفَاءَ وَيُقِيمُوا الصَّلَاةَ وَيُؤْتُوا الزَّكَاةَ وَذَٰلِكَ دِينُ الْقَيِّمَةِ﴾ [البینۃ : ۵] (اور ان کو حکم تو یہی ہوا تھا کہ اخلاص کے ساتھ اللہ کی عبادت کریں، یکسو ہو کر اور نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دیں اور یہی سچا دین ہے) دعا بھی صرف اللہ سے کرنی چاہئے:

﴿وَّاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا﴾[الجن : **۱۸**] (اور یہ کہ مسجدیں اللہ کیلئے ہیں تو اللہ کے ساتھ کسی اور کی عبادت نہ کرو) اور:

﴿فَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَكُوْنَ مِنَ الْمُعَذَّبِيْنَ﴾[الشعراء: **۲۱۳**] (تو اللہ کے سوا کسی اور معبود کو مت پکارنا ورنہ تمہیں عذاب دیا جائے گا) چاہے یہ دعائے عبادت ہو (یعنی جو اذکار اور ادعیہ ماثورہ نماز میں، نماز کے بعد و دیگر اوقات میں پڑھی جاتی ہے) یا دعائے مسئلہ (یعنی اللہ سے کچھ طلب کرنا) لیکن اگر یہ کہنے سے اس کی مراد وہ جو اہلِ اتحاد کہتے ہیں کہ کائنات میں بجز اللہ کے وجود کے کسی کا وجود نہیں اور وہ قائل ہیں کہ: (لَيْسَ إِلَّا اللّٰهُ) یعنی اللہ کے سوا کوئی موجود نہیں اور ان کا نظریہ ہے کہ وجودِ مخلوقات ہی وجودِ خالق ہے اور خالق مخلوق اور مخلوق خالق ہے (جس کی تفصیل سابقہ صفحات میں تفصیل سے گزری) الغرض وہ بندے اور رب کے درمیان دوئی کا اثبات نہیں کرتے اسی طرح اہلِ حلول جیسا کہ یہ جہمیہ کا عقیدہ تھا جو قائل تھے کہ اللہ اپنی ذات کے ساتھ ہر جا موجود ہے، وہ اللہ کو مخلوقات کے ساتھ مختلط مانتے تھے تو اگر اس معنی کا ارادہ کیا تب وہ ملحد اور ضال ہے، واجب ہے کہ اسے توبہ کا کہا جائے! کرلے تو ٹھیک وگرنہ قتل کردیا جائے۔

شیخ سے نبی اکرم کے فرمان: (لَا تَسُبُّوا الدَّهْرَ فَإِنَّ اللّٰهَ هُوَ الدَّهْرُ) (زمانے کو برا نہ کہو کہ زمانہ تو اللہ ہے) **بارے سوال ہوا** کہ کیا اس سے اتحادیہ کے نظریہ اور عقیدہ کی تائید ہوتی ہے؟ ہمارے لئے اس کی وضاحت کریں۔

تو جواب دیا:

الحمدللہ! آنجناب کا فرمانِ مذکور کئی دیگر الفاظ سے بھی مروی ہے مثلا: (يَقُوْلُ اللّٰهُ يُؤْذِيْنِي ابْنُ آدَمَ يَسُبُّ الدَّهْرَ وَأَنَا الدَّهْرُ بِيَدِي الأَمْرُ أُقَلِّبُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ) (مجھے ابن آدم ایذاء دیتا ہے جب وہ زمانے کو برا کہتا ہے اور زمانہ تو میں ہوں، سب معاملہ میرے ہاتھ میں ہے رات اور دن کی گردش میں کرتا ہوں) ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں: (لَا تَسُبُّوا الدَّهْرَ فَإِنَّ اللّٰهَ هُوَ الدَّهْرُ يُقَلِّبُ اللَّيْلَ وَ النَّهَارَ) ایک جگہ ان الفاظ کے ساتھ ہے: (يَقُوْلُ ابْنُ آدَمَ يَا خَيْبَةَ الدَّهْرِ وأَنَا الدَّهْرُ) (یعنی ابن آدم کہتا ہے وائے زمانے کی ناکامی! جبکہ زمانہ تو میں ہوں) تو حدیث میں آپ کا قول: (بِيَدِي الأَمْرُ أُقَلِّبُ اللَّيْلَ وَ النَّهَارَ) اس سے اس حدیث کی تبیین مراد ہوتی ہے کہ مراد یہ نہیں کہ وہ زمانہ ہے کیونکہ اس نے خبر دی ہے کہ وہی دن و رات کو گردش کراتا ہے اور زمانہ ہی شب و روز ہے تو اسی حدیث سے دلالت ملی کہ اللہ تعالیٰ رات و دن کی تقلیب کرتا اور انہیں پھیرتا رہتا ہے جیسا کہ یہ آیت بھی اسی معنی پر دال ہے:

﴿اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُزْجِيْ سَحَابًا ثُمَّ يُؤَلِّفُ بَيْنَهٗ ثُمَّ يَجْعَلُهٗ رُكَامًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ جِبَالٍ فِيْهَا مِنْۢ بَرَدٍ فَيُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ وَيَصْرِفُهٗ عَنْ مَّنْ يَّشَآءُ يَكَادُ سَنَا بَرْقِهٖ يَذْهَبُ بِالْاَبْصَارِ يُقَلِّبُ اللّٰهُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ﴾[النور: **۴۳**] (کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ

ہی بادلوں کو چلاتا ہے پھران کو آپس میں ملا دیتا ہے اوران کو تہ بتہہ کر دیتا ہے پھرتم دیکھتے ہو کہ بادل سے مینہ نکل رہا ہے اور آسمان میں جو پہاڑ ہیں ان سے اولے نازل کرتا ہے تو جس پر چاہتا ہے اس کو برسا دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے ہٹا دیتا ہے اور بادل میں جو بجلی ہوتی ہے اس کی چمک آنکھوں کو اچکے لئے جاتی ہے۔اور اللہ ہی رات اور دن کو بدلتا رہتا ہے اہلِ بصارت کے لئے اس میں بڑی عبرت ہے)

تو اس میں اللہ تعالیٰ نے بارش کی اپنی طرف سے تخلیق اور زمین پر اس کے انزال کا ذکر کیا تو یہ ارضی حیات کا سبب ہے کیونکہ اس نے ہر جاندار شیٔ پانی سے بنائی ہے پھر کہا: (یُقَلِّبُ اللّٰہُ الخ) کہ گردشِ لیل ونہار انزالِ مطر کے ساتھ تحویل احوالِ عالم ہے جو نباتات، حیوانیات اور معدنیات کی خلق کا سبب ہے اور اس سے لوگوں کی حالت بدلتی ہے جو کسی قوم کے عروج اور کسی کے تنزّل کو متضمن ہے، اللہ نے متعدد مقامات میں اپنی تخلیقِ زمان کا ذکر کیا جیسے کہا: **(وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَ النُّوْرَ)[الأنعام : ۱]** (اور اندھیرا اور روشنی بنائی) اور:

(وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ)[الأنبیاء: **۳۳**] (اور وہی تو ہے جس نے رات اور دن اور سورج اور چاند کو بنایا سب آسمان میں تیر رہے ہیں)

(وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ یَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا)[الفرقان : **۶۲**] (اور وہی تو ہے جس نے رات اور دن کو ایک دوسرے کے پیچھے آنے جانے والا بنایا اس شخص کیلئے جو غور کرنا چاہے یا شکر گزاری کا ارادہ کرے)

(اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ) [آل عمران : ۱۹۰] (بے شک آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور رات اور دن کے بدل بدل کر آنے جانے میں عقل والوں کیلئے نشانیاں ہیں)

اور دیگر کئی آیات جو دال ہیں کہ وہ خالقِ زمان ہے،کوئی عاقل یہ تو ہم نہیں کرتا کہ اللہ زمان ہے کہ زمان مقدارِ حرکت ہے اور حرکت کی مقدار اعراض اور قائم بالغیر صفات مثلاً حرکت وسکون اور سیاہ وسفیدی کے باب سے ہے اور کوئی دانا یہ نہیں کہہ سکتا کہ کائنات کا خالق اَعراض اور جواہر واعیان کی محتاج صفات میں سے ہے کیونکہ اعراض تو بنفسہا قائم ہی نہیں بلکہ کسی محل کی محتاج ہیں جس کے ساتھ ان کا قیام ہو اور اپنے غیر کا محتاج بنفسہ موجود نہیں ہوتا تو جو خود سہارے کا محتاج ہے وہ خالق کیونکر ہوسکتا ہے؟

پھر خالق وہ ہوتا ہے جو اپنی ذات کے ساتھ مستغنی ہو اور اس کا ماسوا اس کا محتاج ہو اور یہ خالق سبحانہ کی صفت ہے تو کیونکر تو ھم ہو کہ وہ اول نوع سے ہے؟ اور اہلِ الحاد ووحدت،حلول یا اتحاد کے قائلین یہ نہیں کہتے کہ وہ زمانہ ہے اور نہ یہ کہ وہ اعراض وصفات کی جنس سے ہے بلکہ وہ اسے مجموعِ عالم یا مجموع عالم میں حالّ (حلول کیا ہوا) قرار دیتے ہیں تو اس حدیث میں ان کیلئے کوئی تائید نہ ہوتی اگر اس میں یہ بیان نہ بھی ہوتا کہ وہ مقلبِ لیل ونہار ہے تو اس بیان کے ہوتے ہوئے یہ کیسے ان کی مؤید ہوسکتی ہے؟ یہ سب واضح ہونے کے

بعد ملحوظ رہے کہ اس حدیث کے بارہ میں امام احمد کے اصحاب اور دیگر کے دو قول ہیں، ایک: اور یہ ابو عبید اور اکثر علماء کا قول ہے کہ اس حدیث میں آپ نے یہ کلام اہلِ جاہلیت اور ان جیسوں کے قول کے رد میں کہی، انہیں جب کوئی مصیبت پہنچتی یا ان کی حاجات پوری نہ ہوتیں تو زمانے کو برا بھلا کہنا شروع ہو جاتے، یہ قول ان کے ہاں عام و رائج تھا: (قَبَّحَ اللّٰہُ الدَّھْرَ) (یعنی اللہ زمانے کو قبیح بنادے) یا (لَعَنَ اللّٰہُ الزَّمَانَ الذی۔۔۔۔۔) (اللہ زمانے پر لعنت کرے) شعراء کے ہاں اکثر اس کا استعمال ملتا ہے (آجکل بھی ہے) وہ اکثر زمانہ سے مخاطب ہو کر اس کے ستم کی شکایت کرتے ہیں، ان کا قصد دراصل ان حالات کے فاعل کی سب و شتم ہوتا تھا اور انہیں وہ زمانہ کی طرف مضاف کرتے تو یوں یہ سب و شتم اللہ تعالیٰ کیلئے واقع ہوتی تھی کیونکہ وہی تو ان امور و حالات کا فاعل اور محدِث ہے، دہر تو اس کی مخلوق ہے جسے وہ پھیرتا اور گردش میں لاتا ہے تو تقدیرِ کلام یہ ہے: ابن آدم ان امور کے فاعل کو برا کہتا ہے جبکہ ان کا فاعل تو میں ہوں تو جب وہ دہر کو برا کہتا ہے تو اس کا مقصود فاعل (حقیقی) کی سب و شتم ہے اگرچہ فعل کو زمانہ کی طرف مضاف کرے، زمانہ کا کوئی فعل نہیں، فاعل صرف اللہ وحدہ کی ذات ہے اس کی مثال جیسے کسی آدمی کے خلاف کسی قاضی نے کوئی فیصلہ دیا یا کسی مفتی نے کوئی فتوی تو وہ کہنا شروع ہوا: اللہ اس پر لعنت کرے جس نے یہ فیصلہ اور یہ فتوی دیا جبکہ یہ فیصلہ اور فتوی تو شریعت کے مطابق ہے جو نبی اکرم نے ہمیں دی تو یوں اس سب و شتم کا اصل ہدف آنجناب بنے جبکہ قائل بوجہ اپنی جہالت کے اس واسطہ بنے شخص (قاضی و مفتی) کو اپنے تئیں برا کہہ رہا ہے، ان کا فعل تو فقط شرعی فیصلہ اور حکم کی تبلیغ ہے اس کے بالمقابل زمانہ کا کوئی فعل و کردار نہیں وہ تو اللہ ہے جو گردشِ دوران کا فاعل ہے

دوسرا قول نعیم بن حماد، اہلِ حدیث اور صوفیاء کی ایک جماعت کا ہے جو کہتے ہیں (اَلدَّھْرُ) اللہ کے اسمائے حسنی میں سے ہے اور اس کا معنی ہے: قدیم اور ازلی، ان حضرات نے بعض ادعیہ میں یہ الفاظ روایت کئے: (یا دَھْرُ، یا دَیْھُوْرُ، یا دِیْھَار) یہ معنی صحیح ہے اس لئے کہ اللہ سبحانہ وہ اول ہے جس سے قبل کوئی شیٔ نہ تھی اور وہ آخر ہے جس کے بعد کوئی شیٔ نہیں تو معنی کے لحاظ سے یہ صحیح ہے، نزاع صرف اس امر میں ہے کہ آیا ہر حال میں اللہ کو دھر کا نام دیا جا سکتا ہے؟ مسلمانوں کا اجماع ہے اور یہ بات عقلِ صریح کی رو سے بھی معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ وہ دھر نہیں جسے ہم زمانہ کہتے ہیں یا جو جاری مجری الزمان ہے، لوگ متفق ہیں کہ زمان سے مراد لیل و نہار ہیں اسی طرح وہ اوقات جو جنت میں ہوں گے جیسے کہا: (**وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيهَا بُكْرَةً وَعَشِيًّا**) [کھیعص: **۶۲**] (اور ان کے لئے اس میں صبح و شام رزق ہے) مفسرین نے اس مذکورہ بکرہ اور عشی کی مقدار بارے کہا جیسے دنیا میں ایک ہفتہ اور ایک مزید دن ہو، جنت میں شمس و قمر نہ ہوں گے لیکن اوقات کی پہچان دیگر انوار کے ذریعہ ہوگی جن کی بابت مروی ہے کہ وہ عرش کے نیچے سے نمودار ہوا کریں گے تو وہاں زمان سے مراد حرکت کی وہ مقدار جس کے ساتھ وہ انوار ظاہر ہوا کریں گے

اور کیا اس کے ماوراء کوئی قائم بنفسہ جوہر موجود ہے جسے دھر کہا جا سکے؟ اس بابت لوگوں کے ہاں اختلافِ آراء ہے، افلاطون کے اصحاب میں سے فلاسفہ کی ایک جماعت نے اس کا اثبات کیا جیسے انھوں نے خارج میں مجرد کلیات کا بھی اثبات کیا ہے جنہیں مُثُلِ افلاطونیہ

اور مُثُلِ مطلقہ کا نام دیا جاتا ہے اور ہیولیٰ کا اثبات کیا جو صور سے مجرد ایک مادہ ہے اور انہوں نے خلاء کا اثبات کیا جو (ان کے خیال میں) قائم بنفسہ جوہر ہے! جہاں تک جماہیر عقلائے فلاسفہ وغیرہم تو وہ جانتے ہیں کہ ان سب کی خارج میں کوئی حقیقت نہیں یہ تو ایسے امور ہیں جنہیں ذہن سوچتا اور ان کی بابت اندازے لگاتا ہے تو غالطین سمجھتے ہیں کہ یہ جو اذہان میں (جس کا تصور) ثابت ہے خارج از ذہن بھی یہ بعینہ ثابت ہے جیسے اسی طرح کا انہوں نے ظن وجودِ مطلق بارے کیا اپنے یہ جاننے کے باوجود کہ مطلق بشرطِ اطلاق کا وجود صرف ذہن میں ہے خارج میں سوائے معین شئ کے کسی کا وجود نہیں ہوتا اور یہ اعیان ہیں اور وہ صفات جو ان کے ساتھ قائم ہیں! تو مکان نہیں مگر جسم اور جو اس کے ساتھ قائم ہو اور زمان نہیں مگر حرکت کی مقدار اور صورتوں سے مجرد مادہ نہیں بلکہ صورتوں کے ساتھ مقترن مادے کا بھی وجود نہیں سوائے جسم کے جس کے ساتھ اعراض قائم ہیں اور نہ کوئی صورت ہے مگر جو قائم بالجسم عرض ہے یا وہ جسم جس کے ساتھ عرض قائم ہے، اس پر ایک جگہ مفصل بحث کی ہے! یہاں مقصود علی وجہ الاختصار اس بارے محدود آگہی دینا تھا۔

(یہاں بحمد اللہ فتاویٰ ابن تیمیہ کی دوسری جلد ختم ہوئی)

فہرست مندرجات